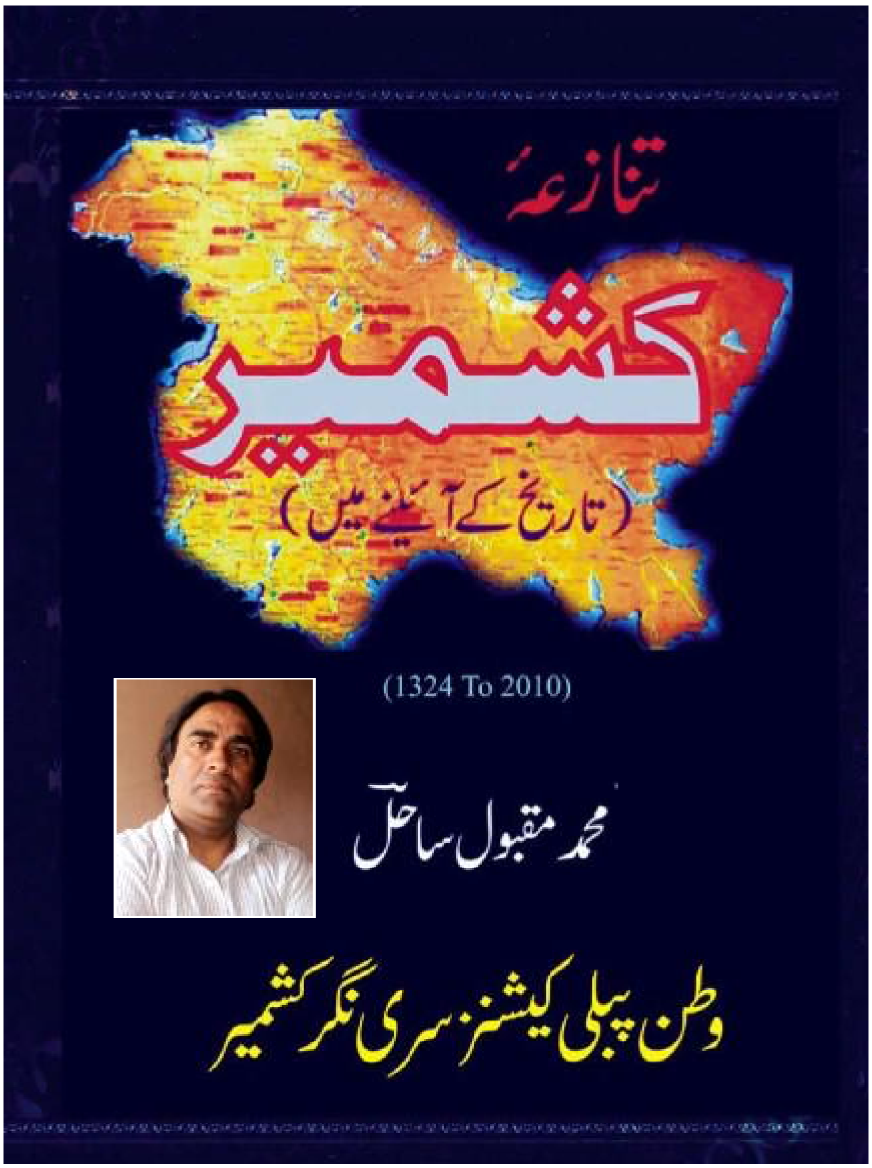

تنازعۂ
کشمیر
(تاریخ کے آئینے میں)
(1324 To 2010)
محمد مقبول ساحل
وطن پبلی کیشنز سری نگر کشمیر

بسمه الله الرحمان الرحیم

تنازعۂ

کشمیر......

(تاریخ کے آئینے میں)

☆

آج وہ کشمیر ہے محکوم ومجبور وفقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

☆

مقبول ساحلؔ

TANAZA-E-KASHMIR

(Tareekh Kay Aaeenay Mein)

(A Book on Kashmir Dispute)

By: M Maqbool Sahil

Price: Rs./= 750

نام کتاب	....	تنازعۂ کشمیر...تاریخ کے آئینے میں
مصنف	....	مقبول ساحلؔ
سال اشاعت	....	2011ء
تعداد	....	500
صفحات	....	398
قیمت	....	مبلغ/750روپے
مطبوعہ	....	سالاسار امیجنگ سسٹمز دھلی ۳۵
ناشر	....	ایپل بکس سری نگر

اس کتاب میں اظھار کئے گئے خیالات خالص مصنف کے ھیں،
ناشر کا مصنّف کی آراء سے متفق ھونا ضروری نھیں۔

PUBLISHER:

APPLEBOOKS

an imprint of

Wattan Publications

Srinagar

اِنتساب!

سسکتے، بلکتے، غمزدہ، مسکین، بےحال،

بےیارومددگارمگرغیوروباشعورباشندگانِ

مادرِوطن کےنام......

محمدؐمقبول ساحلؔ
سرینگر کشمیر

ترتیب وفہرست

پیشِ لفظ

تاریخی مضامین پر مشتمل ادیب اور صحافی مقبول ساحلؔ کی کتاب ''کشمیر..تاریخ کے آئینے میں'' میرے سامنے ہے، یہ مضامین ہفت روزہ ''پکار'' میں چھپ چکے ہیں، چونکہ ان مضامین کا ہماری تاریخ اور ہماری جنگِ آزادی کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس لئے ہمیں ان مضامین کو پڑھ کر سوچنا پڑے گا کہ ہم حقیقت سے کتنی دور ہیں، قوموں کی منازلِ ترقی طے کرنے اور ان کو پستی سے بچانے کے لئے تاریخ ایک موثر قوت ہے۔ تاریخ کا ایک ایک سبق ایک قوم کو پستی سے نکال کر بامِ عروج پر پہنچا دیتا ہے، اس لئے یہ کتاب ہمارے گم شدہ تاریخی سرمایہ، خاص طور پر جنگ آزادی پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مصنف کو کشمیر سے حد درجہ محبت ہے اور یہی محبت اس کو جذباتی بھی بنا دیتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جذبات اور تاریخ کے واقعات ایک دوسرے سے میل کھاتے ہیں، چونکہ مصنف حب الوطنی کے الزام میں طرح طرح کی تکالیف سہہ چکا ہے، انٹیروگیشن اور زندان کی تکالیف نے اس کے دل و دماغ کو بری طرح سے مجروح کیا ہے، اس لئے اس کا لہجہ حکمرانوں کے خلاف ہے اور وہ اس کا اظہار غصے اور طنز کی صورت میں کرتا ہے، حالانکہ تاریخی واقعات کو بیان کرتے وقت ایک درمیانی راستہ اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے، تاہم اس کتاب میں جونئ معلومات درج ہیں، وہ قارئین کی معلومات میں قابلِ قدر اضافہ کرتی ہیں اور ریسرچ کے نئے مواقع پیش کرتی ہیں۔

کشمیر، ایشیاء کا دل ہے، شاہراہِ ابریشم پر واقع ہونے کی وجہ سے اس ملک کو ہمسایہ ممالک چین، تبت، وسطی ایشیا، افغانستان اور ہندوستان کی مختلف تہذیبوں سے واسطہ پڑا ہے، جس کا اس نے اثر بھی قبول کیا ہے لیکن اس کے باوجود کشمیر نے اپنی انفرادیت کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے، اس لئے یہ خطہ صدیوں سے طرح طرح کے مظالم سہتا رہا ہے۔ کشمیر کے لوگ اپنے ملک کو 'کشیر' اور خود کو 'کوشُر' کہہ کر پکارتے ہیں، عیاں ہے کہ یہ دونوں الفاظ عبرانی زبان سے تعلق رکھتے ہیں... کشمیری مختلف زمانوں میں پامال ہوتے ہوئے بھی ابھرتے رہے۔ کشمیریوں کی سب سے صحیح تشریح (Definition) اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس ملک کی نامور عارفہ للیشوری، جنھیں ہم للہ عارفہ کے نام سے جانتے ہیں، کا کہنا ہے کہ.....

اسی آسو تہِ اسی اُس　　　اسی دُوراہ کور پیتہ وتھ
شہس سورہِ نہ زیون تہ مرن　　..اسہ سورے نہ اتہ گتھ

یعنی ہم تھے اور ہم رہیں گے، سورج نکلتا اور ڈوبتا رہے گا، ہم زمانے پر چھاتے رہیں گے۔ یہی شعر ہماری ۷۶۰۰ (سات ہزار چھ سو) سال کی کہانی کی عکاسی کرتا ہے اور یہی جذبہ مصنف کے مضامین میں بھی بار بار اُبھرتا ہے، جیسے وہ اپنے مضامین کے عنوانات مثلاً مغلوں کی آمد اور بیرونی غلامی کا آغاز، روحِ آزادیٔ کشمیر کی پامالی، جب کشمیر کو کھوٹے سکوں کے عوض بیچا گیا۔ ڈوگرہ شاہی.....اور اس کے بعد کے مضامین میں ظاہر کرتا ہے۔ جہاں تک دورِ حاضر کی جدوجہد کا تعلق ہے، مصنف اس جدوجہد میں خود بھی شریک رہا ہے، اس لئے اس کا اندازِ فکر منفرد ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر کوئی پڑھنے والا مصنف کا ہم خیال بن جائے، اس تناظر میں فاضل مصنف سے اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔ تاریخی واقعات اپنی جگہ صحیح ہوتے ہیں لیکن ان واقعات کی تاویل (Interpertation) مختلف ہوسکتی ہے اور ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے، تاہم یہ ضروری ہے کہ منزلِ مقصود کی جانب سفر جاری رکھا جائے اور یہ منزلِ مقصود ہر کسی کیلئے ایک سی نہیں ہوسکتی۔ اختلاف رائے رکھنا اور اسے قبول کرنا ہر ذی شعور انسان پر لازم ہوتا ہے۔

''تنازعہ کشمیر...تاریخ کے آئینے میں'' میں 1947ء کے بعد کے واقعات کا تذکرہ خاص طور پر توجہ کا حامل ہے، کیونکہ ان واقعات کا تعلق ہمارے مستقبل کے ساتھ ہے کیونکہ اس کے بعد کشمیر تاریخ کے ایک نازک ترین دور میں داخل ہوا اور ابھی اس صورت حال سے باہر نکلنے کی جستجو جاری ہے، ہماری مشترکہ تہذیب، جس کو ہم کشمیریت کے نام سے جانتے ہیں، بدھ تہذیب، شیوا تہذیب، اور اسلامی تہذیب کے امتزاج سے بنی ہے۔ سلسلۂ ریشیاں، جس نے اس سرزمینِ لالہ وگل میں جنم لیا ہے، کشمیریوں میں حق طلبی اور حق آگہی کی نئی روح پھونک دی ہے، جس کی بنیاد انسان دوستی پر ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت، جب کشمیر کے اردگرد خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی، ہماری اس ریشہ واری میں کوئی خون خرابہ نہیں ہوا اور ہم نے امن کی شمع کو روشن رکھا اور انسان دوستی اور خدمتِ خلق کے پیغام کو عام کیا، مذکورہ کتاب میں اس حوالہ سے اچھی خاصی بحث کی گئی ہے، لیکن آج 2010ء میں بھی ہم گروہ بندی کے شکار ہیں۔ نااتفاقی نے 1589ء میں ہمیں مغلوں کا غلام بنا دیا تھا اور یہی نااتفاقی اور انسان دشمنی آج تک جاری ہے، جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے، کم ہے...اور اس طرف بھی مصنف نے بھی کھُل کر اشارہ کیا ہے۔

کشمیر کے سیاسی اور غیر سیاسی لیڈروں پر جو تبصرہ مصنف نے کیا ہے، وہ ان کے ذاتی خیالات ہیں، تاہم یہ ضروری ہے کہ تبصرہ کرتے وقت مصنف سنجیدہ اندازِ فکر استعمال کرے۔ جس عرق ریزی سے

فاضل مصنف نے یہ مضامین لکھے ہیں اور نیا مواد اکٹھا کیا ہے، وہ کوشش صد مبارک باد کی مستحق ہے۔ خاص طور پر جو مواد مصنف نے پہلی بار (صوبہ جموں کے حوالہ سے) محترم غلام احمد میر کی کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' سے حاصل کیا ہے، واقعی قابلِ داد ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ ساحلؔ اس کتاب کی تیاری میں مدیرِ اعلیٰ کے طور خود بھی شامل رہے ہیں۔ مصنف نے سیاسی لیڈروں سے لئے گئے انٹرویوز اور جیل میں مختلف سیاسی ورکروں سے کئے گئے تبادلۂ خیال کو بھی اپنی تصنیف میں شامل کیا ہے، چونکہ یہ کتاب مضامین پر مشتمل ہے، اس لئے تاریخ نویسی کے روائتی تقاضوں سے ہٹ کر ہے۔ تاریخ میں چونکہ ایک تسلسل ہوتا ہے، جس کی بنیاد سال اور صدی پر ہوتی ہے اور تمام واقعات تاریخ بتاریخ رقم کئے جاتے ہیں...اور ایسا اس کتاب میں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ تاریخ لکھتے وقت ہم واقعات کے لئے حواشی اور اضافی نوٹس کے ساتھ ساتھ حوالہ جات کے صفحہ نمبرات بھی درج کرتے ہیں، چونکہ یہ کتاب مضامین کا مجموعہ ہے، اس لئے اس میں کہیں کہیں مولف نے مصنفین کا نام، کتابوں کے نام اور صفحہ نمبرات وغیرہ تو درج کئے ہیں لیکن کہیں کہیں انھوں نے اسے ضروری نہیں سمجھا، شائد اخباری مضامین میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا یا پھر انھوں نے شروع میں یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ان مضامین کو کتابی شکل دیں گے۔ چونکہ مصنف نے تاریخ نویسی کا کام پہلی بار کیا ہے، اس لئے امید ہے کہ وہ اپنی آئندہ تخلیقات میں تاریخ کی Methodology کو مدِ نظر رکھیں گے اور حواشی و تعلیقات کا اندراج ضابطے کے مطابق کریں گے، تیسری بات، جو مجھے کہنی ہے، یہ ہے کہ تاریخی مواد کو اکٹھا کرنے کیلئے جس قدر زیادہ کتابوں کا مطالعہ کیا جائے کم ہے تا کہ ایک قاری مطالعہ کے دوران اس کمی کو محسوس نہ کرے۔ ان باتوں کے باوجود مقبول ساحلؔ کی یہ کتاب ''تنازعہ کشمیر....تاریخ کے آئینے میں'' کشمیری ریسرچ سکالروں اور فاضل مصنفین کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ تاریخ نویسی صدیوں سے کشمیریوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور ہمارے پاس سات ہزار سال سے زیادہ عرصے پر محیط واقعات کا مواد مورخین نے جمع کر رکھا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مؤلف مقبول ساحلؔ بھی اس لسٹ میں شامل ہو گئے ہیں۔ انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے یہ دعاء ہے کہ وہ تاریخ نویسی کے موجد ابنِ خلدوؔن کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی آئندہ تخلیقات پیش کریں گے۔

سرینگر، ۲۰...اکتوبر...۲۰۱۰ء

پروفیسر فدا محمد خان حسنین
(سابق ڈائریکٹر آرکائیوز اینڈ مانیومینٹس کشمیر)

عرضِ مصنف!

تاریخ نویسی کوئی بازیچۂ اطفال نہیں اور نہ ہی ہر نفس کے بس کی بات ہے، میرے جیسے بچے تو خیر کسی قطار میں ہی نہیں لیکن بڑے بڑے شہسوار بھی یہاں چاروں خانے چت ہو کر یوں گرتے ہیں کہ دوبارہ اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہتے، میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی ایسا دن بھی آئے گا کہ میں اس مضمون کے دشتِ خارزار میں قدم رکھنے کی حماقت کروں گا اور ایک دن میرے ہاتھ میں اس موضوع پر اتنی ضخیم کتاب ہوگی اور یہ کہ اس کے حاشیہ جات اور پیشِ لفظ کشمیر کے چوٹی کے مورخ، مصنف اور محقق جناب پروفیسر فدا محمد حسنین کے ہاتھوں لکھا جائے گا بلکہ مجھے تو یہ خدشہ تھا کہ پروفیسر صاحب اس مسودے کو ہاتھ میں پکڑتے ہی مجھے یہ انمول مشورہ دیں گے کہ پہلے اس کو کوڑے دان میں پھینک کر آؤ پھر زانوئے ادب تہہ کر کے میرے روبرو بیٹھ جاؤ اور مجھ سے تاریخ نویسی کا پہلا سبق پڑھو لیکن اللہ کا فضل و کرم ہوا کہ پروفیسر صاحب میرے خدشات کے برعکس نہایت انکساری سے پیش آئے اور اس مسودے کو کئی دن تک کافی غور سے پڑھا، اس میں مناسب اور قیمتی اضافے کئے، مجھے مشورے دیے اور اپنے مضامین کا ایک مجموعہ دے کر اس کتاب کو جلد سے جلد چھاپنے کی تلقین کی۔

کشمیر.....میرے مادرِ وطن کا مقدر اگرچہ کئی لحاظ سے کافی بلند بھی رہا ہے لیکن اس کی زلفیں اس قدر الجھی ہوئی ہیں کہ اگر ان میں ایک بار کوئی عاشقِ نامراد الجھ جائے تو اسے واپسی کا راستہ نہیں ملتا، چکوں نے اپنے حساب سے واقعات کو مرتب کیا، مغل دور کے تاریخ دان مغلوں سے مغلوب تھے اور افغانوں نے اگلا پچھلا سارا اثاثہ غرقِ دریا کر دیا، سکھوں نے اپنا سکہ چلایا اور ڈوگروں نے کشمیریوں سے چاقو چھری اور کاغذ قلم چھین کر انھیں رسی اور بوری تھما کر مزدور بنا دیا۔ اس ساری گتھم گتھا میں اصل واقعات کہیں گم ہو کر رہ گئے، یہاں تک کہ سر والٹر لارنس بھی کشمیر کی تاریخ لکھتے وقت اس طرح سے ڈگمگائے کہ انھوں نے اپنی کتاب The Valley of Kashmir میں گوجروں اور مسلمانوں کو دو طبقے قرار دیا (دیکھیں صفحہ نمبر ۳۱۶ پر تصویر) حالانکہ ہماری ریاست کے سارے کے سارے گوجر اور بکروال اللہ کے فضل سے کلمہ پڑھنے والے مسلمان ہیں۔ جہاں صورت حال یہ ہو، وہاں میرے جیسا

ایک حقیر وفقیر اور مفلس وناتواں انسان قلم اٹھانے کی جسارت کیونکر کرسکتا ہے؟ اس بحرِ بیکراں کا نہ تو کوئی کنارہ ہے اور نہ ہی درمیان میں کوئی جزیرہ آتا ہے، یہاں کا سفر اختیار کرنے والا مسافر ساری زندگی بھٹکتا ہی رہتا ہے اور کوئی حتمی نتیجہ اخذ کئے بغیر اپنی 'غلطی' پر تائب ہو کر بیٹھ جاتا ہے، مغل تاریخ کی تباہ کاریوں کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ہمارے وطن پر قبضہ کر کے ہمارے آخری خودمختار بادشاہ یوسف شاہ چک کو 'اغواء' کر کے زیرِ حراست ہلاک کر دیا اور اس کی لاش تک لواحقین کے حوالے نہیں کی، یہاں تک بھی ٹھیک تھا لیکن اس کی محبوبہ اور شاعرۂ کشمیر 'حبہ خاتون' کا نام تک لینا مناسب نہ سمجھا۔ اس روایت کو ابوالفضل نے شروع کیا اور باقیوں نے بھی اسے برقرار رکھتے ہوئے اپنی تمام کتابیں ترتیب دیں۔ یہ روایت بعد میں بھی جاری رہی اور اگر ''کشمیر چھوڑو'' تحریک کا جائزہ لیا جائے تو شیخ محمد عبداللہ کی آتشِ چنار، چودھری غلام عباس کی ''کشمکش'' اور ڈاکٹر کرن سنگھ کی ''سفر زندگی'' کا کوئی بھی بیان آپس میں نہیں ملتا سوائے اس کے کہ تینوں ایک دوسرے پر گندگی اور کیچڑ ملتے نظر آتے ہیں، جس سے ایک محقق اور مورخ کا تذبذب میں مبتلاء ہونا ازبس لازمی ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں ہی کہا کہ میں نے جب سے قلم ہاتھ میں اٹھایا، تب سے کبھی بھی یہ خیال دامن گیر نہیں ہوا کہ میں تاریخ کے موضوع پر کچھ لکھنے کی گستاخی کروں گا لیکن بزرگوں کا قول ہے کہ ہر کام ہماری مرضی سے نہیں ہوتا اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سے وہ کرواتا ہے، جو اس کو پسند ہوتا ہے۔ کشمیر کی تاریخ میں بہت ساری باتیں 13 جولائی کے دن ہوئی ہیں۔ 1931ء میں اسی دن کشمیری شہداء نے سرینگر کے سینٹرل جیل کے باہر ڈوگرہ فوجیوں کی گولیاں کھا کر شخصی راج کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور نوے کی دہائی میں کشمیری نوجوانوں نے بھی اسی دن ہتھ گولے چلا کر بھارت کو اقوامِ متحدہ میں کشمیریوں کے ساتھ کئے گئے وعدے یاد دلائے، میرے ساتھ اس دن یہ ہوا کہ زیرِ نظر کتاب کا پہلا مضمون اسی دن لکھا اور خیال یہ تھا کہ 13 جولائی 1931ء کے شہدا کو اپنے طور خراج عقیدت پیش کروں کیونکہ اس دن ان شہداء کو ایک طرف نیشنل کانفرنس والے اس لئے خراج عقیدت پیش کر رہے تھے کہ ان کے قائد شیخ محمد عبدللہ (تب) اس تحریک کے ساتھ وابستہ تھے، جس کے لئے ان شہداء نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا لیکن اس تحریک کا انجام 1947ء میں اُنہی کے ہاتھوں جو ہوا، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان شہداء کو ''آزادی پسند'' قیادت اس لئے خراج عقیدت پیش کر رہی تھی کہ ان کے حساب سے ان کی تحریک کا مقصد کشمیر کی آزادی تھا، جو ابھی تک پورا نہیں ہوا اس لئے وہ ان کے مشن کے وارث ہیں، لیکن حد یہ تھی کہ مرکزی جماعت کانگریس والے بھی اس دن (13 جولائی 2009ء) کو

ان شہداء کے سامنے سرخم ہوکر پہنچے اوران کی قبروں پر گلباری کی، شاید اس لئے کہ ان ہی شہداء کی قربانیوں کے صدقے ڈوگرے کشمیر سے بھاگے اور دلی والوں (جو کہ اس وقت کانگریس سے ہی وابستہ تھے) نے اس وادئ گلپوش کو بھارت کے ساتھ ملالیا، المختصر یہ کہ شہدائے کشمیر کوخراج عقیدت ادا کرنے کا سلسلہ جاری تھا، اس لئے میں نے بھی اس دن کی مناسبت سے عقیدتاً ایک عدد مضمون لکھ ڈالا، جو اس کتاب کی پہلی قسط بن گیا۔ ہفت روزہ ''پکار'' کا شمارہ بازار میں آیا تو اس مضمون کی کافی سراہنا کی گئی اور اس کے قدردانوں میں زیادہ تر تعداد نوجوانوں کی تھی، ان کی دلچسپی کی وجہ شائد یہ بھی تھی کہ اخبارات میں ان دنوں تاریخ کے موضوع پر بہت کم لکھا جاتا ہے، جبکہ تشدد، توڑ پھوڑ اور خون خرابے نے اخبارات کے کالموں پر بری طرح سے قبضہ کر رکھا ہے، قدردانوں کی طرف سے سراہنا ہوئی تو '' گلے میں پڑ جانے والے ڈھول کو بجانے کے سوا کوئی راہِ فرار نظر نہ آئی۔ جب مضامین کا سلسلہ شروع ہوا تو جو فکر مجھے سب سے زیادہ کھائے جارہی تھی، وہ وسائل کے متعلق تھی، میرے پاس تاریخ کے مضمون پر کتابوں کا کوئی زیادہ بڑا ذخیرہ نہیں تھا، دورۂ پاکستان کے دوران چند ایک کتابیں خریدی تھیں اور چند ایک مقامی طور جمع ہوگئی تھیں لیکن اللہ کا نام لے کر قلم کو حرکت دی اور پورے سفر میں ایسے ایسے اسباب بنے کہ کبھی کبھی میں حیران ہوگیا، خودبخود ایسی ایسی کتابیں ملنے لگیں، جن کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد خدشہ یہ تھا کہ شائد ''پکار'' والے میری اُلٹی سیدھی تحریروں کو زیادہ دیر برداشت نہ کریں اور مجھے چند ایک مضامین کے بعد یہ سلسلہ ادھورا چھوڑنا پڑے، لیکن یہاں بھی میرا اندازہ غلط نکلا، پکار کے مدیر عزیزم وسیم اقبال منہاسؔ نے نہ صرف ہر مضمون کو سراہا بلکہ اس دوران میری پیٹھ بھی تھپتھپاتے رہے، میں نے پچاس اقساط میں کتاب کو سمیٹنے کا نشانہ دیا تھا لیکن مجھے ڈر تھا کہ شائد سلسلہ ایک سو سے زیادہ چلا جائے کیونکہ واقعات کا سلسلہ اس طرح سے آپس میں جڑا ہوا تھا کہ ایک ایک واقع کے لئے کئی کئی قسطوں کی ضرورت تھی لیکن مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ایک اخباری مضمون میں نہ تو واقعات کو پوری طرح سے بیان کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا ممکن تھا، اس صورت حال کے پیش نظر مناسب یہ نظر آیا کہ صرف انہی گوشوں کو ہائی لائیٹ کیا جائے، جن کو اب تک یا تو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا گیا یا پھر کسی سے مغلوب یا متاثر ہوکر محض مصلحتاً توڑ مروڑ دیا گیا اور عام لوگ ان سے ناواقف رہ گئے اس لئے نئے زاویے اور نئے پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت ساتھ رہی اور ایسے واقعات کے بارے میں تفصیلات ملتی رہیں، جنھیں نہ صرف عام قارئین نے سراہا بلکہ بعض سرکردہ مورخین اور محققین کی آراء بھی ملتی رہیں اور انھیں پسند بھی کیا گیا، حالانکہ کئی ایک تنگ نظر لوگوں کی نازک طبیعت کو ناگوار

بھی گزرا، یہ لوگ کھسیانی بلی کی طرح کھمبا تو نوچتے رہے لیکن اپنے اعتراضات کے ثبوت میں کوئی دلیل نہ دے سکے البتہ اس چیز نے میرے حوصلوں کو مزید جلابخشی اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔

میرے آباؤ اجداد تقریباً پانچ سو سال قبل (دورِ بڈشاہی میں) جب ہزارہ سے سلطان زین العابدین کے لشکر کے ساتھ چلے تھے تو انھوں نے شائد سوچا تھا کہ علی شاہ سے بڈشاہ کا تخت چھیننے کے بعد اسے کشمیر کا بادشاہ بنا کر وہ واپس سندھ لوٹ آئیں گے، لیکن بادشاہ نے انھیں ہمیشہ کے لئے اپنا دوست اور محافظ بنا کر یہیں بس جانے کے لئے مجبور کیا (راج ترنگنی آف زونہ راجہ "The Kings of Kashmira" Page No. 75 to 79) تو انھوں نے بھی اس جنتِ ارضی کو اپنے لئے اللہ تعالیٰ کا تحفہ سمجھ کر اپنا آشیانہ یہیں بنالیا اور تب سے اس دھرتی کو اپنا مادرِ وطن سمجھ کر اس سے بے حد محبت کی۔ اس شاندار تاریخی پسِ منظر کا تقاضہ تھا کہ اس خوبصورت خطۂ ارضی پر ہونے والے ظلم و زیادتیوں کا ایک خلاصہ بنا کر آنے والی نسلوں کے ہاتھوں میں رکھ دیا جائے اور یہی وہ مقصد تھا، جس کی تکمیل اللہ تعالیٰ مجھ جیسے حقیر و فقیر کے ہاتھوں کرنا چاہتا تھا اور یہ بفضلہٖ تکمیل کو پہنچا۔ زیرِ نظر کتاب کے بارے میں میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ باضابطہ طور، ارادتاً یا روائتی انداز میں لکھی گئی ایک تاریخ ہے بلکہ یہ کتاب ہفت روزہ "پکار" سرینگر میں شائع شدہ ان مضامین پر مشتمل ہے، جو اس اخبار میں ۱۹ جولائی ۲۰۰۹ء سے ۱۳ فروری ۲۰۱۱ء تک شائع ہوتے رہے اور بے شمار قدردانوں اور دوستوں کی فرمائش اور خواہش پر اسے کتابی شکل دے دی گئی تا کہ (شائد) آنے والے طلبائے تاریخ کے کسی کام آسکے اور اگر وہ میری آراء سے اتفاق نہ بھی کریں تاہم اس زاویے سے اپنی سوچ کو موڑ کر اس ضرور پر مزید کام کریں گے اور ان تلخ و تند حقائق سے اپنے لوگوں کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کو بھی واقف کرائیں گے، جن کی وجہ سے اس سرزمین کے غیور و باشعور باشندگان کی تقدیر ان سے مدتوں سے روٹھی ہوئی ہے اور ان کی تکلیفوں کا کوئی کنارہ نہیں مل رہا، بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

"مکر و فنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام" ...

سال 2008ء میں جیل خانے کے عذاب و عتاب پر مشتمل میری کتاب "شبستانِ وجود، ایک صحافی کی سرگزشت" شائع ہوئی تو اسے صحافیوں کی عالمی تنظیم RSF نے Conflict کے موضوع پر لکھی گئی عالمی کتابوں میں دوسرے درجے پر رکھا، ICRC نے اسے کشمیری نظر بندوں کے بارے میں لکھی گئی پہلی غیر جانبدار کتاب کے طور پر اپنایا اور ایک جرمن مصنف Rudiger Bub نے اس کا جرمن اور انگریزی ترجمہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے اس

کتاب کے حوالے سے مزید محنت کرنا چاہیے تھی کیونکہ کئی اور بھی ایسے واقعات تھے، جو اس میں مزید اضافہ کر کے قارئین کی دلچسپی کا باعث بن سکتے تھے، خاص طور پر ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی نے جس طرح سے کتاب کو کشمیری نظر بندوں کے حوالے سے سراہا، اس کا تقاضہ تھا کہ اس پر مزید محنت کی جانی چاہیے تھی، بہر حال اس احساس نے زیرِ نظر کتاب کی تکمیل میں کافی مدد دی اور یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ اس سلسلۂ مضامین میں میرا فوکس اور دھیان جس بات پر زیادہ رہا، وہ تھا مسئلہ کشمیر اور جب ہم مسلم دور (1320) سے آگے کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہیں سے اس مسئلہ کی جڑوں کا سراغ بھی ملنا شروع ہو جاتا ہے، لہٰذا میں نے بھی مضامین کا سلسلہ یہیں سے شروع کیا اور پہلی قسط لکھنے کے دوران ارادہ یہ تھا کہ اس ساری تاریخ کو ایک ہی قسط میں سمیٹنے کی کوشش کروں گا، اسی لئے اس قسط کا عنوان ''کوٹہ رانی سے شیخ محمد عبداللہ تک'' رکھا لیکن قارئین کے اصرار اور فرمائش پر جب سلسلۂ مضامین شروع ہوا تو اسی قسط کو بنیاد بنا کر اس کی مزید 68 قسطوں میں وضاحت کی اور میرے مشاہدے کے مطابق جب کوٹہ رانی نے رنچن شاہ (سلطان صدرالدین) کی موت کے بعد اُدھیان دیو کو افغانستان سے امپورٹ کر کے اس کے ساتھ بیاہ رچایا، مسئلہ کشمیر یہیں سے شروع ہوا جو آگے چل کر شمیری سلاطین، چک سلاطین، مغل استعمار، پٹھانوں کے ظلم وستم، سکھوں اور ڈوگروں کی اذیت ناک غلامی اور بھارت و پاکستانی افواج کی مداخلت کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی شکل میں آج تک موجود ہے لیکن اس تاریخ کا سب سے تاریک پہلو وہ دور ہے جب ''بھارت کی غلامی'' سے آزادی حاصل کرنے کا دعویٰ کرنے اور مسلح تحریک کو'جہاد' قرار دینے والے بندوق بردار اور سیاست دان تحریک کے آغاز کے برسوں میں ہی آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور سینکڑوں ایسے 'مجاہدین' کا خونِ ناحق اپنے ہی ہاتھوں سے بہا دیا، جو ان کے دشمن کے لئے باعث عذاب بن سکتے تھے یا یوں کہیے کہ بن چکے تھے.....اس دور کی تاریخ کو صفحہ ہائے قرطاس کے سپرد کرنے کے لئے کافی ہمت کی ضرورت تھی کیونکہ بعض لوگ اسے اپنی اصل صورت میں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ابتداء میں میرا خیال تھا کہ اگر کوئی قلم کار یا مورخ ایسی 'حماقت' کرتا ہے تو اسے بھی چودھری غلام عباس اور میر واعظ یوسف شاہ مرحوم کی طرح پہلے اپنا وطن چھوڑنے کی تیاری کر لینی چاہیے کیونکہ جو قائدین ایک صحافی سے یہ کہیں کہ اس نے اپنا اخبار نکالنے سے قبل اُن سے اجازت کیوں نہیں لی تھی؟ وہ ان دنوں کے حالات کو نہ تو برداشت کر سکتے ہیں اور نہ ہی یہ ان کے ہضم کرنے کی چیز ہے، اس لئے میں اس قیمت پر اپنے مادرِ وطن سے محروم ہونے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا، جس کے لئے میں نے حق گوئی کے عوض پہلے ہی قید و بند اور عذاب و اذیت کا طویل سلسلہ برداشت

کیا ہےلیکن ان سبھی خطرات اور خدشات کے باوجود، چونکہ کتاب کاتعلق 'تنازعہ کشمیر'اوراس کے تاریخی پسِ منظر کے ساتھ تھااور واقعات کے تسلسل کا بھی تقاضہ تھا کہ اس سلسلے کو کسی خاص مقام یا موڑ پر لا کر ختم کیا جائے، اس لئے آخر میں ایسی اقساط کو بھی شامل کرنا پڑا جن کے بغیر یہ موضوع تشنہ رہ جاتا...حالانکہ میں یہ بات بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ جن افراد کا ان اقساط کے ساتھ تعلق ہے اور وہ ابھی بقیدحیات ہیں،اس موڑ پر پہنچ کر ایک بار اپنے ماضی کے بارے میں ضرور سوچیں گے....زیرِ نظر کتاب لکھتے وقت میری حالت عاشق کشمیریؔ کے اس شعر جیسی تھی ؎

ہوا خاموش، ساحل مضمحل ، ماحول افسردہ
مجھے اے ناخدا! کس گھاٹ یہ تونے اتارا ہے...

اللہ اس خطۂ ارضی کی نگہبانی کرے.....آمین!

احقر و ناچیز
ساحلؔ محمد مقبول کھوکھر،اڑحال کوکرناگ،اسلام آباد
(مدیرِ معاون ہفت روزہ ''پکار'' سرینگر کشمیر)
۱۳۔فروری ۲۰۱۱ء

(۱)

کوٹہ رانی سے شیخ محمد عبداللہ تک!

سرزمینِ کشمیر پر بسنے والے باشندگانِ سادہ لُوح تاریخ کے ایک ایسے 'گورکھ دھندے' میں اُلجھے ہوئے ہیں جس سے باہر نکلنا تو در کنار، اس کے کسی حد یا کنارے کو تلاش کرنا بھی ناممکن ہے، کوئی بھی قوم اپنے خاص تہواروں، رسوم اور تاریخی یادگاروں کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے، لیکن کشمیر میں اس حوالے سے تنازعات اور تذبذب کے سوا کچھ بھی نہیں مِلتا، 26/جنوری اور 15/اگست کو پورے بھارت میں جہاں ایک طرف انتہائی جوش وخروش اور اہتمام انصرام کے ساتھ منایا جاتا ہے، وہیں دوسری جانب ان ایام کے موقعے پر کشمیر میں جامہ تلاشیوں، خانہ تلاشیوں، ہڑتالوں چھاپوں اور گرفتاریوں کا لامحدود سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور حفاظتی انتظامات، کی آڑ میں عوام کے لئے مشکلات کا سیلاب آجاتا ہے اور ان ایام کی تقریبات میں حصہ لینا تو در کنا، عوام اپنے گھروں میں مقید ہوکر رہ جاتے ہیں۔ یہی حال اُس واحد دن کا بھی ہے، جس کا تعلق نہ تو بھارت کے ساتھ ہے اور نہ ہی پاکستان سے، یہ دن کشمیری جیالوں کی قربانی کی یادگار ہے، جس دن کشمیر میں ڈوگرہ شاہی، شخصی راج اور ظلم و جبر کے ایک بڑے دور کا خاتمہ ہوا (یہ بات اور ہے کہ ریاست کے سیاستدانوں نے خودمختاری کے بجائے دلی سے افواج منگوا کر ایک اور غلامی کا آغاز کیا) لیکن اس موضوع کو ترک کر کے مقصدِ بیان یہ ہے کہ 13/ جولائی 1931ء کے روز سرینگر کے سینٹرل جیل کے باہر جامعہ مسجد کے سامنے جن جیالوں نے 'نعرۂ تکبیر' بُلند کر کے اپنے سینے پر گولیاں کھائیں، وہ کشمیری تھے اور کشمیر کی آزادی کے لئے سرگرم تھے، وہ یہاں سیاسی، سماجی اور دینی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم اور عذاب وعتاب کا خاتمہ چاہتے تھے۔ ان کے سامنے نہ تو الحاق ہند تھا اور نہ ہی انضمامِ پاکستان، وہ لوگ بھارت میں انگریزوں کے خلاف جاری تحریکِ آزادی کے تناظر میں اپنی سرزمین کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے متفکر اور پریشان تھے اور جانتے تھے کہ بھارت انگریزوں کے پنجوں سے چھٹکارا حاصل کر لینے کے بعد ضرور ریاست جموں وکشمیر کی جانب متوجہ ہوگا اور اس چھوٹی سی ریاست کیلئے اپنا وجود قائم رکھنا دشوار ہو جائے گا اسلئے مستقبل پر عقابی نظریں رکھنے والے کشمیر حریت پسندوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ڈوگرہ شاہی کے خلاف اپنی جدو جہد کا آغاز کر دیا تھا، 1931ء تک پہنچتے پہنچتے یہ تحریک بلوغت کے مراحل

طے کر چکی تھی اور 13/جولائی کے روز یہ تحریک اس قدر بالغ ہو چکی تھی کہ اُن کے حق میں آواز اُٹھانے والے عبدالقدیر کو سنٹرل جیل سرینگر سے چھڑانے کے لئے لوگوں کا سیلاب اُمڈ آیا، جس کو بے رحم سے بے رحم اور ظالم ڈوگرہ فوج بھی روک نہ سکی۔ لیکن اس واحد تاریخی دن کے حوالے سے اس وقت کشمیر کی سیاسی قیادت جس چپقلش، تذبذب، ٹکراؤ اور اختلاف کا شکار بنی ہوئی ہے، وہ انتہائی باعثِ افسوس ہے، ایک طرف اس تقریب کے حوالے سے سرکاری طور پر انتظامات کئے جاتے ہیں اور شہدائے کشمیر کے تیئں محبت کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن دوسری جانب نوہٹہ میں مزارِ شہداء کی جانب پیش قدمی کرنے والے علٰحید گی پسندوں کے راستوں میں روڑے اور رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر شہدائے 13/جولائی کی قربانیوں کے ساتھ کھلواڑ کرنے، سودا بازی کرنے اور اُن کے مشن کو پامال کرنے کے لئے الزامات عائد کرتے ہیں اور یہ سلسلہ گزشتہ 20/برسوں سے جاری ہے۔ لیکن عوام کی اکثریت ایسی ہے جو کسی نہ کسی طرح سے اصل صورتحال سے ناواقف ہے۔ اس لئے ضروری بن جاتا ہے کہ عوام کو اصل صورتحال سے آگاہ کیا جائے۔

13/جولائی 1931ء کے روز پیش قدمی کرنے والے اس تاریخی واقعہ کی اصلیت سے پردہ ہٹانے کی بہت سی کوششیں ہوئی ہیں لیکن ہر ایک مورخ نے اپنے اپنے طریقے سے حالات کو پیش کیا ہے۔ آتشِ چنار (شیخ محمد عبداللہ/محمد یوسف ٹینگ) کشمکش (چودھری غلام عباس) کشمیر (انگریزی) پر ویز دیوان اور ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا (غلام احمد میر) تک کی چند ایک موٹی اور مستند کتابوں کے مطالعے کے بعد اگر چہ اس واقعہ کے دیگر مختلف پہلو بھی سامنے آتے ہیں لیکن ان سبھی تاریخی کتابوں سے جس مشترکہ حقیقت پر سے پردہ اُٹھتا ہے، وہ یہ ہے کہ 13/جولائی 1931ء کا واقعہ محض کشمیر کو ڈوگروں کے پنجے سے آزاد کرانا تھا اور اس ریاست کی اُس خودمختاری کو بحال کرنا تھا جو تقریباً ۱۳۲۴ء میں کشمیر کی مہارانی 'کوٹہ رانی' (کوترانی...کبوتری) کی طرف سے افغانستان کے ہندو بادشاہ اُدھیان دیو کو کشمیر پر حکومت کی دعوت کے ساتھ ختم ہوگئی۔ ...!...راج ترنگنی کے حوالہ جات کو صحیح سمجھا جائے تو کشمیر کی تاریخ میں جس پہلے خودمختار راجہ کا نام ملتا ہے، اُس کا نام راجہ گوندا تھا، جس نے مشہور جنگ 'مہا بھارت' سے تقریباً 20/سال قبل کشمیر پر حکومت کی۔ اور اگر چہ درمیانی مدت کی تاریخ دھندلی ہے لیکن یہ سلسلہ آگے جا کر تیسری صدی قبل مسیح میں موریہ سلطنت کے عروج کے ساتھ پھر مل جاتا ہے۔ ریاست کی خودمختاری لداخ کے بادشاہ رنجن شاہ المعروف سلطان صدرالدین کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، جو اپنا بدھ مت ترک کر کے ہندومت اختیار کرنے کی غرض سے کشمیر آیا لیکن چونکہ کشمیر میں اُس وقت شیوازم کا

دور دورہ تھا اور کشمیری برہمنوں نے اُسے اچھوت سمجھ کر قبول نہیں کیا۔ رنچن شاہ نے کشمیر کے آخری ہندو راجہ رام چندر کا قتل کر کے اُس کی بیٹی کوٹہ رانی کے ساتھ شادی کر لی اور دونوں ترکستان سے آئے صوفی بزرگ حضرت عبدالرحمان عرف بلبل شاہ صاحبؒ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے اور ایک طرف کشمیر میں جہاں مسلم دور کا آغاز ہوا، وہیں دوسری جانب کشمیر عملاً ایک غیر کشمیری بادشاہ (رنچن شاہ) کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ صدرالدین کی وفات کے بعد کوٹہ رانی کو تنہائی کا شدت سے احساس ہوا اور اُس نے اپنی مدد کے لئے قندہار کے بادشاہ اُدھیان دیو کو کشمیر آ کر زمام اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی۔ جو شریک حکومت کے ساتھ ساتھ اُس کا شریک حیات بھی بن گیا اور زونہ راجہ (بڈشاہ کا ذاتی منشی) اپنی کتاب 'راج ترنگنی آف زونہ راجہ' (Kings of Kashmira, translated by J.C Dutta) میں رقم طراز ہے کہ اُدھیان دیو نے 1323ء سے 1338ء تک کے تقریباً 15 برسوں تک کشمیر پر حکومت کی۔ اس دوران اُس کا ایک وفادار وزیر شہمیر اُس کا بھرپور تعاون کرتا رہا۔ پرویز دیوان کے مطابق شہمیر کے باپ کا نام طاہر تھا، جس کی نسبت مشہور پانڈو بادشاہ 'ارجن' کے ساتھ تھی۔ اسی دوران تبت سے دولچہ (یا زولچہ) نے حملہ کیا اور اُدھیان دیو کوٹہ رانی کو چھوڑ کر بھاگا ہی تھا کہ دولچہ کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ کوٹہ رانی کے بعد شہمیری سلاطین کا دور شروع ہوا اور 1342ء سے 1561ء تک کے 120 سال شہمیری سلاطین کے ہاتھ لگے اور سلطان زین العابدین (بڈشاہ) کے دور تک اس سرزمین نے کافی امن وسکون اور ترقی وخوشحالی دیکھی لیکن 1420ء کے آس پاس شہمیری سلاطین کے کارِ سلطنت میں جموں کے ڈوگرہ مہاراجاؤں کی مداخلت شروع ہو چکی تھی اور بڈشاہ کے بڑے بھائی علی شاہ کی بیوی ڈوگرہ مہاراجہ بہرام سنگھ کی بیٹی تھی، جس کی وجہ سے کشمیر کے سیاسی حالات پر ڈوگروں کا سایہ پڑنے لگا تھا تاہم پرویز دیوان کے مطابق جب سلطان محمد شاہ کے دور میں کشمیر میں کئی خاندان آپس میں گتھم گتھا تھے اور اُن جھگڑوں کا جب مقامی طور پر کوئی حل نہ نکل سکا تو ابدال ماگرے نے دہلی کے حکمران، مغل شہنشاہ بابر کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ بابر نے حملہ کیا لیکن چک سپہ سالار کاجی چک نے مقابلہ کر کے مغل فوج کو واپس بھیج دیا۔ کوٹہ رانی کے بعد ابدال ماگرے دوسرا ایسا کشمیری تھا جس نے غیر کشمیری حکمرانوں کو کشمیر آ کر حکومت کرنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ کے دور میں دوہرائی گئی اور یوسف شاہ چک کے خاتمے اور گرفتاری کے بعد مغل کشمیر میں داخل ہو گئے۔ مغلوں نے 1581ء کے آس پاس کشمیر کو فتح کر کے سرینگر کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور کشمیر کی رہی سہی نیم خودمختاری کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اورنگ زیب کی وفات یعنی 1707ء تک کشمیر مغل سلطنت کا حصہ رہی۔ اس کے بعد

بھی اگر چہ تقریباً 1727ء تک کشمیر میں کوئی شیر موجود نہ تھا، جو مغلوں کے بوڑھے اور کمزور جبڑوں سے کشمیر کو آزاد کراتا لیکن اسی دوران خواجہ ظہیر دیدمری نامی قاصد نے افغان شہنشاہ احمد شاہ دُرانی کو دعوتِ حکومت دی اور 1752ء میں دُرانی نے کشمیریوں کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کیا۔ یہ سلسلہ 1810ء تک جاری رہا اور اس کے بعد سکھوں کی باری آئی اور انہوں نے بھی 27/سال تک کشمیریوں کی چھاتی پر ''مونگ دلنے'' کا کام انجام دیا۔ سکھوں نے جاتے جاتے 1846ء میں بیع نامہ امرتسر کے تحت 75/لاکھ نانک شاہی سکوں کے عوض کشمیر کو جموں کے ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا اور 1947ء تک کے 101/سال تک ڈوگرے کشمیریوں سے باج وصول کرتے رہے۔ اس ظلم وستم کے خلاف 1917ء کے آس پاس اُٹھنے والی بغاوت کی لہر 1931ء تک آتے آتے ڈوگرہ مہاراجاؤں کے لئے وبال جان بن چکی تھی لیکن ایک بار پھر کشمیری قیادت کے منتشر ہوجانے اور آپسی اختلافات کے سمندر میں ڈوب جانے کی وجہ سے یہ خوبصورت خطۂ زمین بھارت اور پاکستان نامی دو آزاد ممالک کے ہاتھوں بٹ کر ایک طویل عتاب کا شکار ہو گیا جس کا خمیازہ ابھی تک اس خطے کے عوام بھگت رہے ہیں۔

1925ء کے آس پاس مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے لاہور میں مہاراجہ ہری سنگھ کے ایک مخالف ایلین بینر جی کی تقریر سے متاثر ہو کر لاہور کے اخبار ''دی مسلم آوٹ لُک'' میں کشمیری عوام پر مہاراجہ کے مظالم کو موضوع بنا کر ایک مضمون لکھا جس سے کشمیر میں جاری ''ڈوگرہ مخالف'' تحریک کو مزید ہوا ملی۔ اس جدوجہد کا سرگرم حصہ رہنے والے چودھری غلام عباس اپنی سوانح ''کشمکش'' میں لکھتے ہیں کہ 1931 میں جب ہری سنگھ لندن سے کشمیر لوٹا اور اُسے کشمیر کی کشیدہ ترین صورتحال کے بارے میں پتہ چلا تو اُس نے اس کا سنجیدہ نوٹس لیا۔ اس دوران جامع مسجد سرینگر کشمیر کی علیحدگی پسند تحریک کا مرکز بن چکی تھی۔ ایسے ہی ایک مزاحمتی جلسے کے دوران ایک غیر ریاستی باشندے عبدالقدیر نے جامع مسجد کے ممبر پر کھڑے ہو کر ایسی تاریخی تقریر کی کہ جس نے کشمیر کی تاریخ کا رُخ ہی موڑ دیا۔ اس تقریر کے دوران قدیر نے مہاراجہ کے خلاف جہاد کی تلقین کی جس کا زبردست اثر ہوا۔ عبدالقدیر کے بارے میں پرویز دیوان کی کتاب ''کشمیر'' میں درج ہے کہ وہ ایک یوروپی سیاح کے ساتھ خانساں ماں (باورچی) بن کر کشمیر آیا تھا۔ عبدالقدیر صوم وصلواۃ کا پابند اور انتہائی سوجھ بوجھ کا مالک تھا' (صفحہ نمبر 83) غلام عباس کے مطابق نمازِ جمعہ کے موقعہ پر دوسرے مسلم رہنماؤں کے بعد اُسے بھی خطاب کرنے کا موقعہ دیا گیا اور یہ خطاب انتہائی ہیجان انگیز تھا۔ جلسے کے اختتام پر اُسے جامعہ مسجد کے باہر گرفتار کر لیا گیا اور دفعہ 144/A کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں اُس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور اُسے سرینگر

کے سینٹرل جیل میں بند کر دیا گیا۔(پروفیسر فدا محمد حسنین کا اس بارے میں خیال ہے کہ مولانا جمال الدین استرابادی افغانی نے کشمیر کا دورہ کیا تھا، سرینگر اسلام آباد (اننت ناگ) مٹن اور پہلگام سے ہوتے ہوئے، زوجیلا کو عبور کرتے ہوئے لداخ اور وہاں سے روس چلے گئے۔انہوں نے مسلم علاقوں کو مراقو سے لے کر انڈونیشیا تک ملا کر ایک بلاک بنانے کی مہم شروع کی تھی، جس کو Pan-Islamic تحریک کا نام دیا گیا اور مولانا عبدالقدیر خان اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ Disguise میں کشمیر آ گئے، اس دوران وہ حضرت بل میں شیخ محمد عبداللہ سے ملتے رہے اور تقریریں بھی کیں۔اس کے علاوہ وہ پیر عبدل احمد شاہ سے بھی پیر حسام الدین شاہ کی دکان پر ہری سنگھ ہائی سٹریٹ میں ملے تھے اور پنجاب مسلم ہوٹل میں آ کر یہاں لوگوں کے جذبات کو ابھارا تھا...اس نے خانقاہِ معلیٰ میں 21 جون 1931ء کو اس وقت، جب وہاں نمائندگانِ مسلمانانِ کشمیر کا اجلاس ختم ہوا، ہری سنگھ کے خلاف سخت الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے شیر گڑھی میں ہری سنگھ کے محل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ظلم وستم کے اس محل کو اکھاڑ دو'' (شیخ عبداللہ آتشِ چنار، سیاسی ڈائری محمد شاہ سعادت، مولوی محمد سعید مسعودی اور دیگر مورخ حضرات نے بھی اس واقعہ کو خانقاہِ معلیٰ سے ہی وابستہ کیا ہے۔اس سلسلے میں پرویز دیوان کی تحقیق درست نہیں ہے، محمد یوسف صراف ''کشمیر کی جنگ آزادی'' صفحہ نمبر 372 میں بھی یہی درست مانتے ہیں جبکہ باقی مورخین بھی اس واقعہ کو خانقاہ معلیٰ سے ہی منسوب کرتے ہیں، چودھری غلام عباس بڑھاپے کی وجہ سے بھول گیا تھا، مولانا عبدالقدیر خان 25 جون 1931ء کو قید ہوا) بہر حال اس کے فوراً بعد ہری سنگھ نے ریاست کے تینوں خطوں کے نمائندوں کی ایک نشست طلب کی جس میں شیخ محمد عبداللہ اور مولانا محمد یوسف شاہ نے کشمیر سے نمائندگی کی۔ چودھری غلام عباس اور سردار گوہر رحمان نے جموں صوبے سے جبکہ پیر حسن دین بانڈے نے مظفر آباد کی نمائندگی کی۔ یہ مذاکرات ناکام ہوئے اور مظاہرے بھڑک اُٹھے۔ اُدھر مفتی ضیاء الدین نے لاہور جا کر پنجابی مسلمانوں سے مدد طلب کی جبکہ مہاراجہ نے مذاکرات کرنے والے سبھی 17/ کشمیری لیڈروں کی گرفتاری عمل میں لائی اور 17/ روز تک پورے کشمیر میں مہاراجہ کے خلاف سخت ترین احتجاج رہا۔ ہڑتالوں اور مظاہروں میں آنے والی شدت کے پیش نظر مہاراجہ نے گرفتار شدگان کو رہا کر دیا لیکن احتجاج جاری رہا۔ چودھری غلام عباس 13/ جولائی 1931ء کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آج (13/ء جولائی کو) عبدالقدیر کے مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ مسلمانانِ کشمیر کے ایک غریب پرور یار کے یوں پابند سلاسل ہو جانے کی وجہ سے اُس کے ساتھ گونا گوں ہمدردیاں تھیں۔

آج فیصلہ متوقع تھا۔ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جیل کے باہر جمع ہو گئے تھے، سماعت کنندہ مجسٹریٹ جب جیل کے اندر داخل ہوا تو اُس نے جیل کا دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے تقاضہ کیا کہ وہ بھی مقدمے کی سماعت دیکھنا چاہتے ہیں، حکومت کے اہلکاروں اور مسلمانوں کے درمیان تقاضہ جاری رہا تو پولیس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مطلع کیا۔ وہ فوراً پہنچ گیا اور لوگوں کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ لیکن عوام نے اُس کا کہنا نہ مانا تو ضابطہ فائرنگ کو ملحوظِ نظر رکھے بغیر مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اندھا دُھند گولیاں چلیں اور مسلمان تیتر اور بٹیر کی طرح لوٹ پوٹ ہو کر رہ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجسٹریٹ ہواس باختہ ہو گیا ہے اور اس طرح گولیاں تب تک چلتی رہیں جب تک کہ سپاہیوں کے میگزین خالی نہ ہو گئے'' (کشمکش ......صفحہ 79/از چودھری غلام عباس) اس واقعہ کے حوالہ سے پرویز دیوان لکھتے ہیں کہ جیل کے سامنے تقریباً 17/افراد مارے گئے جبکہ جامع مسجد کے باہر بھی مظاہرہ جاری تھا اور وہاں بھی گولی چلائی گئی جس میں مزید دس افراد جاں بحق ہو گئے، اس طرح دونوں واقعات میں کل ملا کر 27/افراد شہید ہو گئے (11 کشمیری موقعہ پر مر گئے 11 دیگر زخموں کی وجہ سے جامع مسجد پہنچاتے پہنچاتے مر گئے، 6 شہری گولیوں سے مرے، کل 28 افراد شہید ہوئے۔ جن میں دو عورتیں مغلی اور جانہ بھی شامل ہیں۔ فدا حسنین) اور ان سبھی افراد کو سرینگر کے نوہٹہ علاقے میں زیارت حضرت نقشبند صاحبؒ کے احاطے میں سُپردِ خاک کر دیا گیا۔ جن کو یاد کرنے کے لئے وادی میں ہر سال 13/جولائی کو ''یوم شہدائے کشمیر'' کے طور منایا جاتا ہے اور جس کے حوالے سے مین سٹریم اور علیحدگی پسند قیادت اپنے اپنے طور پر داعی ہے۔ مین سٹریم ریاستی قیادت، خاص طور پر نیشنل کانفرنس کا دعویٰ رہا ہے کہ 13/جولائی 1931ء کے شہداء نے کشمیر میں شخصی راج کا خاتمہ کرنے میں کلیدی رول ادا کیا اور یہ وہ تحریک تھی جس کی قیادت اس تنظیم کے بانی مرحوم شیخ محمد عبداللہ کر رہے تھے، وہ مانتے ہیں کہ اس واقع کے بعد کشمیر میں تعمیر و ترقی، آزادی اور خوشحالی کا نیا دور شروع ہوا اور غلامی کی زنجیریں ہمیشہ کے لئے کٹ کر رہ گئیں لیکن حریت پسند قیادت کا ماننا ہے کہ 13/جولائی کے شہداء کا مشن ریاست کی مکمل آزادی اور خود مختاری تھا لیکن مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے (26 اکتوبر 1947ء) میں بھارت کے ساتھ ''عارضی الحاق'' کر کے ریاست کو غلامی کے ایک نئے پنجرے میں مقید کر ڈالا اس لئے ان شہداء کا مشن ادھورا ہے، وہ ریاست کی علیحدہ شناخت اور پہچان کے متمنی تھے لہٰذا موجودہ تحریک دراصل اُسی تحریک کا حصہ ہے، اس لئے وہ (علیحدگی پسند) ان شہداء کے وارث ہیں۔ اس کنفیوژن کے دوران کشمیری عوام دوراہے پر کھڑے ہیں اور وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ 13/جولائی کے روز احتجاجی ہڑتال ہوتی ہے، شہر میں کرفیو ہوتا ہے،

کاروبار بند ہوتا ہے، کہیں کہیں جلسہ وجلوس ہوتا ہے لیکن ایک بات جو سبھی میں مشترک ہے، یہ ہے کہ ان شہداء کو 13 / جولائی کے روز اپنے اپنے زاویے سے ہی سہی لیکن بھر پور انداز میں یاد کیا جاتا ہے اور عقیدت کے پھول نچھاور کئے جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ یہ منتشر قوم اور اسکی متضاد قیادت کہیں نہ کہیں آپس میں متفق بھی ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

ا....(۷۰۰۰ سال پہلے تھائی لینڈ سے مصر تک کا علاقہ ایک سیلابی طوفان کی زد میں آ گیا زبور، انجیل اور فرقان میں اس واقعہ کو 'طوفانِ نوح' کے نام سے پکارا گیا ہے، کشمیر میں نیل مت پران میں اس کو منوح کا سیلاب کہتے ہیں یہ پوران ساتویں صدی میں لکھا گیا ہے، جس کے مطابق منوح کو ویشنو نے ہدایت کی کہ کائنات کی ہر جنس کی حفاظت کے لئے کشتیاں بنائے اور ان کو اس میں سوار کرائے، چنانچہ یہ کشتیاں ہمالیہ پربت کی طرف روانہ ہوئیں اور پھر پانی خارج ہونے لگا، اس وقت کشمیر کی وادی بھی پانی میں ڈوبی تھی۔ اور جب پانی خارج ہوا تو کریوے (وڈر) ظاہر ہوئے اور اردگرد سے چودہ قبیلے ناگ، پشاچ، درواہ، گندھارا، جوہندرا، ساکا، کُشا، تنگتا، منڈھوا، انترگری، بہرگری، بوانا، وغیرہ آئے اور یہاں بس گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ کوئی کشمیری اپنے کو کشمیر کا اصلی باشندہ نہیں کہہ سکتا۔ چونکہ ناگ گلگت سے آئے اور پشاچ ہمالیہ پربت سے، ان دو پہلے قبیلوں میں تنازعہ شروع ہوا کہ اصلی کون ہے؟ بعد میں یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے والے قبیلے کو 'ملہ ماسی' اور دوسرے کو 'بلہ ماسی' کے نام سے پکارا جائے گا، کشمیر کا پہلا بادشاہ 'نیل ناگ' تھا.... جسکی حکومت شاردا سے ویری ناگ تک تھی، ناگا بادشاہوں میں سے جو چند نام معلوم ہوئے ہیں، ان میں ناگ سدن گلا، ناگا پدما، ناگا راجہ، آریا نکد ما، اور ناگا ذراہ وغیر شامل ہیں۔ اس کے بعد با کنز اور سکتھنز بادشاہوں کا زمانہ آیا، پھر پاونا یا چوتانی بادشاہوں کا سلسلہ چلا، جنھوں نے چترال، ہندوکش،، ہزارہ وغیرہ پر ۳۲۷ قبل مسیح سے دوسو سال تک حکومت کی۔ ان کے سکوں کا تذکرہ پنڈت رام چند کاک اپنی کتاب Handbook of Archeological monuments، جو 1922ء میں چھپی ہے، میں تمام بادشاہوں کے نام درج کئے ہیں۔ اس کے بعد کُش خاندان کے راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی، جن میں سے کلہن نے راج ترنگنی میں کشکا، کنشکا اور جشکا نامی تین بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔ کنشکا نے پہلی صدی میں بدھ مت کی چوتھی کانفرنس کشمیر میں منعقد کرائی۔ کش خاندان کا چوتھا بادشاہ واسودیوا ہے۔ چونکہ کشمیر میں کابل اور گندھارا سے قبائل آئے تھے، ان میں سیل دیو (۸۷۵) اور سمنت دیو کا نام آتا ہے اور س کے بعد ہندو بادشاہوں کا سلسلہ بادشاہ

گونندا سے شروع ہو جاتا ہے، جن میں اننت ، ہُشکا اور ہرش وغیرہ کے نام آئے ہیں۔کلہن کو چونکہ بدھمت سے دشمنی تھی ،اس لئے اس نے بودھ بادشاہوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔حالانکہ پانچویں صدی تک کشمیر میں بدُھ دور رہا اور گیارہویں صدی تک ہندو دور...اس کے بعد مسلم دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ...گونندا اول کشمیر کا وہ بادشاہ ہے، جس کی فوج نے شری کرشن جی کے خلاف فوج کشی کی، متھرا شہر کو گھیرے میں لیا، اس کے جھنڈے پر ہل کا نشان تھا اور وہ لڑتے لڑتے مارا گیا۔اس کا بیٹا دامودر تھا، وہ تخت پر بیٹھا مگر اس کے سینے میں باپ کا بدلہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔اس گندھارا کے بادشاہ کی لڑکی کے سوئمبر میں حصہ لیا اور سری کرشن پر یلغار کی، مگر مارا گیا۔اس کی بیوی، جو حاملہ تھی، کشمیر کے تخت پر کرشن کی مدد سے بیٹھی اور وہی کشمیر کی پہلی مہارانی بھی تھی.... پروفیسر فدا محمد حسنین)

(2)

جب یوسف شاہ چک نے تان سین کو ٹوکا!

کشمیر کی زرخیز اور پُرنم مٹی نے وقت کی گردشوں اور ستم ظریفیوں کے باوجود ایسے ایسے گل ولالہ کو جنم دیا ہے، جنہوں نے نہ صرف اپنی ذہانت اور قابلیت کے انمٹ نشان چھوڑے ہیں بلکہ جب تک وہ زندہ رہے، شیر کی طرح رہے اور اپنا سر بلند کر کے جئے لیکن جب موت آئی تو اُسے بھی ہنسی خوشی قبول کیا لیکن نہ تو خود جُرمِ ضعیفی کے مرتکب ہوئے اور نہ ہی اپنی قوم کی مرگِ مفاجات کے موجب بنے۔ بہادُری اور شجاعت کے کمال میدانِ کارزار میں دکھلانے والے ارضِ وطن کے یہ جیالے جب محفلِ یاراں میں شامل ہوئے تو اُستادوں کے اُستاد ثابت ہوئے۔ خود کو تیس مار خاں سمجھنے والے فنونِ لطیفہ کے اُستاد کشمیری ادباءاور فنکاروں کے سامنے ہیچ ثابت ہوئے اور جنگ سے لیکر موسیقی تک کے سبھی میدانوں میں اپنی شہسواری کا لوہا منوایا۔ شاید کشمیر میں بہت کم طلبائے تاریخ کو اس بات کا علم ہو کہ بھارت میں موسیقی کے پیمبر سمجھے جانے والے میاں تان سین جب اکبر کے دربار میں کشمیری حکمراں یوسف شاہ چک کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے تو یوسف نے نہ صرف اُس کی کئی غلطیاں پکڑیں بلکہ بذاتِ خود بادشاہ کے سامنے ایسا راگ چھیڑا کہ تان سین کو پہلی بار اپنی کم مائیگی اور ناقابلیت کا احساس ہوا۔ اکثر مورخین تاریخ لکھتے وقت جنگ وجدل اور خون خرابے کے واقعات کا احاطہ کرنے کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ انہوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دے دیا لیکن بہت کم مورخ ایسے ہوتے ہیں جو ان واقعات کے ساتھ ساتھ عوام کے حالاتِ زندگی، رہن سہن، فنونِ لطیفہ اور سماجی رسومات پر بھی توجہ دیتے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ لکھنے والے زیادہ تر مقامی مورخین بھی اس جُرم سے نہیں بچ پائے ہیں اور شاید کشمیر میں سینکڑوں برس کی افراتفری، غیر یقینیت اور کھلبلی بھی اس حوالے سے ایک وجہ رہی ہے کہ اکثر مورخ جنگ وجدل، غلامی، افلاس، مظالم اور بدحالی کے واقعات کے طویل اور غیر مختتم سلسلے سے اپنا دامنِ قلم ہی نہیں چھڑا پائے اور وہ دوسرے پہلوؤں پر توجہ دینا ہی بھول گئے۔

اگرچہ چکوں کے دورِ حکومت کو کشمیر میں ظلم وستم اور فرقہ وارانہ کشیدگی کا دور قرار دیا جاتا ہے اور اسی افراتفری کی وجہ سے کشمیری اولیاءاور علمائے کرام کو مغلوں سے فریاد کرنا پڑی اور کئی وفود نے مغلِ اعظم

کے دربار میں حاضر ہوکر فریاد کی کہ کشمیری عوام کو چکوں کے مظالم سے آزاد کرانے کے لئے کشمیر پر حملہ کیا جائے اور یہ بھی سچ ہے کہ چکوں کے خاتمے کے بعد ایک طرف اگرچہ کشمیری عوام کا امن وسکون بحال ہوا لیکن دوسری جانب کشمیر کی خودمختاری ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی۔ پروفیسر فدا محمد حسنین کا کہنا ہے ''چک دور کو صحیح طور پر کھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے کشمیر کے Contemporary حسبِ حال مورخوں کی تاریخوں کا مطالعہ کریں خاص طور پر سوتا، سلی ور، بہارستانِ شاہی، تاریخِ کشمیر (محمد علی) اور مغل غلامی میں... مغل؛ اور مغلوں کے زرخرید مورخوں کی کتابوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا... اکبر نے کشمیر کو ہڑپ کرنے کیلئے فوج روانہ کی مگر شکست کھا گیا، وجہ یہ تھی کہ کشمیر میں مسلمانوں میں اتحاد قائم تھا، اسلئے اس نے مسلمانوں کی وحدت ختم کرنے کیلئے شیعہ، سُنی تفرقہ شروع کیا اور تب جا کر کشمیر کو غلام بنانے میں کامیاب ہوا۔ یہ تفرقہ آج تک ختم نہیں ہوا کیونکہ مغل مورخوں اور مغلوں کے وظیفہ خوار کشمیری مورخوں نے وہی لکھا، جس سے اکبر کے Imperialism کی کامیابی یقینی ہو۔ ان لوگوں نے چک دور کو ظالمانہ دور لکھا اور اب تک یہی نقل کیا جارہا ہے۔ صحیح حالات کیلئے Contemporary مورخین کی کتابوں کو دیکھنا ہوگا، حضرت مخدومؒ کی ذاتِ بابرکت کو اس سیاسی معاملہ میں ٹھونس دینا بھی انہی مغل وظیفہ خوار مورخین کی من گھڑت کہانیوں میں شامل ہے۔ حضرت شیخ بابا داؤد خا کی کشمیریؒ حضرتِ شیخ حمزہ مخدومؒ کے مریدِ باصفاء تھے، ان کا جسدِ خا کی حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کے مقبرہ میں مدفون ہے .. شیخ بابا داؤد خا کیؒ کا قصیدۂ غسلیہ یوسف شاہی، جس کا ترجمہ غلام رسول بٹ نے کیا ہے، میں سلطان یوسف شاہ چک کی مدح خوانی کرتے ہوئے لکھا گیا ہے: ''...سلطان یوسف شاہ چک خدا کے رسولؐ، آلِ رسولؐ اور صحابہ کرام کا عاشق تھا، جماعت کا پابند اور کبھی امامت بھی خود کرتا تھا تلاوتِ قرآن شریف قاعدے سے کرتا تھا، علم کا شوقین تھا اور علماء سے شرح، تفسیر اور قرآنی آیات کا مطلب معلوم کیا کرتا تھا'' (قصیدۂ غسلیہ یوسف شاہی، مکمل شرح، صفحہ نمبر ۱۰) اسی زمانے کے دو مزید مورخ پرجا بھٹ اور سوکا لکھتے ہیں: ''بادشاہ نے ملک پر ایسے حکومت کی، جس طرح سورج کنول کے پھول پر حکومت کرتا ہے اور تاریکی دور ہوجاتی ہے۔ جب بادشاہ نے تخت سنبھالا، اندر دیوتا کی طرح ملک پر رحمتوں کی بارش ہوئی اور انصاف کا دور دورہ ہوا۔ ساری دنیا میں اس کی شہرت عام ہوئی اور عوام اس سے مالا مال ہوئے'' مغلوں کے بعد دُرانیوں نے کشمیریوں کی غلامی جاری رکھی' افغانوں کے بعد سکھوں نے اور سکھ جاتے جاتے کشمیریوں کو کشمیر سمیت جموں کے ڈوگروں کے ہاتھوں فروخت کر گئے۔ ڈوگروں کو بھگانے کے لئے کشمیریوں نے 50/سال جدوجہد کی اور اگرچہ ہری سنگھ کی مرضی تھی کہ کشمیر خودمختار ریاست کے

طور پر قائم رہے لیکن کچھ کشمیریوں پر پاکستان کا بھوت سوار تھا اور کچھ بھارت کے ساتھ جانے کے لئے بیقرار تھے۔ لیکن اس غداری کے طویل سلسلے سے قطع نظر زیرِ نظر مضمون میں اس بات کا ذکر کرنا مطلوب و مقصود ہے کہ شہنشاہانِ چکاں کے آخری خود مختار بادشاہ یوسف شاہ چک، جنہیں ملکہ حبہ خاتون کا شوہرِ نامدار ہونے کا بھی (چاہے تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی) شرف حاصل رہا ہے، جب کشمیر میں اندرونی بغاوت کو دبانے اور حالات کو سدھارنے میں ناکام رہے تو انہوں نے مغلِ اعظم، شہنشاہِ اکبر کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، جو اُسے مل گئی۔ بہارستانِ شاہی، محمد اعظم دیدمری، پرویز دیوان، صوفی محی الدین، محمد الدین فوق اور غلام احمد میر کی تاریخی تحقیق کو سامنے رکھ کر حالات کے سمندر میں چند غوطے لگانے کے بعد جو تاریخی جواہرات ہاتھ لگتے ہیں، اُن کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ یوسف شاہ چک اپنی کچھ غیر نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک عیاش بادشاہ ثابت ہوا ہے، وہ اپنے شاہی کاموں میں کچھ وقت گزارنے کے بعد فنونِ لطیفہ، جیسے موسیقی اور رقص و سرور کی محفلوں میں مشغول ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے اُس کے امراء، خصوصاً مبارک بیہقی (سلطان کے برادرِ نسبتی) اور چچا زاد لُو ہر چک اُس سے سخت خائف رہتے تھے۔ صوفی محی الدین کا ماننا ہے کہ مبارک بیہقی یوسف کا داماد تھا لیکن دیوان اس بات کو نہیں مانتا، اُس کا کہنا ہے کہ بیہقی کی شادی یوسف شاہ چک کی بہن کے ساتھ ہوئی تھی۔ (دیکھئے پرویز دیوان کی کشمیر۔ انگریزی صفحہ نمبر 5) وہ لکھتا ہے کہ یوسف شاہ چک کیلئے اُسکے بادشاہ بننے کیساتھ ہی، حالات خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پرویز کا کہنا ہے: ''یوسف ایک انتہائی ذہین اور عقلمند سلطان تھا، کچھ مورخوں کا ماننا ہے کہ یوسف شاہ چک ہی کشمیری کلاسیکی موسیقی کا بابا آدم ہے اور اُسی نے کشمیری راگ راگنیوں کی ماں ''راست'' کی تخلیق کی۔ اُس کے فارسی اشعار انتہائی معنی خیز ہوتے تھے اور وہ آج بھی کشمیری ادب میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ یوسف شاہ ہی تھا جس نے گلمرگ کو سیاحتی مقام کے طور دریافت کیا، اس سے قبل اس جگہ کا نام ''گوری مرگ'' (گڈریوں اور چرواہوں کی چوٹی یا بہک) تھا، یوسف شاہ نے اپنی چہیتی ملکہ اور شاعرہ حبہ خاتون کے ہمراہ اس بے حد خوبصورت اور قدرتی مناظر سے لبریز کہستان کی سیر کے دوران وہاں بے شمار قسم کے پھول دیکھے اور اسے ''گلمرگ'' کا نام دے دیا۔

پرویز آگے لکھتا ہے'' سوائے چند ایک کار ہائے سلطنت کے یوسف کی دلچسپی کچھ دیگر کاموں میں زیادہ تھی اور حکومتی کاموں سے عدم دلچسپی اُس کے قریبی امراء کو سخت کھٹکتی تھی۔ جس کا نتیجہ آگے چل کر یہ ہوا کہ اُمراء (اُس کے بہنوئی اور چچیرے بھائی) نے بغاوت کر کے اُسے معزول کر دیا۔ یوسف

کشمیر چھوڑ کر اکبر کے دربار (آگرہ) میں حاضر ہوا اور اُس سے مدد کی فریاد کی تا کہ اپنی سلطنت کو واپس حاصل کر سکے! مورخ لکھتے ہیں کہ اکبر نے تقریباً ایک سال تک یوسف کو ملاقات دینے سے انکار کیا اور ''امروز فردا'' سے کام لیتا رہا اور بادشاہ جب معزول چک سے ہم کلام ہوا تو اُسے شہنشائے کشمیر کے بجائے ''یوسف خان'' کے نام سے پُکارا۔ جبکہ کشمیر کو یوسف کا وطن کہنے کی بجائے اکبر نے اُسے اپنا ''باغِ خاص'' قرار دیا۔ اسی کے ساتھ اکبر نے حکم دیا کہ یوسف کو محل میں انتہائی آرام و اکرام کے ساتھ رکھا جائے' اُسے کئی خدمتگار اور کنیزیں بھی عنایت فرمائی گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر کے دربار میں ایک اطالوی موسیقار (TONA SANTA) یعنی تان سین موجود تھا' جو اپنے فن کے لئے پورے بھارت میں نہیں بلکہ ملک سے باہر بھی مشہور تھا اور موسیقی کے بڑے بڑے اُساتذہ تان سین کے سامنے زانوے ادب خم کرنے کو اپنے لئے باعثِ فخر تصور کرتے تھے۔ بطورِ مہمان قلعۂ آگرہ میں قیام کے دوران کم از کم ایسے دو واقعات پیش آئے جب تان سین کو یوسف شاہ چک کے ہاتھوں خفت اُٹھانا پڑی۔ بتایا جاتا ہے کہ یوسف نے دو مرتبہ تان سین کو ٹوکا اور مشورہ دیا کہ وہ کس طرح سے اپنی غلطیوں کو دُرست کر سکتا ہے۔ پرویز دیوان ''کشمیر'' میں لکھتا ہے ''جہاں تک یوسف شاہ چک اور حبہ خاتون کا تعلق ہے' مجھے اس بارے میں شبہہ ہے۔ اول تو یہ کہ کیا واقعی حبہ خاتون کا وجود کہیں تھا بھی یا نہیں؟ کیا اُس کا گریز وادی کے ساتھ کوئی تعلق تھا؟ کیا اُسے سچ مچ پانتہ چوک میں دفن کیا گیا تھا یا پھر وہ یوسف شاہ چک کی گرفتاری کے وقت گرفتار ہو کر اُسی کے ہمراہ لے جائے گئی اور کشمیر سے باہر مر گئی' حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ایک بات تو سچ ہے کہ کوئی نہ کوئی خاتون کسی زمانے میں موجود رہی ہے جس نے کشمیری ادب کو ''حبہ خاتون'' کے نام سے متعدد میٹھے اور نا قابلِ فراموش گیت عنایت کئے'' اور چونکہ شعراء کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنی غزلوں اور گیتوں کے آخری شعر ''مقطع'' میں اپنا نام یا تخلص استعمال کرتے ہیں اور ان گانوں میں ''زونی'' حبہ اور ''حبہ خاتون'' ملتا ہے۔ اس لئے اس طلسماتی شاعرہ کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اُس کے گیتوں سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اُس کا آبائی گاؤں چندہارہ تھا اور اُس کے گیتوں سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اُس کا محبوب (یار) جمالٹہ کا رہنے والا تھا اور اُس کا نام ''کمال'' تھا۔ اُس کے (حبہ کے) والد کا نام سید البہار تھا اور ماں کا نام بدیع الجمال۔ جیسے جیسے اُس کے اشعار کے سمندر میں تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اُس کی تعلیم' گھریلو حالات' پرورش' نوکروں' اور کھانے پینے کی عادات کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے' لیکن وقت کے کسی بھی مورخ نے الگ سے حبہ خاتون اور یوسف شاہ چک کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے' بلکہ اس پُر اسرار شاعرہ کے بارے میں جو بھی کچھ پتہ چلتا ہے اُس کے اپنے اشعار سے ہی پتہ چلتا

ہے اور وادیِ کشمیر کے ساتھ اس ناقابلِ تردید رشتے اور تعلق کے ثبوت وشواہد کے بعد کوئی کیسے مان سکتا ہے کہ حبہ خاتون کا گریز وادی کے ساتھ کوئی دور کا بھی واسطہ تھا یا اُس کا کنبہ غریب تھا' اُس کے والد کا نام عبدی راتھر تھا' اُس کے پہلے (جاہل) خاوند کا نام عزیز لون تھا (اور اگر وہ سیدزادی تھی تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ کوئی لون اس کا شوہر ہو ہی نہیں سکتا تھا) اور ایک دیگر تحقیق کسی حد تک اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ حبہ خاتون کی والدہ (شاید) گریز کی رہنے والی تھی اور (شاید) ننھیالیوں نے اس نسبت سے گریز کے ایک پہاڑ کا نام حبہ خاتون کے نام پر رکھ دیا۔ تاہم کشمیری مورخ فدا محمد حسنین اور غلام رسول بٹ آف سولنہ کی تحقیق کے مطابق حبہ خاتون ایک سید خانوادے سے تعلق رکھتی تھی' جنہوں نے ایران سے ہجرت کی تھی' اُس کا شوہر ''کمال'' بھی سیدزادہ تھا اور اُن کا خانوادہ حبہ اور کمال سے صرف تین پشت پہلے کشمیر آیا تھا۔ اُس کی ظالم ساس اور حبہ خاتون کی تکلیفوں کو اُس کے اشعار میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حبہ خاتون کی شاعری میں مستعمل کشمیری زبان کے بارے میں بھی محققین کا اختلاف ہے کیونکہ حبہ کا دور بھی وہی دور تھا جب (تقریباً چالیس سال قبل) شیخ نورالدین ولیؒ اور للہ عارفہ بھی کشمیر میں بقیدِ حیات تھے، ان دونوں نے بھی شاعری کی اور حضرت شیخؒ کی شاعری اور حبہ کی شاعری کے درمیان کا عرصہ چالیس سال یا نصف صدی سے زیادہ کا نہیں تھا، دونوں کا عرصہ سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کا زمانہ تھا اور تینوں کی شاعری میں مستعمل زبان میں زمین وآسمان کا فرق ہے، حالانکہ للہ اور شیخ العالمؒ کی شاعری کی زبان ایک ہے جبکہ حبہ کی شاعری میں ماضی قریب کی کافی ترقی یافتہ اور سلجھی ہوئی کشمیری زبان ملتی ہے اور باقی دو کے اشعار اپنے زمانے کی عکاسی کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ کیا واقعی حبہ خاتون نے یوسف شاہ چک کے ساتھ شادی کی اور ملکہ کا خطاب حاصل کیا۔ اُس زمانے کی دو مستند تاریخوں ''بہارستانِ شاہی (ترجمہ: کاشی ناتھ پنڈت)'' اور ملک حیدر کی تاریخ میں اس طرح کے کسی بھی کردار کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جبکہ مغل مورخ ابوالفضل جو کہ آئینِ اکبری میں یوسف شاہ چک کے بارے میں بہت کچھ لکھتا ہے لیکن وہ بھی حبہ خاتون نامی کردار کے حوالے سے پُراسرار طور خاموش ہے جبکہ جدید تحقیق کے مطابق بسوک بہار میں یوسف شاہ چک کی قبر کے نزدیک ایک گمنام عورت کی قبر بھی ہے' عین ممکن ہے کہ یہ حبہ خاتون ہی ہو۔

زونی یا حبہ خاتون کے بارے میں جس مورخ نے سب سے پہلے اپنی تاریخ میں تذکرہ کیا تھا اُس کا نام بیربل کاچرو تھا اور یہ تاریخ بھی حبہ خاتون کی وفات کے تقریباً دوسو سال بعد لکھی گئی اور بیربل کاچرو بھی بمشکل ہی اس بات پر متفق نظر آتا ہے کہ یوسف شاہ چک نے کبھی حبہ خاتون کو ''شرفِ

ہمبستری'' سے نوازا تھا۔ پرویز کے مطابق یہ سلسلہ اُنیسویں صدی میں شروع ہوا جب کشمیری مورخین نے یوسف شاہ چک کو (اپنے قلم کے ذریعے) مجبور کیا کہ وہ حبہ خاتون نامی ایک ایماندار اور خوبصورت شاعرہ کو اپنی ملکہ بنا لے۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ مستند کشمیری مورخ غلام رسول بٹ نے اپنی تحقیق کے ذریعے ایک خاندان دریافت کیا ہے جس کی نسبت حبہ خاتون سے ملتی ہے۔ اس لئے مانا جاسکتا ہے کہ حبہ اور یوسف نے (شاید) کبھی شادی کی تھی اور اُن کے یہاں اولاد بھی ہوئی تھی اور چونکہ بٹ کے دریافت شدہ حبہ خاتون کے بیٹے کا نام حیدر بتایا گیا ہے اور یہ بات بھی الگ سے ثابت ہے کہ یوسف شاہ چک کے بیٹے کا نام بھی حیدر تھا۔ حیدر ایک بہت ہی پیارا لڑکا تھا جس نے اپنے بڑے مگر سوتیلے بھائی یعقوب چک کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی قربانی دے ڈالی ۔حبہ خاتون اور یوسف شاہ چک کا انجام کچھ بھی ہوا ہو لیکن یہ بات تاریخ اور مورخ کبھی فراموش نہیں کرسکتا کہ اُن کے دور میں کشمیر کی فوج اس قدر طاقتور اور دلیر تھی کہ اُس نے مغلوں کو پیر پنچال کے برفانی دروں میں 18 ماہ تک ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا اور اس لڑائی میں بیربل جیسا سپہ سالار بھی کشمیری فوجیوں کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کٹ گیا۔......

3

سلطان زین العابدین بڈ شاہ کا سُنہری دور

ایک نہایت قدیم اور مشہور کہاوت ہے کہ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا، اور یہ کہاوت انتہائی حسین، وجمیل اور خوبصورت وخوشنما سرزمینِ کشمیر کے حوالے سے اس لئے بھی موزون ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سرزمین کی آرائش وزیبائش اور حُسن و جمال کو نکھارنے کے لئے جس قدر توجہ دی ہے، اُسی قدر اس سرزمین کے باشندگان کے نصیب لکھتے وقت اپنی روائتی بے نیازی سے بھی کام لیا اور تاریخ کے اوراق اُلٹنے سے یہ حقیقت بے نیاز ہوتی ہے کہ اس خوبصورت خطۂ زمین پر بہت کم ایسے مواقع آئے ہیں جب یہاں امن وسکون قائم رہا اور لوگوں نے کھلی اور آزاد فضاء میں سانس لی، ترقی و تعمیر اور عروج تہذیب وتمدن کو موقعہ ملا ہو، کوئی ملنسار اور نیک حکمران اس سرزمین کو خال خال ہی نصیب ہوا ہے اور عوام نے بہت کم ایسے زمانے دیکھے ہیں جب اُن کی عزت و ناموس اور مال و جان محفوظ و سلامت رہے ہیں۔ ورنہ مظالم و جبر وقہر وستم کا ایک مسلسل سلسلہ اور کبھی نہ تھمنے والی بارانِ آتش وآہن سے پریشان اس بستی کے مکینوں نے کتنی بار ابابیل نما مسیحاؤں کو آواز دی ہے، تاریخ کے طلباء اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس سرزمین کے ''شریف النفس باشندگان'' نے کبھی اور کسی بھی زمانے میں ایک دوسرے کی ہستی کو تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی کسی کی تابعداری وحکمرانی قبول کی، ایک ظالم کے خلاف اعلانِ جنگ کیا، دلیری ومردانگی سے میدانِ کارزار میں اپنے فنِ سپہ گری کا لوہا منوایا اور دشمن کو مار بھگایا لیکن بیرونی دشمن کے چلے جانے کے بعد آپسی اتفاقِ رائے قائم نہ ہو پایا اور کسی دوسرے بیرونی حکمران کو دعوت دے کر لایا اور تمام کارہائے سلطنت اُس کو سونپ دیئے اور یہ سلسلہ آج تک کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔ لیکن اس خطے نے جو چند ایک ادوارِ امن دیکھے، اُن میں اپنے فن، قابلیت، ہُنر اور ذہانت کا بھرپور ثبوت دیا اور انہی گِنے چُنے چند ایک زمانوں میں شہنشاہ کشمیر زین العابدین عرف بڈ شاہ کا سُنہری دور بھی شامل ہے، جو کہ 1420ء سے 1470ء کے پچاس برسوں پر محیط ہے۔ حالانکہ بڈ شاہ اپنے بُت شکن باپ، سلطان سکندر کے اثاثۂ سلطنت پر تو برابر جمان ہوا لیکن وہ انتہائی شریف النفس، ملنسار اور جمہور نواز

بادشاہ تھا،بعض مورخین کے مطابق زین العابدین غیر مسلموں کا اس قدر طرفدار روحامی تھا کہ اُس نے نہ صرف یہ کہ اپنے والد کے کئی تباہ شدہ مندروں کو دوبارہ تعمیر کروایا بلکہ غیر مسلموں کو تمام حقوق دیئے اور اُن کے جان و مال وعزت کی حفاظت کا بھی خاص خیال رکھا اور یہی وجہ تھی کہ اُس کی موت کے بعد اگر چہ بعض مورخین کے مطابق زین العابدین کو ایک عالیشان مقبرے میں دفن کیا گیا لیکن بعض مورخین کا اختلاف یہ ہے کہ سلطان کی موت کے بعد مسلمانوں نے اُس کی تجہیز و تکفین کے حوالے سے اعتراض اُٹھائے اور اُسے کشمیری پنڈتوں نے ایک مندر کے احاطے میں دفن کر دیا، جہاں سے بعد میں اُسے 'بڈ شاہ کے مقبرے' میں منتقل کیا گیا،اور یہ آج تک محققین کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔لیکن اس گتھی کو فدا محمد حسنین کچھ اس طرح سے سلجھاتے ہیں:''سُلطان زین العابدین کی شادی اور کفن، دفن کا حال سریور Sriwara نے اپنی راج ترنگی میں صفحہ ۱۰۱ تا ۱۲۸ میں درج کیا ہے۔اس کو شہر Zena-Nagar میں دفن کیا گیا ، جو بڈ شاہ کا دارالخلافہ تھا، اس کی قبر کے کتبے پر حاجی خان لکھا ہے۔ بعد میں حیدر شاہ 1470-1472 نے قرآنی آیات لکھوادیں،جس بڈ شاہ کے مقبرے کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، وہ ان کی والدہ کا ہے۔سلطان بڈ شاہ کی قبر شاہی قبرستان مہاراج گنج میں ہے''

ایک روایت کے مطابق سکندر بُت شکن کی وفات کے بعد 1413ء میں اُس کا بڑا بیٹا علی شاہ تختِ کشمیر پر براجمان ہوا، انہی دنوں بلتستان کا علاقہ کشمیریوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ حالانکہ علی شاہ انتہائی سخت گیر اور عیاش قسم کا سلطان تھا اور اُس نے جموں کے ایک ڈوگرہ مہاراجہ کی بیٹی کے ساتھ شادی کی تھی۔لیکن 1420ء کے آس پاس علی شاہ نے اپنے شاہی علماء اور ناصحین کی ملامت سے متاثر ہو کر حجِ بیت اللہ کا پروگرام بنایا اور اپنے چھوٹے بھائی شاہی خان سے کہا کہ وہ اس دوران تخت پر بطورِ سلطان قائم رہے۔اُس زمانے میں چونکہ حج بیت اللہ کا سفر پیدل یا گھوڑوں پر طے کرنا پڑتا تھا اور اس دوران کئی کئی مہینے گزر جاتے تھے اس لئے علی شاہ اپنے چھوٹے بھائی کو اپنا جانشین مقرر کر کے سفرِ محمود پر روانہ تو ہوا لیکن زیارتِ بیت اللہ اُس کی قسمت میں نہ تھی۔ جموں پہنچتے ہی جب وہ اپنے سُسر الیوں سے رخصت لینے پہنچا تو انہوں نے علی شاہ سے کہا کہ اُس نے اپنا تخت شاہی خان کے سُپرد کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے، اول تو وہ اُس کی سلطنت پر قبضہ کر لے گا اور دوم حج کا سفر اس قدر دشوار اور جان گُسل ہے کہ ممکن ہے علی شاہ راستے میں ہی راہِ عدن سدھار جائے۔عقیدہ اور ایمان ناپختہ تھا اس لئے علی شاہ جموں سے ہی ارادۂ حج ترک کر کے واپس لوٹ آیا۔ وہ اگر پُرامن طریقے سے گھر واپس آجاتا تو بات اور تھی لیکن اُس نے اس کے برعکس ڈوگرہ سُسرالیوں کی بھاری فوجی کمک ساتھ لائی اور اپنی ہی سرزمین

میں ایک حملہ آور کی طرح داخل ہوا، پیر پنچال کو پار کرتے ہی سرزمین کشمیر پر اُسے جہاں کوئی انسان دکھائی دیا، وہ اُس کا لہو بہاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

بڈشاہ کا میر منشی اور کاتبِ مورخ زونہ راجہ اپنی 'راج ترنگنی' (جس کا انگریزی ترجمہ ایک بنگالی سکالر جگدیش چندر دت نے 1898ء میں کیا ہے) میں لکھتا ہے:

"علی شاہ ملک میں داخل ہوا، گویا ہاتھیوں کا جھنڈ میٹھے پانی کے چشموں میں داخل ہو گیا۔ جس نے میٹھے اور شفاف پانی کو کیچڑ میں بدل کر رکھ دیا۔ سامنے آنے والے ہر شخص کو کُچلتا، مسلتا آگے بڑھ گیا۔ تباہی بربادی پھیلاتا ہوا طوفان کی طرح، گویا، خوبصورت اور نازک پھولوں کے باغات میں بندروں کا غول داخل ہو گیا ہو، جس نے ہر ٹہنی ہر ڈالی، ہر کلی اور ہر گل کو مسل دیا، کشمیر نے تاریخ کی بدترین تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور خاموش رہا" (صفحہ نمبر ۲۷ تا ۳۷) جبکہ دیوان کے مطابق سلطان علی شاہ کی "ڈوگرہ ملکہ" کے ہمراہ اُس کے رشتہ داروں کی ایک بڑی تعداد کشمیر وارد ہوئی، جسے علی شاہ نے سرینگر کے شہر خاص کے 'جمالٹہ" علاقے میں آباد کیا، جہاں ایک تجارتی منڈی قائم کی گئی، جمالٹہ کا قدیم نام "جموال ہٹا" یعنی 'جموں والوں کی منڈی یا مرکزِ تجارت' تھا! سلطان علی شاہ کے ساتھ لفظ 'خان' کا مطلب 'پٹھان' نہیں ہے بلکہ کشمیر کے اکثر بادشاہ اور سلطان 'خان' لقب کے ساتھ مشہور ہوئے ہیں"

بہر حال علی خان کے حملے کے بعد زین العابدین کشمیر چھوڑ کر ہزارہ کے بادشاہ جسرت خان کھوکھر کے پاس پناہ گزین ہو گیا۔ اس دوران علی شاہ نے اپنے قاصد روانہ کر کے کھوکھروں کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اگر انہوں نے زین العابدین کو وہاں مزید وقت پناہ اور تحفظ دیا تو کشمیری افواج ہزارہ پر حملہ کر دیں گی۔ کھوکھر چونکہ پیدائشی گوریلے اور جنگباز تھے، اس لئے اس دھمکی کے جواب میں انہوں نے پونچھ اور راجوری کے راستوں سے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ علی شاہ کے سُسرالیوں (جموں کے ڈوگروں) نے اس حملے کا مقابلہ کرنے کی کافی کوشش کی لیکن کھوکھروں کی جنگی حکمتِ عملی کے سامنے ٹک نہ پائے، بالآخر جسرت اور شیخا کھوکھر کی کمانڈ میں ہزارہ کی ایک بھاری سپہ نے حملہ کر کے علی شاہ کو تخت سے اُتار پھینکا اور زین العابدین کو بڈشاہ کے خطاب کے ساتھ اس پر نہ صرف بحال کیا بلکہ اُس کی حفاظت کے لئے اپنی فوج کا ایک بڑا اور مستعد دستہ بھی یہاں چھوڑ دیا۔

بڈشاہ کی کشمیر واپسی کا حال اس کے اپنے عہد کے مورخ (کشمیری پنڈت) زونہ راجہ نے

کچھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''...جب ہر سو اندھیرا چھا جاتا ہے، جب دھرتی کی تمام نعمتیں ملیا میٹ ہو جاتی ہیں اور جب دنیا ایک ظالم بادشاہ کی وجہ سے پریشان ہو جاتی ہے...پھر زمین پر معصوم زین العابدین جیسے بادشاہ کا نزول ہوتا ہے....اور پھر جب وہ کشمیر میں داخل ہوا، کامیابی کے ساتھ چمکتی ہوئی تقدیر کی طرح، اچھے لوگوں کے لبوں نے اسے دعائیں دیں، ہر سُو ڈھول نگاڑے بج اٹھے، وہ پہلے عوام کے دلوں میں داخل ہوا، اس کے بعد اپنے دارالخلافہ میں...جب بادشاہ پر ابرِ رحمت کی بارش ہوئی، اس کی رعایا کے دل و دماغ سے سارے دکھ دُھل گئے اور جب اُس نے اپنی شاہی چھتری کو پھیلایا، اس کے دشمنوں کی سانس رُک گئی...اس کا وطیرہ اور برتاؤ ایسا تھا، جیسے گنے کے اندر رس اور رس کے اندر میٹھا گُڑ ہوتا ہے...اور اس نے اپنے غمزدہ عوام کی خوب پیاس بجھائی...'' (راج ترنگنی آف زونہ راجہ، دی کنگس آف کشمیر، مترجم جے سی دت، صفحہ ۷۵تا۷۶)

ادھر پاکستانی مورخ پروفیسر، میجر طارق اعوان اپنی کتاب ''دی ہسٹری آف انڈیا اینڈ پاکستان'' کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں کہ کھوکھروں نے بڈشاہ کی ایک لمبے عرصے تک مدد کی اور اُس کے ہمراہ کئی جنگی مہمات میں حصہ لے کر کشمیر کی سلطنت کو اس قدر وسعت دی کہ اس کی سرحدیں ایک طرف تبت کے ساتھ جا ملیں۔ دوسری جانب ہماچل کے ساتھ پنجاب کا بیشتر حصہ بھی اس میں شامل ہو گیا جبکہ مغرب میں کشمیری افواج فتوحات حاصل کرتے ہوئے گجرات کے ساحل تک جا پہنچیں اور ایک روایت کے مطابق آگے سمندر کو دیکھ کر یہ افواج اسے دُنیاء کی آخری سرحد سمجھ کر واپس لوٹ آئی تھیں۔

پرویز دیوان بڈشاہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اپنی 'متنازعہ' شروعات کے باوجود بڈشاہ کا دورِ حکومت کشمیر کی تاریخ کا سُنہرا باب بن گیا۔ اُس کا کشمیر میں وہی مقام ہے جو بھارت میں اکبر یا اشوک کا تھا۔ وہ لوگوں کا محبوب رہنماء تھا۔ اُس کے فیصلے انصاف پر مبنی ہونے کی وجہ سے وہ ایک عادل حکمران کے طور پر مشہور تھا اور یہی وجہ ہے کہ اُس کا دور کشمیر کی تاریخ کا سُنہرا باب کہلاتا ہے۔ بڈشاہ نے اپنے دور میں کشمیر کی تعمیر نو کا جو سلسلہ شروع کیا۔ اُس کے آثار آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے ڈل اور ولر جھیلوں میں نقلی جزیرے تعمیر کروائے، پُل بنوائے۔ نہریں کھدوائیں اور زینہ گیر کے علاقے کو آباد کرایا۔ درجنوں پگڈنڈیاں اور شاہرائیں بنوائیں اور تجارت کو بڑے پیمانے پر فروغ دیا۔ خاص طور

پر وسطی ایشاء سے ماہرین، فن کار، کاریگر اور معلمین کو کشمیر مدعو کر کے یہاں دستکاریوں کو فروغ دیا اور تعلیم عام کرنے کے لئے وسیع تر اقدامات کئے۔ دیوان کے مطابق خانیار کے روضہ بل علاقے میں جو پُر اسرار زیارت شریف موجودہ محققین تاریخ کے لئے معمہ بنی ہوئی ہے، وہاں دراصل اسی عہد میں مصر سے یہاں آنے والے ایک عالم یوزا آصف کو دفن کیا گیا ہے، جس کے بارے میں بیسویں اور اکیسوں صدی کے بھارت، پاکستان، اسرائیل اور یورپ کے مورخین کا خیال ہے کہ اس جگہ حضرت عیسیٰؑ کو دفن کیا گیا، لیکن تحقیق بتاتی ہے کہ وہاں یوزا آصف مدفن ہیں، جو بڈ شاہ کے دور میں مصر سے آیا اور وہ چونکہ انتہائی پاکباز اور متّقی شخص تھا اس لئے بڈ شاہ نے اُسے اپنا قاضی القُضاء مقرر کر کے یہیں آباد کر لیا، لیکن پرویز کا اصرار ہے کہ اگر یہ بات پوری طرح سے ثابت ہو جائے کہ وہاں یوزا آصف ہی دفن ہے تو کم از کم یہ تحقیق بند ہو جائے گی (اس حوالے سے مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

بڈ شاہ کا محل ' جسے زینہ ڈب کہا جاتا ہے' شہر خاص کے زینہ کدل (مہاراج گنج) علاقے میں موجود تھا، اس کی بارہ منزلیں تھیں۔ بتایا جاتا ہے کہ دُنیا میں گنبد کی طرز پر بننے والی یہ پہلی عمارت تھی۔ کیونکہ اس کے بعد لحاسہ کا پوٹا محل اور لداخ کا محل بنے ہیں لیکن بڈ شاہ کا تعمیر کردہ 'زینہ ڈب' نہ صرف یہ کہ ان دونوں عمارتوں سے بلند تھا بلکہ اِن سے دوسو سال پرانا بھی۔ لیکن بدقسمتی سے چک دور میں اس محل کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ جو بہترین قسم کی لکڑی اور شیشے سے بنایا گیا تھا۔ مرزا حیدر دُگلت، جس نے وسطی ایشاء سے کشمیر پر حملہ کر کے حکومت کی، اپنی تزک میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس محل کو دیکھا، اس کی ہر منزل میں پچاس کمرے تھے یعنی کل ملا کر 'زینہ ڈب' کا محل چھ سو کمروں پر مشتمل تھا۔ یہاں ذی ہوش لوگوں کے لئے دعوتِ فکر ہے کہ اُس دور میں اتنی بڑی عمارت کی تعمیر کشمیر کی ترقی کے عروج کے سوا اور کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ اس محل کی کھڑکیوں میں پنجرہ کاری کا استعمال کیا گیا تھا، حیدر دُگلت نے محل کا جو نقشہ کھینچا ہے، اُس کے مطابق یہ محل اپنے وقت کی عالیشان عمارت تھی جسے چکوں نے اپنے عہدِ سلطنت (1555-1585) کے دوران خاکستر کر دیا۔ چکوں کے دور میں اکثر آتشزنی کی وارداتیں پیش آتی رہیں۔ پائین شہر کئی بار خاکستر ہوا اور سرینگر کی جامع مسجد بھی کئی بار شہید و خاکستر ہوئی اور اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ بڈ شاہ کے دور میں علم و ادب اور تحقیق اس قدر عروج پر تھی کہ آج بھی بڈ شاہ کے زمانے میں ترتیب دی گئی Zology اور Botany کی کتابیں ملتی ہیں، جن کی ترتیب فارسی حروف تہجی کے حساب سے تشکیل دی گئی ہیں۔ اور اس وقت بھی ان کتابوں کی نقلیں ڈوگرہ مہاراجاؤں کے عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ جو کشمیر میں ڈوگرہ رُول کے دوران کرائی گئی تھیں۔ پرویز دیوان اپنی

کتاب 'کشمیر' کے صفحہ نمبر 43 کے آخری پیرا میں اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے ان کتابوں کی اصل اورنقل اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔

پندرہویں صدی کے اس حکمران نے کشمیر میں پہلی بار زنانہ شفا خانے تعمیر کروائے جہاں علاج و معالجے کیلئے سمرقند سے داعیاں اور حکیم منگوائے گئے۔ اس لحاظ سے یہ سلطان ایک عظیم انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے سے صدیوں آگے تھا اور اُس کی دور اندیشی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس حوالے سے ایک دلچسپ قصہ یہ ہے کہ بڈشاہ کے شاہی حکیم (چیف میڈیکل آفیسر) کو ہسپتال کے لئے موزون جگہ تلاش کرنے میں تقریباً دو سال کا عرصہ لگ گیا۔ اُس نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ اُس نے تین مختلف مقامات پر جانوروں کا گوشت رکھ دیا اور ہر سال گوشت کا جائزہ لیتا رہا۔ بالآخر ڈل گیٹ کے قریب موجودہ (ٹی بی ہسپتال) کے پاس اُنھیں سب سے موزون جگہ مل گئی۔ بڈشاہ کے سیکولر ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اُس کے دربار میں دو کشمیر پنڈت زونہ راجہ اور شری ور بڑے عہدوں پر فائز تھے، جواب بھی اپنی تحریروں کے سبب اُس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ کشمیری پنڈت اُسے اس لئے بھی پیار کرتے تھے کہ اُس نے تقریباً اُن تمام پنڈتوں کو بھارت کے مختلف علاقوں سے ڈھونڈ کر کشمیر لایا، جو سلطان سکندر بُت شکن (بڈشاہ کے والد) کی یلغار کے دوران یہاں سے فرار ہو چکے تھے، اُس کا ذاتی معالج شیودت اور عدلیہ کا ناظم شری بھٹ دونوں کشمیری پنڈت تھے، بڈشاہ نے وہ ساری پابندیاں اور قوانین ختم کردیئے جو اُس کے وزیر سہہ بٹ نے کشمیری پنڈتوں پر نافذ کرر کھے تھے، سُہہ بٹ کے اشارے پر منہدم کئے گئے منادر کو دوبارہ تعمیر کرایا گیا۔ پنڈتوں کو یقین دہانی کرائی گئی کہ اُن کے خلاف قانونی کاروائیاں اُن کے اپنے قوانین کے تحت ہی کی جائیں گی۔ گاؤکشی پر پابندی عائد کردی گئی۔ (جیسا کہ یہ اب تک ممنوع ہے) بڈشاہ نے کشمیری پنڈتوں کی مذہبی تعلیم کے لئے نہ صرف اندورن کشمیر مدرسے کھولے بلکہ اُنھیں کاشی اور دکن بھی حصول تعلیم کے لئے بھیجنے کا سرکاری انتظام کرایا۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بڈشاہ کے دور میں، اُسی کے کہنے پر ملّا احمد کشمیری نے ہندوؤں کی مقدس کتاب 'مہابھارت' کا فارسی ترجمہ کیا اور 1505ء میں شری ور نے 'یوسف زُلیخا' نامی کتاب کا سنسکرت میں ترجمہ کیا، اور فارسی کا جو نشہ کشمیری پنڈتوں پر بڈشاہ کے دور میں طاری ہوا تھا، اُس کا اثر رواں عسکری دور کے ابتداء تک اُن پر قائم تھا اور اکثر کشمیری پنڈت فارسی زبان وادب کے کہنہ مشق اُستاد ثابت ہوئے ہیں۔ تاریخی شواہد کے مطابق پہلے کشمیری پنڈت جنھوں نے کشمیر میں فارسی کی تعلیم حاصل کی، سپُر وگوتر سے تعلق رکھتے تھے اور یہی سُپر وشاعرِ علامہ اقبال کے آباواجداد بھی تھے!

تاریخ کے محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بڈ شاہ ایک مثالی فاتح تھا۔ اُس نے اپنے دور میں تقریباً پورے پنجاب کو کشمیر کے ساتھ ملا لیا تھا۔ جبکہ ہماچل پردیش کے کلو، کانگڑہ، لاہول اور مغربی تبت تک اُس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کی فوج نے جسرت خان کھوکھر کی کمان میں دہلی سلطنت پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی، پروفیسر میجر طارق اعوان کے مطابق یہ وہ دور تھا جب دہلی پر رضیہ سلطان کی حکومت تھی، جسرت کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ رضیہ کی فوجوں نے جسرت کا پیچھا پنجاب تک کیا اور اسی علاقے میں وہ کہیں لاپتہ ہوگیا لیکن نہ تو اُس کی لاش ہاتھ آئی اور نہ ہی وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوا (دی ہسٹری آف انڈیا اینڈ پاکستان، صفحہ نمبر ۳۴۸) بڈ شاہ نے اپنے دور حکومت میں قوانین کو ایک نئے اور عادلانہ انداز میں ترتیب دیا اور ٹیکسوں میں بھاری کمی کر کے عام لوگوں کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیئے، اُس نے اپنے خزانوں میں لداخ کی کانوں سے تانبہ اور دریاؤں سے سونے کا چورا حاصل کرنے سے بھاری اضافہ کیا۔ بڈ شاہ ایک پاکباز اور امن پسند انسان تھا۔ اُس نے اپنی دوسری شادی تاج خاتون نامی لڑکی سے کی کیونکہ بیوی ودھا خاتون سے اُس کی اولاد نہیں تھی۔ دونوں بیویاں سیدزادیاں تھیں۔ اُس نے اپنے سرداروں کی خوبصورت بیٹیوں کو بطور 'حرم' رکھنے سے انکار کر دیا تھا، دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ راجوری کے بادشاہ سُندر سین نے اپنی بیٹی راجیہ دیوی کو بڈ شاہ کے حرم میں بھیجا لیکن بڈ شاہ نے اسے 'ماں' کہہ کر پکارا، وہ یہیں مقیم رہی اور اسلام کے حلقے میں شامل ہوگئی، بڈ شاہ نے اُس کے نام سے پائین شہر میں راجوری کدل کے نام سے ایک پُل بنوایا اور آج بھی یہ علاقہ اسی نام سے موسوم ہے۔ سُندر سین نے اس کے بعد اپنی دوسری چھوٹی بیٹی سندرا دیوی کو بادشاہ کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجا۔ لیکن اس بار بڈ شاہ نے اُسے قبول کر کے شادی کر لی۔ اُس نے بڈ شاہ کے وارث آدم خان کو جنم دیا، سُندرا دیوی کو کشمیری عوام پیار سے 'سُندر ماجی' کے نام سے پکارتے تھے۔

سلطان زین العابدین بڈ شاہ غالباً پہلا اور آخری ایسا خود مختار کشمیری بادشاہ تھا[1] جس نے

---

[1] (یہ غلط ہے کہ بڈ شاہ کشمیر کا آخری خود مختار بادشاہ تھا، کشمیر کا آخری خود مختار بادشاہ سلطان محمد یعقوب (چک) بادشاہ غازی تھا، جو ۲۷ صفر المظفر ۹۹۴ ھ، مطابق فروری 1586ء کو تخت پر بیٹھا (بہارستانِ شاہی) مغلوں نے کشمیر کو غلام بنانے کیلئے ایک اور حملہ 28 جون 1586ء کو کیا۔ اُس وقت مغلوں نے کئی کشمیری امراء کو خرید لیا تھا، جن میں سید یوسف بیہقی، عالم شیر خان اور بہرام نائک سرِ فہرست تھے۔ بہرام نائک کی غداری کا تذکرہ سُوکا نے کیا ہے۔ بہارستانِ شاہی غداروں کی لسٹ میں اسماعیل نائک اور شنکی چارکو کا نام لیا گیا ہے۔ اس وقت مغلوں کی رہنمائی شیخ یعقوبِ صرفی اور چرادرشن چارکو کرتے رہے۔ کشمیری افواج نے شنکی اور شیخ یعقوب صرفی کو گرفتار کیا مگر سرپرستی میں رکھا (بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام رسول بٹ 1997ء صفحہ نمبر 135) اس کے بعد دل برداشتہ ہو کر سلطان کشتواڑ بھاگ گیا اور مغل افواج کشمیر میں داخل ہوئیں۔ سلطان یعقوب شاہ نے 23 جولائی 1589ء کو اکبر بادشاہ کے سامنے سرینڈر کیا، جس نے اس کو بہار جلاوطن کر دیا، جہاں وہ زہر سے 1593ء میں مارا گیا....ف م ح)

برصغیر کے متعدد حصوں کو کشمیر کی سلطنت میں شامل کر کے اُن پر حکومت کی۔ لیکن اُس کے دو بیٹے آدم خان اور حاجی خان آپس میں لڑتے رہے۔ بڈ شاہ نے اُنھیں منانے اور جھگڑے ختم کرنے کے لئے جتن کئے لیکن ناکام رہا۔ بالآخر اُس نے بڑے اور 'ناپسندیدہ' بیٹے آدم خان کو تبت کا علاقہ 'گنج' فتح کرنے اور چھوٹے مگر محبوب بیٹے حاجی خان کو لوہکوٹ 'پونچھ' فتح کرنے کے لئے روانہ کیا، دونوں اگر چہ فاتح ثابت ہوئے لیکن 'محبوب' بیٹے نے باپ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور ناپسندیدہ بیٹے آدم نے اپنے باپ کی مدد کی اور پالاشاہی 'بڈ گام' میں فریقین میں جم کر لڑائی ہوئی۔ آدم نے لڑائی تو جیت لی لیکن بطور منتظم کافی کمزور اور نااہل ثابت ہوا۔ بڈ شاہ نے اُسے سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی کافی کوشش کی لیکن آدم سدھرنے کے بجائے باپ کا دشمن بنتا چلا گیا۔ باپ بیٹے کے درمیان قطب الدین پورہ میں لڑائی ہوئی، اب کی بار حاجی خان نے باپ کی مدد کی اور میدان مار لیا۔ اس طرح جب بڈ شاہ کی وفات ہوئی تو حاجی خان اُس کا جانشین مقرر ہوا۔

☆☆☆

4

حضرت عیسیٰؑ اور وادیٔ کشمیر!

کشمیر کی یہ حسین وادی آج کی طرح ہر دور میں ایک جہنم زار نہیں تھی۔ آج کی طرح جنت نشان خطۂ زمین میں بارود کی فصلیں نہیں اُگتی تھیں۔ آج کی طرح یہاں سانسوں اور دھڑکنوں پر پابندی نہیں تھی اور نہ ہی آج کی طرح کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر سُن کر باہر کی دنیاء کے لوگ، خاص طور پر امن کے متلاشی اور خلوت کے متمنی سیلانی اپنی بھوئیں کھینچتے تھے۔ بلکہ یہ وہ سرزمین تھی جسے خاموشی، سکون اور خلوت وعبادت کے پرستار اپنے لئے جنت ارضی قرار دے کر اس کی گھنی زلفوں کے سائے میں زہدو تقویٰ کے اُن مراحل سے گُزر کر واپس آجاتے تھے، جہاں جانے کے بارے میں صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے، روحانیت اور تصوف کے اس مرکز ومسکن نے کتنے ہی عام اور سیدھے سادھے انسانوں کو اولیاء اللہ کے اعلیٰ وارفع درجات ومقامات پر فائز کر دیا، کتنے ہی بھولے، بھٹکے اور گمراہ مسافروں کے دلوں میں اس مقام پر آکر خوفِ الٰہی کی کونپل پھوٹی اور وہ انمول ثمرات سے بہرہ مند ہوگئے اور اس شمع کے کتنے پروانے ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے عشق ومستی سے چور ہو کر اسی کی آغوش میں پناہ لے لی اور انہی پروانوں کی محبت وجاں نثاری نے اس دُنیاوی جنت کو ''پیر واڑی'' (بزرگوں کی کھیتی) بنادیا، جہاں قرنوں قرنوں تک بزرگانِ دینِ مصطفوی کی ہری بھری فصلیں اُگتی رہیں اور جن کا فیض وکرم اب تک اس پر سایہ فگن ہے۔

کشمیر کی تاریخ جتنی قدیم اور عظیم ہے، اُتنی ہی منتشر اور متذبذب بھی ہے، تقریباً اڑھائی ہزار سال قبل مسیح یعنی اب سے تقریباً 5/ ہزار سال پہلے جب کسی شخص نے کشمیر کی تاریخ لکھنے کے لئے پہلی بار قلم اُٹھایا ہوگا تو اُس نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ آگے چل کر اُس کے پیشرو اپنے اپنے نظریات و عقائد، سیاسی وابستگیوں، مصلحتوں اور مجبوریوں کے جوروستم سے مجبور ہو کر اس مقدس کام کا حُلیہ اس قدر مسخ کر دیں گے کہ ایک دن ہر طرف دھُند ہی دھُند دکھائی دے گی۔ راقم کی نظروں سے کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے اب تک کوئی دو مصنّفین کی لکھی ہوئی ایسی کتابیں نہیں گُزری ہیں جن میں سے کسی ایک تاریخی واقعہ کو تقریباً تقریباً ایک جیسے پیرائے میں پیش کیا گیا ہو۔ کسی مورخ نے ایک پہلو پر زور دیا

تو کسی نے دوسرے پہلو پر۔ کسی کو کوئی بادشاہ نہایت عادل، منصف مزاج اور فقہیہ نظر آیا تو دوسرے نے اسی بادشاہ کی بُرائیاں بیان کر کے اُس کے گریبان کی دھجیاں اُڑا ڈالی ہیں اور تذبذب و اختلافِ تحریر کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

حال ہی میں سرینگر میں منعقدہ کتابی نمائش کے دوران ایک جرمن سیاح (روڈ گر بب) سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں اُس نے کہا ''میں کل خانیار علاقے میں حضرت عیسیٰؑ کی قبر کی زیارت کے لئے جانا چاہتا ہوں'' یہ سنسنی خیز انکشاف کہ حضرت عیسیٰؑ کی قبر سرینگر میں ہے، سن کر کان ہی نہیں بلکہ رونگٹھے بھی کھڑے ہو گئے۔ باتوں باتوں میں راز کھلا کہ جرمن سیاح جس درگاہ کو حضرت عیسیٰؑ کی قبر کہہ رہا تھا۔ وہ دراصل خانیار سے محض ایک سو میٹر کی دوری پر واقع روضہ بل کا آستان عالیہ ہے، جہاں حضرت یُوز آصفؒ، نصیرالدینؒ اور چند اولیائے کرام مدفون ہیں۔ یُوز آصفؒ یا پھر عیسیٰ ابن مریم؟ یہ سوال گزشتہ کئی دہائیوں سے کشمیر میں تاریخ کے طلباء و اُساتذہ کے لئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے اور اس حوالے سے کئی قد آور مورخین نے طبع آزمائی کی ہے۔ خاص طور پر جسٹس نذیر احمد کی کتاب Jesus, In hearen on Earth اور صحافی عزیز کشمیری کی کتاب مسیح کی کشمیر میں آمد'' اس تحقیقی سلسلے کی دو زبردست کتابیں ہیں۔ جن میں ایسے بے شمار دلائل پیش کئے گئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیریوں اور یہودیوں میں قریبی تعلقات رہے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہودیوں کے 13 رقبائل میں سے ایک قبیلہ، جس کی قیادت غالباً حضرت عیسیٰؑ کر رہے تھے، بھٹک کر کشمیر آ گیا اور یہاں آباد ہو گیا۔ یہ لوگ چونکہ چرواہے اور گڈر یئے تھے، اس لئے اپنے مویشیوں کو لے کر چارے اور ہریالی کیلئے میں سرسبز علاقوں کی تلاش میں گھومتے رہے۔ اسی سفر کے دوران وہ کشمیر آ گئے اور یہ ہری بھری وادی دیکھ کر اسے اپنا مسکن بنالیا۔ ان مورخین کے بے شمار دلائل میں وہ عادات اور رسمیں بھی شامل ہیں جو آج کل یہودیوں اور کشمیریوں کے درمیان مشترک ہیں۔ مثلاً کشمیری قصاب کا طریقہ کار، جانور ذبح کرنے اور دکان سجانے کا طریقہ، شیر فروش کا طریقۂ کار، کشمیری روٹی، قلچہ اور باقر خوانی بنانے کا طریقہ، مختلف زیارت گاہوں پر دُعا مانگنے اور آہ وزاری کرنے کی عادت، بعض حضرات کی خودغرضانہ فطرت، اپنے فائدے اور مطلب کے لئے دوسروں کی بدگوئی اور حق تلفی وغیرہ وغیرہ، مورخین نے کشمیریوں اور اسرائیلیوں کے خصائل و شمائل کا جو خاکہ اپنے تحقیقی کام میں شامل کیا ہے، اُسے دیکھ کر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے کہ لیکن جسم کے بلند ترین حصے میں مقیم، دل کا سب سے بڑا دشمن دماغ پل بھر کیلئے ٹھہرنے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ ان مورخین کی تحقیق کے تناظر میں کچھ سوال اُٹھتے ہیں،

جن کا جواب ملنا نہایت ضروری ہے، مثال کے طور پر پہلا سوال یہ ہے کہ اسرائیل اور کشمیر کے درمیان ہزاروں میل لمبی مسافت حائل ہے۔ بائبل کے ساتھ ساتھ قرآن شریف بھی اس بات پر متفق ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش اور وفات یروشلم (موجودہ اسرائیل) میں ہوئی۔ اُنھیں (یا پھر اُن کے ہم شکل کو) صلیب پر چڑھانے کا واقعہ بھی یروشلم میں (مسجدِ اقصیٰ کے آس پاس) پیش آیا۔ علاوہ ازیں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی تاریخ پڑھنے سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ صلیب مسیحیوں نے بطور تبرک مسجدِ اقصیٰ میں موجود رکھی تھی، جسے وہ فتحِ یروشلم کے بعد توڑ دینا چاہتے تھے لیکن جب انہوں نے ۱۱۸۷ء میں فلسطین پر قبضہ کیا اور مسجدِ اقصیٰ سے دیگر بدعات کو ہٹانا شروع کیا تو یہ صلیب بھی ۲ نومبر ۱۱۹۱ء کے دن عیسائیوں کو دے دی گئی۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰؑ کے ساتھ سارا معاملہ یروشلم میں ہی پیش آیا۔ لیکن قادیانی نظریہ یہ ہے کہ قرآن شریف فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر نہیں چڑھایا بلکہ اُسے ایک اعلیٰ اور بلند مرتبہ عطا فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ اُنھیں آسمان پر اپنے پاس نہیں بُلایا گیا بلکہ دنیا کی اونچی اور خوبصورت جگہ کشمیر میں بھیج دیا اور اسی لئے کشمیر کو جنت ارضی کہا جاتا ہے، یہ لوگ اپنے دعوے کی حمایت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی آخرالزمان حضرت محمد مصطفیٰ ؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب تھے اور اُن کی وفات کے بعد اُن کی قبر مبارک زمین پر موجود ہے اس لئے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو زمین پر چھوڑ دے اور کسی دوسرے پیغمبر کو آسمان پر بُلا لے، اس لئے قرآن شریف کی طرف سے (بقولِ ان کے) عیسیٰؑ کو بلند مرتبہ عطا کرنے کا مطلب ہے کہ اُنھیں کشمیر بھیج دیا گیا۔ لیکن اس تناظر میں کشمیر کی اُس تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ جس تاریخ میں حضرتِ مسیح کا واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ آج سے تقریباً 1973 سال پُرانا ہے۔ کیونکہ اس پر سبھی متفق ہیں کہ عیسیٰؑ کی وفات صرف 36 سال کی عمر میں واقع ہوئی تھی جس حساب سے اس واقعہ کو آج تقریباً1973 برس گزر چکے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب کشمیر میں موریہ خاندان کی حکومت تھی اور اس زمانے کے سبھی حالات کلہن پنڈت کی راج ترنگنی میں درج ہیں لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ جس زمانے کے بادشاہوں کے ایامِ حکومت کا اتنا باریکی سے حساب رکھا گیا ہو اور دن، مہینے اور سال کا شمار کیا گیا ہے، اُس زمانے میں حضرت عیسیٰ جیسی برگزیدہ شخصیت اپنے قبیلے کے ہمراہ کشمیر میں داخل ہوگئی اور مورخین کی نگاہ سے بچ گئی، دوم...اگر مسیح زندہ کشمیر میں داخل ہوئے اور یہیں اُن کی قبر بھی موجود ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ 'صلیب' کا واقعہ بھی کشمیر میں ہی پیش آیا۔! اس خیال کی اگرچہ اسلام میں کوئی گنجائش موجود نہیں لیکن اگر عیسائی اسے تسلیم کرتے ہیں تو پھر اُنھیں بائبل میں مزید تصحیح کر کے کشمیر کو

یروشلم تسلیم کرنا ہوگا یا پھر یروشلم پر اپنا دعویٰ ختم کر کے کشمیر کو عیسیٰؑ کا وطن ماننا ہوگا۔اور یہ دونوں باتیں فی الحال بعید از قیاس دکھائی دے رہی ہیں۔رام پور اُتر پردیش کے ایک سرکردہ مفکر اور عالمِ دین مولیٰنا شمس نوید عثمانی اپنی کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' میں بھارت کو پیغمبروں کا وطن قرار دیتے ہوئے ویدوں اور قرآن شریف کی آیات کے تقابلی حوالہ جات سے ثابت کرتے ہیں کہ جب حضرتِ آدم علیہ السلام کو خلد سے نکلنا پڑا تو اماں حوّا کے ہمراہ اُنھیں (سراندیپ) سری لنکا کے ایک پہاڑ پر اُتار دیا گیا، جہاں آج بھی اُن کے قدم کا نشان موجود ہے۔عربی مورخین بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ آدمؑ کو سراندیپ کی چوٹی پر اُتارا گیا جو سری لنکا میں موجود ہے۔اسی کتاب میں شمس نوید عثمانی حضرت عیسیٰ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ لداخ کے ایک بودھ گھُمپا میں کچھ عرصہ ٹھہرے جہاں انہوں نے ایک بودھ گرنتھ کا مطالعہ کیا، اس کے بعد وہ پہلگام کے راستے کشمیر میں داخل ہوئے اور چونکہ وہ بھیڑ بکریاں چراتے تھے اور کچھ عرصہ پہلگام میں قیام کیا اس لئے گڈریوں کی مناسبت سے اس علاقے کا نام پہلگام پڑ گیا۔اس جگہ سے آگے چل کر وہ موجودہ عیش مقام پہنچے اور اس جگہ کا قدیم نام عیسیٰ مقام تھا، جو بدل کر عیش مقام ہوگیا، سرکردہ محقق پرویز دیوان اس سلسلے کو عزیز کشمیری کے حوالہ جات سے یوں آگے بڑھاتے ہیں۔

''عیش مقام سے چل کر سرینگر کے راستے ابنِ مریمؑ واپس چلے تو ریاست کے آخری سرے پر اُن کے قیام کی وجہ سے ایک اور بلند، صحت افزاء مقام 'مری' میں رُکے اور یہ مری دراصل 'میری' تھا جس کا مطلب مریمؑ ہے۔اُن کا اگلا پڑاؤ ایبٹ آباد تھا، جو کہ عیسیٰؑ سے منسوب ہے۔یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پوری کہانی میں ابنِ مریم کی واپسی کا ذکر ہو رہا ہے، آمد، قیام یا وفات کا نہیں....ظاہر ہے یہ ساری کہانی کسی قدیم متھ کی بنیاد پر قائم ہے۔اُدھر مولانا عثمانی ایک جگہ مزید لکھتے ہیں کہ سادھوؤں کے ایک گروہ نے ہمالیائی خطے میں ایک گورے چٹے، خوبصورت، اور جوان، سفید پوش شخص کو دیکھا جس کی عمر 35 یا 36 سال کے آس پاس تھی۔سادھوؤں نے اس نوجوان راہب سے بات کی تو اُس نے بتایا کہ میں علم حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلا تھا اور اب واپس جا رہا ہوں۔اُدھر حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے چند سال ایسے بھی گزرے ہیں، جن کے حال و احوال کے صفحات خالی ہیں۔محقق اور مورخین مانتے ہیں کہ عیسیٰؑ ان برسوں میں خاموشی سے کہیں چلے گئے اور غار و کوہ میں عبادت کرنے کے بعد واپس آ گئے۔اگر سادھوؤں سے ہمالیائی چوٹیوں میں ملاقی ہونے والے سفید ریش نوجوان کو عیسیٰؑ سمجھ لیا جائے تو یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ حصولِ علم کے بعد واپس اپنے وطن لوٹ رہے تھے اور ممکن

ہے کہ یہی وہ زمانہ ہو جب ان کے بارے میں تاریخ کے اوراق خالی پڑے ہیں لیکن چونکہ مورخین اس خلاء کے بعد واقعات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں اس لئے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ کی وفات کشمیر میں ہوئی اور وہ یہیں مدفون بھی ہوئے (عیسوی تصور کے مطابق) لیکن یہاں یہ بات بھی ثابت آتی ہے کہ جب عیسیٰؑ کی (ظاہری) وفات ہوئی تو کشمیر میں موریہ دورِ حکومت تھا اور ان دنوں کسی کو دفن کرنے یا اس کی قبر محفوظ کرنے کا کشمیر میں کوئی رواج نہیں تھا، اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ قبر مختلف ادوار میں خصوصی طور حکومتوں کی توجہ کا مرکز رہی ہوتی اور اس حوالے سے آج اتنا تذبذب نہ ہوتا یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ بھارت اور کشمیر میں عیسائیت کی آمد کے بعد اس جگہ پر کوئی عالیشان عیسائی گرجا گھر تعمیر کر کے اس کنفیوژن کو سرے سے ہی ختم کر دیا گیا ہوتا اور پھر اس کے بعد مسلم دور کے بادشاہوں نے اس طرف اور بھی زیادہ توجہ دی ہوتی اور آج محققین کو اس حوالے سے مغز ماری نہ کرنا پڑتی۔ البتہ جہاں تک روضہ بل کی درج اور دستیاب تاریخ کا تعلق ہے تو اس کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ درگاہ شہمیری سلاطین کے دورِ حکومت (1346 تا 1551ء) سے زیادہ پرانی نہیں ہے اور چونکہ زین العابدین بڈشاہ کے دور میں دنیا کے مختلف ممالک سے لاتعداد اور عظیم المرتبہ علمائے دین، مشائخ، کاریگر، اساتذہ، اور اولیائے کرام کشمیر تشریف لائے یا پھر بہتوں کو بڈشاہ نے کشمیریوں کی دینی اور فنی تعلیم و تربیت کے لئے یہاں مدعو کیا تھا لہٰذا ممکن ہے کہ ان ہی بزرگوں میں کسی ایک کو اس جگہ دفن کر دیا گیا ہو۔

''تاریخ کشمیر'' کے مصنف محمد الدین فوقؔ بڈشاہ کے زمانے کے جن برگزیدہ مشائخ و علماء کا ذکر کرتے ہیں، ان میں سے سید حسین منطقی خراساں سے آئے تھے، سید محمد عالی بلخی، بلخ (بخارا) کے بادشاہ تھے، ایک دن دل کی دنیا بدل گئی، اپنا تخت و تاج چھوڑ کر یادِ خدا کے لئے نکل پڑے اور کشمیر پہنچ گئے، سید جانباز ولیؒ (کپواڑہ) اصفہان سے آئے، سید برخوردار میر شمس الدین اندرابیؒ (لولابی) اندراب سے آئے تھے، شیخ بہاؤالدین گنج بخشؒ حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کے ہم صحبت اور ہم عصر تھے، ملاء احمد کشمیریؒ بھی اسی دور میں گزرے ہیں، حافظ بغدادیؒ بغداد سے یہاں آئے تھے، قاضی جمال الدین ہندوستان سے آئے تھے، حضرت قاضی میر علی بخاریؒ بخارا سے آئے تھے، مولانا کبیرؒ سلطان زین العابدین کے استاد تھے، ملاء عود خراسان سے آئے تھے، ملاء جمیل نامی سخنور بھی اسی زمانے میں گزرے ہیں جبکہ اس کے علاوہ سومناتھ، بودی بٹ، پنڈت زوُنہ راجہ، شر یور وغیرہ بھی بڈشاہی دور کے اعلیٰ پایہ کے لوگوں میں شامل تھے۔ محمد الدین فوقؔ اگرچہ یوزآصف نامی کسی بزرگ کا تذکرہ نہیں کرتے

تاہم پرویز دیوان اپنی کتاب(Pervez dewan's Kashmir) میں صفحہ نمبر 43پر رقمطراز ہیں:

''بڈ شاہ ایک عظیم بادشاہ تھا، وہ نتائج کا حامی تھا، اس نے وسطی ایشیاء سے کئی بزرگوں اور مفکرین کو کشمیر مدعو کیا اور انہی میں یوزا آصف نامی مفکر، جو کہ بڈ شاہ کا قاضی القضاء (چیف جسٹس) تھا، بھی شامل تھا۔ بھارت، پاکستان، اسرائیل اور یوروپی مورخین کا خیال ہے کہ یوزا آصف ہی دراصل یسوع مسیح تھے یوزا آصف کے بارے میں کچھ مورخین کا خیال ہے کہ وہ مصری باشندہ تھا، جبکہ بعض کے مطابق وہ ترکی سے آیا تھا، اگر چہ کی اس کی جائے پیدائش اور وطن کے بارے میں مختلف مورخین کے ہاں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کے ایک اعلیٰ پایہ اور متقی و پرہیزگار بزرگ ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں...اس لئے عین ممکن ہے کہ روضہ بل میں اسی بزرگ کو سپرد خاک کیا گیا ہو جبکہ آستانِ عالیہ کے باہر انگریزی حروف میں ایک بڑا سا بورڈ بھی نصب ہے، جس پر لکھا گیا ہے کہ یہاں زیارتِ حضرتِ یوزا آصفؒ ہے، اس کے علاوہ اس جگہ حضرت سید نصیرالدینؒ بھی مدفون ہیں، بورڈ پر واضح الفاظ میں درج ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰؑ کی قبر نہیں ہے''

(پروفیسر فدا محمد حسنین نے اکتوبر2010 ء میں راقم کو ایک ملاقات کے دوران بتایا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کے چھوٹے صاحبزادے طارق عبداللہ کے زمانے میں، جب وہ ڈائریکٹر ٹورازم تھے، سوئزر لینڈ کا ایک محقق یہاں آیا، طارق عبداللہ نے مجھے نیڈوز ہوٹل میں بلایا اور کہا کہ ان کے ساتھ روضہ بل جاؤ اور ان کی وہاں کچھ مدد کرو، ان کے پاس ایک ایسا Aparatus (مشین) تھی، جس سے زمین کے اندر کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ روضہ بل میں اصل قبر زمین کے نیچے ہے اور اس کے اوپر کا حصہ بند ہے اس لئے زمین کے نیچے کا حال معلوم کرنے کے لئے اس جدید ترین مشین کو استعمال کرنے کے لئے انگریز نے وہاں ایک چھوٹا سا سوراخ کیا اور اس میں ایک تار ڈال دیا تا کہ زمین کے اندر کی تصویر لی جا سکے، لیکن اس سے قبل ہم روضہ بل میں ایک مجاور سے ملے تھے اور اس سے کہا تھا کہ ہم اندر کی تصویر لینا چاہتے ہیں، اس نے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی تصویر نہیں آئے گی، اس کے بعد اس مغربی محقق نے کئی بار کوشش کی، تصویر لینے کے جتن کئے اور اپنی مشین ساتھ لے کر واپس سوئزر لینڈ چلا گیا، وہاں جا کر جب اس نے اس کیمرے میں لگی فلم کو Develop کیا تو اس نے مجھے فون کر کے بتایا "It is

"all black...we did not succeed (یہ سب کالی فلم ہےاور ہم کامیاب نہیں ہوئے)
پرویز دیوان بھی اپنی کتاب ''کشمیر'' کے باب "Christ in Kashmir & Ladakh" میں اس حوالے سے کافی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور عیسیٰؑ کے وارد کشمیر اور لداخ ہونے کے حوالے سے کئی دلائل پیش کرتے ہیں، انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب اس جگہ پر عیسیٰؑ کی قبر ہونے کی خبر مغربی دنیا میں پھیلی تو سائنسدانوں کا ایک وفد ''کشف القبور'' Discovery of the graves کی جدید ترین مشین لے کر سرینگر آیا لیکن وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکا کیونکہ وہ اس مشینری کو لے کر جتنی مرتبہ بھی زیارتِ شریف کے قریب گئے، اتنی ہی مرتبہ مشین نے کام کرنا چھوڑ دیا لیکن جب وہ اسے وہاں سے باہر لے کر گئے تو یہ پھر سے کام کرنے لگی'' پرویز نے اس حوالے سے اتنا لکھا ہے کہ اس پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک پوری کتاب لکھنا پڑے گی، لیکن ابھی ''پکار'' میں اتنے صفحات نہیں ہیں کہ اس تشنگی کی تشفی ہو سکے، تاہم بیسویں صدی کے کشمیری مورخ ڈاکٹر صوفی اس حوالے سے رقمطراز ہیں کہ یوزا آصف نامی ایک بزرگ مصر سے آئے، وہ حضرتِ موسیٰؑ کی اولاد میں سے تھے اور بڈشاہ زین العابدین کے دربار میں بطور جج تعینات تھے (بحوالہ پرویز دیوان صفحہ نمبر ۴۵۱) لیکن اس حوالے سے پہلا انکشاف کرنے والے سید نصیر الدین بہقی کا کہنا ہے کہ یوزا آصف ایک پیغمبر تھے اور کئی صدیاں قبل اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، دلچسپ بات یہ ہے کہ خود نصیر الدین بہقی بھی اسی درگاہ میں یوزا آصف کے ساتھ مدفون ہیں، اس زیارت شریف کا تذکرہ 'تاریخِ حسن' میں بھی موجود ہے اور حسن کا ماننا ہے کہ حضرت یوزا آصف کے بارے میں شنکر آچاریہ (کوہِ سلیمان) کے پاس ایک کتبہ موجود تھا لیکن سکھ دور میں دوسری کئی اہم نوادرات کے ساتھ اسے بھی مٹا دیا گیا''۔

بزرگ صحافی اور محقق عزیز کشمیری پندرہویں صدی کے مورخ ملاء نادری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ دیواری کتبہ راجہ گوپادتہ کے دورِ حکومت میں موجود تھا، جب کوہ سلیمان پر موجود اس کتبے کی جگہ موجود اس کا مندر زمین میں دھنس گیا تو راجہ نے فارس سے آئے ایک معمار سلیمان کو اس مندر کی مرمت کے لئے تعینات کیا، جب وہ مندر کے کلس پر چڑھنے لگا تو ہندوؤں نے اعتراض اُٹھایا کہ دوسرے مذہب کا ماننے والا مندر کے اوپر نہیں چڑھ سکتا لیکن اسی دوران بیت المقدس سے آنے والے حضرت یوزا آصف وارد کشمیر ہوئے اور انہوں نے پیغمبری کا اعلان کیا، انہوں نے سلیمان کو حکم دیا اور اس نے اس مندر کا کام سن 54 میں مکمل کیا، تاہم یہ سن کس کلینڈر کے مطابق تھا، یہ پتہ نہیں چلتا۔

تاہم اس سلسلے میں فدا محمد حسنین کا ماننا ہے ''عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ Jesus

Christ خدا کا بیٹا ہے۔ جس نے صلیب پر جان دے کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کیا، جو دفنایا گیا اور دوسرے دن قبر سے غائب ہوگیا۔ اس کے بعد اپنے حواریوں سے کئی بار ملا اور پھر آسمان کی طرف اڑ گیا جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوا، وہ نہ تو صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ ہی مارا گیا، بلکہ اسے خداوند کریم نے اپنی جانب بلا لیا اور وہ روزِ قیامت سے پہلے پھر سے نمودار ہوگا...صاف ظاہر ہے کہ مذہبی نکتۂ نگاہ سے روضہ بل پر کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر تحقیق مطلوب ہے تو مذہبی دائرہ سے باہر نکل کر کرنی ہوگی۔(ا) سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کشمیر کو حضرتِ عیسیٰ کے ساتھ کس نے ملا لیا؟...صاف ظاہر ہے کہ سوکا پنڈت نے بھوشیہ مہا پوران 115ء سے لکھنا شروع کیا، اس میں اس نے کشمیر کے راجہ شالی دامن سے ایک عظیم الشان شخص سے باتیں کرتے ہوئے بتایا ہے، جس نے اپنے آپ کو ''ایشوراپُترم'' (خدا کا بیٹا) اور ''کنیا گربھم'' (کنواری ماں سے پیدا شدہ) بتاتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ اس کو اپنی قوم نے تکلیف دی اور وہ ''ایسا ماسی'' (عیسیٰ مسیح) ہے۔ بھوشیہ پوران ہندوؤں کا اٹھارہواں پوران ہے۔، جو مہاراجہ کشمیر کی ملکیت تھا، جس نے اس کو بھنڈارکر انسٹیچیوٹ پونا سے چھپوایا، یہ سنسکرت اور شاردا لیپی (رسم الخط) میں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ ہندوؤں نے ظاہر کیا ہے، اس لئے اگر اس کو کسی مذہب یا فرقہ سے جوڑا جائے تو ہم کوئی تحقیق نہیں کرسکیں گے(۲) یوسو مسیح کا ذکر تبتی اور چینی مخطوطات میں بھی ہے اور فارسی مخطوطات میں بھی۔ کشمیری مورخ ملا نادری نے صاف طور پر لکھا ہے کہ یوزا آصف دراصل حضرت مسیح تھا، جو کشمیر پر نازل ہوا اور روضہ بل میں ہی مدفون ہے۔(۳) سکے Nunswati میں پہلی صدی میں بدھ کونسل کے وقت Kanshika نے جو Coins جاری کئے تھے، ان میں ایک کوئن پر Yuzh کندہ ہے (۴) تختِ سلیمان کے ایک کتبے پر درج ہے کہ اس کھنبے کی زینت کے لئے 'ایلی کوف مرجان یا ایلی کم، مرجان کا بیٹا' صاف ظاہر ہے کہ مرجان ایک کشمیرن تھی، جس کے بارے میں مرحوم بشارت سلیم، جو خود کو یوزا آصف کی نسل سے کہتے تھے کہ یوزا آصف نے مرجان سے شادی کی تھی۔ (۴) خواجہ محمد اعظم دیدمری تاریخ واقعاتِ کشمیر میں لکھتے ہیں: ترجمہ: ''حضرت سید نصیرالدین خانیاریؒ کا مقبرہ محلّہ خانیار میں ہے، یہ مقبرہ انوارِ فیض دستگاہ ہے، ان کے قریب ہی ایک لوحِ مزار ہے، عوام میں مشہور ہے کہ اس جگہ ایک پیغمبر آسودہ ہے، جو قدیم زمانے میں کشمیر میں مبعوث ہوا تھا، یہ جگہ ''مقامِ پیغمبرؑ'' کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخ کی کتاب میں ایک حکایت نظر سے گزری، جس میں کہا گیا ہے کہ ایک سلطان زادہ زہد و تقویٰ کا شیوہ اختیار کر گیا، اس نے بہت زیادہ ریاضت کی اور عبادت میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، جس کے نتیجے میں وہ کشمیر کے لوگوں پر

مبعوث ہوا، وہ کشمیر آیا اور لوگوں کی ہدایت میں مصروف ہو گیا وفات کے بعد وہ محلّہ انزمرہ (انزی مرہ) میں دفن کیا گیا۔ مذکورہ کتاب میں اس پیغمبر کا نام ''یوزا آصف'' لکھا گیا ہے، انزمرہ خانیار سے متصل واقع ہے۔ اکثر اصحابِ کمال، خصوصاً راقم کے مرشد حضرت ملا عنایت اللہ شال فرمایا کرتے تھے کہ زیارت کے وقت اس مکان سے نبوت کے فیض و برکات ظاہر ہوتے ہیں، والعلم عنداللہ...(واقعاتِ کشمیر، محمد اعظم دیدمری، اردو ترجمہ ظہور شہداد اظہر صفحہ نمبر..189-188)، ان حوالہ جات سے صاف ظاہر ہے کہ روضہ بل میں کوئی پیغمبر ہی مدفون و آسودہ ہے، اس لئے یہ ریسرچ ہونی چاہیے کہ اس جگہ کون پیغمبر مدفون ہے، جو کشمیریوں پر نازل ہوا (۵) روضہ بل کی درگاہ کے اندر ایک پتھر ہے، جس پر پیروں کے نشان ہیں اور دونوں پیروں میں زخموں کے نشان ظاہر ہیں۔ کیا یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں زخموں کے نشان کیا ظاہر کررہے ہیں۔؟ ہوسکتا ہے کہ یسوع مسیح کے پیروں میں صلیب پر کیلیں گاڑھی گئی ہوں... یوزا آصف کون ہے؟ اس پر تحقیق ہونی چاہیے کیوں کہ یہ مسلم نام نہیں بلکہ عبرانی نام ہے''

یوزا آصف یا عیسیٰ مسیحؑ ...؟ خانیار کے قریب واقع روضہ بل کے آستانِ عالیہ میں کون دفن ہے؟ اس سوال کا جواب بھی وہی ہے کہ پہلے مرغی آئی یا انڈا؟ لیکن جو بات سب سے دلچسپ ہے، وہ یہ ہے کہ اس مقام پر جو بھی ہستی آرام فرما ہے، وہ بہت ہی اعلیٰ پایہ اور عظیم المرتبہ ہے اور اسلام کا یہ نظریہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر علاقے میں وقتاً فوقتاً اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے تا کہ گمراہ لوگوں کو راہِ راست پر لایا جاسکے اس لئے ہوسکتا ہے کہ روضہ بل کی اس زیارت گاہ کے اندر موجود قبرستان میں بھی انہی پیغمبروں میں سے کوئی مدفون ہو، یہاں یہ بات بھی کافی دلچسپ ہے کہ کہ مذکورہ قبر کافی بڑی ہے لہذا اس کے اندر جو کوئی بھی ہستی موجود ہے، وہ بھی یقیناً کافی برگزیدہ اور اعلیٰ پایہ ہوگی، اس حوالے سے تحقیق اور تلاش کے دروازے کھلے ہیں اور کوئی نہ کوئی وقت ضرور ایسا آئے گا جب یہ گتھی سلجھ جائے گی...ویسے بھی اگر اللہ کے راز اللہ تک ہی محدود رہیں تو زیادہ بہتر ہے..........

5

مغلوں کی آمد۔بیرونی غلامی کا آغاز

تاریخِ کشمیر میں ملنے والے پہلے بادشاہ راجہ گوننداجس نے اندازاًجنگِ مہابھارت سے تقریباً 20/برس قبل کشمیر پر حکومت کی سے لے کر یوسف شاہ چک کے زمانہ(1589ء) تک یہ وادی ایک آزاد،خودمختار،مضبوط اور مربوط ریاست تھی۔اس عرصہ(تقریباً ساڑھے چار ہزار سال) کے دوران اس ریاست میں ایسے ادوار بھی آئے جب یہاں کے بادشاہوں نے حملے کر کے وسطی ایشیاء،تبت، قندھار اور دلی تک کے علاقہ جات کو فتح کیا اور ان علاقوں کو اس ریاست کا حصہ بنایا لیکن چک دور میں وقت کے حکمرانوں کی بدگمانیاں،بدمستیاں اور بے راہ روئیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ مذہبی علماء،قائدین اور صوفیائے کرام کو مجبوراً ایک فیصلہ لینا پڑا جس کی وجہ سے عوام کا مال و جان اور علمائے کرام کی قتل و غارتگری رُک گئی،صورتحال تبدیل ہوگئی اور عوام کی مفلوک الحالی بھی تھم گئی لیکن یہ خطۂ اراضی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بیرونی تسلطُ میں چلا گیا۔چکوں کے خاتمے کے بعد مغلوں نے پیر پنجال کے راستے دستک دی، مغلوں کا زوال ہوا تو دُرانیوں (افغانوں) نے دروازہ توڑ کر داخلہ لے لیا۔اُن کے زوال کے بعد سکھوں کی یلغار ہوئی،وہ جاتے جاتے انگریزوں کو زمین کے ساتھ ساتھ عوام بھی فروخت کر گئے، انگریزوں نے ڈوگروں کو پورا کشمیر بطورِ نذرانہ عنایت فرمادیا اور ڈوگرہ جاتے جاتے یہ تحفہ بھارت کو بخش گئے۔لیکن اِس بار یہ ریاست اتنے ٹکڑوں میں بٹ گئی کہ اس کا دوبارہ جُڑ پانا ناممکن ہوگیا۔

مذکورہ بالا ادوار تاریخ کشمیر کے ایسے مدوجذر ہیں،جن کی وجہ سے اس چھوٹی سی بستی کے باشندوں کا جسم،روُح،ضمیر،غیرت اور پورے کا پورا وجود تہ وبالا ہوکر رہ گیا۔مسلسل غلامی،مختلف اقوام کے مظالم،اندرونی بدحالی اور غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے ان(500) پانچ سو برسوں کے دوران کشمیریوں کے دِل ودماغ کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی اور شاید ہی تاریخ میں ایسی کوئی دوسری قوم رہی ہوگی جس نے اتنے چھوٹے عرصے میں اس قدر زیادہ اور سخت مظالم سہے اور دیکھے ہوں گے!!

اگرچہ مغل شہنشاہوں نے پہلے بھی کئی بار کشمیر کے خواب دیکھے تھے اور اس جنتِ اراضی کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے منصوبے تیار کئے تھے لیکن کبھی غم دوراں نے اُن کا ساتھ نہ دیا اور کبھی غم

جاناں رکاوٹ بنا رہا۔لیکن چک دور میں ایک طرف مغلوں کی حسرت اور ہوس نے کچھ اُس طرح سَر اُٹھایا کہ اُنہوں نے اپنے منصوبے کو حتمی شکل دینے کا پکا ارادہ کرلیا اور دوسری جانب چکوں پر بدگمانی اور گمراہی کا ایسا نشہ طاری ہوا کہ پہلے خود یوسف شاہ چک از خود اکبر کے دربار میں حاضر ہوگیا اور اپنے بہنوی سید مبارک بیہقی کے علاوہ چچا زاد لوھر چک کے خلاف شکایت کر کے اُن سے اپنی سلطنت کے حصول کے لئے امداد کی درخواست کی۔اکبر نے یوسف شاہ چک کے وطن کشمیر کو"اپنا باغِ خاص" کہہ کر یاد کیا اور یوسف کو بادشاہ کشمیر کی بجائے'یوسف خان' کے نام سے مخاطب کیا۔اِس کے بعد یوسف واپس آیا۔راستے میں اس نے سیاسی چال چل کر مغل فوج کو دھوکہ دے دیا۔یوسف کو راستے میں ہی مغل افواج پر شُبہہ ہوگیا تھا کہ اُن کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔اس لئے آگرہ سے سرینگر آتے ہوئے اُس نے مغل سپہ کو دھوکہ دے دیا اور اپنے بل بوتے پر کشمیر کو دوبارہ حاصل کرلیا۔یوسف کو اگرچہ سلطنت ایک بار پھر واپس مل گئی تھی لیکن ماضی کے تھپیڑوں سے اُس نے کچھ نہ سیکھا اور اُس کے درباری پھر سے فرقہ وارانہ سازشوں اور ظلم وستم میں مصروف ہوگئے۔حالانکہ اپنے دوسرے دورِ حکومت (1580-1586) کے دوران اُس نے انتظامی سطح پر بہت کچھ سیکھا لیکن وہ اپنے حکام اور درباریوں کو نہ سُدھار سکا۔

کشمیر کے اطراف واکناف اور شہر و دیہات میں چکوں کے عوام دشمانہ مظالم اور فرقہ ورانہ تشدد کے واقعات جب حد سے بڑھ گئے اور اب چکوں نے علماء تک کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع کردیا تو چارو نا چار ولایتِ کشمیر کے اعلیٰ منصب پر فائز سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ نے اس کا سدِ باب کرنے کیلئے صوفیائے کشمیر کو غور وخوض کیلئے طلب کیا اور طے پایا کہ علماء اور صوفیائے کرام پر مشتمل ایک وفد اکبر کے پاس بھیجا جائے اور شہنشاہِ ہند سے فوری امداد طلب کی جائے۔فیصلے کی رُو سے حضرت بابا داود خاکیؒ اور حضرت شیخ یعقوف صرفیؒ کی قیادت میں کشمیری علماء اور عمائدین کا ایک وفد آگرہ روانہ ہوگیا۔پرویز دیوان کے مطابق سفیروں کے اس وفد میں جو لوگ شامل تھے،اُن میں ایک سرکردہ شعیہ رہنماء بابا خلیل اللہ کے علاوہ سُنی عمائدین ابراہیم خان اور عبدالمانی بیہقی شامل تھے۔اِن میں سے بابا داوُد خاکی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کا کہنا تھا کہ علی شاہ چک اور یوسف شاہ چک کے دور میں سُنی مسلمانوں کو زیادہ پریشانی نہیں تھی لیکن یعقوب شاہ چک کو اِن کے ساتھ خدا واسطے کا بیر تھا جبکہ وہ ہندووں (پنڈتوں) کا بھی ازلی عدو تھا۔خاکی اور صرفیؒ نہ صرف یوسف شاہ چک کی وجہ سے پریشان تھے بلکہ اُن سُنی عمائدین سے بھی خفا تھے جو یوسف کے ساتھ مخاصمت پر آمادہ تھے اور وہ صرف یہی چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح یہاں امن قائم ہوجائے،اس کے لئے پہلے انہوں نے مقامی طور بے شمار

کوششیں کیں لیکن ہرکوشش ناکام ہوگئی ۔(پریز دیوان" کشمیر"The rage of Page 56 sages)لیکن پروفیسر فدامحمد حسنین اس دلیل کونہیں مانتے ،ان کا کہنا ہے کہ حضرت شیخ حمزہ مخدوم کے اس اقدام کے بارے میں کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔وہ حضرت باباداؤدخاکیؒ سے منسوب اس بات کوبھی نہں مانتے کہ انہوں نے مغل افواج کی قیادت کی تھی ،بقولِ ان کے باباداؤدخاکیؒ کی وفات ۳ ماہ صفر۹۹۴ھ بمطابق 1586ء میں ہوئی ،جبکہ اکبر کی فوج نے ۲ کارتک ۵۰۹ شا کا1583ء میں سرینگر پر قبضہ کیا۔ تاہم اس حوالہ سے واقعاتِ کشمیر(محمداعظم دیدمری) میں یوں درج ہے: " قاضی موسیٰ کی شہادت کے بعد شہر کے لوگ یعقوب شاہ سے متنفر اور دل برداشتہ ہوئے۔اکثر بزرگ اس شہر سے کوچ کر گئے ،جبکہ جامع کمالات شیخ یعقوب صرفیؒ ،دیگر اکابر،رؤساء وفقراٗ اکبر بادشاہ کوآمادہ کرنے چلے گئے حضرت باباداؤدخاکیؒ اپنے پیروں کی زیارت کے لئے ملتان چلے گئے ،ادھر حضرت شیخ وغیرہ نے دلی پہنچ کر بادشاہ کے ارکانِ سلطنت کوفتح کشمیر کی بشارت دی اور باہم عہدو پیمان طے پائے ، ان میں سے کچھ اس طرح ہیں:

☆مذہب اور غلے کے معاملات میں حکام کی طرف سے کوئی انحراف نہ ہو

☆کنیز اور غلام کشمیر کے لوگوں سے نہ لئے جائیں۔

☆روزگار کے وسائل پیدا کر کے کشمیریوں کوروزگار فراہم کیا جائے۔

☆کشمیریوں کی خوشحالی کا خیال رکھا جائے۔

☆ملکی امور میں طاقت واقتداران کو نہ دیا جائے ،وغیرہ وغیرہ

ان عہدو پیمان کے بعد اکبر بادشاہ کے آدمی عزم و جزم کے ساتھ کشمیر کی تسخیر میں منہمک ہوگئے ،"جس کی تفصیل آگے آئے گی....(واقعاتِ کشمیر،محمداعظم دیدمریؔ،اردوترجمہ پروفیسر ظہور شہداد اظہرؔ،صفحہ نمبر222-223)

اسی کتاب کے اگلے صفحات میں یہ تحریر بھی درج ہے:"یہ بات ظاہر ہے کہ اس گڑ بڑ ،فتنہ و فساد اور خوف ورجاء کے عالم میں اکبر بادشاہ کی طرف سے محمد قاسم خان ،میر بحرتیس ہزار سواروں کے ساتھ راجور(راجوری)کے راستے سے نمودار ہوا،امرائے کشمیر میں سے حیدر چک ولد یوسف چک اور دیگر بزرگ اور مشائخ بالخصوص جناب جامع الکمالات ،مظہرِ آیات وبینات قدوۃالواصلین،حضرت شیخ الیشان یعقوب صرفی قدس سرہٗ ولد خواجہ حسن گنائی ،جوحرمین شریف سے واپس تشریف لا چکے تھے ،نے قاسم خان کی رہنمائی کی ،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے تک یعقوب چک کومتلق خبر نہ ہوئی ،

جب اسے معلوم ہوا تو وہ زبردست لشکر لے کر ہیر پورہ چلا آیا، راستے میں بے حد تعصب اور سخت رویے کے خلاف بہت سے فوجی قاسم خان کے ساتھ آ ملے۔ یعقوب چک نے جب اپنی بساط الٹی دیکھی تو وہ کشتواڑ کی طرف دم دبا کر بھاگ نکلا....دوسرے دن مغل لشکر بیرام گلہ پہنچا، اور وہاں سے قاسم خان نے حضرت شیخ یعقوب صرفی اور ندو جی تواجی کو، جو عمدہ کارکنوں میں شامل تھا، لشکر کے ہمراہ کر دیا تاکہ آگے جا کر سرینگر پر قبضہ کریں...." (صفحہ نمبر 224 واقعات کشمیر اردو، گلشن پبلشرز سرینگر)

مغلوں نے پہلا حملہ کیا اور پیر پنچال کے راستے کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن برفباری کی وجہ سے کشمیر میں داخل نہ ہو سکے، تاہم اس حملے کی وجہ سے چکوں میں کافی کھلبلی مچ گئی۔ اس وجہ سے یوسف شاہ چک کی اپنے بیٹے کے ساتھ کافی کہاسنی ہوئی اور یعقوب چک نے کشتواڑ بھاگنے کا ارادہ کر لیا لیکن مغلوں کے خطرے کو دیکھ کر اُس نے باپ کے ساتھ صلح کر لی اور مغلوں کو سبق سکھانے کا عہد کر لیا۔ وہ دونوں حملہ آوروں کے خلاف بے جگری کے ساتھ لڑے اور یہ جنگ کافی طویل چلی، جس میں نہ کشمیری مغلوں کو واپس بھگا سکے اور نہ ہی مغل کشمیریوں پر فتح پا سکے۔ دونوں اطراف سے فوجی جنرل اور سپاہی بڑے پیمانے پر مر رہے تھے اور کہا جاتا ہے کہ اکبر کا عظیم سپہ سالار بیربل بھی اسی جنگ میں درۂ پیر پنچال میں مارا گیا۔

صوفی محی الدین کے مطابق صورتحال کی نزاکت دیکھتے ہوئے یوسف شاہ چک نے امن معاہدے کی پہل کی اور اس کے جواب میں راجہ بھگوان داس نے اکبر کی طرف سے چک کو ایک 'باعزت معاہدہ امن' پیش کیا۔ جس کی رو سے مغلوں کا کشمیر میں داخلہ تقریباً تقریباً طے ہو گیا لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر سے یہ دوہرانا ضروری ہے کہ دلی کے حکمرانوں کو کشمیر لانے کیلئے مقامی سطح پر کون سے حالات پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ جب تک کسی گھر کے اندرونی جھگڑے اور اختلافات حد سے تجاوز کر کے چار دیواری سے باہر نہیں چلے جاتے، تب تک ہمسائے اور پڑوسی اُس میں مداخلت نہیں کرتے اور نہ ہی اُنھیں بیچ بچاؤ کرنے کیلئے گھر کے اندر آنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس وادی گلپوش میں 'گلہائے رنگا رنگ' کی کچھ اس قدر بہتات ہے کہ ایک گُل دوسرے گل کی رنگت اور خوشبو کو نہ تو برداشت کرنے کیلئے تیار ہوتا ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کیلئے۔ کشمیر میں بڑی ذاتوں، قبائل، عمائدین، قائدین، مختلف فرقوں کے علماء اور با اثر افراد اور شخصیات ہر دور میں ایک دوسرے کے خلاف لڑتے اور سازشیں کرتے رہے ہیں اور جب معاملات حد سے بڑھ گئے تو پھر باہر سے کمک منگوائی، باہر والوں نے نہ صرف اِن کے جھگڑے ختم کرائے بلکہ اس سرزمین کو اپنا مسکن بنا کر کشمیریوں پر حکمرانی بھی کی اور کوڑہ رانی سے

شیخ عبداللہ تک کی چھ سواٹھاون سال کی تاریخ ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے۔آج کل بھی جو کچھ اس سرزمین پر ہورہا ہے، اُس کا تعلق بھی انہی باتوں کے ساتھ ہے۔لیکن ذرا غور سے دیکھنے اور سوچنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال مغلوں کی آمد کی وجوہات بھی کچھ ایسی ہی تھیں۔اُس دور میں کشمیر میں چک، رینہ، ماگرے اور پڈر قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ آپس میں گتھم گتھا ہورہے تھے اور انہوں نے کشمیر کے حصے کرکے اپنی اپنی علیحدہ حکومتیں قائم رکھی تھیں۔ یہ سلسلہ فتح چک کے دور میں ہی عروج پر پہنچ چکا تھا، فتح چک نے چار قبائل کے جھگڑے ختم کرنے کیلئے کشمیر کو چار حصوں میں تقسیم کردیا۔ایک حصہ اپنے پاس رکھا اور باقی تین اپنے حریفوں کو دے دیئے۔ فتح چک سے علحیدہ ہوتے ہی رینہ، ڈار اور پڈروں نے ماگرے قوم کے ساتھ اتحاد کرلیا اور محمد شاہ کو تخت پر بٹھانے کی سازش رچائی۔ پہلی کوشش اگرچہ ناکام ہوگئی لیکن دوسری کوشش کامیاب ہوئی۔مگر اس بار کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ اُسے دلی کے بادشاہ سکندر لودھی نے امداد کا وعدہ کیا تھا۔ پرویز دیوان کے مطابق لودھی خاندان کا اُس سے بھی پہلے کشمیر کے ساتھ رشتہ تھا اور سرینگر کے ملہ کھاہ قبرستان میں آج بھی ایک لودھی شہزادی کی قبر موجود ہے، جس کا 1520ء کے آس پاس سرینگر کے تختِ سلیمانی کے قریب قتل کردیا گیا تھا۔ جبکہ چپقلش کی ایک کڑی کے طور پر ابدال ماگرے نامی کشمیری لیڈر نے بھی اسی دور میں بابر کے پاس پناہ لی اور مدد کی اپیل کی تھی۔ اس پر عمل کرتے ہوئے بابر نے کشمیر پر حملے کیلئے اپنی بھاری فوج بھیجی لیکن کاجی چک نے اُس کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور مغل لشکر کو مایوس لوٹنا پڑا حالانکہ اس کامیابی نے چکوں کی بنیادیں کشمیر میں کافی مضبوط کردیں۔لیکن اس کے باوجود کشمیریوں نے اپنی 'مخصوص' خو اور وضع ترک نہ کی اور نہ ہی اپنے اندرونی جھگڑے ختم کئے۔اب چکوں کی باری تھی کیونکہ وہ مضبوط حکمران بن کر اُبھر چکے تھے اس لئے انہوں نے شعیہ سنی فسادات کا سہارا لے کر انتقامی سلسلہ شروع کیا۔ حالانکہ اُن کی کئی سُنی شاہمیری سلاطین کے ساتھ رشتہ داریاں بھی تھیں۔

اکبر کے کشمیر میں داخلے سے پہلے راجہ بھگوان داس نے یوسف شاہ چک اور اکبر کے درمیان ایک امن معاہدہ کروادیا جس کے تحت مغل کشمیر میں داخل ہوگئے، حالانکہ اُس وقت (1586ء) مغلوں نے کشمیر پر اپنی حکومت قائم نہیں کی بلکہ یعقوب چک کو ہی تخت پر بٹھادیا لیکن اُن کا کشمیر میں داخلہ ہوچکا تھا۔تاہم یعقوب چک نے مغلوں کے ساتھ مخاصمانہ رویہ اختیار کیا جس کے بعد مغلوں نے پھر سے بھاری حملہ کیا اور اب چونکہ وہ تمام راستوں اور دروں سے واقف ہوچکے تھے اس لئے اُنھیں زیادہ دشواری نہیں ہو پائی۔اس مرتبہ شعیہ رہنماء بابا خلیل اللہ نے مغلوں کی بھرپور امداد اور حمایت کی اور یہ

واقعہ(1589ء) کا ہے۔

یوسف شاہ چک کے انجام کے بارے میں اکبر نامہ میں کچھ اسطرح سے درج ہے:

''یوسف شاہ کو بہار میں جا گیر عطاء کر دی گئی، اس کو منصب دار کے عہدے پر فائز کیا گیا اور پانچ ہزار سپاہ اس کی نگرانی میں دے دی گئی اور اس نے اڑیسہ میں مان سنگھ کی زیر قیادت جنگ میں بھی حصہ لیا، اکبر کشمیر کو دوبارہ یوسف شاہ کی حکمرانی میں دینے کے وعدے پر پورا نہیں اترا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حکمت عملی کے لحاظ سے کشمیر اس قدر اہمیت کا حامل تھا کہ وہ اس کو دوبارہ اس خاندان کے کنٹرول میں نہیں دینا چاہتا تھا جس نے اس کے لئے بے انتہاء تکالیف اور مشکلات پیدا کی تھیں، بھگوان داس، جس نے کشمیریوں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، نے معاہدے کی خلاف ورزی کو اپنی توہین گردانا، اس نے اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرنے کی کوشش کی'' (اکبر نامہ ترجمہ: ایس ایم بُرکے/صفحہ نمبر 114-115)

پروفیسر فدا محمد حسنین اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ یوسف شاہ چک کی وفات بسوک بہار میں ۱۴ ذوالحجہ کو ہوئی، وہ لکھتے ہیں:

''سلطان محمد یوسف شاہ کو راجہ ٹوڈرمل کی نگرانی میں نظر بند کر دیا گیا، کشمیر کے آخری خود مختار سلطان اور اس کے بیٹے محمد یعقوب شاہ کو بھی حراست میں لے لیا گیا، کشمیر کو مکمل طور پر بھارت کے ساتھ جوڑ دیا گیا، یعقوب شاہ کو اڑھائی برس کی قید کے بعد راجہ مان سنگھ کی سفارش پر رہا کر دیا گیا، ادھر یوسف شاہ کو بھی راجہ مان سنگھ کی تحویل میں دے دیا گیا اور اسے بہار میں ایک اچھی خاصی جا گیر عطاء کر دی گئی، اس کے سپرد پانچ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بھی رکھا گیا اور اس کی تنخواہ بھی مقرر کی گئی، جو مبلغ ۲۱۰۰ روپئے اور ۲۵۰۰ روپئے ماہانہ کے درمیان تھی، اس نے راجہ مان سنگھ کے ماتحت بنگال میں خدمات انجام دیں اور اڑیسہ کی جنگ میں بھی حصہ لیا، اسی دوران یوسف شاہ کی صحت جا گیان ناتھ پور میں خراب ہوگئی، اسے بسوک پہنچانے میں سید مبارک اور اس کے بیٹے سید عبدالمالی نے مدد کی، جہاں چھ دن کی علالت کے بعد وہ اس جہانِ فانی سے چل بسا اور اس طرح سے کشمیر کے ایک انتہائی مہذب اور خود مختار بادشاہ کا دور بھی اختتام کو پہنچا'' (بحوالہ: سلطان محمد یوسف شاہ چک' از فدا محمد

خان حسنین)

ادھر سب سے پہلا مغل شہنشاہ جو کشمیر میں داخل ہوا، اکبر تھا، اکبر کے کشمیر داخلے کے بارے میں محمد الدین فوق "تاریخ کشمیر" میں لکھتے ہیں۔

> "1586ء بمطابق 997ھ میں اکبر نے خود کشمیر آنے کا ارادہ کیا۔ رستہ اُن کے لئے انجان بھی تھا اور دشوار گزار بھی۔ اکبر کے ہمراہ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) شاہزادہ سلطان مُراد، شیخ فرید بخشی، مرزا خانِ خاناں، زین خان کوکہ، حکیم ابوالفتح، جگن ناتھ، میر شریف عالی، قاضی حسین، نور قلیچ، رام داس، ابوالفضل، مرزا کیقباد، خلف مرزا، حکیم شیخ فیضی، سلطان خسرو اور بہت بڑے بڑے نامی گرامی امراء بھی تھے۔

تھنہ منڈی راجوری تک کا راستہ کافی ہموار تھا لیکن یہاں سے سرد علاقہ شروع ہوا اور ساتھ ہی دشوار گزار پہاڑی سلسلہ بھی۔ آگے پیر پنچال کی اونچی اور برف پوش چوٹیاں اُن کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھیں۔ فروری کا مہینہ تھا اور تقریباً دو کوس طویل انتہائی سخت، دشوار گزار، برفپوش اور سنگلاخ "پیر کی گلی" کا درہ تھا اور اسے پار کرنے کے لئے بادشاہ اور اُس کے سبھی ہمرکاب و ہمسفروں کو اسپ و فیل سے نیچے اُتر کر اپنی ٹانگوں اور پیروں کا استعمال کرنا پڑا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں شہنشاہِ ہند اکبر اعظم کو کشمیر کی روائتی گھاس کی جوتی (پُول) پہننا پڑی۔ بادشاہ اور اُس کے امراء و شہزادوں کو بھی گھاس کی جوتیاں پہنائی گئیں"۔ فوق کے مطابق گھاس کی جوتیوں کا انتظام بہرام گلہ کے پاس کیا گیا اور یہ شوپیان پہنچنے تک جاری رہا۔ بادشاہ کے ہمراہی چونکہ ہندوستان اور پنجاب کے میدانی علاقوں کے باشندے تھے اس لئے کشمیر کے اِن پیچ، پُر خار اور کہستانی علاقوں پر چلتے چلتے اُن کی جان کے لالے پڑ گئے، رستے کی دشواریاں کیا کم تھیں کہ آسمان سے برف اور بارش برسنا شروع ہوگئی۔ لشکر کے کچھ لوگ تو آگے گزر گئے لیکن جو پیچھے رہ گئے، برف اور یخ میں اکڑ کر مر گئے۔!! کشاں کشاں، انتہائی سختیاں اور مصیبتیں برداشت کرتے ہوئے بادشاہ اپنے اہلِ حرم اور امراء کے ہمراہ ہیر پورہ شوپیان پہنچ گیا۔ یہ مقام اور یہاں بادشاہ کے اِستقبال کے لئے کیا گیا انتظام اتنا زبردست تھا کہ اُنھیں یہاں پہنچتے ہی ساری گزشتہ کُلفت بھول گئی۔ پھولوں کی شگفتگی، ہوا کی مواقفت اور خوشبو، آبشاروں کے نظارے اور قدرتی مناظرہ بادشاہ کو اچانک محسوس ہوا کہ وہ محشر حساب سے فارغ ہو کر کسی جنت میں آ گیا ہے۔ بادشاہ کی بیگمات اور اہلِ حرم ابھی راستے میں ہی تھے اور انہوں نے سفر کی سختیوں کے سامنے تقریباً تقریباً ہتھیار ہی ڈال دیئے تھے لیکن بادشاہ کی ضد تھی کہ وہ اُنھیں ساتھ لے کر ہی آگے جائے گا۔ خانِ خاناں نے انتہائی

کوششوں کے بعد اس کام کو بھی انجام دیا تو بادشاہ کا جلال اور غصہ ٹھنڈا ہوا۔فوق کے مطابق اکبر کو خان پور میں ایک ایسا پرحجم درخت دِکھایا گیا جس کی ایک شاخ کو ہلا دینے سے سارا درخت جھومنے لگتا تھا۔

اکبر جب شوپیان سے چل کر سرینگر پہنچا تو یہاں اُس کے قیام کیلئے مغل گورنر برائے کشمیر مرزا یوسف خان کے گھر میں انتظام کیا گیا تھا۔تیسرے دِن تھکانِ سفر سے فارغ ہونے کے بعد اکبر نے شہاب الدین پور کی سیر کی، جو دریائے جہلم کے کنارے خوبصورت جگہ تھی۔اس دوران اکبر کی ایک من پسند خاتون مریم مکانی نے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی تو بادشاہ نے جواب میں یہ فارسی شعر لکھ بھیجا۔

حاجی بسوئے کعبہ وار دنہ وار دبرائے حج

یارب! بود کہ کعبہ بیاید بُسوئے ماء

(یہ تو ویسی بات ہوئی کہ حاجی کعبہ میں حج کیلئے جانے کی سوچ ہی رہا ہو لیکن خدا کے فضل سے کعبہ ہی میری جانب چل کر آ جائے)۔سرینگر کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اکبر نے وسطی کشمیر (مراز) کی سیر کا ارادہ کیا،سفر کا واحد ذریعہ دریائے جہلم تھا اور بتایا جاتا ہے کہ اُس وقت کشمیر میں تیس ہزار کشتیاں موجود تھیں لیکن بادشاہ کے قابل کوئی نہ تھی۔اس لئے بادشاہ کیلئے دریائی محل تیار کئے گئے۔دریا کے کنارے بادشاہ کی شایانِ شان بستی (بلکہ شہر) آباد کر دیا گیا۔بادشاہ کئی دنوں تک وسطی کشمیر میں گھومتا رہا اور نندی مرگ (شوپیان،کولگام سرحد) کے مقام پر بادشاہ نے پڑاوٗ ڈالا اور شکار و تفریح کا اہتمام کیا۔

ایک طرف فاتح اکبر اس حسین مگر مفتوح سرزمین پر مٹر گشتی اور عیش ونشاط میں مصروف تھا اور دوسری جانب معزول و مفتوح بادشاہ یعقوب شاہ آوارہ گردی کی حالت میں اوقات بسری کر رہا تھا۔کافی دنوں تک صحرا نوری اور آوارہ گردی کے بعد تنگ آ کر اپنے قاصدوں اور بھروسہ مند افراد کے ذریعے بادشاہ کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور بادشاہ نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بخشش کا اعلان کر دیا۔ لیکن بقول فدا حسنین اسے بھی گرفتار کر لیا گیا اور اپنے وزیر راجہ مان سنگھ کی نگرانی میں رکھ دیا اور اڑھائی سال بعد رہا کر دیا گیا،محمد الدین فوق کے مطابق یعقوب شاہ تاعمر اسی حال میں رہا اور آخر کار 1593ء میں کشتواڑ میں انتقال کر گیا اور وہیں دفن ہو گیا۔!

اس طرح سے کشمیر کی خود مختاری اور آزادی مغل اعظم کے داخلے اور آخری خود مختار بادشاہ کی وفات کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی اور اس سرزمین کو غیروں کی ایسی نظر لگی کہ آج تک اس کی شانِ رفتہ بحال نہ ہو سکی لیکن ابھی ایک اور کہانی کو انجام تک پہنچانا باقی ہے۔

6

(مُغلیہ دور.....گزشتہ سے پیوستہ)

رُوحِ آزادئ کشمیر کی پامالی...1

وادئ گلپوش میں مُغلوں کے داخلے کے ساتھ ہی اس ''نیم خودمختار مسلم سلطنت'' کی ساری خودمختاری ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی۔ نیم خودمختار مسلم سلطنت کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا کہ مسلم دور کے آغاز (کوٹہ رانی، رنچن شاہ) سے لے کر چک دور تک کے سبھی بادشاہ اگرچہ بظاہر کشمیر میں ہی پھلے پھولے تھے لیکن ان کا اصل وطن کشمیر نہیں تھا۔ رنچن شاہ لداخ سے آیا تھا، شہمیر یوں کا اصل وطن (ایک روایت کے مطابق) پنچاگھاروا وادی جو کہ بُدھل اور راجوری کے درمیان واقع تھی) تھا۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ شہمیر کا باپ طاہر ترک باشندہ تھا، پرویز دیوان کے مطابق شہمیر کی نسبت پانڈوؤں کے ایک بھائی ارجن سے ملتی ہے اور وہ سہد یو بادشاہ کے زمانے میں کشمیر آیا، جس نے لنکر چک اور شہمیر کو ایک ایک گاؤں کی جاگیر عطا کی۔ اسی طرح چکوں کے بارے میں بھی اسی طرح کے بہت سے تاریخی حوالہ جات ملتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دردستان سے آئے تھے اور گریز (رازدان درے) کو پار کر کے اُن کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اُن کا جدِ امجد لنکر چک اور شہمیر یوں کا جدامجد شہمیر ایک ہی زمانہ (راجہ سہد یو کے دور میں) کشمیر آئے اور کچھ ہی وقت میں کشمیر کے راج تاج پر قابض ہو گئے۔ اسلئے اگرچہ یہ سلاطین مسلم تھے لیکن ساتھ ہی غیر کشمیری بھی تھے۔ بہر حال راجہ بھگوان داس اور یوسف شاہِ چک کے دستخطوں سے طے پانے والے معائدہ امن کے تحت مغل افواج کشمیر داخل ہو گئیں لیکن معاہدے کے مطابق مغلوں کو کشمیر میں محدود اختیارات حاصل تھے اور پرویز دیوان لکھتے ہیں کہ یہ معائدہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے سٹیٹ سبجیکٹ قانون اور ہری سنگھ کے دستاویز الحاق (1947ء) سے کافی ملتا جُلتا معاہدہ تھا۔ صحافی اور مورخ صوفی غلام محی الدین نے اس پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ راجہ بھگوان داس نے جب اس معاہدۂ امن کی دستاویز اکبر کے سامنے پیش کی تو اکبر کو یوسف چک کی سابقہ دغابازی یاد آ گئی اور اُس نے دستاویز کو پھاڑ کر پھینک دیا اور ساتھ ہی یوسف شاہ چک کی گرفتاری کا بھی حکم دے دیا۔ راجہ بھگوان داس ایک غیرت مند راجپوت تھا، اُس نے اپنی آن کے لئے اپنی ہی تلوار پر چھلانگ مار

کرخودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن اسے بچالیا گیا۔ اکبر یا اس سے قبل اُس کے بزرگوں بابر اور ہمایوں نے بھی کشمیر کو حاصل کرنے کے بڑے بڑے خواب دیکھے تھے اور وہ کشمیر کو اپنی سلطنت کا مکمل اور ناقابلِ تنسیخ حصہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اکبر اس لئے بھی کشمیر کے حوالے سے غضب ناک تھا کہ اُس کی افواج کو کشمیری افواج کے ساتھ ایک طویل اور خونریز ٹکر لینا پڑی تھی اور اس کے بعد اُن کا کشمیر میں مشروط داخلہ بادشاہ کی توہین کے مترادف تھا۔ راجہ بھگوان داس چونکہ قول دینے کیساتھ ساتھ اس مشروط معاہدے پر اپنے دستخط بھی کر چکا تھا اس لئے اُس نے مخجل ہو کر گرفتار شدہ یوسف شاہ چک کے روبرو حاضر ہونے پر اپنی موت کو ترجیح دی۔ اکبر نے یوسف کو گرفتار کر کے قلعہ میں بند کر دیا اور ادھر یعقوب شاہ چک (یوسف کا بیٹا) چند کشمیری معززین کی مدد سے کشمیر کا سلطان بن گیا لیکن اسکے باوجود کشمیر میں فرقہ وارانہ تشدد (جس کی سرپرستی چک کر رہے تھے) تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ جسکے بعد سلطان العارفین ؒ شیخ حمزہ مخدوم ؒ کو صوفیائے کرام پر مشتمل مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والا ایک اعلیٰ سطحی وفد اکبر کے پاس بھیجنا پڑا جس کے نتیجہ میں 1589ء میں مغلوں نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔

گزشتہ مضمون میں ہم نے اکبر (جسے دینِ الٰہی جیسے فرسودہ اور بے ہودہ قانون کی وجہ سے اپنے وقت کے جید، مقتدر اور معزز علماء نے مرتد قرار دے دیا تھا) کو شوپیان کے راستے کشمیر میں داخل کر کے سرینگر کی سیر کرائی تھی۔ اس ہفتہ کے مضمون میں زیادہ تر توجہ یوسف شاہ چک پر مرکوز کرنا مقصود ہے۔ دیوان کے مطابق اکبر نے یوسف کو اڑھائی سال تک بہار کے ایک جیل میں نظر بند رکھنے کے بعد رہا کر دیا۔ اُسے اپنے مصاحبوں میں شامل کر کے بہار کی ایک چھوٹی سی جاگیر بسوک کا گورنر بنا دیا۔ اُسے پانچ سو کی جاگیر بھی عطا کی گئی۔ حالانکہ یہ عہدہ اور عزت و وقار دراصل یوسف شاہ چک کی جلاوطنی تھی۔ اس سفر کے دوران یوسف شاہ چک کے ہمراہ ملک حیدر چاڈورہ نامی کشمیری امیر بھی موجود تھا۔ جدید تحقیق کے مطابق بسوک (بہار) میں آج بھی مغل قلعہ کے پاس دو انجان قبریں موجود ہیں۔ جن میں سے ایک کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اُس میں یوسف شاہ چک دفن ہے لیکن دوسری قبر کا معمہ ابھی تک حل طلب ہے۔ تاہم جہاں تک حبہ خاتون کا تعلق ہے تو اس حوالے سے تاریخ کے اوراق زیادہ تر خاموش ہی دکھائی دے رہے ہیں۔ اس عظیم اور طلسماتی شاعرہ کے بارے میں جو کچھ بھی پتہ چلتا ہے وہ خود اسی کے اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ وہ خود اپنے اشعار میں اپنے ''یار'' (محبوب) کے بارے میں کہتی ہے کہ اُس کا نام ''کمال'' تھا اور وہ جمالٹہ کا رہنے والا تھا۔ اُس نے اپنے والد کا نام سید البہار (سید بہاؤالدین) اور ماں کا نام بدیع الجمال بتایا ہے۔ وہ چندہارہ کی رہنے والی تھی، وہ اپنے اشعار میں

اپنے نوکروں، اپنے شاندار بچپن، تعلیم، پرورش اور عمدہ خوراک کے بارے میں وضاحت کرتی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اُس کے عہد میں لکھی جانے والی تین تاریخوں ''بہارستانِ شاہی'' اور ابوالفضل کی تاریخ آئینِ اکبری، اکبرنامہ اور ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخِ کشمیر میں جہاں ایک طرف یوسف شاہ چک کا تفصیلاً تذکرہ ملتا ہے وہیں دوسری جانب ان تینوں مستند کتابوں میں حبہ خاتون نامی کسی ملکہ، معزز خاتون یا شاعرہ کا کوئی برائے نام تذکرہ بھی نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا کشمیری مورخ بیربل کا چرو گزرا ہے، جس نے حبہ خاتون اور یوسف شاہ چک کے دور کے دوسو سال بعد اُن کا ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے، جبکہ پہلا کشمیری مصور غیور حسن تھا، جس نے حبہ اور یوسف شاہ چک کی کئی تصاویر تیار کی تھیں۔ غیور حسن کا تعلق بیسویں صدی سے تھا۔ جبکہ بیربل کا چرو بھی صرف اتنا خدشہ ظاہر کرتا ہے کہ ''شاید یہ ممکن ہے کہ یوسف نے حبہ خاتون کو ایک بار شرفِ ہمبستری عطا کیا ہو (بحوالہ پرویز دیوانز کشمیر، صفحہ نمبر 55) اس کے بعد کے (19ویں صدی کے) مورخین نے حبہ خاتون کو یوسف شاہ چک کی ملکہ کہا ہے تاہم موجودہ دور کے سرکردہ مورخ غلام رسول بٹ (سولنہ) اپنی تحقیق کی بنیاد پر بڑے وثوق سے لکھتے ہیں کہ حبہ خاتون کا نام زونی تھا، وہ چندہارا کی رہنے والی تھی، اُس کے والدین ایرانی سادات (شعیہ) تھے اور اُس نے کمال نامی سید زادے سے نکاح کیا تھا، جہاں اُن کا ایک بیٹا بھی ہوا تھا جس کا نام حیدر تھا، جبکہ دوسری جانب یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یوسف شاہ چک کے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام بھی حیدر تھا۔ جس نے اپنے بڑے (سوتیلے) بھائی یعقوب کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان کی قربانی دے دی تھی۔ پرویز کے مطابق یہ بھی ایک مفروضہ ہی ہے کہ حبہ خاتون پانتہ چھوک میں مدفون ہے، اُن کا کہنا ہے کہ بسوک بہار میں یوسف شاہ چک کی قبر کے پاس ایک بے نام زنانہ قبر موجود ہے، عین ممکن ہے کہ کشمیر کی یہ عظیم شاعرہ یہیں مدفون ہو۔ لیکن جہاں تک داور گریز میں ایک پہاڑ کو حبہ خاتون کے نام سے منسوب کرنے کا تعلق ہے، ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حبہ کی والدہ کا تعلق گریز سے تھا اور عین ممکن ہے کہ اس وجہ سے گریز کے لوگوں نے اس پہاڑ کا نام حبہ خاتون سے منسوب کر دیا ہو یا پھر یوسف کی ''بے جدائی اور بے التفاتی'' کی وجہ سے پریشان ہو کر زونی اپنے ننھیال گریز چلی گئی ہو اور وہیں کہیں مر گئی (پروفیسر فدا محمد حسنین کے مطابق حبہ خاتون کا نام حبیبہ تھا)، جبکہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ یعقوب چک کے ہمراہ کشتواڑ چلی گئی اور وہیں وفات پائی۔ لیکن اس حوالے سے ملنے والے سبھی حوالہ جات محض قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں اور ان میں شک و شبہے کی کافی گنجائش موجود ہے۔ سچ فقط اتنا ہے کہ حبہ خاتون نامی ایک شاعرہ ضرور تھی اور اُس کے بارے میں صرف اتنا صحیح ہے، جتنا کہ اُس کے اپنے اشعار سے پتہ چلتا

ہے۔ مختصراً یہ کہ حبہ خاتون کا کردار رامائن کی سیتا کے ساتھ کافی مشابہت رکھتا ہے، جو زمین کا سینہ چاک کر کے پیدا ہوئی اور آخر میں پھر اسی کی گود میں سما گئی لیکن اس رامائن کے رام یعنی یوسف شاہ چک کا مقبرہ آج بھی بسوک بہار میں موجود ہے۔ علی شاہ (بڈشاہ کے بڑے بھائی) کے بعد یوسف شاہ چک دوسرا کشمیری سلطان تھا جس کی موت غریب الوطنی کی حالت میں (دورانِ حراست) ہوئی جبکہ علی شاہ کو جسرت کھوکھر کے سپاہیوں نے گرفتار کرنے کے بعد پنجاب کے کسی ویرانے میں قتل کر کے اُس کی لاش تک غائب کر دی تھی۔ (دیکھئے تاریخ ہندو پاکستان از میجر، پروفیسر طارق اعوان)

شہنشاہِ اکبر کے ارتداد کے بارے میں محمد سعید الحق اپنی کتاب ''محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک'' میں رقمطراز ہیں:

> ''اکبر کے لادین نظریہ ''دینِ الٰہی'' اور بعض درباری ملاؤں کے ''اعلانِ معصومیت'' کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ جونپور کے قاضی ملا محمد یزدی، قاضی بنگال میر یعقوب، قاضی صدرالدین لاہوری، ملا عبدالشکور، ملا محمد معصوم شیخ منور، میر معزالملک، قطب الدین کوکا، شہباز خان کمبوہ، خان جیاری اور بعد میں مجدد الفِ ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سمیت بہت سے علماء اور امراء نے اکبر کو مرتد قرار دے کر اُس کی سخت تنقید اور ملامت کی لیکن شاہی قوت نے اُنہیں بُری طرح سے دبا دیا۔'' (صفحہ نمبر 291) سعید الحق آگے لکھتا ہے''اکبر نے مخالفت سے جھنجھلا کر بہت سے خلاف شرع کام کئے، مثلاً رسولِ پاکؐ کے نام مبارک کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ بہت سی مساجد گرا دیں، اذان بند کر دی گئی، روزے، نماز اور حج پر پابندی عائد کر دی، مردوں کے لئے ریشمی لباس اور سونے کا استعمال جائز قرار دیا۔ گاؤ کشی کو ممنوع قرار دیا۔ علومِ اسلامیہ اور عربی سیکھنے کی حوصلہ شکنی کی، عیدین کی بجائے نوروز منایا جانے لگا۔ بھینسوں اور اونٹوں کے ذبحیہ پر بھی پابندی عائد کر دی اور قریبی رشتہ داری کے اندر شادی بیاہ کو ممنوع قرار دے دیا۔'' شیخ احمد سرہندیؒ کے الفاظ میں ''اُس وقت کے علماء اسلامی احکام کے اظہار سے اتنے عاجز تھے کہ اظہار کرتے تو قتل ہو جاتے''۔

زیرِ نظر مضمون میں اگرچہ مغلوں کے کشمیر پر قبضہ کرنے کا ذکر مقصود تھا لیکن چونکہ میرے وطن کی خودمختاری اور آزادی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہی تھی، اس لئے اُس بادشاہ کے ماضی اور باطن سے پردہ ہٹانا ضروری تھا، جس نے وقت کے علماء اور اولیائے کرام کے ہاتھوں طوقِ لعنت پہننے کے بعد اس

جنتِ ارضی پر قدم رکھا تھا...اس لئے وطن کی محبت اس شہنشاہ کی طاقت پر حاوی ہوگئی۔ گزشتہ مضمون میں اکبر کو سرینگر میں چھوڑ دیا تھا۔ آیئے اُس سے آگے کا راستہ دکھایا جائے۔

اکبر نے اپنے دورِ اقتدار میں کل ملا کر تین مرتبہ کشمیر کا سفر کیا۔ پہلی بار وہ دریائی سفر کرتے ہوئے شوپیان کے نندی مرگ علاقے میں گیا۔ سرینگر کے کئی باغات کی سیر کرتے ہوئے پٹن تک چلا گیا، یہاں اُس نے بہت مال وزر غریبوں میں تقسیم کیا اور اپنے حکام کو رعایا پروری کے احکامات دے کر واپس دلی چلا گیا۔ اس دوران وہ اپنے کشمیری گورنر مرزا یوسف خان کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور یہاں اُس کے بیٹے مرزا یادگار کو گورنری کی کرسی سونپ دی (محمد الدین فوق/مکمل تاریخ کشمیر/صفحہ نمبر 509) فوق کے مطابق اکبر کو کشمیر کی آب وہوا اس قدر پسند آئی کہ اُس نے اگلے برس پھر کشمیر آنے کا پروگرام بنایا اور اگر چہ وزراء اور اُمراء نے سخت مخالفت کی لیکن بادشاہ حتمی فیصلہ لے چکا تھا اس لئے ضد پر اڑا رہا۔ فوق کے مطابق یہ سفر 1000ھ میں ہُوا جس کے لئے ابوالفضل نے فال نکال کر بادشاہ کو سفر کا مشورہ دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب مغل گورنر مرزا یادگار نے بغاوت کر کے کشمیر میں اپنا سکہ رائج کر دیا تھا لیکن جب اُسے بادشاہ کی آمد کی خبر ملی تو وہ بوکھلا گیا اور تمام باغیوں نے مل کر مشورہ کیا کہ بادشاہ کے استقبال کے لئے ایسا اہتمام کیا جائے کہ وہ سب کچھ بھول جائے۔ لیکن بادشاہ کو خبر ہو چکی تھی، اُس نے حکم دیا کہ عام لوگوں کو تشفی وتسلی کے دام میں اسیر کرو اور مفسدوں کا قلع قمع کرو۔ غرض بہت سے شوریدہ سروں کو سزا ملی اور عادل خان فرار ہو گیا۔ اس موقعہ پر ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس ملک (کشمیر) میں چور اور گداء بہت کم نظر آتے ہیں، بادشاہ حسن سے فارغ ہو کر زعفران زار کی سیر کے لئے گیا اور اس کی شادابی اور خوشبو سے محظوظ ہوا" اسی سفر کے دوران اکبر نے اپنے شہزادے سلیم اور اپنی شادی کا بھی اہتمام کیا۔ اُس نے ہندوستان کے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے جو فارمولہ اختیار کیا تھا وہی کشمیر میں بھی آزمایا۔ چک حکومت اگر چہ مٹ چکی تھی لیکن اُن کا اثر ورسوخ باقی تھا۔ اکبر نے شمس الدین چک کی بیٹی کو اپنے حرم میں شامل کر لیا جبکہ حسین چک کی بیٹی کا نکاح سلیم (جہانگیر) کے ساتھ کرا دیا۔ اس کے علاوہ اکبر نے کشمیر میں جو دوسرا کامیاب حربہ آزمایا، وہ کشمیریوں کو بھکمری اور بے روزگاری سے نجات دلانے کیلئے ہاری پربت پر قلعہ ناگرنگر کی تعمیر کا تھا۔ اکبر کا تیسرا اور آخر سفر 1005ھ میں ہوا۔

مورخین کے مطابق اس سال کشمیر میں ایک چالباز شخص، جس کا تعلق گوری خاندان سے تھا نے بدخشیوں اور کشمیر کے کچھ ضمیر فروشوں کے ساتھ مل کر سازش کرنے کی کوشش کی لیکن مغل گورنر محمد قلی خان نے اُسے گرفتار کروا کر قتل کر دیا۔ (جاری)

7

(مُغلیہ دور......گزشتہ سے پیوستہ)

رُوحِ آزادیٔ کشمیر کی پامالی..۲

کشمیر پر ابھی مغل قبضے کو صرف پانچ سال کا عرصہ گزرا تھا لیکن یہاں ہر سُو رشوت خوری اور مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فوق کے مطابق اپنے دورۂ کشمیر کے دوران اکبر نے جو خاص کام انجام دیا وہ خائنوں اور ظالموں کی سرکوبی کا تھا۔ اس زمانہ میں کشمیر میں سخت قحط بھی پڑا اور شدت یہ تھی کہ سرینگر کے عیدگاہ میدان میں ہر اتوار کو اسی ہزار بھوکوں کو سرکاری لنگر سے کھانا کھلا جاتا تھا۔ قلعہ ناگرنگر (ہاری پربت) کی تعمیر جو کہ بائیس سال تک جاری رہی، اس قحط سالی میں کشمیری مزدوروں کی روزی روٹی کا واحد سبب تھی۔ اس سال بادشاہ نے کشمیر میں ''روشنی کا تہوار'' بھی منایا اور کشمیر کے موسمِ خزاں سے متعلق یہ شعر کہا ؎

ذوق فنا نیا فتۂ ورنہ درنظر
رنگین تراز بہار بود جلوۂ خزاں

(اگرچہ اب وہ پرانا ذوق وشوق باقی نہیں ہے، لیکن نظروں کے سامنے خزان کا جو منظر ہے، وہ کسی بہار سے بھی زیادہ رنگین اور دلکش ہے)

اس شعر سے بادشاہ کی رنگین مزاجی کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ طبعًا بوڑھا ہو چکا تھا۔ اسی سفر کے دوران سلیم کے ساتھ تبت کے بادشاہ علی رائے کی بیٹی کی شادی بھی ہوئی۔ یہ جہانگیر کی کشمیر میں دوسری شادی تھی۔ اسی زمانے میں اکبر نے کشمیر کو مرکزِ حرب بنا کر تبت پر حملہ کیا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ محمد الدین فوق کے مطابق اس بار بادشاہ کشمیر میں تین ماہ اور 29/دن تک مقیم رہا اور سردی شروع ہوتے ہی اپنے ساتھیوں کے اصرار پر واپس ہندوستان چلا گیا۔ اکبر کی موت 1605ء میں ہوئی۔ آٹھویں دن جہانگیر تخت نشین ہوا تو اُس نے سب سے پہلے کشمیر کا رُخ کیا۔ جہانگیر نے اپنے دورِ اقتدار (1605-1627ء) کے دوران 8/مرتبہ کشمیر کا دورہ کیا، دو مرتبہ اپنے والد اکبر کے ہمراہ اور چھ مرتبہ اپنی ملکہ نور جہاں کے ہمراہ (انارکلی کی روح کو تڑپتا چھوڑ کر نور جہاں کی زلفیں

سنوارتا رہا) جہانگیر کا دور کشمیر میں تعمیر وترقی کا دور مانا جاتا ہے۔ اُس دور میں جہلم کے منبع ویری ناگ چشمہ پر عالیشان بارہ دری اور غسل خانہ تعمیر کیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جہانگیر ویری ناگ اور براری نمبل میں دو باندھ بنوا کر پانی کا ذخیرہ کرنا چاہتا تھا لیکن کسی نے اُسے بتادیا کہ دشمن اس پانی میں زہر ملا کر بڑے پیمانے پر ہلاکتوں کا موجب بن سکتے ہیں،اس لئے اُس نے یہ منصوبہ ترک کردیا۔ پرویز دیوان کے مطابق جہانگیر کے دور سے پہلے بھی اگرچہ چنار کا درخت کشمیر میں موجود تھا لیکن اُس نے اس درخت کی اس طرح سے سرپرستی کی کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ درخت اسی زمانے میں متعارف ہوا ہو۔ اُس نے شاہراؤں، راستوں اور باغات وسیر گاہوں میں اس درخت کو اس طرح لگایا اور سجایا کہ کشمیر کے حسن اور خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے، جہانگیر نے کشمیر میں کچھ عجیب وغریب قوانین بھی نافذ کئے۔ اُس نے ہندو مسلم شادیوں اور 'ستی' جیسی رسم پر پابندی عائد کردی لیکن ''بیگار'' کو قانوناً جائز ٹھہرایا۔ حالانکہ جب شیخ یعقوب صرفیؒ اکبر کے دربار میں فریاد لے کر گیا تھا تو اس نے بادشاہ کو واضح طور بتادیا تھا کہ کشمیریوں پر اُن کا محدود اختیار ہوگا لیکن ظلم وستم کا سلسلہ جاری رہا، جس کی وجہ سے کشمیری مغلوں سے متنفر ہوتے رہے۔ جہانگیر کے بعد شاہجہاں اورنگ زیب اور بعد کے کچھ مغل سردار اور گورنر کشمیر پر راج کرتے رہے۔ سر والٹر لارنس اپنی کتاب ''ویلی آف کشمیر'' کے صفحہ نمبر 194 پر مغل دور کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مغلوں نے کشمیر کے موسم اور سادہ لوح لوگوں سے متاثر ہوکر یہاں اپنا مسکن بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ انہوں نے جگہ جگہ عیش کدے تعمیر کروائے، باغات اور سیر گاہیں تعمیر کروائیں اور درختِ چنار کو اس کام کا مرکز بنایا۔ انہوں نے ڈل جھیل کے کنارے 777ء باغات بنوائے، جس سے اُن کی عیش پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن......ایک پُرانا اور مسلمہ اصول ہے کہ ''ہر کمالِ راز وال'' یعنی ہر عروج کو ایک دن شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی کچھ مغلوں کے ساتھ بھی ہوا۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت تک آتے آتے مغل سلطنت اتنی وسیع اور دراز ہوچکی تھی کہ اُن سے سنبھالی نہ گئی۔ اس دوران عیش پرستی اور سُستی وکاہلی اس کے امراء اور وزراء کا مقدر بن چکی تھی اور دوسری جانب، دوسری اقوام اور حکمران موقعہ کی تلاش میں تھے۔ لارنس کے مطابق:

''1752-54ء'' کے دوران کشمیر کا صوبہ دلی کے ہاتھوں تقریباً نکل چکا تھا اور اگرچہ کشمیری اپنی شانِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کر کے اپنی خود مختاری، آزادی اور عزت ووقار بحال کرسکتے تھے لیکن اس دوران اُنہیں غلامی کی عادت پڑ چکی تھی''۔ مغلوں کی لگام ڈھیلی ہوئی تو کشمیر کا گھوڑا اپنی ہی دھن میں ایک انجان راستے پر دوڑ پڑا...اور آگے اس کا سامنا جس مصیبت سے ہوا اُس کا نام تھا نادر شاہ دُرانی...

یعنی بادشاہِ افغانستان۔ والٹر لارنس (ویلی آف کشمیر) صفحہ نمبر 196 پر رقمطراز ہیں "مغلوں کے خاتمے کے بعد کشمیر کا صوبہ نئے ملکوں کے ہاتھوں میں چلا گیا اور 1752 سے 1754ء کے دوسال میں یہ اپنی تاریخ کے سب سے ظالم حکمرانوں (پٹھانوں) کے قبضے میں جا چکا تھا۔" لارنس نے مسلم دور اور ہندو دورِ حکومت کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو دور میں ہندو بادشاہوں کے زیرِ سایہ ہندو رعایا بہت خوشحال اور آباد تھی لیکن مسلم دور میں بادشاہوں نے مسلم رعایا پر ایسے مظالم ڈھائے، جن کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ تاہم اس دوران جس بادشاہ کے دور میں ہندو اور مسلم، دونوں خوشحال اور آزاد تھے وہ تھا زین العابدین بڈشاہ، جس نے عوام کی فلاح و بہبود، ترقی اور خوشحالی کے یکساں اقدامات کیئے۔ کاریگروں، اُساتذہ اور ماہرین کو باہر سے لا کر یہاں بسایا اور سب کو برابر حقوق دیئے۔

(8)

چراغ بیگ اور کاکر خان کی بھیانک دستک!

خطۂ کشمیر کے حسین و دلفریب، سرد و تر اور مشکبار نظارے، دریا و کہستان، درے اور شاہرائیں گواہ ہیں کہ گزرے وقتوں کے دوران اِن پر کتنی کدالیں، پھاوڑے اور ہتھوڑے چلے ہیں اور ان گلستانوں کو کتنی بار دشمنوں کے ٹڈی دل لشکروں نے اپنے پیروں تلے لتاڑا ہے، ان کی پاکیزگی اور حرمت وعصمت کو تار تار کیا ہے، اور سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہر جانے والے کے بعد ہر آنے والا پہلے سے زیادہ ظالم، خوفناک، خون ریز اور گل چین ثابت ہوا ہے اور اس گلشن کو سجانے یا آباد کرنے کی بجائے اسے اُجاڑنے کا ہی موجب بنا ہے۔

مغلوں کی توسیع پسندانہ طبیعت اور وسعتِ سلطنت کے ساتھ ساتھ ماند پڑ چکی تھی اور اورنگ زیب کے زمانے تک اس سلطنت پر احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ دُرانی کا سایہ پڑ چکا تھا، مغلیہ سلطنت لے دے کر دلی تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔ کشمیر جسے کبھی اکبر نے اپنا 'باغِ خاص' کہہ کر یاد کیا تھا۔ اب مُغلوں کی کشش کا باعث ومرکز نہیں رہا تھا۔ محمد شاہ رنگیلا (1717) کے آس پاس دہلی کا 'بادشاہ' بن چکا تھا، اس دور میں کشمیر میں تعینات دلی کے گورنروں کا یہ عالم تھا کہ وہ لمبے لمبے عرصے تک کشمیر سے باہر رہنے لگے تھے اور انہوں نے اپنی ذمہ داریاں یہاں مقیم اپنے 'ایجنٹوں' کے کندھوں پر ڈال دی تھیں۔ اسی دوران مغل گورنر عقیدت خان نے ابوالبرکت نامی کشمیری 'ایجنٹ' کو اپنا نائب مقرر کر دیا، جس کے بعد تقریباً 1727ء کے آس پاس اُس کے پیشرو آگھر خان نے اُسے معزول کر کے دلی کے ایک قید خانے میں ڈال دیا۔ 1741ء کے آس پاس رہا ہوا تو پونچھ کے زمیندار پنڈت دیا رام اور اُس کے دو ہم پلہ زمینداروں ولی اور محمد زمان کی فوج میں شامل ہو گیا۔ اور ان تینوں نے ابوالبرکت کے ساتھ مل کر مغل گورنر عنایت اللہ خان دوم (مغلوں کے آخری گورنر) کو قتل کر دیا۔ دیوان کے مطابق "ایک بار پھر کشمیر میں افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا" مختلف ذاتوں اور قبائل کی اندرونی چپقلش اور فتنہ وفساد کی وجہ سے یہ خطہ ٹہنی سے لٹکے ہوئے پختہ پھل کی طرح پھر سے کسی نہ کسی کی جھولی میں گرنے کیلئے تیار تھا، اور جیسا کہ اکثر ہوتا آیا کہ آنے والی مصیبت کا سایہ پہلے ہی محیط ہونے لگتا ہے، کشمیر کے 'معززین' کسی بیرونی

خاندان(حکمران) کوکشمیر پرحکومت کرنے کیلئے مدعوکرنے کیلئے تیار بیٹھے تھے'

غلام احمد میر اپنی کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' کے مضمون کشمیر..غلامی کے سات سوسال' میں رقمطراز ہیں ''1747ء میں احمد شاہ دُرانی نے نادرشاہ کی جگہ تختِ افغانستان پر قبضہ کرلیااور اِدھر کچھ کشمیریوں نے دُرانی کے نام ایک خط لکھ کراُسے کشمیر آنے کی دعوت دی لیکن جاسوسوں کی مدد سے یہ خط دُرانی تک پہنچنے سے قبل ہی مغل جنرل،مرزاسیاف کے پاس پہنچ گیا،اُس نے گورنراحمد شاہ کوواپس بُلا کرامیر مقیم کوکشمیر کا گورنر بنادیالیکن باغی گورنر برکت خان کے بیٹے عبدالقاسم نے اُسے یہاں ٹکنے نہیں دیا۔1752ء میں یہی میر مقیم خواجہ ظہیر دیدمری کے ہمراہ دُرانی سے ملنے لاہور چلا گیااوراُسے کشمیر پر قبضہ کرنے کی دعوت پیش کی۔اپنے مادرِوطن کوغیروں کے حوالے کرنے والی کشمیریوں کی یہ تیسری جماعت تھی۔اس سے قبل کوٹہ رانی نے اُدھیان دیوکوافغانستان سے بلاکر کشمیر کا سلطان بنادیا، پھر چکوں کے دور میں پہلے یوسف شاہ چک اور بعد میں شیخ یعقوب صرفیؒ نے مغلوں کودعوت دی اوراب اس وطن کوافغانوں کے سُپرد کیاجارہا تھا۔میر کے مطابق اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے عبداللہ خان کی کمانڈ میں ایک بھاری افغان لشکر نے کشمیر پرحملہ کیااورگل خان نامی فوجی افسر نے عبدالقاسم کوگرفتار کر کے کشمیر میں افغان جھنڈا لہرادیا!

کشمیر کی غلامی کے ان ساڑھے چھ سو برسوں کے عرصے میں غوطے لگانے کے بعد جو بات سامنے آتی ہے،وہ یہی ہے کہ اس عرصے(1320ءتا2010ء) کے دوران کشمیری عوام پرسب سے زیادہ ظلم ومصائب کے پہاڑ افغانوں نے ہی توڑے ہیں۔اس دور کی غلامانہ زندگی کا اندازہ اس بات سے لگایاجاسکتا ہے کہ پٹھان فوجی افسراوراہلکار کشمیریوں کوگھوڑوں کی طرح استعمال کرکےاُن کی پیٹھ پر سواری کرتے تھے(جیسا کہ آج بھی بعض سیاسی لیڈر جلسوں اور جلوسوں کے دوران کرتے ہیں) پٹھانوں کےتشدد کا خاص نشانہ کشمیری پنڈت واہلِ تشعیہ تھے۔اِن دونوں اقوام کیلئے حکم تھا کہ وہ اپنے روائتی لباس(فرن) کی بغلوں میں دوجیبیں سلوائیں تاکہ اُن کی پیٹھ کی سواری کرنے والے افغان فوجی ان کورکاب کےطور پراستعمال کرسکیں۔والٹرلارنس' ویلی آف کشمیر' میں رقمطراز ہیں''مغلوں کے زوال کے بعد جب کشمیر شاہانِ دُرانی (افغانوں) کے قبضے میں چلا گیا تواس دور میں ظلم وستم اورمحتاجی وغلامی کے سوا کُچھ بھی نہیں ملتا۔اِس دور میں اُنہی لوگوں کوگورنر کے عہدے پرتعینات کیاجاتا تھا،جو یہاں کے پسماندہ عوام سےمحصول اورٹیکسوں کے نام پرزیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کرکےافغانستان تک پہنچانے کے متحمل ہوتے تھے۔دولت اکٹھا کرنااورلوگوں پرظلم ڈھانا افغان گورنروں کےفرائضِ منصبی میں شامل

تھااور کسی گورنر کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اُسے کب کابل واپس بُلا لیا جائے گا۔اس لئے وہ یہاں جتنے دن رہتا، اپنی ضد، من مانی، ہٹ دھرمی اور جنونیت کا احساس دِلاتا رہتا اور یہی اُس کی قابلیت کا ثبوت بھی ہوتا تھا'' (ویلی آف کشمیر/صفحہ 197) لارنس کے مطابق اگر چہ افغانوں نے کشمیر میں کچھ نئی تعمیرات بھی کھڑی کیں لیکن انہوں نے جھیل ڈل کے کنارے اور کئی دیگر مقامات پر مغلوں کی تعمیر کردہ عالیشان عمارتوں اور باغات کو بُری طرح مسمار کر دیا۔اس لئے اگر پٹھان حکمرانوں کو کشمیر میں یاد کیا جاتا ہے تو محض اُن کے مظالم اور تباہ کاریوں کی وجہ سے ہی یاد کیا جاتا ہے''

''پٹھان (دُرانی) مسلکاً شعیہ تھے لیکن اُن کے عقدِ نکاح میں مغل زادیاں تھیں جو کہ سُنی تھیں اور پٹھان اُن کے عشق میں اس قدر مجنون تھے کہ پٹھان سُنی فرقہ کو اپنا قبیلہ تسلیم کر کے اُن پر خاص مہربانیاں کرتے تھے۔اُن کے درباری اور امراء، سبھی سُنی مسلمان تھے۔اُنھوں نے کشمیری شعیوں اور پنڈتوں پر سواری بھی کی اور اُن سے بیگار بھی لی لیکن اس کے باوجود مورخین نے حیرت انگیز طور پر افغانوں کو 'سُنی دشمن' قرار دیا ہے'' پرویز دیوان/رائی کشمیر/صفحہ نمبر 67)

پٹھانوں نے کشمیر میں تباہی و بربادی مچانے کے ساتھ ساتھ کچھ تعمیری نقوش بھی چھوڑے۔مثلاً پٹھان سپہ سالار امیر جوان شیر قزلباش نے سرینگر میں چھوٹا سا قلعہ ''شیر گڑھی'' کے نام سے تعمیر کروایا جسے آج کل 'اولڈ سکریٹریٹ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسی سپہ سالار نے سرینگر کا امیرا کدل پُل بھی تعمیر کروایا جو سال 1979ء تک قائم تھا۔افغان گورنر عطاء محمد خان نے چرار شریف میں حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کی درگاہ تعمیر کروائی اور حضرت شیخ کے تئیں اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر اُن کے نام کا سکہ بھی رائج کرایا۔اس طرح حضرت شیخؒ دنیاء کے پہلے ایسے صوفی بزرگ تھے، جن کے نام کا سکہ جاری کیا گیا، عطا محمد خان کی تعمیر کردہ درگاہ چرار شریف 1995ء میں پاکستانی عسکریت پسند مست گُل کے ساتھیوں اور بھارتی افواج کے درمیان طویل 'محاصرہ چرار شریف' کے دوران تقریباً ایک ہزار دیگر مکانات کے ہمراہ خاکستر ہو گئی۔تاہم شیخ نورالدینؒ کے نام کا سکہ آج بھی کئی عجائب گھروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

افغان دور (1752ء تا 1819ء) 67/سال تک کے عرصے میں افغانوں نے کشمیر میں لالہ سکھ جیون مل سے لے کر سردار جبار خان تک تقریباً 20/گورنروں کو کشمیر بھیجا اور ہر گورنر کو پہلے سے زیادہ تیز اور زہریلا بنا کر ارسال کیا گیا۔انہی افغان سرداروں اور گورنروں میں کاکر خان اور چراغ بیگ نامی امراء بھی شاملِ تھے، جن کے مظالم کی داستانیں کشمیری لوک ادب کا حصہ بن چکی ہیں اور ان

دونوں سے کشمیر میں کئی ضرب المثال آج بھی منسوب ہیں۔ کاکر خان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اُس نے کشمیریوں کی پیٹھ پر سواری کرنے اور اُن سے بیگار لینے کی رسم رائج کرائی جبکہ چراغ بیگ کے بارے میں رواء ہے کہ اُسے کشمیر بھیجا گیا تو اُس نے آتے ہی راستے میں ایک جنازے کو روک کر مُردے کی ناک اپنے خنجر سے کاٹ لی۔ جب اُس سے مُردے کی ناک کاٹنے کی وجہ پوچھی گئی تو اُس نے کہا کہ کشمیر میں اُس کی تعیناتی کی خبر زندوں تک تو پہنچ گئی ہوگی لیکن مُردوں تک یہ پیغام یہ مُردہ لے کر جائے گا!

والٹر لارنس نے پہلے افغان گورنر اسد خان کے بارے میں لکھا ہے:

''اِن (افغانوں) کا براہِ راست نشانہ کشمیر کے شعیہ، پنڈت اور جہلم ویلی کے بمبہ تھے (اوڑی کے راجے) نہ جانے کیوں افغانوں کو بمبوں کے ساتھ خواہ مخواہ کی دشمنی تھی۔ اسد خان کا طریقۂ تعزیز یہ تھا کہ وہ کشمیری پنڈتوں کو دو دو کر کے رسیوں سے باندھتا اور پھر جھیل ڈل میں ڈبو دیتا۔ اسد خان اپنے بادشاہ نادر شاہ کی کاربن کاپی کی طرح تھا، بے رحم، ظالم اور سنگدل...اُس کی تفریح کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک پنڈت کے سر پر فضلے سے بھرا مٹکا رکھ دیتا اور مسلمانوں سے کہتا کہ وہ اس گھڑے پر تب تک کنکریاں ماریں جب تک کہ وہ گھڑا پوری طرح پھوٹ نہ جائے۔ ان کنکریوں سے نہ صرف یہ کہ فضلہ پنڈت کے پورے جسم پر بکھر جاتا بلکہ وہ اندھا بھی ہو جاتا...''بیچارہ پنڈت'' (ویلی آف کشمیر، صفحہ نمبر 197ء) لارنس مزید لکھتا ہے ''پنڈت جو اکثر مونچھیں بڑھایا کرتے تھے کو حکم دیا گیا کہ وہ داڑھی بڑھائیں، سروں پر پگڑی اور پیروں میں جوتے پہننے پر پابندی تھی۔ ماتھے پر ٹیکہ لگانا منع تھا، کہا جاتا ہے کہ آج کل (تقریباً 20 رسال قبل تک) کشمیری پنڈتوں کی طرف سے زیادہ پگڑی کا پہننا اور ماتھے پر بڑا سا تلک لگانا دراصل افغان دور میں اُن پر ہونے والے مظالم کا ردِعمل ہے پنڈتوں پر جزیہ عائد تھا، جس وجہ سے بے شمار برہمن وادی چھوڑ کر فرار ہو گئے، متعدد مارے گئے اور متعدد مسلمان بن گئے، کہتے ہیں کہ افغانوں میں ایک سے بڑھ کر ایک ظالم پیدا ہوئے۔ اسد خان کے جانے کے بعد مدد خان آیا تو اُس نے پنڈتوں کو ڈل میں ڈبونے کے عمل میں یہ تبدیلی لائی کہ گھاس کی رسیوں کی جگہ اُن کو چمڑے کے پٹوں سے باندھا جانے لگا۔ اُس نے پنڈتوں کے ساتھ ساتھ شعیوں کو بھی ڈل میں

غرق کرنا شروع کر دیا، کہتے ہیں کہ عطا محمد خان نامی گورنر فرعونی طرز پر مظالم ڈھاتا تھا جبکہ تھا جبکہ ایک پٹھان خاتون کو شب بیگم برہمنوں کے لئے کسی ڈائن سے کم نہ تھی۔ وہ پنڈت لڑکیوں کے سر منڈوا کر اُن کے چہروں پر کالک پوت دیتی اور کئی کئی روز تک منہ دھونے نہیں دیتی تھی، کبھی کبھی تو غصے کے عالم میں وہ اِن کی ناک بھی کاٹ دیتی تھی۔ جب کوئی پٹھان کسی پنڈت کو دیکھتا تو اُس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا اور بغیر اجازت سواری کرنے لگ جاتا۔ غرض یہ کہ اگر پٹھانوں کے مظالم کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے تو دفتروں کے دفتر درکار ہوں گے''۔ (ویلی آف کشمیر صفحہ نمبر 198)

1819ء میں افغان گورنر عظیم خان شاہِ افغان کی ہدایت پر واپس کابل روانہ ہو گیا اور اپنے بھائی جبار خان کو زمامِ اقتدار سونپ دی۔ محمد الدین فوق کے مطابق ''بھائی کی روانگی پر جبار خان نے 1819ء میں مسندِ خلافت پر قدم رکھا، یہ شخص رحمدل، منصف مزاج مگر سادہ لُوح تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے دور میں زمانہ اُفاغنہ کے سارے جور و ستم ختم ہو جاتے لیکن وقت نے اُس کا ساتھ نہیں دیا اور اُسے جلدی ہی معزول کر دیا گیا۔ اعظم خان کے واپس چلے جانے کے بعد پنڈت بیربل نے پنجاب میں رنجیت سنگھ کو دعوت دی کہ وہ کشمیر پر حملہ کر دے رنجیت سنگھ اس سے قبل ایک بار کشمیر پر حملہ کر کے شکست کا مزہ چکھ چکا تھا اس لئے یکا یک لشکر کشی کی جرأت نہ کر سکا۔ لیکن پنڈتوں نے اُسے طرح طرح کے سبز باغ دِکھائے اور کہا کہ ہندو جی جان سے اُس کے ساتھ ہیں، ملک میں ظلم ہو رہا ہے اس لئے فتحِ کشمیر ضروری ہے۔ رنجیت سنگھ راضی ہو گیا تاہم اُس نے فوج کا نقصان اور جنگی مصارف کا ذمہ بیربل پر ڈال دیا اور اس کے بیٹے راجہ ورکو یرغمال بنا کر (بطورِ ضمانت) اپنے پاس رکھ لیا۔ اس اطمینان کے بعد دیوان ظفر جنگ بہادُر کو راجہ گلاب سنگھ (جموں) سردار ہری سنگھ نلوہ، جوالا سنگھ پدانیہ، حکم سنگھ چمنی، سرداران اٹاری والا اور ڈیرہ، شہزادہ کھڑک سنگھ وغیرہ کو تیس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ کشمیر پر چڑھائی کے لئے روانہ کر دیا۔ یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کا کر خان کو بھگانے اور سکھوں کو بلانے میں اس بار کشمیری پنڈتوں نے اہم رول ادا کیا اور بیربل پنڈت نے اپنے بیٹے تک کو سکھوں کے پاس رہن رکھ دیا۔ ورنہ اب تک یہ داغ کشمیری مسلمانوں کے ماتھے پر تھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ جب ظلم بڑھ جاتا ہے تو شریف سے شریف شخص بھی ردِ عمل دکھاتا ہے اور انصاف کیلئے نعرہ بلند کرتا ہے۔ پنڈتوں اور اہلِ تشعیہ نے پٹھان دور کے 67 سال کے دوران جو مظالم دیکھے اور سہے تھے، اُن کے جواب میں اس طرح کا ردِ عمل ایک قدرتی عمل تھا۔ لیکن یہاں یہ کہنا کہ سکھوں نے افغانوں کو کشمیر سے بھگایا یا پھر اُن سے لڑ کر کشمیر حاصل کیا، غلط

ہوگا۔ کیونکہ جب سکھوں نے کشمیر پر حملہ کیا، پٹھان افغانستان میں بادشاہ کی معزولی اور گرفتاری (انقلابِ افغانستان) کے بعد کشمیر سے بد دِل ہوکر خود ہی یہاں سے تقریباً دستبردار ہو چکے تھے۔

غلام احمد میر اپنی حالیہ کتاب "میں نے کشمیر جلتے دیکھا" میں رقمطراز ہیں: "......اسی طرح افغانوں پر بھی زوال کے بادل منڈلانے لگے۔ 1810ء میں افغانستان کے بادشاہ زمان شاہ کو پسپا کر کے قید کرلیا گیا اور ساتھ ہی اُس کی آنکھیں بھی نکال لی گئیں۔ افغانستان میں غیر یقینیت کی وجہ سے پٹھانوں کو مجبوراً کشمیر چھوڑنا پڑا اور اگرچہ تاریخ نے کشمیریوں کو آزاد رہنے کا ایک اور موقعہ دیا تھا لیکن وقت نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ اسی کے ساتھ مسلم دورِ حکومت کا بھی ریاست سے خاتمہ ہوگیا۔ جواب تک جاری ہے کیونکہ آج بھی ریاست پر حکومت کرنے والوں کو دلی کی مدد اور حمایت حاصل ہے، پٹھانوں نے جاتے جاتے عظیم خان نامی جس گورنر کو کشمیر کا حکمران بنا کر چھوڑا تھا، وہ وافر فوجی اور مالی امداد کی عدمِ دستیابی کی وجہ سے یہاں زیادہ دیر تک نہ ٹک سکا، اُدھر افغانستان میں جنگ و جدل اور اندرونی خلفشار نے شدت اختیار کر لی تو عظیم خان بھی یہاں سے اپنا بوریا بستر ہ لے کر فرار ہوگیا۔ افغانوں کے جانے کے بعد ایک بار پھر کشمیر کے مختلف قبائل نے سر اُٹھایا اور آپس میں گتھم گتھا ہوئے اور اس کا براہ راست فائدہ سکھوں کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو مِلا۔

9

سکھ دور.... کشمیریوں کی بَرزخ سے واپسی!

''پکار'' کے زیرِ نظر کالموں میں سرزمین کشمیر کی تاریخ پر مضامین کے رواں سلسلے کا سب سے بڑا اور اہم مقصد میرے سامنے یہ تھا کہ تنازعۂ کشمیر کی جڑوں کو تلاش کیا جائے اور کشمیری عوام، جو کہ گزشتہ ساڑھی چھ دہائیوں سے بھارت اور پاکستان کے پنجوں سے باہر نکلنے کیلئے برسرِ پیکار ہیں، کو یہ باور کرایا جائے کہ اُن کی جدوجہد صرف 63 سال پُرانی نہیں بلکہ یہ ہاتھا پائی، چھٹپٹاہٹ اور مزاحمت رنچن شاہ کیساتھ شروع ہو کر کشمیر پر مغل شہنشاہ اکبر کے قبضے کے ساتھ اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی جبکہ اسکا اصل آغاز کوٹہ رانی کی طرف سے ادھیان دیو کی دعوت کے ساتھ ہو گیا تھا۔ لیکن اس کیلئے کسی اور کو ذمہ دار ٹھہرانے کی بجائے اپنا قومی محاسبہ کرنا زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ کشمیر کے آخری حکمران یعقوب اور یوسف شاہ چک نے یہاں ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے، جن کے تناظر میں مغلوں کو یہاں اپنے قدم جمانے کا موقعہ ملا۔ چکوں نے مغل دربار میں حاضریاں دے دے کر اپنی ساری کمزوریوں سے مغلوں کو باخبر کر دیا تھا، دوم یہ کہ اس کے بعد کشمیریوں کو آگے کی تاریخ میں اپنی آزادی اور خودمختاری کو بچانے اور اپنی مقدس سرزمین کو سنبھالنے کے مزید کئی مواقع ملے لیکن انہوں نے نہ صرف یہ مواقع گنوا دیئے بلکہ ساتھ ہی اپنے پیروں پر بھی کئی مرتبہ خود کلہاڑی چلائی اور باہر کے لوگوں کو پہلے تو خود اپنے اوپر مسلط کر ڈالا اور پھر انہی کے خلاف مصروفِ جدوجہد رہے وار علامہ اقبال کے اس شعر کی عملی تفسیر بنے رہے۔

پلٹنا ، جھپٹنا ، جھپٹ کر سنبھلنا
لہو گرم گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!

اپنے لہو کو گرم رکھنے کے لئے کشمیری غیروں پر پلٹنے اور جھپٹتے تو رہے لیکن اس دوران وہ اپنی قومی حمیت، غیرت، عزت اور آبرو کو ایک غیر محسوس طریقے سے گنوا بیٹھے اور بیرونی تسلُط اِس سرزمین کا مقدر بن گیا، جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔

کسی بھی قوم کے تشخص اور شناخت پر یہ ایک کاری ضرب ہوتی ہے کہ اُس کے قائدین اور افراد کو غیروں کے رحم و کرم اور امداد پر زندہ رہنے کی عادت پڑ جائے۔ 1947ء میں کشمیری قائدین کی

نظریں بھارت پر تھیں اور پچاس سال بعد جب عسکری تحریک شروع ہوئی تو ہمارے علیحدگی پسند قائدین کی نگاہیں پاکستان پر جالگیں۔لیکن پوری قوم کے ساتھ ساتھ کشمیر کے مشکبار گلستانوں، پھولوں اور بلبلوں کو اُس قائد اور مسیحا کا اب تک انتظار ہے جو صرف کشمیری عوام کے بارے میں کشمیری بن کر سوچے گا اور اس وطن کی عظمتِ رفتہ بحال کرے گا۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے دُرانیوں کے قیامت خیز مظالم سے بھرے تاریخِ کشمیر کے 67 برسوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی، حالانکہ ایک ہفت روزہ اخبار کے کالموں میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ اِن میں سارے واقعات کا احاطہ کیا جائے لیکن پھر بھی سمندر کو کولڈ ڈرنک کی بوتل میں بند کرنے کی جس قدر بھی قلمی کوشش ممکن ہوتی ہے، کی جاتی ہے۔افغانیوں پر اگر آسمانی آفت نہ ٹوٹتی تو نہ جانے وہ کب تک کشمیریوں کی چھاتوں پر مونگ مرچی اور دیگر مصالحہ جات دلتے رہتے۔ دُرانی کی گرفتاری اور دُرگت کے بعد تمام کا کرخان، چراغ بیگ اور اسد خان خجل ہو کر کشمیر سے چلے گئے۔اس دور میں چونکہ کشمیری پنڈتوں اور اہلِ تشیعہ پر سب سے زیادہ مظالم ڈھائے گئے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے دِل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو تسخیر کشمیر کرنے کی دعوت دی۔ پنڈت لیڈر بیربل نے جب رنجیت سنگھ کو یہ دعوت دی تو وہ پہلے کافی گھبرا گیا کیونکہ وہ اس سے قبل بھی کشمیریوں کی شمشیر زنی اور شہ زوری کا مزہ چکھ چُکا تھا۔لیکن بیربل نے رنجیت سنگھ کو لالچ اور سبز باغ دِکھلا کر آمادہ کر لیا۔محمد الدین فوق کے مطابق ''بیربل نے رنجیت سنگھ کو طرح طرح کے خواب دِکھلائے اور کامیابی کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ تمام ہندو (پنڈت) جان و مال سے آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں اور ملک میں جو ظلم وستم ہو رہا ہے۔اُس لحاظ سے فتحِ کشمیر کوئی بڑی بات نہیں۔رنجیت سنگھ آخر کار راضی ہو گیا، تاہم اُس نے فوجی نقصانات اور مصارفِ جنگ کا ذمہ دار بیربل کو بنا دیا۔اور اس کے لڑکے راجہ ورکو یرغمال بنا کر رکھ لیا......'' المختصر یہ کہ پونچھ کے کُچھ باغی زمینداروں اور مہاراجہ آف جموں گلاب سنگھ کے ہمراہ سکھوں کا ایک بہت بڑا اٹڈی دل راجوری سے دو راستوں (پوشانہ اور درہال) سے کشمیر کی جانب بڑھا اور ہیرہ پورہ شوپیان کے راستے سے وادی میں داخل ہو گیا۔خالصہ افواج جب پیر پنجال کی چوٹیوں پر پہنچیں تو افاغنہ لشکر، جس کو شوپیان کے پاس تیار رکھا گیا تھا، خالصوں پر ٹوٹ پڑیں اور بہت خون ریزی ہوئی۔ پٹھانوں کو کافی کامیابی ملی اور وہ سکھوں کو کافی پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے۔لیکن کئی دِن کی خونریزی کے بعد ظفر جنگ بہادُر (باغی) کے سپاہیوں میں سے کسی نے جبار خان کے بازو پر ضرب لگا دی اس چوٹ نے اُسے قدرے بےقرار و بےہوش کر دیا کہ وہ واپس سرینگر فرار ہو گیا اور اپنا مال و اسباب باندھ

کر بارہمولہ کے راستے سے کابل بھاگ گیا۔ اُدھر جب سکھوں نے پٹھانوں کو بھاگتے دیکھا تو اُن پر بھی جلال آ گیا اور انہوں نے پورے ملکِ کشمیر کو روندنا شروع کر دیا۔" (مکمل تاریخ کشمیر / محمدالدین فوق / صفحہ نمبر 661)

لیکن انگریز مورخ اور زرعی اصلاح کار سر والٹر لارنس کے مطابق افغان گورنر فتح خان بازکزئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے مطابق پٹھانوں پر لازم تھا کہ وہ ہر سال آٹھ لاکھ روپے سکھ مہاراجہ کو کشمیر کے عوض ادا کریں، فتح خان اپنے بھائی عظیم خان کو کشمیر کا گورنر بنا کر کابل چلا گیا لیکن عظیم خان ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام رہا اور اس کے ردِعمل کے طور پر سکھ افواج نے کشمیر پر 1814ء میں حملہ کر دیا۔ (ویلی آف کشمیر صفحہ نمبر 198) لارنس کے مطابق خالصہ افواج نے پیر پنجال کے راستے پیش قدمی کی جبکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سارے حملے (آپریشن) پر پونچھ سے نگاہ رکھی اور ہر کام اپنی ہدایت پر کروایا۔ لیکن اس بار بھی فتح خان نے نہ صرف یہ کہ سکھوں کو واپس کر دیا بلکہ آٹھ لاکھ روپے ادا کر کے سابقہ معاہدہ کی توثیق کروالی لیکن اُس کا بھائی عظیم خان پھر اپنا وعدہ وفاء کرنے سے ناکام رہا حالانکہ اُس نے اپنے لئے دو کروڑ روپے اکٹھے کر لئے اور اس چار سو بیسی سے خفاء ہو کر 1814ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حتمی حملہ کر دیا۔ پٹھانوں نے سکھ افواج کو شوپیان میں ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن پنڈت بیر بل دھر کشمیر سے 'نگلی نارواؤ' علاقے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کے ہمراہ اُس کا بیٹا راج کاک بھی تھا۔ دونوں نے لاہور جا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ سے مدد کی بھیک مانگی۔ ادھر جب عظیم خان کو اس غداری کا پتہ چلا تو اُس نے اپنے سپاہیوں کے ذریعے بیر بل کے گھر کی خواتین کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اگر چہ اُس کی والدہ نے خودکشی کر لی لیکن اُس کی بہو کو کلمہ پڑھا کر کابل بھیج دیا گیا" لارنس کے مطابق "جب عظیم خان کو بیر بل کے مشن کی کامیابی کا علم ہوا تو وہ ہوشیار ہو گیا اور انتہائی عجلت کی حالت میں اپنے بھائی جبار خان کو کشمیر کا گورنر بنا کر خود کابل روانہ ہو گیا اور پھر 1819ء میں مصر دیوان چند، رنجیت سنگھ کا فوجی جنرل جموں کے مہاراجہ گلاب سنگھ کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور کشمیر وادی پانچ پیڑیوں کی مسلم حکمرانی کے بعد ایک بار پھر غیر مسلموں (سکھوں) کے ہاتھوں میں چلا گیا (لارنس کے مطابق) سکھوں کی آمد کشمیریوں، خاص طور پر یہاں کے کسانوں اور زمینداروں کے لئے ایک خوشخبری سے کم نہ تھی جو انتہائی ظالم اور بے رحم پٹھان سرداروں کی باجگزاری اور سختیوں کی وجہ سے بے حد پریشان تھے۔

کشمیر کی تہذیب وتمدن اور تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے آئی اے ایس آفیسر اور کشمیر کے

سابق ڈویژنل کمشنر پرویز دیوان (جن کی پیدائش سرینگر میں ہوئی ہے) اپنی تین جلدوں پر مشتمل تاریخِ ریاست (Pervez Divans Jammu , Kashmir &Ladakh) کی پہلی جلد (Kashmir) میں لکھتے ہیں :- ''دیوان چند کشمیر میں سکھوں کا پہلا گورنر تھا، اُس نے اپنا نام ''ظفر جنگ'' رکھا تھا، سکھوں کے 27 / سالہ دور میں کشمیر میں 9 / سکھ گورنر تعینات رہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے صرف تین گورنر سکھ تھے جبکہ باقی سب پنجابی مسلمان تھے۔ رنجیت سنگھ کو ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا کہ کہیں اُس کا کوئی گورنر کشمیر میں خودمختاری یا آزادی کا اعلان نہ کر دے۔ اِس لئے وہ انھیں وقت بے وقت بدلتا رہتا تھا۔ اُس کے شک کی وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل افغان دور میں ایسا ہو چکا تھا۔ کشمیر مورخین نے اگرچہ بعض سکھ گورنروں کے مظالم کی لمبی داستانیں رقم کی ہیں لیکن اِن مظالم میں سرِ فہرست ٹیکسوں کا نفاذ تھا۔ سکھ گورنروں میں سے دو گورنر بہت مقبول رہے، جن میں دیوان کرپارام اور کرنل مہیان سنگھ کمنے دان (کمانڈر) قابلِ ذکر ہیں''۔

دیوان کرپارام کا عرصہ 1827ء سے 1831ء تک تھا، وہ سکھ گورنروں میں سب سے زیادہ شریف طبیعت اور مہربان گورنر رہا ہے۔ وہ زیادہ تر تفریحی پروگراموں میں ہی مست رہتا تھا، اُسی کے دور میں سرینگر کا رام باغ تعمیر کیا گیا۔ اُس نے اُس وقت رنجیت سنگھ کو کھری کھری سُنائی جب مہاراجہ نے واجب الادا ٹیکس سے زیادہ رقم طلب کی اور عوام پر ٹیکسوں کی شرحیں بڑھانے کا حکم دیا۔ دیوان کرپا رام نے بادشاہ کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ دیوان کرپارام کی رحمدلی اور غیرت کا عالم یہ تھا کہ اُس نے مہاراجہ کے کثرتِ مطالبہ سے تنگ آ کر ہری دوار یا بنارس جا کر گمنامی کی زندگی کو ترجیح دی ۔اس کے برعکس اُس کا چیف سکریٹری غلام محی الدین نامی مسلمان (کشمیری) تھا، جو گورنر کی پوسٹ خالی ہو جانے کے بعد از خود مہاراجہ کی خدمت میں گورنری کی ملازمت کے لئے حاضر ہوا (پرویز دیوان)

دوسرا سکھ گورنر جو اپنی شرافت اور انصاف پسندی کی وجہ سے مقبول عام تھا کرنل مہیان سنگھ تھا، اس نے سات سال تک حکومت کی، اس کا عرصۂ اقتدار 1834ء سے 1841ء تک رہا، وہ ایک بہادر سپاہی کے طور پر بھی جانا جاتا تھا، اُس کے جسم پر ستائیس کے قریب جنگی زخم تھے، جنھیں وہ اپنے لئے بہادری کے طمغوں سے تشبیہ دیتا تھا۔ رنجیت سنگھ کے تمام گورنروں میں سے اُسے مقبولیت حاصل تھی، اُس نے شادیوں پر سے ٹیکس معاف کر دیا تھا۔ اُس کے زمانے میں شدید قحط پڑا تو اُس نے بے شمار لوگوں کی مدد کی اور زرعی پیداوار پر بھی لگان وغیرہ معاف کر دیا۔ اُس کے زمانے میں امیرا کدل کی ازسرِ نو تعمیر کی گئی۔ لیکن افُ یہ بدقسمتی! اُس کے سپاہیوں کو مہیان سنگھ کی یہ دریادلی اچھی نہیں لگی اور اُنھیں

محسوس ہوا کہ کرنل یہ کام فوجی اخراجات میں کٹوتی کر کے انجام دے رہا ہے لہٰذا حسد کے مارے فوجیوں نے اُسے ہلاک کر دیا۔

مورخین اور محققین کے لئے یہ بات بہت مشکل ہے کہ وہ سکھ دور کو ایک بیرونی تسلط قرار دیں یا پھر وُصولی کا ظالمانہ دور، البتہ چھتہ بل سرینگر میں اس دور میں ایک بہت ہی دلدوز اور عبرتناک واقعہ پیش آیا۔ جس میں سکھ حاکموں نے ایک گائے کو ذبح کرنے کی پاداش میں ایک ہی گھر کے 18/افراد کو زندہ جلا دیا لیکن اس طرح کی باتیں خال خال ہی ہوتی تھیں۔ صوفی محی الدین کے مطابق ''یہ سکھ گورنر مہیان سنگھ تھا جو کشمیر میں گھر گھر گھوم کر یہ جائزہ لیتا رہا کہ کہیں کوئی آدمی بھوکا نہ مر جائے حتیٰ کہ اس دوران اُس کے اکیلئے بیٹے کی ماں بھی مر گئی''

ایسے کئی مورخین کشمیر میں موجود ہیں جو سکھ دور کو محض اس لئے ''بیرونی قبضہ'' قرار دیتے ہیں کہ سکھ غیر مسلم اور غیر کشمیری تھے ورنہ محض چند ایک انسانی لغزشوں (مظالم) کو چھوڑ کر سکھوں کے اقتدار کا 27/سالہ دور کشمیر میں بڑے آرام سے گزر گیا تاہم سکھ دور میں کئی بار کشمیر میں قحط پڑا جس سے بیشمار لوگ مارے گئے۔ پرویز دیوان کے مطابق ''کشمیر میں سکھ دور میں کئی بار قحط پڑا، خاص طور پر 1833-34ء میں کشمیر میں قحط سے بُری حالت ہوئی لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نہ صرف یہ کہ خود کشمیر آ کر صورتحال کا جائزہ لیا بلکہ عام لوگوں کی امداد کے لئے مہیان سنگھ جیسے قابل اور نیک گورنر کو بطور خاص یہاں تعینات کیا اور اُسے ہدایت دی کہ وہ مسجدوں اور مندوروں میں راشن کی تقسیم کے لئے مفت کیمپوں کا انعقاد کرے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات 1838ء میں ہوگئی۔

آج کے دور میں جو بے خبر لوگ اور موقعہ پرست سیاستدان ریاست جموں وکشمیر کے قومی اور تہذیبی تشخص کے تحفظ کے لئے دفعہ 370/کو لاگو کروانے کا دعویٰ کر کے کئی دہائیوں سے کشمیر میں ''ووٹ سیاست'' کے بل بُوتے پر کرسی اقتدار پر براجمان ہیں، اُنھیں اس تاریخی حقیقت سے نظر نہیں چُرانی چاہیئے کہ سکھوں کے دورِ حکومت میں کشمیر میں پاسپورٹ سسٹم رائج تھا اور کوئی بھی کشمیری تب تک باہر نہیں جا سکتا تھا جب تک اُس کے پاس حکومت کا جاری کردہ اجازت نامہ (پاسپورٹ) نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ اُسے ''ٹانگہ'' نامی خارجی (Exit-Tax) بھی ادا کرنا پڑتا تھا، اگرچہ کشمیری اس قانون کی وجہ سے کافی پریشان تھے اور اُنھیں اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا لیکن اس قانون کا مقصد کشمیر سے بڑے پیمانے پر ہجرت کو روکنا تھا۔ خاص طور پر قحط کے ایّام میں اور موسمی تباہ کاریوں کے دوران یہ بات بھی

تاریخ کے اوراق پر بکھری پڑی ہے کہ ان مشکل حالات میں اکثر کشمیری پنڈت آبادی کشمیر وادی سے ہجرت کر جاتی اور جب حالات ٹھیک ہو جاتے تو پھر واپس آجاتی یہ روایت تقریباً 20 رسال قبل کشمیر میں عسکری تحریک کے آغاز کے دوران بھی دوہرائی گئی لیکن اس بار غلطی یہ ہوئی کہ پنڈت برادری نے اپنے مکانات اور کھیتی باڑی فروخت کر کے اپنی واپسی کے سبھی راستے بند کر ڈالے، اس کے باوجود بھی کشمیر کے کھیت، کھلیان اور مرغزار و کُہسار اپنے ان قدیم باشندوں کے منتظر ہیں اور یہاں کی آبادی بھی راستوں میں نظریں بچھائے بیٹھی ہے۔

بہر حال دیوان کے مطابق ''پاسپورٹ قانون نافذ کرنے کے پسِ پردہ 1834ء کا وہ قحط تھا، جس دوران کشمیریوں نے بڑے پیمانے پر یہاں سے ہجرت کر لی، جہاں اُن میں سے بڑی تعداد غریبی اور مفلسی کی وجہ سے مر گئی لہذا مہاراجہ کو کشمیریوں کی ہجرت کے لئے یہ قانون نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی مشکلات کی طرف بھی خصوصی توجہ دینا پڑی۔

''والٹر لارنس سکھ دور کے حوالے سے رقمطراز ہیں:- ''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کشمیر میں سکھ دور بہت اچھا اور رحم لانہ تھا تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ سکھ دور پٹھانوں سے کافی بہتر اور مختلف تھا''لارنس Moor croft نامی کتاب کے باب 3 اور صفحہ نمبر 294 کے حوالہ جات کے تناظر میں لکھتے ہیں کہ سکھوں نے زرعی نظام میں کافی سدھار کیا تھا اور کشمیریوں کو عذاب وعتاب سے کچھ چھٹکارا ملا تھا۔

10

جب کشمیر کو کھوٹے سکوں کے عوض بیچا گیا!

والٹر لارنس اپنی شہرہ آفاق کتاب میں مزید لکھتے ہیں:۔ موتی رام کشمیر میں پہلا سکھ گورنر تھا، ہری سنگھ اور سکھوں کو کشمیر لانے والے پنڈت بیر بل کو بھی حکومت میں شامل کر لیا گیا، ہری سنگھ نے شمال مغرب (اوڑی اور مظفر آباد) کے بمبوں اور ککھوؤں کو اعتماد میں لے کر اس خطے میں امن بحال کرایا۔ (کیونکہ یہ دونوں قومیں ہر دور میں بیرونی حملہ آوروں کے خلاف نبرد آزما رہتی تھیں) کرپا رام 1825ء میں کشمیر کا گورنر تھا، وہ زیادہ تر کشتی رانی اور کشتیوں میں رہنے والی خواتین کا بہت دِلدادہ تھا (ویلی آف کشمیر صفحہ نمبر 199) ہانجیوں نے اُس کا نام "کرپہ شرونی" رکھا تھا۔ "شرونی" کشمیری میں شکارا چلانے والے چپّو کی آواز، گھنگھرو یا پازیب کی آواز کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ 1827ء میں کشمیر میں شدید زلزلہ آیا جس سے شہر سرینگر تقریباً تقریباً پوری طرح تباہ ہو گیا۔ اسی سال تین کشمیری پنڈتانیوں نے "ستی" کی آگ میں کود کر جان دے دی۔ جبکہ اس کے بعد وادی میں کالرا کی بیماری پھوٹ پڑی۔ کرپا رام نے پانچ سال کشمیر میں گورنری کی اور اسی دوران ایک شام جب وہ طرب و نشاط کی ایک محفل میں جھیل ڈل کے کنارے مگن تھا کہ لاہور سے رنجیت سنگھ کا بُلاوا آ گیا اور سے معزول کر کے ہردوار بھیج دیا گیا۔ جہاں اُس نے باقی زندگی گمنامی کے عالم میں بسر کی"

دیوان کرپا رام کے اس انجام کے بارے میں پرویز دیوان کی کتاب سے پہلے ہی حوالہ جات پیش کئے جا چکے ہیں کہ اُس نے مہاراجہ کے ایک حکم کی مخالفت کرتے ہوئے کشمیریوں سے اضافی لگان لینے سے انکار کر دیا تھا اور گورنری کا عہدہ چھوڑ کر گمنامی کے اندھیروں میں چلا گیا۔ اس کے بعد 1831ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ کشمیر کا گورنر نامزد ہوا۔ شیر سنگھ بھی سیر و تفریح کا دلدادہ تھا اور اُس نے تمام کارِ سلطنت اپنے ایک نائب بیساکھ سنگھ کے سُپرد کر دیئے تھے۔ اسی زمانہ میں کشمیر میں شدید قحط پڑا۔ لاہور سے جمعدار اور خوشحال سنگھ کو مہاراجہ نے خصوصی طور پر کشمیر روانہ کیا اور اُسے اس حوالے سے ضروری انتظامات کرنے کی ہدایت دی گئی لیکن اُس کی غلط پالیسی کی وجہ سے قحط کی شدت

میں مزید اضافہ ہو گیا اور اس وجہ سے بے شمار کشمیری بھکمری سے ہلاک ہو گئے۔ جبکہ بے شمار لوگ پڑوسی ریاست پنجاب میں ہجرت کر گئے۔ کہتے ہیں کہ شیر سنگھ کے دور کا یہ قحط اس قدر شدید تھا کہ اس کی مثال آج بھی کشمیر میں دی جاتی ہے۔ 1833ء میں کرنل مہیان سنگھ کو کشمیر کے گورنر عہدے پر تعینات کیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اُس نے پنجاب سے اپنے ساتھ غذائی اجناس اور انڈے وغیرہ درآمد کرائے، جس سے ان کشمیری کسانوں اور دیہاتیوں کی حالت میں سدھار آیا، جو قحط کی وجہ سے اپنی فصلوں کے بیج تک چٹ کر گئے تھے۔ مہیان سنگھ نے عوام کو کچھ ریلیف دیتے ہوئے لگان وغیرہ میں کمی کرائی اور انتظامیہ میں رد بدل کر کے عوام کا اعتماد بحال کرایا۔ اُس نے زرعی معاملات میں تبدیلیاں لائیں اور لگان وصولی کا نیا نظام تشکیل دیا، جس سے کسانوں پر کچھ بوجھ ضرور بڑھا لیکن اس کے نتیجہ میں زرعی پیداوار میں اضافہ بھی ہوا، زرعی قرضہ جات پر سود معاف کر دیا، ناپ طول کے نظام میں بھی سدھار لایا گیا اور فراڈ دلالوں کو سزائیں دی گئیں۔ کرنل مہیان سنگھ مقدمات اور معاملات کا فیصلہ فوراً اور مساوات کے اصول پر سُناتا تھا۔ والٹر لارنس لکھتا ہے ''مہیان سنگھ کی اصلاحات اور غریب پروری سکھ فوج سے نہ دیکھی گئی اور اُسے ہلاک کر دیا گیا۔ یہ خبر سن کر مہاراجہ گلاب سنگھ بذات خود کشمیر آیا اور اپنے ساتھ ایک خصوصی فوجی دستہ بھی لایا۔ قتل کی تحقیقات کے بعد اُس نے شیخ محی الدین نامی مقامی کشمیری کو گورنر کے عہدے پر تعینات کر دیا، ۔ یہ 1842ء کا زمانہ تھا''

اسی دور، یعنی 1842ء میں کشمیر کے شمال میں وادیٔ کرناہ سے بمبہ افواج نے وادی پر حملہ کر کے ایک بار پھر افراتفری کا ماحول قائم کر دیا۔ یہ قوم خود کو ترک الاصل جتلاتی ہے اور زمانہ قدیم سے ہی انتہائی جنگجو قوم رہی ہے، اُن کا لیڈر سلطان زبردست خان سرینگر میں سکھوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا لیکن بمبہ راجہ شیر خان نے اس کا بدلہ لینے کے لئے شہلہال کپواڑہ میں ایک سکھ فوجی چھاونی پر حملہ کر دیا اور تقریباً سات ہزار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جبکہ مزید 8000 ہزار فوجیوں کے ساتھ سرینگر کی جانب پیش قدمی کی۔ یہ موسم سردی کا تھا، شدید برف باری کی وجہ سے سکھ بمبوں کا مقابلہ نہ کر سکے لہٰذا انہوں نے سلطان زبردست خان کو رہا کر کے بمبوں کے سُپرد کر دیا'' (ویلی آف کشمیر صفحہ نمبر 200) اگلے سال 1843ء میں سرینگر کی جامع مسجد کے دروازے نمازیوں کے لئے دوبارہ کھول دیئے گئے جو کہ 1819 میں افغانوں کی شکست اور سکھوں کی آمد کے وقت بند کر دیئے گئے تھے، یہ کام سکھوں کے مقامی گورنر شیخ غلام محی الدین نے انجام دیا اور اس کے بعد یعنی 1845ء میں امام الدین کشمیر کا گورنر بنا، جبکہ 1846ء میں ریاست جموں و کشمیر کا تمام وہ حصہ، جو دریائے سندھ کے مشرق کی

جانب اور دریائے راوی کے مغربی جانب (موجودہ کٹھوعہ سے لے کر کرناہ اور گریز تک) جس پر سکھوں کا قبضہ تھا اور جسے انگریز حکومت کو بطور تاوان یا ہرجانہ چھوڑ دیا گیا تھا، بیع نامہ امرتسر کی رُو سے جموں کے مہاراجہ گلاب سنگھ کو دے دیا گیا۔ اور ڈوگروں نے اس کے عوض انگریز حکومت کو محض 75/لاکھ روپے کا معاوضہ ادا کیا۔ لیکن امام الدین اگرچہ ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ کا دوست بھی تھا لیکن اُس نے اس معاہدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے بہادر بمبہ راجہ شیر احمد اور اُس کی فوج کی مدد حاصل کی اور قلعہ ہاری پربت پر قبضہ کرکے 40/دن تک ڈوگروں کے خلاف لڑتا رہا۔ اس دوران مہاراجہ گلاب سنگھ کی بُری طرح شکست ہوئی اور اُس کا نمائندہ لکھپت رائے مارا گیا، بمبوں اور کھکھوں نے پوری وادی پر یلغار کر دی اور شہر سرینگر میں قتلِ عام شروع کر دیا، اس صورتحال کے پیشِ نظر انگریز فوج ڈوگروں کی مدد کے لئے جب جموں پہنچی تو امام الدین نے ہتھیار ڈال دیئے۔

<u>بیع نامہ امرتسر 1846ء</u>:- سکھوں کی تنابیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کی بعد ڈھیلی پڑ چکی تھیں، ایسٹ انڈیا کمپنی یا برطانوی سامراج نے بھارت پر اپنا تسلط اس حد تک جما لیا تھا کہ اب وہ مختلف ریاستوں سے باج وصول کرتے تھے۔ پنجاب کے سکھ راجہ دلیپ سنگھ پر ایک کروڑ کا ہرجانہ عائد کرتے ہوئے تاجِ برطانیہ کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے لاہور معاہدے پر دستخط تو کر دیئے تھے لیکن ابھی اس معاہدے کی سیاہی بمشکل ہی خشک ہوگی تھی کہ انگریزوں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اُس نے ایست انڈیا کمپنی کی 'سکرٹ کمیٹی' کے ممبران کو ایک خط لکھ کر بتادیا کہ کُلو اور کانگڑہ کے علاوہ منڈی ہماچل پردیش کے علاقہ جات کو کمپنی بہادر کے دائرے سے باہر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس لئے یہ پورا ضلع انگریزوں کے پاس رہنا چاہیے۔ اس حوالہ سے پروفیسر فدا محمد حسنین لکھتے ہیں:

> ''لاہور معاہدہ 1846ء پر مہاراجہ دلیپ سنگھ کے دستخط نہیں ہیں، کیونکہ وہ اس وقت نابالغ تھا، معاہدے پر اس کے بھائی رام سنگھ اور دوسرے امراء نے دستخط کئے تھے.... معاہدۂ امرتسر پر F C wonix کے دستخط ہیں اور یہ معاہدہ گورنر جنرل اور راجہ گلاب سنگھ کے درمیان طے ہوا تھا''

(بحوالہ Brithish Policy towards Kashmir)

اس معاہدہ کے عوض اس نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کے ہرجانے سے 25/لاکھ روپے کم کر دیئے اور 75/لاکھ کا مطالبہ کیا اور اسی فیصلے کے تناظر میں 16/مارچ <u>1946</u>ء کے دن برطانوی سامراج اور سکھ راجہ دلیپ سنگھ کے درمیان 75/لاکھ روپے کے عوض بیع نامہ امرتسر پر دستخط ہوئے۔ (پرویز دیوان)

محمدالدین فوق لکھتے ہیں:

''سرکارانگریزی نے بلاوجہ چھیڑخوانی کے معاوضہ میں لاہورسرکار(سکھوں) سے ستلج اور بیاس کے پہاڑی اورمیدانی علاقوں کےعلاوہ ایک کروڑ روپےنقد باپتِ مصارفِ جنگ طلب کیا، چونکہ اس قدر بڑی رقم کا ادا ہونا مشکل تھا، اس لئے مہاراجہ دلیپ سنگھ نے اس رقم کے عوض صوبۂ کشمیر و ہزارہ معہ علاقہ کوہستانی بطور دوام کمپنی بہادُر کوتفویض کردیا، چونکہ اس وقت صاحبانِ عالیشان کو روپے کی ضرورت تھی، اس لئے انہوں نے 75/لاکھ روپے کے عوض صوبۂ کشمیر کومہاراجہ گلاب سنگھ(ڈوگرہ) کے حوالے کردیا۔15/مارچ 1846ء کوامرتسر میں اُسے مہاراجہ کا خطاب دیا گیااور 16 مارچ کو وہیں عہد نامہ لکھا گیا''(مکمل تاریخ کشمیرصفحہ نمبر 789) یہ سرزمین پاک، صوفیوں اور ریشیوں کا مسکن، گلستانِ مشک باریعنی کشمیر کے بُلبلوں کوتاریخ میں ایسے موڑ بھی دیکھنے کو پڑے ہیں جب وقت کے حاکموں نے اُنھیں کھوٹے سکوں کے عوض خریدا اورفروخت بھی کیا لیکن اس کے باوجود بھی اُنہوں نے نہ تو ایک دوسرے کے وجود کوتسلیم کیا اور نہ ہی مرغِ میدانی سے شاہین کوہستانی بننے کی آرزو کی۔

افسوس! صد افسوس! کہ شاہین نہ بنا تُو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات!
تقدیر کے قاضی کا ہے فتویٰ یہ ازل سے
ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

بلبلانِ گلستانِ کشمیرخاموش دیکھتے رہے اور گوری سرکار نے خالصہ سرکار سے اُنھیں خرید کر ڈوگرہ شاہی کوفروخت کردیا۔اوروطنِ عزیز کی تاریخ داغدار ہوتی رہی ہے!

تاریخِ کشمیر کے مطابق:-''عہد نامہ امرتسر کی رُو سے انگریز سرکار کولاہورسرکار پر بہت سے اختیارات حاصل ہوگئے، اسی عہد نامہ کے مطابق وزارت کونسل کے بجائے 'کونسل' کاتقرر ہوااورکونسل کوریذیڈنٹ کے ماتحت رکھا گیا، انگریزفوج کے اخراجات کے لئے لاہورسرکار پر بائیس لاکھ کا سالانہ بوجھ ڈالا گیا، مہارانی کا سالانہ وظیفہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا اور ایک خودمختار مہارانی انگریزوں کی وظیفہ خوار بن گئی۔یہ عہد نامہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے بالغ ہونے یعنی 4/دسمبر 1854ء تک قائم رہا، اس عہد نامہ کی وجہ سے مہارانی چنداں کافی بوکھلا گئی تھی، وہ انگریزوں کے خلاف اندر ہی اندر شازشیں کرتی

رہی اور جب اس کی خبر انگریزوں کو ہوئی تو انہوں نے اُسے قلعۂ شیخو پورہ (لاہور) میں بند کر دیا لیکن وہ یہاں بھی خاموش نہ بیٹھی تو اسے بنارس بھیج دیا گیا، وہاں سے فرار ہونے والی ہی تھی کہ پکڑی گئی اور چنار گڑھ منتقل کر دی گئی۔ اسی طرح وہ نیپال سے ہوتے ہوئے اپنے بیٹے کے پاس لندن پہنچ گئی''

ڈوگروں کے داخلۂ کشمیر کے بارے میں فوق لکھتے ہیں ''ڈوگروں کے آخری گورنر شیخ امام الدین نے کافی مزاحمت کی لیکن جب انگریزی افواج کی مدد ڈوگروں کیلئے جموں پہنچی تو شیخ نے مزاحمت ترک کرنے اور اطاعت قبول کرنے کا ارادہ کر لیا، وہ تھنہ منڈی راجوری چلا گیا، جہاں انگریز کمانڈر لارنس موجود تھا۔ 31/ اکتوبر 1846ء کو دونوں کی ملاقات بہرام گلہ میں ہوئی اور یکم نومبر کے روز گورنر کشمیر لیفٹنٹ ایڈورڈ کے ہمراہ تھنہ منڈی واپس آ گیا، شیخ امام الدین نے انگریزوں کو بتا دیا کہ وہ سکھ راجہ لال سنگھ کے کہنے کے مطابق ڈوگروں سے لڑتا رہا اور اب اُن کے ہی کہنے پر ہتھیار چھوڑ رہا ہے

آخر کار کرنل لارنس اور مہاراجہ گلاب سنگھ تھنہ منڈی سے روانہ ہو کر کشمیر میں داخل ہوئے اور اس طرح کشمیر کے یہ حسین مرغزار و کُہسار سکھوں کے تسلط سے نکل کر انگریزوں کے توسط سے ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ کی دسترس میں آ گئے اور 1846ء سے 1947ء تک کے اگلے 101/ سال تک ڈوگرہ شاہی کا اس سر زمین پر غلبہ رہا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ پہلا ڈوگرہ راجہ تھا، سر والٹر لارنس کے مطابق گلاب سنگھ ایک بہادر اور جری حکمران تھا، وہ ایک دور اندیش حاکم تھا اور چونکہ اُس کے داخلۂ کشمیر میں بمبہ اور کھکھا راجے کافی رکاوٹ ڈال چکے تھے اس لئے وہ سب سے پہلے انہی ''دشمنوں'' سے اپنے ملک کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ اس غرض کیلئے اُس نے کوہِ وتان اور نستہ چھن (نیلم ویلی) کے پہاڑی سلسلے میں کئی قلعے تعمیر کروائے اور سڑکیں تعمیر کروا کر وہاں اپنی بھاری فوجی کمک بھی تعینات کروائی لیکن شیر احمد خان مسلسل سات سال تک انہیں پریشان کرتا رہا تاہم گلاب سنگھ نے اُس کے ساتھ سخاوت اور دریا دلی کا روّیہ روا رکھا اور وہ یاری پورہ تحصیل دیوسر (کولگام) میں آ کر آباد ہو گیا اور وہیں وفات پائی۔ اس پریشانی سے چھٹکارا پانے کے بعد گلاب سنگھ نے زرعی اصلاحات پر توجہ مرکوز کی اور پوری وادی کی سر زمین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ پہاڑی قرار دیا گیا، ایک حصہ زیرِ آب یعنی دھان کی کھیتی پر مشتمل تھا۔ جبکہ تیسرا حصہ جاگیر داروں کے قبضے میں تھا۔ مہاراجہ نے کشمیر میں اپنے تیز طرار افسروں کو تعینات کر کے لگان اور ٹیکس کی وُصولی کو یقینی بنانے کے تمام اقدامات کئے ۔ بعض مورخین کے مطابق جو رقم یعنی 75/ لاکھ روپے، مہاراجہ گلاب سنگھ نے بیع نامہ امرتسر کے وقت انگریزوں کو ادا کی تھی، وہ کشمیری عوام سے ٹیکس وصول

کر کے محض چند برسوں میں واپس حاصل کر لی۔ لیکن بعض مورخین کے مطابق مہاراجہ نے واضح حکم دے رکھا تھا کہ وصولی براہِ راست سرکاری خزانے تک پہنچنی چاہیے اور سرکاری اخراجات میں کمی کی جانی چاہیے تا کہ بیع نامہ امرتسر کے وقت انگریزوں کی ادا کی گئی رقم واپس جمع ہو سکے۔ اُس نے غیر یقینیت اور لاقانونیت کا سختی سے خاتمہ کیا جس کی وجہ سے وہ "ہر دلعزیز" ہو گیا۔ (والٹر لارنس)

☆☆☆

11

ڈوگرہ شاہی
جب انسانوں کی قیمت جانوروں سے کم تھی!

......انگریزوں نے 75/لاکھ روپے کے عوض پُوری (غیر منقسم) ریاست کو ڈوگروں کے ہاتھوں فروخت کردیا تھا، مہاراجہ گلاب سنگھ اپنی فوجوں کو ساتھ لے کر کشمیر وارد ہو چکا تھا اور عوام سے ٹیکس اور لگان لے لے کر اپنی وہ رقم پوری کر رہا تھا، جو اُس نے کشمیر کے عوض انگریزوں کو ادا کی تھی۔ بمبوں اور کھکھوں کے پے در پے حملوں کی شدت کچھ کم ہوئی تو مہاراجہ نے اپنی سلطنت کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ والٹر لارنس نے ''لفظ ڈوگرہ'' کی تشریح کرتے ہوئے ''ویلی آف کشمیر'' میں ایک حاشیے میں لکھا ہے ''ڈوگرہ'' لفظ: یہ اس ملک کا نام ہے، جو جموں کے آس پاس آباد ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ نام ایک'' دولفظی'' جملے سے لیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے'' دوجھیلوں کے درمیان'' والا علاقہ (جموں سروئیں سَر اور مانسر نامی دوجھیلوں کے درمیان واقع ہے جسے'' ڈُگر'' بھی کہا جاتا ہے) اس ملک میں بہت سی ذاتیں آباد ہیں، جن میں ہندو مسلمان اور سکھ مذاہب کو ماننے والے شامل ہیں، اس علاقے میں رہنے والے سبھی لوگ چاہے وہ اونچی ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں، چاہے نیچی سے، چاہے ہندو ہیں یا مسلم'' ڈوگرے کہلاتے ہیں، پہلی 'سکھ جنگ' کے موقعہ پر بحیثیت فوجی'' ڈوگروں نے کافی وقار حاصل کیا تھا اور ڈوگرہ سپاہیوں نے ہنزہ اور نگر حویلی کی فوجی چڑھائیوں کے دوران بھی اس شان اور وقار میں اور بھی اضافہ ہوا تھا اور یہی صورتحال چلاس (بلتستان) حملے کے دوران بھی قائم رہی''

لارنس، مہاراجہ گلاب سنگھ کے بارے میں مزید لکھتا ہے'' اُس نے شخصی راج کے نظام میں اصولوں کی سیاست کو شامل کر کے کافی سُدھار پیدا کرلیا تھا، اُس نے عوام پر واضح کیا کہ وہ اُن کے شانہ بشانہ چلنے کا متحمل ہے۔ وہ چاہتا تو عوام سے پُرانے اور فرسودہ نظام میں سدھار کئے بغیر خدمت کرا سکتا تھا لیکن اُس زمانے میں حکومت خود مہاراجہ کے ہاتھ میں تھی، وہ زیادہ تر کشمیر میں ہی موجود رہتا تھا، وہ بیک وقت ایک سرگرم مہاراجہ بھی تھا اور ایک ماہر سردار بھی، اُس کی پالیسیوں کی وجہ سے عوام کی کچھ حالت

بدلی اور تھوڑا اعتماد بحال ہوا۔ اُس نے 1857ء کے بدترین دنوں میں انگریزوں کی اچھی دوستی نبھائی اور اُسی سال اس دنیا سے چل بسا۔'' بتایا جاتا ہے کہ اُس کی وفات کے دِن بھی کشمیر میں ایک زلزلہ آیا۔ اُس کی سمادھی دُودھ گنگا (چھتر کول) کے کنارے (رام باغ) میں ہے۔ اُس کی جگہ اُس کے تیسرے بیٹے رنبیر سنگھ، جو کہ ایک سخت ہندو شہزادہ ثابت ہوا ہے کو کشمیر کا مہاراجہ بنایا گیا۔ اُس کی دلچسپی صرف ہندو مذہب اور سنسکرت میں تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے تئیں کافی نرم اور رحمدل تھا اور اُس نے اِنھیں ہرطرح کی مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ وہ تاج برطانیہ کے نظام حکومت سے بھی کافی متاثر تھا۔ اُس نے کافی سنجیدہ کوششیں کر کے ریاست میں ہسپتالوں اور شفاءخانوں کا نظام متعارف کرایا۔ بتایا جاتا ہے کہ 1872ء میں کشمیر کے سُنیوں اور شعیوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنی دور اندیشی اور فہم و فراست کا مظاہر کر کے شعیہ فرقے کے لئے تین لاکھ روپے کی امداد منظور کر کے معاملے کو ختم کروادیا۔

غلام احمد میر آف راجوری اپنی کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' جس کی ادارت راقم نے انجام دی ہے) میں رنبیر سنگھ کے بارے میں لکھتے ہیں ''رنبیر سنگھ کے حکومت سنبھالتے ہی 1877ء میں کشمیر میں پھر سے قحط پڑا۔ جھیلِ ولر میں کئی جانیں ضائع ہوگئیں، کشمیری بھاگ رہے تھے تا کہ فاقہ کشی سے نجات حاصل کرسکیں... سینکڑوں لوگ بھوک اور پیاس کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔ لوگوں کے پاس بہت کم قابلِ کاشت زمین تھی جبکہ زرعی اصطلاحات کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ آمدورفت کے رابطے کم تھے۔ اس لئے رنبیر سنگھ نے 1880ء میں سرینگر اور بانہال کو آپس میں جوڑنے کیلئے ایک'' ٹانگہ روڈ'' تعمیر کیا۔ جو آج کل ''سرینگر جموں NH-1 شاہراہ کے نام سے مشہور ہے تعمیر کروائی جبکہ دوسری جانب (شمال کی) جانب اوڑی/ راولپنڈی روڈ کو ترقی دی گئی اور اس کی مرمت کی گئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ مغل بادشاہ اکبر کی طرح سیکولر خیالات اور مذہبی رواداری کا قائل تھا لیکن اُس کا بیٹا پرتاپ سنگھ اس کے برعکس ثابت ہوا اور اس نے اپنے باپ کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ پرتاپ سنگھ قدرے تنگ نظر اور جنونی تھا، سکھوں کے بعد ڈوگرہ دور کی تمام زیادتیوں کو مورخین نے اُسی کے کھاتے میں ڈالا ہے''۔

تاریخ کے اوراق میں دبی جیتی جاگتی حقیقتیں بزبانِ حال بیان کرتی ہیں کہ کشمیری عوام پر ایسے بھی ادوار آئے ہیں جب مویشیوں کی قیمت انسان سے زیادہ اور اُن کی عزت و توقیر کشمیریوں سے بڑھ کر ہوتی تھی۔ اس سادہ لُوح قوم نے خاموشی کے ساتھ مگر تسلسل سے جو مظالم برداشت کئے ہیں اُن

کی وجہ سے اس کے مافی الضمیر ،اندر ہی اندر ایک لاوا پکتا رہا اور وقتاً فوقتاً بغاوت کی صورت میں باہر بھی نکلتا رہا۔لیکن ہر دور میں اس کی بدقسمتی یہ رہی کہ قیادت کے اندر پھوٹ پڑی اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کو نیچا دِکھانے کے لئے سرکشی پر آمادہ رہا۔عوام نے طویل قربانیاں دیں،صبر واستقلال کا مظاہر کیا اور تحریکوں وبغاوتوں میں آخری سانس تک قیادت کا ساتھ دیا لیکن قیادت کا باغی طبقہ دشمنوں سے جاملا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔کشمیر کی مین سٹریم قیادت ہو یا آزادی پسند، ہر دو قائدین میں سے کوئی نہ کوئی بغاوت پرآمادہ ہے۔بالا دستی کی دوڑ کوحق پرستی اور اقتدار کے حصول کو''عوامی خدمت'' قرار دے کر پوری قوم کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ بہر حال بات چھڑی تھی ڈوگرہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی ،جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اگر اُس کے دور میں کسی ڈوگرہ سپاہی کے ہاتھوں کسی کشمیری مسلمان کا قتل ہوجاتا تو عدالت سپاہی پر صرف 16/روپے کا جرمانہ عائد کرتی جس میں سے 12/روپے سرکاری خزانے میں چلے جاتے اور مقتول کے لواحقین کو صرف 4/روپے ملتے جبکہ گائے ذبح کرنے کے جُرم میں کشمیری مسلمانوں کو پھانسی دینے اور گولی ماردینے کا قانون نافذ تھا۔انہی مظالم کی داستان لکھنے پر ایک یوروپی سیاح رابرٹ تھارپ(Robert throp) کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔اس مورخ اور سیاح کے بارے میں تاریخ کی مختلف کُتب سے جو حوالہ جات ملتے ہیں۔اُن کو مجتمع کرنے کے بعد جو صورت حال سامنے آتی ہے،اُس کے مطابق رابرٹ تھراپ نے جب کشمیر آکر ڈوگرہ مظالم کی داستانیں سُنیں تو اُس نے اس کے خلاف ایک کتاب(Kashmir mismanagement) لکھی اور مغربی دُنیاء کو کشمیریوں کی مظلومیت کے چشم کُشاء واقعات کے بارے میں آگاہ کیا۔جس سے برہم ہوکر پرتاپ سنگھ کے سپاہیوں نے رابرٹ کو شنکر آچاریہ پر لیجا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔رابرٹ تھارپ کو کشمیر کی تاریخ میں ایک نہایت مخلص اور ہمدرد دوست کے طور پر یاد کیا جاتا ہے،جس نے کشمیر کے حوالے سے بیرونی دُنیاء کی آنکھیں کھولی تھیں۔اُس کی قبر آج بھی سرینگر میں جنگلات گلی کے آبی گزر عیسائی قبرستان میں موجود ہے۔راقم نے تقریباً دس سال قبل اس یوروپی سیاح کے بارے میں ایک تحقیقی مضمون لکھا تھا اور اس قبر کو کئی دن کی مشقت کے بعد مذکورہ قبرستان سے ڈھونڈ نکالا تھا۔یہ مضمون محکمۂ رورل ڈولپمنٹ کے ماہنامہ'' دیہات سُدھار'' کے ایک شمارے میں شائع ہوا لیکن بدقسمتی سے دیہات سُدھار کے ایڈیٹر اس مضمون کے ساتھ میرا نام لکھنا بھول گئے تھے۔

غلام احمد میر کے مطابق''پرتاپ سنگھ کے زمانے میں ڈوگرہ اور ہندو راجپوتوں کے علاوہ کسی بھی مسلمان کو کوئی ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔''ڈوگرہ حکومت کے ایک سو سال کے دوران مسلمان

گھروں کے اندر معمولی چاقو، چھری، کٹار اور کلہاڑی تک مِل جاتی تو افرادِ خانہ پر وہی قہر ٹوٹتا جو آج کل کلاشنکوف اور میزائل وغیرہ ملنے پر ٹوٹتا ہے، حالانکہ کشمیر کی تاریخ کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ سلسلہ مغلوں کے کشمیر میں داخلہ کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، جب مسلمانوں سے ہتھیار چھین لئے گئے تھے۔ مغلوں کو کشمیر فتح کرنے میں جو ہزیمت اور مصائب اُٹھانا پڑے تھے، اُن سے خوفزدہ ہو کر اس کے بعد کے حکمرانوں نے اس بات کو اپنے قانون میں شامل کر لیا کہ کشمیریوں کے ہاتھ میں کسی طرح کے ہتھیار نہیں آنے جائیں اور یہ سلسلہ شخصی راج کے خاتمے (1947) کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح جاری رہا اور نتیجہ یہ ہوا کہ نوے کے اوائل میں جب کشمیری نوجوانوں کے ہاتھوں میں یکا یک اور طویل عرصے کے بعد نہایت جدید ترین ہتھیار آ گئے تو انہوں نے کئی صدیوں کی کسر ایک ساتھ پوری کی۔

ڈوگرہ دور میں مسلمانوں کے لئے حصول تعلیم بھی ممنوع تھا۔ اسی دور میں مشہور انگریزی مورخ اور زرعی اصلاح کار والٹر لارنس بھی کشمیر وارد ہوئے اور انہوں نے زرعی اصلاحات کے تاریخی کام کے ساتھ ساتھ کشمیر کی تاریخ بھی رقم کی اور اس وقت بھی اُن کی کتاب ''ویلی آف کشمیر'' اس وادی کے حوالہ سے ایک اہم دستاویز مانی جاتی ہے، تاہم حیران کُن بات یہ ہے کہ والٹر لارنس اپنی اس کتاب میں صرف ایک ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ تک کے حالات کا ذکر کرتے ہیں اور ویلی آف کشمیر میں ''کشمیر کی سیاسی تاریخ'' رنبیر سنگھ کے حالات پر ختم ہو جاتی ہے اور اس مضمون کے آخر پر والٹر لارنس لکھتے ہیں کہ اس دور میں کشمیر میں انگریز سیاحوں کی آمد شروع ہوئی، جنھوں نے اپنا بہت سا پیسہ اس ''پُر امن'' وادی میں خرچ کیا اور لوگوں کو روزگار ملا۔

کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے ایک اور خاصی مستند کتاب ''تاریخ کشمیر'' کے مصنف محمد الدین فوق نے اس سے بھی بڑا ''ظلم'' یہ کیا ہے کہ انہوں نے سکھ دور کو ہی اپنی کتاب کا آخری باب بنایا ہے اور وہ آخری سکھ گورنر شیخ امام الدین کے ذکر کے بعد ''مشائخ علماء و ساداتِ کشمیر'' کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ محمد الدین فوق نے رابرٹ تھراپ کے انجام سے سبق حاصل کرتے ہوئے ڈوگروں کے بارے میں قلم نہ چلایا ہو کیونکہ محمد دین فوق نے جب یہ کتاب لکھی، وہ دور ڈوگروں کے زوال کا عروج تھا، کشمیر میں ڈوگرہ شخصی راج کے خلاف زبردست تحریک جاری تھی اور عوام سراپا احتجاج تھے۔ تاہم غلام احمد میر آف تھنہ منڈی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں اُردو زبان کو کشمیر میں سرکاری زبان کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ 1909ء میں اُردو کے نفاذ کے خلاف کشمیر میں

زبردست تحریک چلی، جس میں پڑھے لکھے کشمیری پنڈتوں اور مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اول تو یہاں کے سبھی (دو چند) تعلیم یافتہ لوگ فارسی دان تھے یا پھر سنسکرت جانتے تھے، یہ لوگ اُردو سے ناواقف تھے اور اُردو کو پنجابیوں کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کشمیری ملازمین کو خدشہ تھا کہ اُردو کے آجانے کے ساتھ ہی اُن کی روزی روٹی چھن سکتی ہے اور پنجابی کشمیر کی خوبصورت سر زمین کی تہذیب وتمدن کو بدل کر کشمیریت کو مفلوج کر دیں گے، جس سے کشمیر پنجاب بن کر رہ جائے گا۔ یہ بھی خدشہ یہ تھا کہ کشمیری عوام غربت کی وجہ سے اپنی زمین فروخت کر کے اس سر زمین کا نقشہ بدل دیں گے۔ اس تحریک کی وجہ سے مہاراجہ ریاست کے مستقبل کے حوالے سے فکر مند اہوا اور اُس نے پنجابیوں اور اُن کے غلبے کو دُور رکھنے کیلئے سٹیٹ سبجکٹ قانون تیار کروایا''

بعض سیاستدان اور اُن کے دامِ فریب میں پھنسے ہوئے مورخین اور قلمکار ریاست میں سٹیٹ سبجکٹ قانون کو مرحوم شیخ محمد عبداللہ سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سکھ دور میں جب قحط پڑنے لگے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ریاست سے باہر جانے کے لئے پاسپورٹ سسٹم رائج کردیا، جو اُردو تحریک کے دوران سٹیٹ سبجکٹ کی شکل اختیار کر گیا۔ تاہم شیخ صاحب کے کھاتے میں یہ بات ضرور جاتی ہے کہ انہوں نے اس قانون کو 1950ء کے معاہدے میں شامل کر کے اسے بھارتی آئین میں شامل کروایا لیکن یہ تصور 1909ء میں منظر عام پر آچکا تھا جب مرحوم شیخ صاحب کی عمر صرف 4 سال تھی۔

''اس دور کی تاناشاہی کا عالم یہ تھا کہ آزادیٔ رائے پر پابندی عائد تھی اور حد یہ تھی کہ کشمیر وادی سے کوئی بھی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا اور کشمیر کے چند ایک اخبارات لاہور سے شائع ہوتے تھے جبکہ منشی محمد دین فوق کو بھی کشمیر سے اخبار نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی حالانکہ جموں سے تین اخبارات ''ڈوگرہ گزٹ، رنبیر، اور نیتی پاترا'' شائع ہوتے تھے جبکہ لداخ سے ''لداخ پھوتیاں'' کے نام سے وہاں قائم موراوین عیسائی مشن (Moravian Mission) کے اہتمام سے شائع ہوتا تھا'' (پرویز دیوان صفحہ 81)

پروفیسر جی، ایم شاہ اپنی کتاب ''ویلفیئر آف مسلمز'' میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے بارے میں

رقمطراز ہیں:

''مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ...... اپنے غریب مسلم عوام کی فلاح و بہبود کیلئے مندرجہ ذیل اقدامات اُٹھائے تھے:

(ا) سرینگر کے اسلامیہ ہائی سکول کو چلانے کے لئے سالانہ مبلغ تین ہزار روپیہ ''گرانٹ ان ایڈ'' کی صورت میں واگزار کیا گیا اور درجنوں دیگر سکولوں کو تسلیم کیا گیا۔ ان کیلئے بھی رقومات واگزار کی گئیں جبکہ غریب مسلم طلباء کے حق میں 3200 روپے سالانہ کے وظائف بھی منظور کئے گئے، مسلم اساتذہ (مولوی صاحبان) کو تقریباً تمام اسلامی سکولوں میں تعینات کیا گیا تاکہ وہ طلباء کو قرآن اور اسلامیات کی تعلیمات دے سکیں جبکہ مکاتب اور واحد اُستاتذہ والے سکولوں کو بھی تسلیم کیا گیا اور اِن کو چلانے کے لئے رقومات فراہم کی گئیں۔

(ب) 1916ء میں مہاراجہ نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا جائزہ لینے کیلئے ایک کمیشن کے قیام کا اعلان کیا، اس کمیشن کا سربراہ اُس وقت بھارت میں برطانوی ماہر تعلیم شارپ کو بنایا گیا، مہاراجہ نے مسٹر شارپ کی تمام شفارشات کو تسلیم کیا اور اُن کے نفاذ کا بھی حکم دیا تاہم ریاستی انتظامیہ اور افسران نے اس حوالے سے ایمانداری اور ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کیا، جس کی وجہ سے کشمیری مسلمان برہم ہوئے اور انہوں نے احتجاج کیا''۔ (بحوالہ۔ پرویز دیوان)

12

ڈوگرہ شاہی...۲

اردو زبان اور سٹیٹ سبجیکٹ قانون!

ڈوگرہ شاہی کے دوران اگر چہ کشمیریوں پر قدم قدم پر تعزیز کا سلسلہ جاری رہا اور 1846ء سے 1947ء تک کے ایک سوا ایک برس تک کشمیری عذاب وعتاب اور جان کنی کی حالت میں رہے لیکن اس دوران چند ایک اچھے کام بھی ہوئے۔ مثال کے طور پر ریاستِ جموں وکشمیر کا نقشہ ترتیب دیا گیا اور گلگت بلتستان کے شمال مشرق سے لے کر ہماچل پردیش کی سرحدوں تک جموں، کشمیر، مظفرآباد، لداخ اوربلتستان یا قراقرم تک کے پانچ صوبوں پر مشتمل ایک آزاد اور خودمختار ریاست کا وجود عمل میں آیا۔ جو 1947ء کے اکتوبر مہینے تک قائم رہا حالانکہ 15/اگست 1947ء کو بھارت اور پاکستان کے نام سے دو خودمختار ممالک دُنیا کے نقشے پر اُبھر چکے تھے۔ اس دور کی دوسری اچھی بات سر والٹر لارنس کا دورۂ کشمیر اور اُن کی طرف سے زرعی اصلاحات کی تکمیل تھی، جس کے باعث کسانوں میں زمین تقسیم کرنے کے راستے ہموار ہوئے حالانکہ چکداری اور جاگیرداری کا خاتمہ شخصی راج میں ممکن نہ تھا لیکن کاشت کاروں کے لئے اُجرت نظام رائج ہوا اور مزارع وکاشتکار کے درمیان لین دین کے اصول مرتب کئے گئے۔ ڈوگرہ دور کے دوران ہونے والی ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ انہوں نے کشمیر کو جموں سے ملانے والی شاہراہ بانہال کے راستے تعمیر کرائی جسے آج کل سرینگر جموں شاہراہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور کشمیر کا باقی ماندہ دُنیا کے ساتھ واحد زمینی رابطہ بھی ہے۔ لیکن ڈوگرہ عہد کے آخری ایاّم میں جو دو بڑے کام ہوئے اُن میں ریاست کا پشتنی باشندہ ''سٹیٹ سبجیکٹ'' قانون اور اُردو زبان کو سرکاری درجہ دینا بھی۔

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ جس اُردو زبان میں اس وقت برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کا مذہبی، لسانی، تہذیبی اور ثقافتی اثاثہ محفوظ ہے اور جس کے بغیر مسلمانوں کا زندہ رہنا محال ہے، ایک وقت ایسا بھی تھا کہ اس ریاست کے پڑھے لکھے لوگوں نے اس زبان کے داخلے پر ہنگامہ کھڑا کیا باضابطہ ''اُردو مخالف تحریک'' چلائی۔ گزشتہ شمارے میں چند تاریخی حوالہ جات کے بل پر

بتایا گیا تھا کہ 1907ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ریاست کا پشتنی باشندہ ہونے کا قانون اُس وقت نافذ کیا جب پنجاب اور کئی دیگر شمالی ہندوستان کی ریاستوں سے اُردو پڑھنے اور لکھنے والے بابُو کشمیر آنا شروع ہوگئے اور مہاراجہ کے دفتری کاموں میں معاون بنے، جس کی وجہ سے کشمیر کے فارسی دان مسلمانوں اور سنسکرت جاننے والے پنڈتوں کو اپنی روزی روٹی خطرے میں نظر آنے لگی اور انہوں نے اِس زبان اور اس کے جاننے والوں کے کشمیر میں داخلے کے خلاف باضابطہ تحریک چلائی۔ لیکن چند مقتدر اور محترم قارئین نے اس بات پر اعتراض اُٹھاتے ہوئے کہا کہ اُردو زبان 1907ء سے بہت قبل یعنی تقریباً 1879ء میں ریاست میں رائج تھی اور مہاراجہ اسی زبان میں انگریزوں کے ساتھ خط و کتابت کرتا تھا، لہٰذا اپنے قارئین کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ اس موضوع کے سمندر میں چند ایک مزید غوطے لگائے جائیں کہ شاید کچھ اور گوہر نایاب غریب کے ہاتھ لگ جائیں۔

سال 1993ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے مالی اشتراک سے ''کشمیر میں اُردو'' نام سے پروفیسر عبدالقادر سروری کی ایک اچھی خاصی کتاب شائع ہوئی ہے، کتاب میں پروفیسر سروؔری (کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر) نے انتہائی انمول معلومات فراہم کرتے ہوئے اُردو کی بہترین خدمت کی ہے، اسی کتاب کے آغاز میں ''عرضِ ناشر'' کے تحت اکیڈیمی کے سابق سکریٹری محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں:

> ''............ راجگانِ جموں نے اپنی دُھن میں جس ریاست کے چہار خانے جلدی جلدی جوڑ دیئے تھے، اس کی تہذیبی صورتحال سے ناواقف ہونے کے سبب انہوں نے لسانی تشدد سے کام لینا چاہا لیکن حکمران گھرانے میں اقتدار کی رسہ کشی نے جب اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں پھینک دیا تو چند اُردو جاننے والے ملازم پنجاب سے یہاں آ گئے۔ انہی میں سے ایک بھاگ رائے نے 1888ء کے قریب تقریباً بے خیالی کے عالم میں سرکاری دستاویزات میں اُردو کا استعمال شروع کر دیا تھا اور یہ ریاست کی لسانی صورتحال کو ایسا راس آیا کہ اُردو ریاست کے سرکاری علمی ادب پر ایک میگھ دُوت کی طرح رواں دواں ہوگئی حالانکہ جموں میں سرکاری عندلیے کی مزاحمت کے پتھر بھی موجود تھے اور کشمیر کے مسلمانوں نے فارسی کو، جو چھ سو برسوں سے اُن کی سرکاری ثقافتی اور مذہبی ترجمان تھی، ترک ہوتے دیکھ کر شور مچایا،

چنانچہ کشمیر کے خاصانِ دربار کی رہنمائی میں حکومت کو باقاعدہ عرضی واگزار کی گئی کہ فارسی کے بجائے اُردو جیسی نوخیز زبان کو منہ نہ لگایا جائے لیکن وہ ساز گار تواریخی قوتوں کے بادبانوں پر تیر رہی تھی، اس لئے حکمران ہاتھ ملتے رہ گئے، قدامت پسند بے بس ہوگئے اور بیسویں صدی جموں و کشمیر میں اُردو کے محاورے میں داخل ہوئی اور پہچانی گئی..........''(کشمیر میں اُردو/صفحہ نمبر 4)

سرکردہ ادیب اور محقق محمد یوسف ٹینگ کی مذکورہ تحریر سے دو باتیں واضح ہوجاتی ہیں، ایک تو یہ کہ پہلی بار بھاگ رائے نے 1888ء میں کشمیر میں اُردو زبان کا معمولی سا استعمال شروع کیا تھا اور اسے بھی '' تقریباً بے خیالی کا عالم'' قرار دیا گیا اور دوم یہ کہ اس زبان کو اُس وقت سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں تھا جبکہ اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی ختم ہوجاتا ہے کہ اس زبان کو 1879ء میں ریاست میں نافذ کیا گیا کیونکہ ٹینگ کے مطابق بھاگ رائے نے 1888ء میں پہلی بار ریاست میں اس کا استعمال شروع کیا، یہ تو بالکل ایسی مثال ہے کہ جیسے اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے باجود گزشتہ کئی دہائیوں سے ریاست کا 40 رفیصد سرکاری ریکارڈ انگریزی زبان میں مرتب ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود اسے سرکاری زبان قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس سے اُردو کی قانونی حیثیت ختم ہوجاتی ہے، ظاہر ہے کہ 1888ء کے بعد کئی برسوں تک بالکل آج کل کی انگریزی کی طرح اُردو بھی خاموشی کے ساتھ یا پھر '' بے خیالی کے عالم میں'' سرکاری دفاتر میں رائج رہی ہوگی اور جب حد سے زیادہ تجاوز کرگئی اور فارسی و سنسکرت جاننے والوں کی روزی روٹی ہونے لگی تو انہوں نے اس کے خلاف شور برپا کیا۔ پروفیسر سروری ''کشمیر میں اُردو'' کے اگلے صفحات میں لکھتے ہیں۔

''یہ 1878/79ء کا زمانہ تھا کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں کشمیر میں سخت قحط پڑا۔ مہاراجہ نے پنجاب سے غلہ منگوا کر سستے داموں فروخت کرنے کا انتظام کیا لیکن عہدایداروں کی خیانت اور بددیانتی کی وجہ سے عوام کی تکلیفیں رفع نہ ہوئیں، بھوکے اور روٹی مانگنے والوں کے بارے میں مشہور ہوگیا کہ مہاراجہ اُنھیں بوریوں میں بھر کر وُلر جھیل میں ڈبو دیتا ہے۔ آخر انگریز حکومت کو بھی اس طرف توجہ دینا پڑی اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے خلاف مقدمہ کھڑا ہوگیا۔ مہاراجہ کو بڑی اندھیر بتانے کے لئے، مہاراجہ کے وفادار عہدیداروں اور لکھنے والوں کی بڑی جدوجہد جاری رہی۔ انہی میں سے ایک پنڈٹ سالگرام سالک نے لاہور اور امرتسر سے اُردو اخبار جاری

کئے اور مضامین بھی لکھے تھے، ریاست میں اُس وقت اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی ، اس لئے عرصہ تک اہلِ کشمیر اور کشمیر سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ قلم ملحقہ شہروں یعنی لاہور، امرتسر وغیرہ سے اخبار نکالتے تھے''(کشمیر میں اُردو صفحہ نمبر 89)

پروفیسر سروری کی یہ سطور بھی یہی ظاہر کرتی ہیں کہ 1879ء میں اُردو کشمیر میں دور دور تک موجود نہیں تھی یعنی سرکار کی پناہ میں نہیں تھی اور مہاراجہ پر لگنے والے الزامات کے داغ دھونے کے لئے سالگرام سالک نے بھی لاہور اور امرتسر سے اُردو اخبارات جاری کئے جبکہ تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی موت 1885ء میں ہوگئی تھی اور اُردو کا پہلا استعمال 1888ء یعنی اُس کی موت کے تین سال بعد ہوا اور وہ بھی غیر شعوری اور غیر سرکاری طور، اس لئے اُردو مخالف تحریک اُس کے بیٹے سری پرتاپ سنگھ کے دورِ اقتدار (1885 تا 1925ء) میں ہی چلی، اسی دور میں جب شخصی اختیارات پر روک تھام کیلئے ایک کونسل قائم کی گئی تو کشمیر کے مشہور شاعر خواجہ امیر الدین نے کئی نظمیں لکھیں، جن میں سے ایک نظم میں یہ مصرعہ شامل تھا:۔

''راجہ بیٹھا بھی نہیں تھا''

کشمیر میں اُردو شاعری کے آثار بھی اسی دور سے ملنا شروع ہو گئے تھے، علاوہ ازیں یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے پانچ صوبوں میں پانچ مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں جن میں وادی میں کشمیری، لداخ میں بودھی اور بلتی ، مظفر آباد میں پہاڑی، جموں میں ڈوگری اور قراقرم میں بلتی اور گلگت میں شینا زبان شامل ہے جبکہ اس کے علاوہ کئی علاقوں میں گوجری، بھدرواہی، پشتو، پنجابی اور درجنوں چھوٹی چھوٹی زبانیں بولی جاتیں تھیں اس لئے ان سبھی زبانوں کے بولنے والوں نے اُردو کو بول چال کی حد تک رابطے کی زبان کے طور پر اختیار کر رکھا تھا، وہ اس زبان میں اظہارِ خیال تو کر لیتے تھے لیکن اسے سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی۔

متذکرہ بالا کتاب کے صفحہ نمبر 91 ر پر اگر چہ پروفیسر سروری رقمطراز ہیں کہ ''اس سہ لسانی بلکہ چہار لسانی ریاست کی مختلف لسانی اکائیوں کے درمیان (اُردو) ایک رابطہ بن چکی تھی اور ریاست کی سماجی ، اجتماعی اور سرکاری زندگی میں اہم خدمت ادا کر رہی تھی ، مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں 1889ء میں اسے سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا'' لیکن اس پیراگراف کے آگے اکیڈیمی نے یہ حاشیہ چُست کیا ہے کہ ''اس سلسلے میں سروری صاحب نے کوئی سند پیش نہیں کی ہے'' اور اکیڈیمی جیسے مستند ادارے کی طرف سے جوڑی گئی یہ سطر کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس موڑ پر ایک بار پھر پرویز دیوان کی

کتاب ''کشمیر'' کی طرف رجوع کرنا ناگریز ہے، جو اس موضوع کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اگر چہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور میں کشمیریوں کی فلاح و بہود کے لئے کافی اقدامات کئے گئے لیکن اس کے باوجود اُن کی غربت ختم نہیں ہوئی، مہاراجہ نے بیگار ختم کردی اور ایک ہائی کورٹ قائم کیا [1] ......اسی دور میں 1907ء میں اُردو نے فارسی کی جگہ لے لی اور ڈوگرہ عدالتوں میں اس کا باضابطہ استعمال ہونے لگا۔ متعدد مسلمانوں اور فارسی جاننے والے پنڈتوں نے اس کی مخالفت کی انہوں نے اُردو کو ''پنجابیوں کی زبان'' قرار دے کر اس کے نفاذ کے خلاف ہنگامہ برپا کیا اور یہ لوگ کسی حد تک صحیح بھی تھے کیونکہ نئی زبان کے نفاذ اور رواج کی وجہ سے ہزاروں فارسی دانوں کے پیٹ میں لات پڑ رہی تھی، دوسری جانب اتنی ہی بڑی تعداد میں اُردو جاننے والے پنجابی بابوؤں کا سیلاب ریاست میں اُمڈ آیا اور اس کے خلاف باضابطہ تحریک شروع ہوگئی لیکن یہ کیسا ستم ہے کہ 1947ء کے بعد یہی اُردو زبان ریاستی مسلمانوں کی قومی زبان بن گئی اور تمام پنجابی ہندو مطالبہ کرتے رہے کہ ہندی کو ان کی قومی زبان کے طور رائج کیا جائے'' (کشمیر/ پرویز دیوان/صفحہ نمبر 81)

اس طرح جس زبان کو کسی زمانے میں غیر کشمیری بابوؤں (پنجابیوں) نے اپنا ذریعۂ معاش بنا کر کشمیر اور کشمیریوں پر تھوپنے کے لئے مہاراجہ کی پیالہ و کاسہ برداری کی، اُس کو کشمیر کے لوگوں نے ہمیشہ کے لئے سینے سے لگا لیا اور اپنا لسانی، تمدّنی، مذہبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی ورثہ اور تاریخ اُس کی گود میں ڈال دیا لیکن اسے یہاں لے کر آنے والوں نے ہندی اور پنجابی کو اپنا لیا۔ بہر حال اُردو ریاست کے ماحول کو ایسی راس آئی کہ دوسری زبانوں کے قلمکاروں نے بھی اگر چہ اپنی اپنی زبان میں اظہارِ خیال کیا لیکن رسم الخط اُنھیں بھی وہی اپنانا پڑا جو فارسی سے اُردو نے لیا تھا اور اُردو زبان کی مضبوطی کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ اس کا رسم الخط دنیا کی قدیم ترین اور امیر ترین زبانوں یعنی فارسی اور عربی سے مستعاد لیا گیا تھا، جس کے حرف تہجی میں ہر حرف کا ایک الگ اور مخصوص مخرج ہے اور انگریزی کی طرح ہر حرف کا مخرج اپنی مرضی کے مطابق یا ''سینہ بسینہ روایات'' کے ماتحت نہیں۔ اُردو زبان کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے مہاراجہ پرتاب سنگھ کے فیصلے کے خلاف اُس وقت ایجی ٹیشن کا اُٹھنا از بس لازمی تھا کیونکہ اس کے ساتھ یہاں کے (اِکا دُکا) پڑھے لکھے لوگوں کی روزی روٹی وابستہ تھی اور اس تحریک کو عوامی حمایت اس لئے ملی کہ غیر کشمیری بابوؤں کی آمد سے کشمیر کی حسین سرزمین خطرے میں پڑ سکتی تھی اور

چونکہ کشمیر میں چہار سُو غربت کا اندھیرا تھا (یہاں تک کہ روٹی مانگنے والوں کو غرق آب کر دیا جاتا تھا) اِن حالات میں پنجابی بابو کشمیر کی زمین کوڑیوں کے بھاؤ خرید سکتے تھے لہٰذا عوامی تیور دیکھ کر مہاراجہ کو درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس نے زبان رائج کرنے کی اپنی ضد بھی پوری کی اور ایسا قانون بھی نافذ کیا کہ جس کی موجودگی میں غیر کشمیری صاحبِ ثروت لوگ یہاں کسی طرح کی پراپرٹی بھی نہ خرید پائیں۔ حالانکہ اس کا متبادل ''پٹہ نظام'' بھی قائم رہا، جسکے تحت کوئی بھی غیر کشمیری نوے (90) سال کیلئے کشمیر کی اراضی یا پراپرٹی پٹے پر حاصل کرسکتا ہے لیکن یہ اُس کی ذاتی جاگیر نہیں بن سکتی۔ لیکن بقول غالب ؎

''کون جیتا ہے تیری زُلف کے سر ہونے تک!''

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو کی آمد اور فارسی کے خاتمے کے خلاف کشمیر کے مسلمانوں اور پنڈتوں کے علاوہ جموں کے ڈوگرے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ وہ بیرونی بابوؤں کی وجہ سے پریشان تھے اور یہ تحریک ''سٹیٹ سبجیکٹ قانون'' کے نفاذ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی....حالانکہ بہت سے لوگوں کی غلط فہمی ہے کہ یہ قانون 1950ء کے معاہدہ خودمختاری میں شامل تھا، جسے بھارتی آئین کی دفعہ/370 کے ساتھ جوڑا جاتا ہے، تاہم شیخ محمد عبداللہ مرحوم کے کھاتے میں یہ کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ انہوں نے اس قانون کے تحفظ اور اسے بھارتی آئین میں شامل کروانے کیلئے کافی جدوجہد کی اور اس جدوجہد میں وہ کامیاب بھی رہے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ سکھوں کی آمد کے وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیری باشندوں کے لئے پاسپورٹ نظام رائج کیا تھا اور یہی نظام 1952ء تک مختلف صورتوں میں کشمیری باشندوں کی مخصوص اور ممتاز شناخت کو قائم رکھنے کا باعث بنا اور بالآخر بھارتی آئین کا حصہ بنا، جسے ختم کرنے کیلئے مرکز میں بہت سے بنیاد پرست عناصر تو سرگرم ہیں ہی لیکن بدقسمتی سے ریاست کے اندر بھی مرکز اور بنیاد پرست فاشسٹ قوتوں کے زرخرید غلاموں کی کمی نہیں جو اپنے حقیر مفادات کی تکمیل کیلئے اپنے مادرِ وطن کے چپے چپے کا سودا کر کے کشمیر اور کشمیریت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اُنھیں یاد رکھنا چاہیے کہ وطن کی محبت ہر انسان کے لئے ایمان کے جُز کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا سودا اپنی ماں کے سودے کے برابر ہوتا ہے.......

☆☆☆☆

؎۱... یہ صحیح نہیں ہے کہ مہاراجہ نے بیگار سسٹم خو ختم کیا، اس حوالہ سے یہ یاد رکھنا ہوگا کہ بیگار، رسوم اور راس تو گلینسی کمیشن کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ نے منسوخ کئے تھے....1924ء میں جو میمورینڈم مسلمانوں نے وائسرائے کو پیش کیا، اس میں یہ تحریر تھا کہ اان سے بیگار لی جاتی ہے، In the cover of the memorial ,the Muslims demanded that proprietary right of the land should be given to the peasents…….that the system of the "Begar" should be abolished…….

اس میمورنڈم میں Muslim Grievances کے تحت آئٹم نمبر 10 میں یہ لکھا ہے:

10. "Begar" is a forced labor in several ways, which i being taken taken from villagers without wages. Rajputs, Pandits, Brahmins, Sikhs and Syeds were exempted..... (ڈائری محمد شاہ سعادت، صفحہ نمبر ۱۶۷) Galncy Commission کی رپورٹ میں شق نمبر 7، کارِسرکار کے تحت لکھا ہے'' تمام خدمات کے لئے معاوضہ ادا کیا جائے اور 'راس سسٹم، جس کی رو سے فرنٹئر تک جانا پڑتا ہے، کو ختم کیا جائے اور اس کی جگہ ٹھیکیدار مقرر کیا جائے'' لارنس نے بیگار کے بارے میں لکھا اوراس کو ختم کرنے کی سفارش بھی کی تھی لیکن مہاراجہ نے اس کو ختم کرنے کا آرڈر نہیں دیا..(**فدا محمد حسنین**)

☆☆☆☆

13

ڈوگرہ شاہی...۳

کشمیریوں کی سیاسی' سماجی اور دینی پسماندگی!

ایک چھوٹی سی غلطی' لاپرواہی یا بے نیازی جہاں ایک طرف بہت بڑے انقلاب کا پیشِ خیمہ بن کر بڑے بڑے انقلاب بپاء کر دیتی ہے' وہیں (کبھی کبھی) خوابِ غفلت میں صدیوں سے محواقوام کی تقدیر بھی بدل کر رکھ دیتی ہے۔مغلوں کے حملے کے بعد کشمیر کی اس سرزمین پر تقریباً چار سو سال تک غلامی' محکومیت' بے چارگی اور مصائب و آلام کے جو کالے اور گھنے بادل چھائے رہے' اُن کی وجہ سے کشمیری عوام کی عزتِ نفس' اناء اور غیرت بُری طرح سے مجروح ہوئی تھی ،تلوار و تفنگ کی ماہر ایک جنگجو قوم کو اس قدر مقہور و مجبور بنا دیا گیا تھا کہ اسے چاقو چھری تک رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔مغل حکمران کشمیریوں کی جنگی مہارت اور ہمت و جرأت سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ انہوں نے آنے والے حکمرانوں کیلئے جو آئین مرتب کیا،اُس میں سب سے پہلی شق یہ شامل کر دی کہ کشمیریوں کو ہتھیار سے اور ہتھیار کو کشمیریوں سے دور رکھنا لازمی ہے۔اس مسلسل چھ سو سالہ غلامی اور محکومی نے کافی حد تک کشمیریوں کی دفاعی اور مزاحمتی قوت کو متاثر کیا اور اس قوم نے ہر طرف سے مایوس ہو کر خود کو اس سانچے میں ڈھال لیا لیکن ضمیر و خمیر میں اس ظلم و ستم کے خلاف اندر ہی اندر جو چنگاری سلگ رہی تھی ،اُسے بھی ایک نہ ایک روز شعلہ بننا ہی تھا۔گزشتہ قسط (نمبر 11) میں ذکر آیا تھا کہ تقریباً 1916ء میں ایک انگریز ماہر تعلیم مسٹر شارپ کی سربراہی میں ڈوگرہ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے کشمیری مسلمانوں کی سماجی' اقتصادی اور تعلیمی پسماندگی کے خاتمے کے لئے ایک کمیشن قائم کیا۔کمیشن نے اپنی رپورٹ میں مہاراجہ سے سفارش کی کہ کشمیری مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور اسے درست کرنا فوری اور اہم ضرورت ہے، حق یہ ہے کہ مہاراجہ نے اس رپورٹ کی تمام سفارشات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے فوری نفاذ کا اعلان

بھی کیا اور اس حوالے سے احکامات بھی صادر کئے لیکن مہاراجہ کے بعض تنگ نظر، فرقہ پرست اور بددیانت افسروں نے اس رپورٹ کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور جب یہ خبر لوگوں تک پہنچی تو اس کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ معمولی نوعیت پر شروع ہونے والی مزمت نے شدت اختیار کر لی اور کشمیر وادی کے کونے کونے میں مہاراجہ کے خلاف تقریروں، جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کئی سو سال کے بعد کشمیر کی خانقاہوں اور مساجد کے ممبروں سے علماء نے مہاراجہ کے خلاف زبردست تقریریں کیں اور ڈوگرہ شخصی راج کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔

غلام احمد میر ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' میں رقمطراز ہیں:

''1916ء کی مزاحمت کے چشمے سے پھوٹنے والی چھوٹی سی دھار 1924ء تک ایک بہت بڑے طغیان آمیز دریاء میں بدل چکی تھی اور ڈوگرہ شاہی کے خلاف اندر ہی اندر پکنے والا لاوا اُس وقت پھوٹ کر باہر آ گیا، جب سرینگر کی سلک فیکٹری (ریشم خانہ) کے ملازمین نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال کر دی۔ حکومت نے اُن کے مطالبات تسلیم کرنے کی بجائے اُن کے لیڈر کنگ (King) کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ اس گرفتاری کی وجہ سے شہر میں سخت تناؤ پیدا ہو گیا اور نوجوانوں نے سڑکوں پر نکل کر اپنی ناراضگی کا بھرپور مظاہرہ کیا، تناؤ اور کشیدگی کے اسی ماحول میں بھارت میں برٹش وائسرائے نے کشمیر کا دورہ کیا تو کشمیری علماء کے ایک وفد نے خواجہ سعد الدین شال کی قیادت میں وائسرانے سے ملاقات کی اور مہاراجہ کے خلاف ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی پسماندگی کی جانب فوری طور توجہ دی جائے۔ مطالبات کی فہرست میں شامل تھا کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں دی جائیں، کاشتکاروں کو اُن کی زمینوں کے مالکانہ حقوق دیئے جائیں۔ کیونکہ اُن کی محنت و مشقت سے تیار کردہ فصلیں (پنڈت) زمیندار کھا جاتے ہیں اور اُن کے بال بچے بھوکے مرتے ہیں۔ اس میمورنڈم پر کشمیر کے دو میر واعظین مرحوم میر واعظ احمد اللہ اور مرحوم میر واعظ ہمدانی نے بھی دستخط کئے تھے حالانکہ یہ دونوں دینی رہنماء اُس وقت مہاراجہ کے درباری تھے۔ میمورنڈم میں مزید کہا گیا تھا کہ جن مساجد اور درگاہوں پر حکومت نے قبضہ کر رکھا ہے، وہ مسلمانوں کے لئے کھول دی جائیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہی میمورنڈم آگے چل کر مسلم کانفرنس کی

بنیاد ثابت ہوا''۔

اس واقعہ کے حوالہ سے محمد شاہ سعادت اپنی ڈائری میں کچھ اس طرح سے لکھتے ہیں:

''۲۴۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کشمیر تشریف لائے، حکومتِ کشمیر نے ان کی مہمان نوازی کا فرض ادا کیا، وائسرائے نے صحت افزاء مقامات کی سیر کی... کشمیری مسلمانوں نے اس خیال سے کہ وہ ان مظلوموں کی دادرسی کے لئے آئے ہیں، ایک میمورنڈم تحریر کیا، جس میں گیلنسی اور کئی دیگران نے بھی مشورہ دیا، میمورنڈم پیش کرنے کے لئے خواجہ سعد الدین شال، خواجہ حسن شاہ نقشبندی، مولوی عتیق اللہ، جنرل سیکریٹری انجمن نصرت الاسلام، میر واعظ مولوی احمد اللہ ہمدانی، سید حسن شاہ جلالی، مولوی شریف الدین مفتی وغیرہ ممبران منتخب ہوئے اور میمورنڈم وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انہوں نے مہاراجہ سے واقعات پر روشنی ڈالنے کے لئے لکھا، علمائے کشمیر نے تحقیقات کرنے اور شکایت کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی (چنانچہ) جب تحقیقات شروع ہوئی تو میمورنڈم پر دستخط کنندہ گان کی طلبی ہوئی، تین چار ممبروں کے بغیر سبھی نے میمورنڈم پیش کرنے کا اقرار کر لیا اور دل دہلا دینے والے بیانات دیئے، میمورنڈم میں کچھ اس طرح سے لکھا تھا:

''اراضیاتِ کشمیر کو برہمنوں اور جوتشیوں نے ناجائز طور اپنے قبضے میں لایا ہے، ان سے واپس لے کر اصلی حقدار مسلمانوں کو سونپا جائے۔ لیجسلیٹو اسمبلی کی مجلسِ قانون ساز یہ کو انتخابی اصولوں پر، جیسا کہ سرکار نے وعدہ فرمایا ہے، اس کے ممبران کی تعداد میں تناسبِ آبادی کا لحاظ رکھا جائے۔ چونکہ موجودہ دور میں رائے عامہ کی کوئی وقعت نہیں ہے اس لئے مجلس کا وجود ضروری ہے تا کہ باشندہ گانِ ریاست کی فلاح و بہبود ہو سکے'' (ڈائری محمد شاہ سعادت، صفحہ نمبر ۱۴۷، بشکریہ غلام رسول حسرت گڑھا)

''...اس میمورنڈم کی اطلاع مہاراجہ کو ملی تو اُس نے خواجہ سعد الدین شال کو جلاوطن کر دیا اور دونوں میر واعظین کو اپنے دربار سے بے دخل کر دیا جبکہ خواجہ حسن نقشبندی کی جاگیر منسوخ کر دی گئی، اس واقعہ نے کشمیری عوام کے صدیوں پُرانے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا اور پُرانی بے چینی کا لاوا نفرت کی آتش فشاں سے باہر پھوٹا!'' میں نے کشمیر جلتے دیکھا/ غلام احمد میر/صفحہ نمبر 49)

یہ واقعہ 1924ء کا ہے اور اس وقت ڈوگرہ سامراج کو کشمیر پر حکمرانی کرتے ہوئے 78/برس

ہو چکے تھے۔عوام ظلم وستم اور مسلسل عذاب وعتاب کو اپنا مقدر سمجھ کر خاموشی سے زندگی بسر کر رہے تھے لیکن مہاراجہ کے چند نااہل اور بددیانت آفیسروں نے کشمیری مسلمانوں کے حوالہ سے مہاراجہ کے دل میں پیدا ہو رہے نرم گوشے سے پریشان ہو کر شارپ کمیشن کی سفارشات کو نظرانداز کر دیا اور 1916ء سے 1924ء تک کے 8/برسوں میں کشمیریوں کے دلوں میں سلگ رہی نفرت کی چنگاری شعلہ بن کر آتشداں سے باہر آ چکی تھی۔ریشم خانہ کے ملازمین پر مہاراجہ کے سپاہیوں کے ڈنڈے پڑنے کی دیر تھی کہ اس شعلے نے ڈوگرہ شاہی کے تمام محل و مینار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پرتاب سنگھ کے سامنے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ وہ کوئی بروقت اور صحیح فیصلہ نہیں لے پائے۔میر واعظین کا احترام ومقام فراموش کرتے ہوئے اُن کی دربار سے بے دخلی اور خواجہ سعدالدین شال کی جلاوطنی مسلمانانِ کشمیر کے لئے ایک چیلنج تھی اور اس بات کا واضح اشارہ بھی کہ ڈوگرہ حکمران جان بوجھ کر کشمیری مسلمانوں کو نشانہ بنانے پر بضد ہیں اور اُن کی مذہبی اور سماجی آواز وقیادت کو طاقت کے بل پر دبانا چاہتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریشم خانے کے ملازمین کی ایجی ٹیشن ''کشمیری چھوڑ و تحریک''میں تبدیل ہو گئی!۔

سبحان حجام کی تحریک

کشمیر کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب نہ صرف مذہبی اور سیاسی سطح پر شخصی راج کے خلاف لوگ بیدار ہو رہے تھے بلکہ سماجی سطح پر بھی تحریکیں چل رہی تھیں۔خاص طور پر کشمیریوں کی سماجی تحقیر وتذلیل کے خلاف بھی کئی سماجی شخصیات نے علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا۔اسی سماجی بیداری کی تحریک کا ایک کردار محمد سبحان حجام بھی تھا۔سبحان حجام پیشے سے نائی تھا لیکن اُس نے مہاراجہ کے خلاف کشمیر میں 'گرم گوشت' کی تجارت اور خواتین کے استحصال کے خلاف ایک ایسے وقت میں آواز بلند کی، جب ایسا کرنا گردن زنی کے برابر تھا۔اس زمانے کی تصویر کشی کے لئے مذکورہ سطور کو نقل کرنا ضروری ہے۔

ترجمہ.....''عجیب دِن تھے وہ'لوگ زندگی کے ہر گوشے میں صفائی اور پاکیزگی دیکھنا چاہتے تھے، وہ ہر درد کی دوا اور ہر زخم کی مرہم پٹی کرنا چاہتے تھے،انقلاب نے اُنہیں ایک بار پھر اپنی طاقت کا احساس دلایا تھا،ان دنوں کشمیر میں کئی ایک جگہوں پر قحبہ خانے چلائے جا رہے تھے۔کشمیری خواتین کا استحصال نہ صرف مقامی طور پر ہو رہا تھا بلکہ اُنہیں اس بےشرم اور بےہودہ دھندے کے لئے کشمیر سے باہر بھی بھیجا جاتا تھا۔عورتوں کی اس تجارت کے خلاف لوگوں میں اندر ہی اندر نفرت پائی جاتی تھی لیکن ڈر اور خوف کی وجہ سے کوئی اس کے خلاف آواز بلند نہیں کر رہا تھا۔لیکن پھر ایک نوجوان سامنے آیا اور اس ذلیل کاروبار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔اعلانِ جنگ کرنے والا یہ ایک عام شخص تھا جو پیشے

سے نائی تھا، عام لوگوں نے اس نوجوان کے خلاف کوئی ردِعمل نہیں دکھایا بلکہ وہ اس نیک کام کے لئے اُس سے بہت خوش ہوئے۔ سبحان حجام نے اس گندے کام کے خلاف جگہ جگہ جا کر عوامی بیداری پیدا کی۔ اگر چہ آج کل یہ کام بہت معمولی نظر آئے گا لیکن اُن دنوں یہ ایک کارِدار دوالا معاملہ تھا۔ یہ وہ منظّم کام تھا جس کے ساتھ ریاست کے دلالوں کے ساتھ ساتھ بیرونِ ریاست کے زن فروش بھی جڑے ہوئے تھے اور اُن کی پہنچ بہت اوپر تک تھی، ان لوگوں کو حکومتی سر پرستی کے ساتھ غنڈوں، لفنگوں اور سماجی دشمن عناصر کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ پس! ان سبھی کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ برطانوی ہندوستان میں کشمیر ایک آزاد ملک کی آزاد ریاست نہیں بلکہ ایک ایسا آزاد نما غلام علاقہ تھا جس کا بہت عرصے سے غیر کشمیری اور شخصی حکمرانوں نے استحصال کیا تھا۔ ان حالات میں محمد سبحان انتہائی مشکل حالات میں کام کر رہا تھا۔ اُسے مختلف طریقوں سے ہراساں و پریشان کیا گیا اور اذیتیں بھی دی گئیں، اُس کی صحت جو پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں تھی، مزید خراب ہوگئی لیکن اُس نے اس کی پرواہ بھی نہیں کی اور اپنے مقصد کی آبیاری میں مصروف رہا...... بالآخر اُس کے دشمنوں نے لڑائی ہار دی اور وجہ یہ تھی کہ اُسے عوام کی بھر پور حمایت مل رہی تھی......'' (شیرازہ/کشمیری/مہجور نمبر/صفحہ 165)

ان سطور کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی کشمیر کی اس خوبصورت وادی میں ایک بار پھر ایسے بادل منڈلانے لگے تھے جو آگے چل کر ڈوگرہ شاہی کے زوال کے لئے طغیانی کا کام کرنے والے تھے۔ سیاسی، دینی اور سماجی سطحوں پر عوام کے مختلف مکتبہ ہائے فکر اپنے اپنے حساب سے اس سامراجیت کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے۔ اس موقعہ پر شاعرِ کشمیر مہجور کا 1932ء کے آس پاس لکھا ہوا ایک خط بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس زمانے میں مہجور کو دس سال کے دوران تین بار نوکری سے معطل کیا گیا اور تین بار بحال کیا گیا اور جب (سزا کے طور) اُنہیں مظفر آباد تبدیل کر دیا گیا تو انہوں نے اس تبدیلی کو ''جلاوطنی'' سے تعبیر کرتے ہوئے ایک مفصل خط لکھا جس کا ایک اقتباس پیش ہے:

> ''1965 (بکرمی) میں چوہدری خوشی محمد ناظر سیٹلمنٹ آفیسر صاحب نے مجھ کو چھ روپے کا پٹواری بنایا تھا۔ آج بارہ سال کے بعد میں 12/روپے کا پٹواری ہوں۔ گویا میں نے بحالت مجموعی 4 آنے 2 پائی سالانہ کے حساب سے ترقی پائی۔ 65ب میں میرے ساتھ جو لوگ بحیثیت پٹواری کام کرتے تھے، ان میں سے بطورِ نمونہ چند اشخاص کے نام پیش کروں گا، جو کہ اب تک زندہ ہیں ا۔ پنڈت ویشنہ

بٹ۲۔ پنڈت گوند بٹ،۳۔ پنڈت آنندرام، ۴۔ پنڈت دینا ناتھ،۵۔ پنڈت مکندرام، ۶۔ پنڈت گواشہ لال کول وغیرہ۔ ان میں سے نمبرا آج کل وزارت بارہمولہ کا محاسب 30/روپے ماہوار پر اور نمبر۲ تا نمبر۴ ویلی کشمیر میں 25 روپے ماہوار سے 41 روپے تنخواہ پانے والے گرداور اور قانون گویان ہیں۔ ۵ اور ۶ تحصیلداران ہیں۔ اہلکارانِ مذکورہ کی علمی لیاقت کسی طور پر مجھ سے زیادہ نہیں بلکہ بہ لحاظ کارکردگی تجربہ و محرّرانہ قابلیت کے میں اُن سے بدرجہا بہتر ہوں، میں نے بھی ترقی کے لئے ہر وقت کوشش کی مگر ایک گرداور اور قانون گو یے سے سٹیلمنٹ آفیسر تک تمام آفیسر غیر مسلم تھے، اس لئے مجھے کبھی ترقی نصیب نہیں ہوئی، میں نے وجہ معلوم کرنے کے لئے گورنر صاحب کے کانفیڈنشل کلرک کو دس روپے اور ایک لوئی دے کر وہ فائل حاصل کر لی، جس میں میرے خلاف سازش پوشیدہ تھی، مجھے پتہ چلا کہ...... کسی محبوب شاہ نامی شخص نے صاحب انسپکٹر جنرل پولیس کو ایک سادہ درخواست بدیں مضمون بھیجا ہے کہ یہ پٹواری (مہجور) پنجاب کے لیڈران کے ساتھ خط و کتابت رکھتا ہے اور کشمیر میں گاندھیائی تحریک پھیلاتا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور اور امرتسر سے کئی اخبارات منگواتا ہے، خود بھی پڑھتا ہے اور زمینداروں کو بھی پڑھ کر سُناتا ہے، پٹواری کا لڑکا سرینگر میں زیرِ تعلیم ہے...... سُنا ہے کہ پٹواری اخبارات کے لئے بھی لکھتا ہے...... سُنا گیا ہے کہ پٹوار کا رابطہ محمد الدین فوق ایڈیٹر ''کشمیر'' لاہور کے ساتھ بذریعہ خط و کتاب ہے......'' (شیرازہ/کشمیری/مہجور نمبر/صفحہ 114 سے آگے)

شاعرِ کشمیر کے اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ شخصی راج کے اس زمانے میں اول تو مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی سرکاری انتظام سرے سے ہی نہیں تھا اور اگر غلام احمد مہجور کی طرح کوئی ایک آدھ مسلمان تعلیم حاصل کر کے کسی سرکاری عہدے تک پہنچ بھی جاتا تھا تو اُس کی ترقی کے راستوں میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ حالانکہ سرکاری ملازمین کے سروس بُک میں سُرخ روشنائی سے نوٹ لکھنے والے آفیسروں کی اس وادی میں آج بھی کمی نہیں لیکن شخصی راج کی بات زیادہ ہی نرالی تھی۔

دینی رہنماؤں کی دربار سے بے دخلی اور جلاوطنی، سماجی کارکنوں کی ایذارسانی اور مسلم آفیسروں کے ساتھ سوتیلے سلوک کا یہ مسلسل سلسلہ بیک وقت مہاراجہ کے تابوت میں یکے بعد دیگرے

فولادی میخ ثابت ہورہا تھااورصورتحال بدسے بدتر ہوئی جارہی تھی، مہاراجہ اپنی مستی میں کافی دیر تک ڈوبا رہااور جب اُسے اپنی غلطیوں کا تھوڑا احساس ہوا تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔غلام احمد میر لکھتے ہیں:

''مہاراجہ کو اپنی ہمالیائی غلطی کا احساس ہوا اور اُس نے اس پر ندامت کا بھی اظہار کیا لیکن اسی دوران اُسے مرض الموت نے ایسا گھیرا کہ وہ جانبر نہ ہوسکا ۔آخری ہچکی لینے سے پہلے پرتاب سنگھ نے راج کمار ہری سنگھ کو بُلا کر بتایا'' مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے لہٰذا میرے کشمیریوں کا خاص خیال رکھنا کیونکہ وہ بہت معصوم اور غریب ہیں''.......[1]

1925ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے حکومت سنبھالی، جسے ورثے میں جموں وکشمیر کی شورش زدہ ریاست ملی، وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے لندن چلا گیا اور شیخ محمد عبداللہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری مکمل کی۔وہ ایک سرکاری سکول میں بطور سائنس ٹیچر منتخب ہوگئے لیکن کشمیر کی سیاسی بے چینی نے اُنہیں سیاست کے میدان میں دعوت دی اور انہوں نے ملازمت کو خیر باد کہہ کر سیاست کو پوری طرح اپنا لیا۔شیخ عبداللہ لاہور میں تھے کہ مہاراجہ کے ایک مخالف ایلین بینرجی (Alien Banerji) نے کشمیر کے حوالے سے ایک سحر انگیز اور شعلہ بیان تقریر کی۔جو شیخ نے بھی سُنی اور اس طرح اُن کے جذبات کو بھی ہوا ملی۔انہوں نے لاہور کے اخبار'' دی مسلم آوٹ لُک'' میں کئی مضامین لکھے اور مہاراجہ کو نشانہ بنایا۔

---

[1]..... معاف فرمایئے...اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے، کیا غلام احمد میر مہاراجہ پرتاب سنگھ کی موت کے وقت وہاں موجود تھا؟ کیا کسی نے اس کو یہ خبر دے دی؟ یا پھر انہوں نے خواب میں یہ دیکھا... پرتاب سنگھ کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ صبح سویرے کسی مسلمان کا مہنہ نہیں دیکھتا تھا.تانترک پنڈتوں نے اس کو'بھگہ پوجا'' یعنی اندامِ نہانی کی پرستش میں محو کردیا تھا،اس نے کبھی بھی کسی مسلمان حکیم سے علاج نہیں کرایا بلکہ جموں کے آریہ ویدک ویدوں اور بنارس کے پنڈاویدوں سے علاج کراتا تھا،مہاراجہ افیون کا بھی عادی تھا....مہاراجہ اپنا وقت پوجا پاٹ، برہمنوں، جوگیوں اور پنڈتوں کی سیوا میں بسر کرتا تھا....(فدا محمد حسنین:محمد سعادت شاہ مورخِ کشمیر)

14

عبدالقدیر، کشمیریوں کا غیبی ہمدرد

کشمیر کے لالہ زاروں، کوہساروں اور میدانوں میں اُگنے والے نرم ونازک اور معصوم پھولوں نے بہت طویل عرصے تک غیروں کے ظُلم وستم، مظالم اور دوسرے استحصال سہنے کے بعد خود سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ اس ناانصافی اور مسلسل عذاب وعتاب کے خلاف صف آرا ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ چاہتے ہیں....اور جیسا کہ داناؤں کا قول ہے کہ وقت کا دریاء اپنا راستہ خود بخود بناتا چلا جاتا ہے اور اس کے راستے میں آنے والے پربت، چٹانیں، کھیت، اور بستیاں اس کی تُند وتیز لہروں کے سامنے تنکے ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح ڈوگروں کے مظالم اور ستم دراصل خفتہ کشمیر قوم کو صدیوں کی نیند سے جگانے کے لئے ''اذانِ فجر'' ثابت ہورہے تھے، ڈوگرہ حکومت میں شامل چند ایک مسلم افسران کا روّیہ اپنے لوگوں کے ساتھ غیر مسلموں سے بھی زیادہ بدتر اور بہیمانہ تھا اور اپنی قوم کے ساتھ دشمنی اُن کی ترقی کی شرطِ اول تھی، اِن دنوں کی چشم دید صورتحال اُس وقت کے سرکردہ رہنما چودھری غلام عباس اپنی سوانح ''کشمکش'' کے صفحہ نمبر56/ پر کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اِدھر حکومت نے مسلمانوں کو ظلم وتعدیب کے مختلف حربوں سے دبایا اور جب اسے یقین محکم ہوگیا کہ اب یہ قوم، چاہے لاکھوں ہاتھ پاؤں مارے، اُبھرنے کی نہیں تو پھر زمانۂ امن اور حالتِ اطمینان میں اس نے مسلمانوں سے کُھلے بندوں شدید بے انصافیاں شروع کردیں۔ سابقہ شواہد کا نقشہ ان کے سامنے تھا اس لئے وہ بے انصافیوں کے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت بھی کیونکر کرسکتے تھے۔ انہوں نے جسمانی اور ذہنی پستی اور آزادیٔ ضمیر کی پامالی کا سلسلہ شروع کردیا، جبکہ بعض علاقوں میں خانہ خُدا کی تعمیر ان کے لئے ناممکن ہوگئی۔ فلاح کی طرف بلانے والی اذانیں بھی اُن کیلئے مُمنوع قرار دی گئیں۔ آزادیٔ تقریر تو کبھی ریاست میں نام کو بھی نہ تھی لیکن اب مسلمانوں کے مذہبی جلسے اور جلوس بھی حکومت کی طبعِ نازک پر گراں گزرنے لگے تھے اور ان کا انعقاد قطعاً حکومت کے رحم وکرم پر منحصر ہوگیا تھا، اس سلسلے میں مسلمان اول تو

طائرِ زیردام کی طرح پھڑ پھڑائے لیکن صیاد کا دام کچے دھاگے کا نہ تھا کہ اس سے آزادی حاصل کر سکتے، نتیجہ یہ ہوا کہ جس قوم کے خدا اور رسولؐ نے مشرکوں کو نجس کہہ کر مخاطب کیا تھا، وہی مشرک مسلمانوں کو نجس اور ملیچھ سمجھنے لگے اور وہ وقت بھی آ گیا کہ ریاست کے برادرانِ وطن نے چھوت چھات کے معاملے میں مسلمانوں کو اچھوتوں سے بھی زیادہ قابلِ نفرت سمجھا، حتیٰ کہ بعض حکمران اپنی مخصوص مجلسوں اور محفلوں میں مسلمانوں کی شکل تک دیکھنا گوارہ نہ کرتے تھے اور اس حالت میں اگر کوئی مسلمان اتفاقاً ان کے نزدیک سے گزر جاتا تو ان کے معبودوں کی عبادت ہی درہم برہم نہ ہوجاتی بلکہ اس محفل کا فرش اور تمام اشیاء ناپاک ہوجاتیں''۔

قائدِ کشمیر چودھری غلام عباس، جو کہ نہ صرف تحریکِ مزاحمت کے اولین قائدین میں سے تھے بلکہ شیخ محمد عبداللہ کے قریبی سپہ سالاروں میں سے بھی شامل تھے، علاوہ ازیں وہ جموں صوبے کے واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم رہنما تھے۔ انہوں نے اپنی اس ''نایاب'' تصنیف میں جموں کے مسلمانوں کے جو حالات بیان کئے ہیں، وہ اور بھی زیادہ چونکا دینے والے اور قابلِ افسوس ہیں۔ جموں کے مسلمانوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:-

''اِن ایّام میں ہندوستان میں 'شُدھی' کی تحریک زوروں پر تھی، اس سے نپٹنے کے لئے جمعیت علمائے ہند اور انجمن تبلیغ الاسلام میدان میں اُتر چکی تھیں...... یاد رہے کے ریاست کے بعض پہاڑی علاقوں میں اُس وقت ایک اجنبی کے لئے ہندو اور مسلمانوں میں تمیز کرنا بے حد مشکل ہو گیا تھا، ان مسلمانوں کے رسوم، وظع قطع اور لباس حتیٰ کہ عام عادات بھی ہندوانہ تھیں، گھر گھر میں مورتیں تھیں، جن کو یہ مسلمان پوجتے اور ان سے مرادیں مانگتے تھے، ان حالات میں ہماری تشویش حق بجانب تھی۔ ایسوسی ایشن (ینگ مینز ایسوسی ایشن) کا دائرہ عمل ان ایّام میں زیادہ سے زیادہ جموں کے دو تین اضلاع تک تھا...'' (کشمکش۔صفحہ 38/)

گزشتہ چند مضامین میں ہم نے ان سطور میں کشمیر کی اُس سیاسی، سماجی، دینی اور اقتصادی صورتحال پر تفصیلی بحث کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے اس سرزمین پر ایک اور بغاوت کے لئے زمین اور ماحول تیار ہو رہا تھا، اس بغاوت کی خبر دلی میں قابض برطانوی سرکار کو بھی تھی اور اُس نے کئی بار مہاراجہ سے بھی کہا کہ وہ کشمیریوں کی حالتِ زار کو سدھارنے اور بہتر بنانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرے اور اگر

چہ مہاراجہ از خود بھی اس صورتحال سے پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ اس بے چینی اور غیر یقنی صورتحال کا خاتمہ ہو جائے لیکن اُس کے ماتحت افسر اور وزراء راجہ کے حکم کا مذاق اُڑاتے رہے جس سے افراتفری اور بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ لوگ مہاراجہ کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔

غلام احمد میر لکھتے ہیں:-

''ہری سنگھ 1931ء میں لندن سے لوٹا تو اُسے کشمیر کی شدید ترین صورتحال کے بارے میں بتایا گیا، اس نے سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا اور اس پر قابو پانے کے لئے اقدامات کرنے کیلئے کہا، ان دنوں سرینگر کی خانقاہ معلیٰ سیاست کا مرکز بن چکی تھی ایسے ہی ایک مزاحمتی جلسے کے دوران عبدالقدیر نامی ایک غیر ریاستی شخص خانقاہ کے ممبر پر رونما ہوا اور ایک تاریخی خطاب کر کے کشمیریوں سے مہاراجہ ہری سنگھ کے شخصی راج اور مظالم کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کی، عبدالقدیر کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ وہ ایک یورپی سیاح کے ساتھ خانساماں کی حیثیت سے کام کرتا تھا، گرمی کے دنوں میں اکثر یورپی سیاح کشمیر آتے تھے، عبدالقدیر صوم وصلواۃ کا پابند تھا اور انتہائی شعلہ بیان مقرر بھی''

اِدھر چودھری غلام عباس عبدالقدیر کے بارے میں لکھتے ہیں:-

''عبدالقدیر سیاح کے خانساماں کے طور پر کشمیر آیا تھا، وہ انتہائی سوجھ بوجھ کا مالک اور صوم وصلواۃ کا پابند تھا، نماز جمعہ کے موقعہ پر جامع مسجد کے اجتماع میں دوسرے رہنماؤں کے آخر میں اُسے خطاب کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ اُس کا طرزِ تخاطب ہیجان خیز تھا۔ اُسے جلسے کے اختتام پر جامع مسجد کے باہر گرفتار کر لیا گیا۔ اور دفعہ 144/A کے تحت مقدمہ دائر کر کے سنٹرل جیل سرینگر منتقل کر دیا گیا، اُس کے خلاف جیل کے اندر ہی مقدمہ چلایا جا رہا تھا'' (یہ واقعہ جامعہ مسجد میں نہیں بلکہ خانقاہِ معلیٰ میں پیش آیا...ف م ح)

اِدھر عبدالقدیر کی گرفتاری عمل میں لائی گئی اور اُدھر مہاراجہ ہری سنگھ نے تینوں خطوں یعنی کشمیر، مظفر آباد اور جموں کے نمائندوں کی ایک ہنگامی نشست طلب کی، جس میں شیخ محمد عبداللہ اور میر واعظ مولانا یوسف شاہ نے کشمیری کی نمائندگی کی، چودھری غلام عباس اور سردار گوہر رحمان نے جموں کی جبکہ پیر حسن دین بانڈے نے مظفر آباد کی نمائندگی کی۔ مذاکرات کے کئی ادوار ہوئے جو تمام تر کوششوں کے باوجود ناکام

رہے اور جوں ہی اس ناکامی کی اطلاع باہر گئی تو سرینگر میں مظاہرے بھڑک اُٹھے، اسی دوران مفتی ضیاء الدین اور کئی دیگر معززین نے لاہور اور پنجاب جا کر وہاں کے مسلمانوں سے مہاراجہ کے خلاف مدد طلب کی جبکہ اِدھر کشمیر میں مہاراجہ نے مذاکرات کی ناکامی کے بعد ''نقصِ امن'' کے پیشِ نظر مذاکرات میں شامل سبھی 17/افراد کی گرفتاری عمل میں لائی، ان میں شیخ محمد عبداللہ، چودھری غلام عباس، مولینا یوسف شاہ، حسن دین بانڈے اور سردار گوہر رحمان بھی شامل تھے مہاراجہ کا خیال تھا کہ قائدین کی گرفتاری سے عوام ڈر کر خاموش ہو جائیں گے لیکن اس کا اُلٹا ردعمل ہوا اور مظاہروں میں مزید شدت آ گئی، مہاراجہ نے عوام کے تیور دیکھ کر قائدین کو رہا کر دیا جبکہ اس کے باوجود ہڑتال جاری رہی اور پورے 17/روز تک سرینگر کی گلیوں، بازاروں اور شاہراؤں پر ویرانی چھائی رہی اور تاریخ گواہ ہے کہ غلامی کے گزشتہ ساڑے چھ سو سالوں میں یہ سب سے طویل ہڑتال تھی۔

13/جولائی کا دن کشمیر کی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا، اس دن شہداء نے اپنے گرم گرم لہو سے کشمیری عوام کے دلوں میں ایسی انقلابی مشعل روشن کر دی جو شائد ہی کبھی گُل ہو سکتی ہے۔ سنٹرل جیل سرینگر میں مقید شعلہ بیان مقرر عبدالقدیر کے مقدمے کی سماعت جبکہ جیل اور جامع مسجد کے باہر ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور عبدالقدیر کی حمایت میں مظاہرے شروع ہو گئے، اس واقعہ کے بارے میں کشمکش کے صفحات پر درج ہے:-

''آج 13/جولائی کو پھر اُس (عبدالقدیر) کے مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی مسلمانانِ کشمیر کے ایک غریب پرور یار کے یوں پابندِ سلاسل ہو جانے کی وجہ سے اِس کے ساتھ گونا گوں ہمدردیاں تھیں۔ آج فیصلہ سنایا جانا تھا، مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جیل کے باہر جمع ہو گئے تھے، سماعت کنندہ جج جب جیل کے اندر داخل ہوا تو اُس نے جیل کا دروازہ اندر سے بند کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے تقاضا کیا کہ وہ بھی مقدمے کی کاروائی سُننا چاہتے ہیں، حکومت کے اہلکاروں اور عوام کے مابین تقاضہ جاری رہا تو پولیس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اطلاع دی، وہ بھی فوراً پہنچ گیا، لوگوں کو فوری طور منتشر ہونے کیلئے کہا گیا، جب عوام نے اُس کا کہنا نہ مانا تو ضابطہء فائرنگ کو ملحوظِ نظر رکھے بغیر دسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو لوگوں پر گولی چلانے کا حُکم دے دیا...... پولیس نے مجسٹریٹ کا اشارہ پاتے ہی مسلمانوں پر اندھا دُھند گولیاں برسادیں، مسلمان تیتر اور بیڑ کی طرح لوٹ پوٹ ہو کر گرے...... یوں معلوم ہونے

لگا کہ خود مجسٹریٹ بھی حواس باختہ ہوگیا ہے......وہ بوکھلاہٹ میں حکم امتناعی نہ دے سکا یا ممکن ہے کہ اُس نے عملاً ایسا کیا ہو مگر پولیس نے اُس وقت گولی چلانا بند کیا، جب اُن کے میگزین خالی ہو گئے''

(کشمکش / چودھر غلام عباس / صفحہ نمبر 79)

اس واقعہ کے حوالہ سے پرویز دیوان مزید تفصیلات یوں شامل کرتا ہے۔

''مہاراجہ کے سپاہیوں نے مُشتعل ہجوم پر فائرنگ کر دی، جس سے جیل کے باہر 17/افراد جان بحق ہو گئے جبکہ نوہٹہ میں جامع مسجد کے باہر بھی احتجاجی مظاہرہ جاری تھا، پولیس نے وہاں بھی فائرنگ کر دی جس میں مزید دس افراد مارے گئے۔ اس طرح اِن واقعات میں 27/افراد جان بحق ہوئے''

یہ فائرنگ مہاراجہ کے مجسٹریٹ اور پولیس آفیسروں کی تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی کا کھلا مظاہرہ تھا جو ڈوگرہ سامراج کے جنازے میں آخری کیل ثابت ہوئی اور اسی کی وجہ سے راکھ کے ڈھیر میں چھپی چنگاری کو ہوا لگی اور اُس نے جنگل کے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سنٹرل جیل اور جامع مسجد کے دو واقعات میں جاں بحق ہونے والے شہداء کو نوہٹہ میں حضرت نقشبند مشکل کُشاؒ کی درگاہ کے احاطہ میں سُپرد خاک کر دیا گیا، جہاں ہر سال 13/جولائی کے روز اُنھیں خراجِ عقیدت ادا کیا جاتا ہے (اور یہی واقعہ راقم کے لئے یہ کتاب لکھنے کا محرک بھی بنا) لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ آج بھی مفاد پرست سیاستدان اِن شہداء کو کئی سیاسی خانوں میں بانٹ کر اُن کے مِشن کے نقیب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ ایک بات تو طے ہے کہ اِن شہیدوں نے نہ تو الحاق ہند کے لئے اپنا خون بہایا اور نہ ہی الحاقِ پاکستان کے لئے.....البتہ انہوں نے اپنا لہو دے کر کشمیری عوام کو ایک طویل خواب خرگوش سے جگا دیا اور ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھ دی جس نے آگے چل کر کشمیر سے ڈوگرہ شاہی کا خاتمہ کر دیا اور کشمیر پھر سے کشمیریوں کے ہاتھ میں آ گیا.....لیکن وائے بد قسمتی!

اس واقعہ کے بعد عبدالقدیر نامی اُس 'غیر' کشمیری ہمدرد کا کیا انجام ہوا، اُسے پھانسی دی گئی، گولی مار دی گئی یا پھر کشمیر سے بھگا دیا گیا؟ اس سوال کا جواب ملنا مشکل قدرے مشکل ہے کیونکہ اِس حوالے سے اکثر مورخین خاموش ہی نظر آتے ہیں تاہم وادی کے ایک نوجوان صحافی ظہیرالدین کا دعویٰ ہے کہ اُنہوں نے اپنی تحقیق سے پتہ لگایا ہے کہ عبدالقدیر خان دراصل ایک کشمیری تھا، وہ گوٹلی باغ گاندربل کے پٹھانوں میں سے تھا۔ اُن کی فیملی نے بخشی دور میں ہجرت کر لی اور آج اُن کے رشتہ دار راولپنڈی پاکستان

میں رہتے ہیں۔خود چودھری غلام عباس نے بھی اس حوالہ سے لکھا ہے کہ فائرنگ کے اس واقعے کی حکومت نے یہ جوازیت پیش کی کہ عوام کا ایک ہجوم جیل پر حملہ آوار ہوا جس وجہ سے پولیس کو گولی چلانا پڑی،حالانکہ یہ سفید جھوٹ تھا کیونکہ شہداء کی ایک بھی لاش جیل کے اندر سے برآمد نہیں کی گئی اور حکومت نے خود بھی تسلیم کیا کہ گولی جیل کے باہر چلی،حقیقت یہ ہے کہ پولیس نے منتشر ہوتے ہوئے مسلمانوں پراور پھر جیل کے بیرونی صحن سے باہر سڑک پر بھاگتے لوگوں پر گولی چلادی،وہ ''کشمکش'' کے صفحہ نمبر80/ پر رقمطراز ہیں:-

''ہم تین دوست شام کے وقت جامع مسجد کے قریب سے امیرا کدل کی طرف جارہے تھے تا کہ دیگر نمائندوں کے ساتھ اس سانحہ کی روشنی میں مشورہ کر کے آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا جائے ، جب ہم مہاراج گنج پہنچے ،جو سرینگر کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے تو یہ دیکھ کر ہمیں بہت دُکھ ہوا کہ چند ہندوؤں کی دکانیں جُلائی جاچکی تھیں اوران کا مال باہر سڑک پر پڑا ہوا تھا، جب ہم مہاراج گنج سے ذرا آگے بڑھے تو ہمیں معلوم ہوا کہ شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا ہے اور عوام کی نقل وحرکت پر پابندی لگادی گئی ہے......فوج تمام ڈوگرہ ہندوں پر مشتمل تھی،ایک مقام پر کچھ سپاہیوں اور ادنیٰ عہدیداروں نے ہمیں روک لیا ،کچھ دیر وہ ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے پھر تہذیب سوز گالیوں پر اُتر آئے ،اُن میں سے شاید کوئی ہمیں پہچانتا تھا،اُس نے باقیوں کو بھی ہماری حیثیت سے آگاہ کر دیا ،پھر تو انہوں نے بہت پیچ وتاب کھائے، دشنام طرازی کے علاوہ اُنھیں یہ بھی کہتے سنا گیا کہ اُنہی غنڈوں اور بد معاشوں کی وجہ سے ریاست کا امن تباہ ہوا ہے اور ہندوؤں کا مالی نقصان ہوا ہے،اس لئے بہتر ہے کہ ان کا اسی جگہ خاتمہ کر دیا جائے! تاہم اس دوران وہاں چند ذمہ دار افسران آگئے......اُن میں سے ایک کے ساتھ میری معمولی سی جان پہچان تھی ،انہوں نے دو سپاہی ہمارے ساتھ کر دیئے......ہمارا ہاوس بوٹ گاؤ کدل میں تھا،ہم تقریباً دس بجے رات کو وہاں پہنچے''

شام گئے گاؤ کدل کے ہاوس بوٹ تک پہنچانے اورعزت واکرام دینے والے سپاہی دراصل مخبر ثابت ہوئے اورآدھی رات کو چھاپہ مار کر تینوں دوستوں (غلام عباس، گوہر رحمان اور محمد یعقوب علی کنٹریکٹر) کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔اس حوالے سے چودھری مزید لکھتے ہیں:-

''ہم تینوں کی گرفتاری کا منظر قابلِ دید تھا، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، ایک سینئر اسسٹنٹ، دو اسسٹنٹ سپرانٹنڈنٹ، چار انسپکٹر، کئی ادنیٰ اہلکار، سب انسپکٹر اور بے شمار کانسٹیبل بندوقیں تانے اور پستول لٹکائے ہوئے تھے، حالانکہ کرفیو نافذ تھا، سارا شہر فوج کے تسلط میں تھا، اندھیری رات کا سماں، انسان یا کسی جاندار کی آواز تو درکنار ہوا کی سرسراہٹ بھی سنائی نہ دیتی تھی لیکن حکومت کی غیر مآل اندیشی اور گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ ہم تین اور صرف تین آدمیوں کی گرفتاری کیلئے پولیس کے اعلیٰ و ادنیٰ افسروں اور سپاہیوں کا اتنا بڑا لاؤلشکر آیا ہوا تھا، انسپکٹر جنرل پولیس نے کہا مجھے حکم ہوا ہے کہ آپ کو ہتھکڑی لگا کر لایا جائے، میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، میں حیران ہوں کہ مجھ میں کسی خوف و ہراس کی بجائے بیبا کی کہاں سے آ گئی تھی..'' (کشمکش رغلام عباس رصفحہ 82)

13 رجولائی کا واقعہ غیر معمولی نوعیت کا تھا، شہر کے پائین علاقے میں پیش آنے والی اِس خونین واردات نے بارود کا کام کیا تھا، مشتعل مظاہرین نے بازاروں اور دکانوں میں توڑ پھوڑ کی اور ڈوگرہ فوج نے گرفتاریوں اور مار دھاڑ کا سلسلہ شروع کر دیا، جو کئی دن تک جاری رہا، پولیس کی ناکامی کے بعد شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا اور عوام کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی گئی، اِن مظاہروں، جلسوں اور جلوسوں کی قیادت مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے کی اور چونکہ یہ ایک نازک موقعہ تھا اور عوام کو ایک قائد کی ضرورت تھی، اس لئے یہ واقعہ شیخ صاحب کے لئے نادر و نایاب ثابت ہوا، وہ عوام کی قیادت کرتے رہے ،جس کی وجہ سے اُنھیں راتوں رات کافی شہرت نصیب ہوئی''

اگر چہ بعض مورخین شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کی تاریخ 21رستمبر 1931ء بتاتے ہیں لیکن چودھری کے مطابق اُنھیں سرینگر کے نوہٹہ علاقے میں اُس وقت گرفتار کر لیا گیا تھا جب وہ 13رجولائی کے شہداء کی تجہیز و تکفین میں مرحوم میر واعظ یوسف شاہ کے ہمراہ مصروف تھے، اُن کے اپنے الفاظ میں'' ہماری گرفتاری کے پورے بارہ گھنٹے بعد دوپہر کے وقت شیخ محمد عبداللہ کو جامع مسجد میں جبکہ وہ میر واعظ کی معیت میں شہداء کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے، گرفتار کر لیا گیا، دوسرے دن ہمارے ہاتھ پشت پر جھکڑ دیئے گئے اور ہاری پربت قلعے میں پہنچا دیا گیا......رات انتہائی تاریک تھی''

1. ....مولانا عبدالقدیر خان کا کیا ہوا؟ وہ کیسے غائب ہوا؟ اس کا جواب شیخ عبداللہ، چودھری عباس اور مولوی مسعودی دیں گے ...مورخین سے کیا پوچھنا؟ 1947ء تک کسی نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ خان صاحب کا کیا ہوا اور وہ کہاں گم ہو گئے ....مسٹر غلام رسول مغل (ڈپٹی سیکریٹری ریٹائرڈ) متصل پالی ٹیکنک کالج گوگجی باغ نے باضابطہ ایک اخباری انٹرویو دیا تھا کہ مولانا عبدالقدیر خان کو خفیہ طور مروایا گیا اور وہ دیوان اسٹیٹ گونی کھن کے کونے میں دفن ہیں...ف م ح)

15

شیخ، چودھری، اور میر واعظ کا سہ فریقی اختلاف!

گزشتہ سے پیوستہ......

تاریخ کشمیر کے ''کشمیر چھوڑ وتحریک'' نام کے اہم ترین باب کی ایک اہم کتاب ''کشمکش'' جس پر ریاست کی ایک سیاسی جماعت (نیشنل کانفرنس) نے قدغن لگا رکھی ہے، کے صفحات پر چودھری غلام عباس مرحوم اپنی اور مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی پہلی گرفتاری کے بارے میں لکھتے ہیں:-

> ''قلعہٴ ہاری پربت کے اندر...... روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا، یہ قلعہ ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے اور وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک تنگ وتاریک پگڈنڈی سے گزرنا پڑتا ہے، وہ بھی اِن دنوں قلعہ کے عدم استعمال کے باعث ناقابلِ گزر ہو چکی تھی، رات کی تاریکی میں جب ہمارے ہاتھ پُشت کی جانب بندھے ہوئے تھے، ہم کئی بار وہ پگڈنڈی طے کرتے ہوئے گرتے گرتے بچے، رات کے پورے بارہ بجے تھے، جب ہم قلعے میں پہنچے۔ وہاں جموں کے تینوں نمائندوں کو ایک کمرے میں اور سرینگر کے محبوسین کو دوسرے کمرے میں بند کر دیا گیا، کمرہ بالکل تیرہ وتار تھا، ہاتھ کو سُجھائی نہ دیتا تھا، چھت اتنی نیچی تھی کہ ذرا انگڑائی لی تو ہاتھ چھت سے جا ٹکرائے، یہاں بھی وہی کیفیت تھی، جس سے ہمیں بادامی باغ میں سابقہ پڑا تھا، نہ بستر، نہ روشنی، ہم اسیرانِ حریت کو یقین ہو گیا کہ صدیوں کے بعد آج یہ کمرے اس لئے کھولے گئے ہیں کہ ہم یہاں گل سڑ کر مرجائیں اور آزادی کی رُوح کچلی جاسکے!(کشمکش/صفحہ نمبر87)

چودھری غلام عباس، گوہر رحمان اور یعقوب علی کنٹریکٹر غالباً ''کشمیر چھوڑ وتحریک'' کے اولین اسیر تھے اور دوسرے روز ان میں شیخ محمد عبداللہ کو بھی شامل کر لیا گیا[1]۔ ایک طرف قیادت گرفتار ہو چکی

---

[1]... 1931ء میں ''کشمیر چھوڑ وتحریک'' نے جنم نہیں لیا تھا بلکہ مسلمان اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے تھے....سب سے پہلا شخص، جو قلعہ جیل کی تاریک کوٹھری میں بند ہوا، غلام نبی گلکار تھا....ف م ح)

تھی تو دوسری طرف عوام کا یہ حال تھا کہ اُن کے سامنے اس تحریک کو آگے بڑھانے کے حوالے سے ابھی تک کوئی بھی پروگرام یا لائحہ عمل موجود نہیں تھا، نہ ہی آج کل کی طرح اُن دنوں ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو، اخبارات اور ٹیلی ویژن کا چلن تھا، جسے قائدین استعمال کرتے، اس لئے یہ وقت کشمیری عوام کیلئے کافی آزمائش کا وقت تھا، اُنھیں فیصلہ کرنا تھا کہ آیا انھیں 13 رجولائی کے خون خرابے، جانی نقصان اور اُس کے بعد مہاراجہ کی ڈوگرہ سپاہ کے مظالم اور قائدین کی گرفتاری جیسی باتوں سے خوفزدہ ہو کر اس کشمکش سے دستبردار ہونا چاہیے اور ''پرانی تنخواہ'' پر کام کرنا چاہیے یا پھر صبر و استقلال اور عزم و ارادے کا راستہ اختیار کر کے اُسے آگے بڑھانا چاہیے اور اس طویل غلامی اور محکومیت کا خاتمہ کرنا چاہیے، خوش قسمتی سے عوام نے دوسرا مگر سخت ترین راستہ اختیار کیا۔ قائدین کی حراست کے بعد لوگوں نے سرینگر میں مسلسل ہڑتال کر دی اور جب تک قائدین بند رہے، سرینگر میں ہر قسم کا کاروبار بند رہا بتایا جاتا ہے کہ کشمیری عوام کا یہ فیصلہ اتنا قوی اور مستقل تھا کہ اس نے ہندوستان بھر کی تمام سابقہ ہڑتالوں کا ریکارڈ مات کر دیا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا، اُس وقت ریاست میں مسٹر ویکفیلڈ کی حاکمیت تھی۔ 13 رجولائی کے خون خرابے کی وجہ سے اُس کی بہت بے عزتی ہوئی تھی اور اُسے دلّی واپس بھیج دیا گیا تھا، اُس کے بعد ہری کرشن کول کو ریاست کا وزیر اعظم بنایا گیا، کول نے مہاراجہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کشمیری عوام کی اس تحریک کو تین ماہ کے اندر اندر کچل دے گا لیکن نتیجہ اس کے اُلٹ نکلا اور کشمیریوں نے نہ صرف ہڑتالوں کا سلسلہ تیز کر دیا بلکہ سڑکوں اور گلی کوچوں میں احتجاج، پتھراؤ اور مظاہروں کا شدید اور لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ شہر میں 13 رجولائی کے روز بے گناہ مسلمانوں پر اندھا دھند گولی چلنے، 27 رافراد کی شہادت اور بعد کے مظالم کی وجہ سے کشمیری مسلمانوں کے اندر انتقامی جذبات بھڑک اُٹھے جبکہ ان خبروں کی وجہ سے بیرونِ کشمیر مسلمانوں میں بھی کشمیریوں کے لئے ہمدردی بڑھنے لگی اور اس حوالے سے ہونے والے پروپگنڈہ اور شور شرابے کی وجہ سے راجہ ہری کرشن کول تنگ آ گیا اور اُس نے گرفتار قائدین کو رہا کر دیا۔

چودھری غلام عباس لکھتے ہیں:۔ ''رہائی کے فوراً بعد راجہ ہری کرشن سے ہماری ملاقات ہوئی، موضوعِ ملاقات حالات کو اعتدال پر لانا تھا۔ اس سلسلے میں ہماری اُس کے ساتھ کئی بار ملاقات ہوئی۔ ہری کرشن کول زمانہ ساز، متحمل مزاج، بردبار اور گہرے دِل و دماغ کا تجربہ کار انسان تھا، درحقیقت اُسے ''گرگ باراں دیدہ'' (مصیبتوں سے گزرنے والا کُتا) کہنا چاہیے، جوانی کے ساتھ ساتھ میرے اندازِ گفتگو میں شوخی و طراری بھی تھی، اس لئے اُس کے ساتھ نوک جھونک رہی، اس سے تنگ آ کر اُس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا ''چودھری! ابھی آپ جوان ہیں اور آپ کی رگوں میں گرم گرم خون تیزی کے

ساتھ دوڑ رہا ہے، جب یہ خون ذرا سرد پڑ جائے گا، تو پھر آپ ایک صحیح قومی کارکن بنیں گے، اگر چہ اُس وقت راجہ جی کی بات مجھے ناگوار معلوم ہوئی لیکن تجربے نے بتلا دیا کہ جو کچھ اُس نے کہا تھا، سچ تھا'' کشمکش/صفحہ 89)

''کشمیر چھوڑ و تحریک'' کے ابتدائی ایاّم میں ریاست کو ایک اچھی قیادت نصیب ہوئی تھی، شیخ محمد عبداللہ زیادہ تر دیہی کشمیر کی ترجمانی کرتے تھے جبکہ میرواعظ مولوی یوسف شاہ کا مرکز شہرِ خاص، جامع مسجد اور اس کے ملحقہ جات میں تھا، جہاں وہ ہر نماز پر ہزاروں مسلمانوں سے مخاطب ہوتے تھے جبکہ اس کے علاوہ اُنھیں شہر کے متعدد متمول اور صاحبِ ثروت گھرانوں کی حمایت بھی حاصل تھی چودھری غلام عباس کا تعلق جموں سے تھا اور اُس میں قائدانہ خصوصیات اگر چہ بدرجہ اُتم موجود تھیں لیکن جموں کے مسلمانوں کو چونکہ مہاراجہ کے انتظامیہ میں اچھی خاصی پوزیشن حاصل تھی اس لئے چودھری اپنے لوگوں کی زیادہ حمایت نہ جُٹا سکے، ریاست کی بدقسمتی تھی کہ اُنھیں تاریخ کے اس نازک موڑ پر جو تین بڑے قائد ملے، اُن کے خیالات ایک دوسرے سے قطعاً مختلف اور متضاد تھے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اس اتحاد کا زیادہ دنوں تک چلنا ممکن نہیں تھا، تینوں رہنماء ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے اور نتیجہ وہی ہوا جو موجودہ مزاحمتی قیادت کا ہو رہا ہے۔ ہر لیڈر اور ہر تنظیم کا اپنا الگ ایجنڈا، پروگرام اور لائحہ عمل ہے اور سبھی اپنے اپنے حساب سے مسئلہ کشمیر کا حل چاہتے ہیں، حالانکہ اس حل کے لئے کسی بھی تنظیم، لیڈر یا اتحاد کے پاس کوئی موثر اور قابلِ قبول فارمولہ موجود نہیں ہے۔ اس ساری (سہ رُخی) صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے پرویز دیوان اپنی کتاب ''کشمیر'' میں لکھتے ہیں:-

13/جولائی کی ہلاکتوں کے بعد بھڑک اُٹھنے والی عوامی آگ، مظاہروں اور احتجاج کی قیادت سنبھالتے ہی شیخ محمد عبداللہ راتوں رات کشمیریوں کے غیر متنازعہ قائد بن گئے، مہاراجہ نے شیخ کے اِن اقدامات کو سنجیدگی سے لیا اور اُسے 21/ستمبر 1931ء کو گرفتار کر کے قلعہ ہاری پربت میں بند کر دیا۔ (حالانکہ غلام عباس کے مطابق شیخ کو 15/جولائی کو گرفتار کیا گیا) یہ شیخ محمد عبداللہ کی پہلی گرفتاری تھی جبکہ اس کے بعد انہوں نے اپنی عمر کا پانچواں حصہ قید خانوں میں گزار دیا...... 1931ء میں اُٹھنے والی عوامی مزاحمت کے بعد کشمیری مسلمانوں نے ''مسلم کانفرنس'' نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی، شیخ محمد عبداللہ اس کے سربراہ منتخب ہوئے، چودھری غلام عباس کا تعلق جموں سے تھا اور وہ کشمیری سیاست میں ایک اہم مقام پیدا کر چکے تھے لیکن کچھ ہی وقت کے بعد سرینگر کے مدبّرین نے ''آزاد کانفرنس'' نام سے اپنا ایک سیاسی گروپ تشکیل دیا۔ اس کی قیادت میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ

نے سنبھالی، اُن کا مرکز شہرِ خاص اور جامع مسجد کا علاقہ تھا۔ شیخ محمد عبداللہ دیہی عوام کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اُنہوں نے دیہی عوام کی قیادت کی جبکہ چودھری غلام عباس جموں کے مسلمانوں میں کوئی خاص ارتعاش یا تحریکی ہمدردی پیدا نہ کر سکے، جس کی وجہ یہ تھی کہ جموں کے پنجابی، ڈوگری اور پہاڑی بولنے والے لوگوں کی مہاراجہ کے ساتھ زیادہ ناراضگی نہیں تھی کیونکہ اُنھیں مہاراجہ کی سرکار میں اچھی خاصی نمائندگی حاصل تھی۔ اس طرح تاریخ کے اس موڑ پر تینوں رہنماؤں کے مختلف خیالات اور نظریات زیادہ دیر تک ساتھ نہ چل سکے اور ان میں نفاق پیدا ہوگیا، جو کہ ناگزیر تھا۔

قدرت نے کشمیری عوام کو 13/ جولائی کے شہداء کے گرم لہو اور انمول قربانی کے صدقے صدیوں پرانی غلامی اور محکومی کے خلاف بیدار کر کے صف آرا کر دیا تھا لیکن قائدین نے اس قوم کی حالت پر ترس نہ کھایا (اور نہ شاید کبھی کھائیں گے) اپنے اپنے متفرق پروگرام اور ایجنڈا کو لے کر آگے چلے تو عوام میں مایوسی اور افسردگی کا پیدا ہونا لازمی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ 1937ء میں احمدیہ (مولوی احمد اللہ کے معتقد، جو کہ میر واعظ ہمدانی کے معتقدوں سے مختلف تھے) مسلم کانفرنس سے الگ ہو گئے، جبکہ اسی سال شیخ محمد عبداللہ اور چودھری غلام عباس کی قیادت والی جماعت ''ینگ مینز ایسوسی ایشن بھی الگ ہوگئی اور انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کو اپنا قائد مان لیا اور یہ جماعت سیکولر نظریات کا پرچار کرنے لگی۔ اس وقت شیخ صاحب اور چودھری غلام عباس کے درمیان ایک اور دراڑ پید ہوگئی، جب شیخ نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کا فیصلہ کیا، چودھری کا کہنا ہے کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کی سیکولر نوازی، کانگریس پرستی اور بھارت کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے، وہ خود لکھتے ہیں ''کشمیر چھوڑ و تحریک'' ایک اسلامی تحریک تھی (جو مسلمانوں نے ڈوگروں کے خلاف شروع کی تھی) ہندو سکھ اور ڈوگرے اوّل تو اقلیت میں تھے لیکن دوم اُن میں سے جو لوگ صاحبِ ثروت اور با اثر تھے، وہ مہاراجہ سے خوش تھے یا پھر بھارت نواز تھے، اُن میں سے کوئی بھی تحریک میں شامل نہیں تھا۔ البتہ آنجہانی پریم ناتھ بزاز کشمیریوں کے واحد غیر مسلم ہمدرد تھے۔ گلینسی رپورٹ پر کھڑے ہونے والے فتنے کے دوران انہوں نے میرے ایک ایک لفظ کی تائید کی لیکن بعض کشمیری مسلمان کانگریس کو خوش کرنے کیلئے اُن سے ناراض ہو گئے'' کشمیر کے معاملات میں جواہر لال نہرو نے جو کچھ کہا وہ کشمیریوں (مسلمانوں) کو خوش کرنے (یا پھر اُن کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے) کہا، دُنیا اب اتنی کم عقل نہیں رہی کہ جتنا ہندو کانگریس سمجھتی ہے، کشمیر کے صرف وہی مسلمان اُن کے جھانسے میں آ سکے جو مفاداتِ ملت سے مخصوص مصالحت کی وجہ سے منہ موڑ چکے تھے ورنہ اگر جواہر لال نہرو نیک ہوتا تو وہ نہ صرف خود قید و بند میں مبتلا ہوتا بلکہ اپنے

ہزاروں ہندوؤں کو بھی ریاست پر یورش کا حکم دیتا اور اس طرح ریاست کے مسلمانوں کو اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیتا......کس قدر شرم کی بات ہے کہ اتنا سب کچھ جاننے کے بعد بھی چند مسلمان جواہر لال نہرو اور گاندھی کو اپنا دوست اور قائداعظم کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں'' کشمکش/ صفحہ نمبر117,116)

خواجہ غلام محمد میر اپنی کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' کے صفحات پر اسی زمانے کی روداد بیان کرتے ہوئے پیر پنجال کے مغرب میں واقع صوبۂ جموں کے پہاڑی علاقوں میں ہونے والی ایک بغاوت کا ذکر کرتے ہیں:-

''غالباً 1935ء یا اس سے کچھ قبل کی بات ہے کہ پیر پنجال کے دامن میں مغرب یعنی صوبۂ جموں کی جانب آباد پہاڑی علاقوں، گول گلاب گڑھ سے لے کر پونچھ تک کے عوام یکا یک گھروں سے نکل آئے اور اپنے اپنے علاقے کے تمام سود خور ساہوکاروں اور زمینداروں پر ہلہ بول دیا۔ اس حملے میں نہ تو کوئی لیڈر تھا اور نہ سپہ سالار، نہ ہی کسی تنظیم نے اس کے لئے پروگرام یا کال دی تھی اور نہ اس کے لئے اس سے قبل کوئی تحریک چلی تھی، اس کام کے لئے عوام کو کس نے تیار کیا، یہ بھی معلوم نہیں لیکن واقعہ یہ ہوا کہ زمینداروں اور ساہوکاروں کے سود در سُود کے عذاب سے چھٹکارا پانے کے لئے لوگوں نے ان پر ہلہ بول دیا، تمام بہی کھاتے اور کاغذات جلا ڈالے اور اپنی گروی رکھی ہوئی جائیدادوں اور زمینوں کو چھڑا لیا۔ اس خاموش کاروائی کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں نہ تو کوئی ہاتھا پائی ہوئی، نہ کوئی ہلاک ہوا اور نہ ہی زخمی۔ البتہ اس خاموش انقلاب کا بدلہ مہاراجہ کے فوجی اور پولیس والے بعد میں کئی برسوں تک لوگوں سے لیتے رہے''۔

اگرچہ کشمیر کے تناظر میں اس تاریخی واقعہ کا ذکر کرنا ضروری نہیں تھا لیکن ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ڈوگرہ مہاراجہ کا نظام حکومت محض کشمیری مسلمانوں کے لئے ناقص، نا کارہ اور ظالمانہ نہ تھا بلکہ جموں صوبے کے مسلمان، ڈوگرے اور پہاڑوں میں رہنے والے ہندو اور مسلمان بھی اُن سے یکساں طور پریشان تھے، سود خوروں اور ساہوکاروں، زمینداروں، ضعلداروں اور جاگیرداروں کو اتنی ڈھیل دے دی گئی تھی کہ وہ جونکوں کی طرح غریبوں کا خون چوس رہے تھے، جس کے خلاف لوگوں نے تنگ آمد بہ جنگ آمد کی مصداق حتمی قدم اُٹھایا۔

قائدینِ کشمیر کے نظریاتی ٹکراؤ اور انتشار کی وجہ سے تاریخ کے ایک انتہائی نازک اور حساس

موڑ پر کشمیری عوام ایک بار پھر ساحلِ مراد تک آتے آتے حالات کی موجوں کے تھپیڑوں میں پھنس گئے لیکن اس کے باوجود جو تحریک اپنی رفتار سے آگے بڑھتی رہی اور قائدین نے پہلے مہاراجہ کو ایک عارضی سمجھوتہ کر کے اپنی فریقانہ حیثیت تسلیم کروائی اور اس کے بعد اُنھیں کھلے عام جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کی آزادی مل گئی۔

شیخ محمد عبداللہ کشمیر میں مصروف رہے اور غلام عباس جموں میں، لیکن دونوں اپنے اپنے طور اور علیحدہ علیحدہ راستوں پر عوام کو مہاراجہ کے خلاف تیار کرتے رہے، اپنے معاملات کو تھوڑی دیر تک فراموش اور ترک کر کے چودھری غلام عباس میر واعظ کشمیر مولوی محمد یوسف شاہ اور شیخ محمد عبداللہ کے تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں:-

''......دوسرے ہی سال سرینگر میں میر واعظِ کشمیر اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان شدید اختلافات رونما ہونے لگے، اختلافات کی یہ باہمی جنگ یقیناً مفادِ ملت کے خلاف تھی اور دیکھا جائے تو اقتدار کی اس جنگ کے لئے یہ کوئی موزوں وقت نہیں تھا، میر واعظ کو احساس ہو چلا تھا کہ عبداللہ ان کی خاندانی پوزیشن کو ملیا میٹ کر دے گا اور میر واعظوں کا قدیمی وقار اور اعتبار ختم ہو جائے گا جبکہ ادھر شیخ محمد عبداللہ بھی جانتے تھے کہ جب تک میر واعظ کا گھر سیاسی، مذہبی اور قومی لحاظ سے سالم و ثابت رہے گا، وہ کشمیر کا واحد لیڈر نہیں بن سکے گا، اس معاملہ میں ابتداء کس نے کی، میرے لئے یہ ٹیڑھا اور مشکل سوال ہے......بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ اس تیزی کے ساتھ چھڑ گئی کہ اس کا تھم جانا اب آسان نہ تھا، مسلم کانفرنس سے متعلق اور شیخ محمد عبداللہ سے قریبی مراسم ہونے کی وجہ سے مجھے اس کشمکش میں پہلے مسلم کانفرنس کے جنرل سیکریٹری اور پھر صدر ہونے کی حیثیت سے ایک فریق بننا پڑا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے سیاسی اختلافات کے باوجود میر واعظ صاحب کی ذاتی حیثیت کو کبھی کسی کیلئے نہ بُرا محسوس کیا اور نہ ہی اُن کی شرافت اور علم کا مجھ سے انکار بن آیا......''

چودھری اس موضوع پر مزید لکھتے ہیں:-

''میر واعظ کے احباب خاص رجعت پسند لوگ رہے ہیں، اگر کبھی انتہاء پسندوں نے اُنھیں مشورہ دیا بھی اور شیخ محمد عبداللہ سے اُن کی سیاسی رفاقت بھی ہو گئی تو یہ سلسلہ دیر پا ثابت نہ ہو سکا، اندریں حالات میر واعظ اپنی رجعتِ پسند مجلسِ

مشاورت کی وجہ سے بامِ عروج سے فرشِ زمین پر آ گرنے پر مجبور ہو گئے۔ اُدھر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھی...... چھٹے ہوئے شیر یر تھے اور اُن کے مفادات دنگا فساد سے وابستہ تھے۔ کشمیر کے دونوں لیڈروں کی باہمی سر پھٹول میں حکومت کی چاندی تھی...... چنانچہ حکومت کے ایک عنصر نے ہماری پیٹھ ٹھونکنا شروع کر دی اور دوسرے نے میر واعظ کی پارٹی کی، ہم اپنی جگہ خوش تھے کہ حکومت کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے اور حکومت اپنی جگہ مطمئن و مسرور تھی کہ ان عقل کے اندھوں کو اچھی طرح بے وقوف بنایا جا رہا ہے"(کشمکش/چودھری غلام عباس/صفحہ نمبر 129)

(غور سے دیکھا جائے تو موجودہ دور میں بھی کشمیری قیادت کی مجموعی صورتحال بالکل ایسی ہے، جیسی کہ ڈوگروں کے خلاف لڑائی کے وقت تھی)

16
مسلم کانفرنس سے نیشنل کانفرنس تک

قیادت کی مجبوریاں اور سیاسی نقطہ ہائے نظر میں اختلافات بڑھتے بڑھتے اس قدر الجھ گئے اور پیچیدہ ہو گئے تھے کہ دریا کے بہتے پانی' کمان سے چھوٹنے والے تیر اور جسم سے اُڑ جانے والی روح کی طرح اسے واپس لانا تقریباً ناممکن ہو گیا، لیکن اس کے باوجود تینوں قائد باہمی طور جس بات پر متفق اور یک رائے تھے' وہ تھی ڈوگروں کی غلامی سے نجات، وہ اس حوالے سے عوامی نفرت اور انقلاب کے لئے ہموار ہونے والی زمین اور سازگار ہونے والے ماحول سے بھی پوری طرح واقف تھے، اُنہیں معلوم تھا کہ ڈوگرہ شاہی کی اس دیوار میں دیمک لگ چکی ہے اور اس میں وقت کے زلزلوں نے کئی بڑی بڑی دراڑیں ڈال دی ہیں اور اسے ڈھیر کرنے کے لئے بس ایک چھوٹے سے جھٹکے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی یہ وہ وقت تھا، جب پوری دُنیا میں مظلوم اور محکوم اقوام اپنی آزادی کے لئے برطانوی سامراج سے نبرد آزما ہیں' دوسری جنگِ عظیم نے برطانیہ' جاپان' جرمنی اور امریکہ جیسی مخاصم اور متحارب طاقتوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی' ہٹلر دُنیا کا تھانیدار بن رہا تھا اور دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی افراتفری یہ نوید سنا رہی تھی کہ دُنیا کے نقشے پر عنقریب بہت سی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ بہت سے ممالک کا نقشہ بدلنے والا تھا اور نئے ممالک اُبھرنے والے تھے۔ ان سبھی حالات پر کشمیری قائدین کی بھی نظر تھی اور اوپر آسمانوں میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ دُنیا کی بدلتی صورتحال کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کی تقدیر بھی بدل دی جائے لیکن اس نازک ترین موڑ پر جبکہ موجودہ مصیبتوں سے نکلنے کے لئے کشمیری قائدین سب کچھ کر رہے تھے، انہوں نے (شاید) مستقبل کے حوالے سے کچھ بھی نہ سوچا تھا یا پھر ساری صورتحال کچھ اس طرح سے پیش آئی کہ اُنہیں فرصت میں بیٹھ کر فکر فردا کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔

جون 2004ء میں راقم نے اس دور کے ایک اہم گواہ اور بھارتی وزیراعظم ہند آنجہانی اندرا گاندھی کے قریبی ہمراز پنڈت پی این دھر کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا تھا' دھر نے تیس اور چالیس کی دہائی کے درمیانی دس برسوں کے کشمیر میں رونما ہونے والے واقعات کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اُن دنوں معاشیات (کامرس) کے مضمون میں اپنی اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ

بدلتے ہوئے (برصغیر اور عالمی) حالات کے تناظر میں کشمیر کے مستقبل کے حوالے سے کوئی پالیسی یا خاکہ تشکیل دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے قائدین کو مشورہ دیا تھا کہ بھارت میں عوامی تحریک نے انگریزوں کو فرار کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے اور عنقریب بھارت آزاد ہو جائے گا۔ دوسری طرف 1943ء کے آس پاس نظریہ پاکستان بھی کافی زور پکڑ چکا تھا اور جغرافیائی اعتبار سے کشمیر بھارت، پاکستان اور چین کے درمیان ایک خوبصورت دُلہن کی طرح تھا۔ جنگ وجدل کے ماحول میں یہ خدشہ تھا کہ جیسے ہی کوئی تبدیلی رونما ہوگی یہ سبھی ممالک اس خطۂ زمین کو ہڑپ کرنے کی ضرور کوشش کریں گے، اس لئے کشمیری دانشوروں اور قائدین کے لئے لازمی تھا کہ وہ موجودہ جدوجہد کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی نظر رکھیں۔ دھر نے کہا ''میں نے قائدین کے سامنے کشمیر کی معاشیات، کرنسی ارو پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے ایک تفصیلی خاکہ بھی پیش کیا لیکن قائدین اپنے معاملات میں اس قدر اُلجھے ہوئے تھے کہ میری تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور بعد میں جو ہوا وہ سب نے دیکھا۔ صورتحال یوں بدلی کہ کشمیری قائدین فیصلہ بھی نہ کر پائے کہ اُنہیں کیا کرنا چاہیے۔ بھارت اور پاکستان آزاد ہوئے، مہاراجہ کو فرار ہونا پڑا اور کشمیر کے کئی ٹکڑے ہو گئے، مشرق میں چین نے ایک حصے پر قبضہ کر لیا، شمال میں پاکستان اور جنوب مشرق سے بھارتی افواج نے قبضہ جما لیا'' دھر کا کہنا تھا کہ اُس وقت جو صورتحال اس ریاست اور اس کے چاروں طرف پیدا ہو رہی تھی، اُس کا تقاضا تھا کہ ڈوگروں کو یہاں سے ضرور جانا ہے لیکن اُس کے بعد کیا کرنا ہے، یہ ہم میں سے کسی نے نہیں سوچا۔ دھر نے کہا ''میں قائدین اور دانشوروں سے مایوس ہو کر کشمیر چھوڑ کر افغانستان چلا گیا اور بطور اُستاد پٹھانوں کی نوکری کر لی، جہاں مجھے بہت مزہ آیا''

انہی ایام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پرویز دیوان لکھتے ہیں:۔

''جلد ہی شیخ محمد عبداللہ کا جھکاؤ انڈین نیشنل کانگریس کی طرف بڑھ گیا، جس کے پاس ایک جمہوری نظریہ تھا اور یہ نظریہ شیخ محمد عبداللہ کے نظریے کے بہت قریب تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بہت اہم رول ادا کیا (یہ وہی کانگریس تھی، جس نے پہلے برطانیہ کے خلاف تحریک آزادی کی قیادت کی اور بعد میں آزاد ہندوستان پر 1947، 1977، 1980، 1989، 1991، اور 1996ء میں حکومت کی) ڈاکٹر کچلو نے ایک ایسی ہی نشست میں (تاریخ میں پہلی بار) کہہ دیا تھا

''کشمیر بھارت کا ایک حصہ ہے'' اور شیخ محمد عبداللہ نے ڈاکٹر کچلو کے اس بیان کی
''تعریف'' کی تھی ، وہ کانگریس کے لیڈروں پنڈت نہرو اور خان عبدالغفار خان
(سرحدی گاندھی) سے لاہور کے ریلوے سٹیشن پر ملے اور اُن سے بات کی' پنڈت
نہرو بعد میں بھارت کے پہلے وزیر اعظم بنے'' (کشمیر/صفحہ نمبر 85)

شیرِ کشمیر کہلانے والے شیخ محمد عبداللہ کے کانگریس اور بھارتی قائدین کی طرف اس جھکاؤ کو نہ تو میر واعظ کشمیر نے پسند کیا اور نہ ہی کشمیریوں کی جدوجہد کو خالصتاً مسلمانوں کی تحریک قرار دینے والاے غلام عباس نے' اس کے ردِّعمل میں اگرچہ کشمیر میں عوامی سطح پر کوئی خاص مزاحمت بھی نہیں ہوئی لیکن قائدین نے اس کی کھل کر مخالفت کی۔ اس حوالے سے غلام عباس کی خودنوشت ''کشمکش'' کے کچھ اورصفحات کو الٹنے کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''سرینگر میں باہمی کشمکش کا یہ سلسلہ اس حد تک طول کھینچ گیا کہ ایک پارٹی کا مستحسن اقدام اور کارکردگی بھی دوسری پارٹی کے لئے باعثِ تنقید ہوگئی (بالکل آج کل کی طرح) ایک وقت آیا کہ دونوں پارٹیوں (مسلم کانفرنسوں اور آزاد کانفرنس) کے چیدہ چیدہ لیڈروں کو حکومت نے یونہی غیر رسمی طور گرفتار کرلیا' میں ان دنوں جموں میں تھا...... مجھے بھی گرفتار کر کے قلعہ باہو میں بند کر دیا گیا اور 9/ماہ کی سزا دی گئی ......شیخ محمد عبداللہ اور میر واعظ کی پارٹیوں کا اختلاف سرینگر تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ سارے صوبہ کشمیر میں پھیل گیا۔ مسلم کانفرنس منظّم جماعت تھی ، اس کے کارکنوں کی تعداد بھی بے شمار تھی جو تمام کے تمام آزمودہ کار تھے اور قید و بند کے مصائب جھیلنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس کے برعکس میر واعظ (مہاجرِ ملت مولوی محمد یوسفؒ) میں یہ باتیں مفقود تھیں۔ اس لئے آخر کار میر واعظ کا پہلا رسوخ واثر ختم ہوگیا اور اُن کی تحریک اپنے ذاتی حلقۂ اثر تک محدود ہو کر رہ گئی......میر واعظ اپنے مخصوص مذہبی ماحول کی وجہ سے قید و بند کے لئے موزون نہ تھے گو قید و بند کے معاملہ میں شیخ محمد عبداللہ بھی پھسڈی واقع ہوئے تھے جو ہمیشہ چور دروازے کے ذریعے ہی جیل سے باہر آئے لیکن وقت کی پُکار' ضرورت اور مجبوری کے ''محاسن'' سے وہ بخوبی واقف تھے۔'' (کشمکش/صفحہ 130)

شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ دورانِ اسیری اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے چودھری لکھتے

ہیں ''اسیری کے تین چار ماہ کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور (جموں کا) وہی دوست (نام انہوں نے مصلحتاً مخفی رکھا ہے) ادھمپور جیل میں باجازتِ حکومت مجھ سے ملے، ملاقات کی غرض یہ تھی کہ اسمبلی انتخابات میں تعاون کے لئے مجھے مائل کیا جائے۔ ایسے موقعوں پر اسیروں کو ہم خیال بنانے کے لئے بیرونی سیاست کا نقشہ انتہائی مایوسانہ اور بھیانک طریقے سے کھینچا جاتا ہے۔ تاکہ محبوسین خائف اور پریشان ہو کر مقابلہ کی سکت پہلے ہی کھو دیں، مجھے افسوس صرف شیخ محمد عبداللہ پر ہوا کہ وہ بھی رجعت پسندی کے عمیق گڑھے میں گر رہے تھے۔ مجھے اس گفتگو کے دوران یہ یقین دلایا گیا کہ اسمبلی کے ساتھ تعاون کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمام سیاسی اسیر آزاد کر دیئے جائیں گے۔ مجھے ان دوستوں کی گفتگو پر تعجب بھی ہوا، ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔'' (کشمکش/ غلام عبداس/صفحہ 133)

یہ واقعہ غالباً 1934ء کا ہے جب چودھری ابھی اسیر ہی تھے اور شیخ محمد عبداللہ کو رہا کر دیا گیا تھا، انہوں نے اپنے حلقۂ اثر میں انتخابات میں امیدوار کھڑے کر کے اس مہم میں بھر پور حصہ بھی لیا۔ اس دوران متعدد اسیروں کو بھی رہا کر دیا گیا لیکن جیلوں سے نکلنے والے اکثر تحریکی کارکن قیادت سے بدظن ہو چکے تھے کیونکہ مسلم کانفرنس کی انتخابات میں شرکت نے اُنہیں سخت مایوس کر دیا تھا کیونکہ بقول فیضؔ ۔

یہ وہ سحر تو نہیں کہ جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

شخصی راج اپنی جگہ قائم تھا، عوام پر مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور قیادت انتخابات لڑ کر اقتدار کی کرسی پر براجمان ہو گئی۔ فیلڈ میں چونکہ مسلم کانفرنس تنہا اور واحد جماعت تھی اس لئے اُس کی کامیابی یقینی تھی، میر واعظ مولوی یوسف شاہ کی جماعت آزاد کانفرنس شہر کے بعض علاقوں تک ہی محدود تھی جبکہ شیخ محمد عبداللہ نے دیہی علاقوں اور قصبہ جات میں مسلم کانفرنس کا اچھا خاصہ نیٹ ورک تیار کر لیا تھا، اس لئے مسلم کانفرنس نے اچھی خاصی اکثریت سے یہ پہلا اسمبلی انتخاب جیت لیا۔

تحریکی کارکنوں کی رہائی کے بعد اُن کی تحریک کے تئیں بددلی اور مایوسی نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو مستقبل کے حوالے سے متفکر کر دیا اور الیکشن کے چند ماہ بعد اُن کو جماعتی تنظیم کے لئے مجبور کیا' وہ سمجھ گئے کہ اگر مسلمانوں کے یہی لیل و نہار رہے تو اس صورت میں نہ مسلم کانفرنس زندہ رہ سکے گی اور نہ ہی قومی رہنما سیاسی لحاظ سے زندہ رہ سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے سوپور کے مقام پر 1934 کے وسط میں مسلم کانفرنس کے سالانہ جلسہ کا اہتمام کیا اور منتشر ہو رہے عوام کو ایک بار پھر مجتمع کرنے کی کوشش کی

، یہ سلسلہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا، توں توں قیادت ایک دوسرے سے دور اور منتشر ہوتی جا رہی تھی۔ اس دوران میر واعظ یوسف شاہ اور میر واعظ مولوی احمد اللہ ہمدانی بھی ایک دوسرے سے الگ ہو چکے تھے اور ینگ مینز ایسوسی ایشن اور مسلم کانفرنس نے شیخ محمد عبداللہ کو اپنا قائد مان لیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کانگریس کے بہت قریب آ چکے تھے اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کشمیر کو بھارت کا حصہ قرار دے کر شیخ صاحب کی زبانی توصیفی کلمات بھی سُن چکے تھے لیکن اس دوران شیخ محمد عبداللہ کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر ریاست کا موجودہ شخصی نظام بدلنا ہے تو اس کے لئے ایک بھرپور عوامی تحریک کی ضرورت ہوگی لہٰذا کشمیری مسلمان تنہا یہ انقلاب برپا نہیں کر سکتے، اس لئے ریاست کے دیگر فرقوں اور مکتبہ ہائے فکر کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ انہوں نے 11/جون 1939ء کو مسلم کانفرنس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھ دیا۔ یہ فیصلہ تنظیم کی ایک خصوصی نشست میں لیا گیا، جس کی صدارت خواجہ غلام محمد صادق نے کی۔ پرویز دیوان کے مطابق:۔

> ''مسلم کانفرنس کے 176/ممبران (مندوبین) میں سے صرف 3/ مندوبین نے اس فیصلے کے خلاف ووٹ دیا۔ اس فیصلے کے بعد ریاست کے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم کانفرنس میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ جبکہ چودھری غلام عباس کو مسلم کانفرنس کی جموں ونگ سونپ دی گئی (کیونکہ انہوں نے اس فیصلے کی مخالفت کی تھی)''
>
> ''ہلال احمد وار نے تاریخ کشمیر کے حوالے سے اپنی ایک تصنیف میں اس صورتحال کے بارے میں لکھا ہے:۔ ''مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس نے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں کھینچ لیں اور ''شیر'' اور ''بکرا'' نامی فسادات چھڑ گئے۔ نیشنل کانفرنس ایک بڑی جماعت بن چکی تھی اس لئے اُسے عوامی حمایت بھی حاصل تھی جبکہ مولوی یوسف صاحب کی قیادت والی مسلم کانفرنس کا حلقۂ اثر شہر کے کچھ علاقوں تک ہی محدود تھا''

پرویز لکھتے ہیں:۔ ''غلام محمد صادق ایک جمہور نواز سیکولر خیالات کا (Leftist) شخص تھا، نیشنل کانفرنس نے اُسے لاہور بھیجا' جہاں اُس نے انتہائی موثر طریقے سے ان امکانات کو معدوم کر دیا کہ این سی اور پاکستان تحریک کے درمیان کسی طرح کا گٹھ جوڑ تھا، اِدھر سرکردہ صحافی اور دانشور پی۔جی رسول اپنی تصنیف ''1947ء مملکت کے آخری دِن'' میں لکھتے ہیں:۔ ''چودھری غلام عباس مسلم کانفرنس کو نیشنل

کانفرنس میں بدلنے کے حوالہ سے ایک فریق تھے اور انہوں نے اس حوالے سے کافی کام بھی کیا لیکن بعد میں جب شیخ محمد عبداللہ (بقول اُن کے) کانگریس کے ایک ''آلۂ کار'' کی طرح برتاؤ کرنے لگے تو وہ اُن سے الگ ہو گئے جبکہ پروفیسر رشید کا بھی یہی کہنا ہے کہ چودھری 1939ء میں شیخ سے الگ ہو گئے! ادھر چودھری اپنی خودنوشت ''کشمکش'' میں اس حوالہ سے رقمطراز ہیں:۔

> ''ریاسی جیل سے ......فروری 1939ء میں میری اور شیخ محمد عبداللہ کی یکے بعد دیگرے رہائی ہوئی ......اختلافات اور گزشتہ تلخ اور ناخوشگوار تعلقات کے باوجود ہم میں پھر باہم مراسم کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ لیکن توقع کے مطابق شیخ محمد عبداللہ جیل سے ایک پکے نیشنلسٹ ہو کر نکلے......باہمی سیاسی گفت وشنید اور اپنی پارٹی سے اندرونی مذاکرات کے بعد یہ بات قرار پائی کہ نیشنل کانفرنس کے قیام کے فیصلے کے لئے سرینگر میں مسلمانوں کا ایک مخصوص اجلاس طلب کیا جائے چنانچہ نیشنل کانفرنس کے قیام کے لئے مندرجہ ذیل شرائط طے پائیں'' (کشمکش/صفحہ نمبر 178/177)

ان سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چودھری غلام عباس نہ صرف نیشنل کانفرنس کے قیام کے وقت شیر کشمیر کے ساتھ تھے بلکہ انہوں نے نیشنل کانفرنس کے بنیادی منشور یا اس کے قیام کے لئے پانچ شرائط پر مشتمل خاکہ بھی تشکیل دیا، ان میں مندرجہ ذیل نکات شامل تھے۔

۱...... مسلمانوں کی تمام مخصوص مذہبی، اقتصادی، سیاسی اور دفتری شکایات کے لئے جدوجہد کرنا نیشنل کانفرنس کے اغراض ومقاصد میں شامل ہوگا۔

۲...... اسمبلی اور دیگر پبلک اداروں کے انتخابات میں مروجہ جداگانہ طریقۂ انتخاب بحال کیا جائے گا۔

۳...... شیخ محمد عبداللہ کانگریسی پالیٹکس نہیں اپنائیں گے، نہ ہی کسی حالت میں کانگریس کی حمایت کی جائے گی۔

۴...... مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی کسی بھی حالت میں مخالفت نہیں کی جائے گی۔

۵...... مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف جہادِ آزادی میں ریاست کی تمام بسنے والی قومیں شریک ہوں گی اور کانفرنس کا منتہائے مقصود ہر طریقہ سے ریاست میں ذمہ دارانہ نظامِ حکومت کا قیام ہوگا''

اس خاکہ کے بارے میں چودھری لکھتے ہیں:۔ ''یہ شرائط کھلے اجلاس میں میری جانب سے

پیش کی گئیں اورفریقِ مخالف کی جانب سے تسلیم کی گئیں، ہماری جانب سے اعلان بھی کیا گیا کہ ہم ایک قسم کے میثاق کے تحت نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے تیار ہیں اور ہم متحدہ قومیت کے علمبرداروں کا سیاسی طرزِعمل کچھ عرصہ دیکھنے کے بعد قطعی فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ ہر قسم کی ممکنہ جرح و تعدیل، تنقید و تنقیح، پیش بندی اور حفظِ ماتقدم کے بعد نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لایا گیا، ہندو پریس نے متفقہ طور نیشنل کانفرنس کے قیام کی مخالفت کی کیونکہ ان کے نزدیک مذکورہ بالاشرائط اور جکڑ بندیوں کی وجہ سے یہ جماعت ایک فرقہ پرست جماعت تھی!" (کشمکش/صفحہ177/78)☆☆

17

جناح،شیروانی،نہرواورکوہالہ پُل!

مسلم کانفرنس.... کشمیری قائدین کی اَن بن اور آپسی رشہ کشی کی وجہ سے دولخت ہوکر نیشنل کانفرنس نامی ایک نئی جماعت کو جنم دے چکی تھی۔ این سی کا سیکولر جمہوری نظریہ ریاست کے مستقبل کو بھارت کی جانب لے جارہا تھا۔ جبکہ مسلم کانفرنس کا سیاسی نظریہ پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کا حامی تھا۔ آگے چل کر اس جماعت کے قائدین نے اس حوالے سے ایک باضابطہ قرارداد پاس کی اور الحاقِ پاکستان کا اعلان بھی کیا لیکن تب تک مسلم کانفرنس میں وہ دم خم باقی نہ رہا تھا۔ جو اُن کے نظریے کو سپورٹ دے سکتا جبکہ اس دوران شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں نہ صرف مہاراجہ کے خلاف ایک فیصلہ کُن مورچہ کھل چکا تھا بلکہ شیخ کے خیالات کو دلی میں کافی سنجیدگی کے ساتھ لیا جانے لگا اور بھارتی قائدین کی کشمیر آمد کا سلسلہ بھی کافی حد تک بڑھ چکا تھا۔

چالیس کی دہائی کے دوران بھارتی قائدین، خاص طور پر پنڈت جواہر لال نہرو کی کشمیر کے تئیں کافی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ اُن کے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ملاقاتوں، تعلقات اور کشمیر کے تئیں حد سے زیادہ دلچسپی کو دیکھتے ہوئے کئی بار سردار پٹیل نے کھلم کھلا کہا تھا کہ پنڈت جی کشمیر کو بھارت سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور اس تاثر کا پنڈت جی نے بھر پور فائدہ بھی اُٹھایا۔ کشمیر گیزیٹر کے مطابق 1940ء میں پنڈت جی کو کشمیر میں جو عزت واکرام دیا گیا، اُس کی تاریخ میں خال خال ہی کوئی مثال ملتی ہے 1940-45ء کے دوران برصغیر کے دو بڑے قائدین نے کشمیر کا دورہ کیا۔ اُن میں پنڈت نہرو کے علاوہ قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی شامل تھے۔ پرویز دیوان کے مطابق محمد علی جناح جون 1944ء میں کشمیر آئے۔ دیوان کے مطابق کشمیریوں نے جناح کی آمد پر ملا جُلا ردِعمل دِکھایا جبکہ ''ریجنل گیزیٹر'' کے مطابق کشمیری عوام نے قائدِاعظم کو کشمیر میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ گیزیٹر کے مطابق جو سلوک مسلمانوں نے جناح کے ساتھ کیا، وہی کشمیری پنڈتوں نے نہرو مہاسبھا کے لیڈر روی، ڈی ساورکر کے ساتھ بھی کیا۔ جناح مرحوم کے دورۂ کشمیر کے بارے میں اگرچہ مختلف مورخین نے مختلف آراء دی ہیں اور اس موضوع کے حوالے سے بھی کشمیری مورخین اُس قطار میں نظر آتے ہیں، جس

میں پوری کشمیری قوم الحاقِ پاکستان اور الحاق ہندوستان کے حوالے سے کھڑی ہے۔ تاہم پی، جی رسُول نے اپنی تنصیف ''1947ء کے مملکت کے آخری دِن'' میں لکھا ہے کہ کشمیری عوام نے جناح مرحوم کے دورے کے دوران اُن کے تیئں والہانہ محبت اور جوش وخروش کا اظہار کیا تھا۔ اصل بات بھی یہی ہے کہ کیونکہ قائداعظم کے پروگرام کو سبوتاژ اور درہم برہم کرنے میں کشمیر کے عام لوگوں سے زیادہ نیشنل کانفرنس کے بعض قائدین اور کارکنوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ خاص طور پر بارہمولہ میں پیش آنے والے واقعہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ پرویز دیوان کے مطابق قائداعظم کے دورۂ کشمیر کے دوران بارہمولہ کی ایک ذی عزت فیملی نے اُنھیں اپنے گھر مدعُو کیا تھا۔ اسی دوران این سی کے کارکن مقبول شیروانی کی قیادت میں وہاں جمع ہوگئے اور انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے حق اور قائداعظم کے خلاف نعرہ بازی شروع کردی۔ میزبانوں نے شیروانی اور اُس کے رفقاء کا پیچھا کیا لیکن اسی دوران وہاں لوگوں کی بڑی تعداد جمع ہوگئی اور انہوں نے شیروانی کو بھگا دیا۔ شیروانی نے خانپور کے قریب ایک کشتی میں پناہ لے لی اور کشتی بان کو جہلم کے دوسرے کنارے پر چلنے کے لئے کہا، جیسے ہی کشتی جہلم کے نصف میں پہنچی تو لوگوں نے کشتی بان کو حکم دیا کہ وہ کشتی واپس لائے۔ اس پر خطرے کا اندازہ کرتے ہوئے شیروانی نے کشتی سے دریاء میں چھلانگ مار دی اور تیر کر دوسری جانب چلا گیا، جہاں اُس نے پولیس سپرانٹنڈنٹ کے گھر میں پناہ لے لی'' (کشمیر/ پرویز دیوان/صفحہ نمبر 86)

قائداعظم کے اس دورے کے بارے میں نوے کی دہائی تک کشمیر میں ایک اور قصہ بھی مشہور تھا کہ بعض لوگوں نے جوتوں کا ہار تیار کر کے اُن پر پھینکا اور اُن کے دوقومی نظریے کی مخالفت کی لیکن اس حوالے سے کافی تحقیقات اور کھوج کرنے کے بعد بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ایسا کوئی واقعہ سچ مچ پیش آیا ہوگا کیونکہ جناح کے اردگرد اُس دوران سخت ترین حفاظتی بندوبست رہتا تھا اس لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص اتنی ہمت کر سکے یا پھر اُسے اتنا وقت مل سکے کہ وہ اُنھیں یہ ہار پہنا سکے، یہ قصہ بھی دراصل اُسی پروپگنڈہ کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کا مقصد کشمیری عوام کے دلوں میں قائداعظم کے تیئں بدظنی پیدا کرنا ہے۔ کشمیر کے ایک سیاسی لیڈر ہلال احمد وار نے اپنی کتاب میں اس حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اُس کے مطابق ''نیشنل کانفرنس کے قائدِ غلام محی الدین قرّہ کی قیادت میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے قائداعظمؒ کے خلاف ایک بڑے مظاہرے کا اہتمام کیا اور اس دوران مظاہرین نے کچھ شرمناک حرکتیں بھی کیں۔ جن میں قائداعظم کو بقول اُن کے عضوے تناسل دکھانا اور اُن کی طرف جوتے پھینکنا بھی شامل تھا (لیکن کشمیریوں کی اس طرح کی عادت بھارت کی وزیراعظم آنجہانی اندرا

گاندھی کے ساتھ سال 1983ء کے ایک جلسے کے دوران بھی سرینگر میں دیکھنے کو ملی، اندرا گاندھی نے اس کا ردِعمل یوں دِکھایا کہ اس کے چند ماہ بعد انہوں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی قیادت والی حکومت کو برطرف کردیا......دیوان) اسی طرح کے واقعات پنڈت نہرو کی بیٹی کے علاوہ مرِدُلا سارابائی کے ساتھی بھی پیش آئے۔ سارابائی 1944ء میں مہاتما گاندھی کی مشیر کے طور کشمیر آئی تھی تا کہ مہاراجہ کے خلاف یہاں جاری مزاحمت کو بڑھاوا دے سکے۔ دیوان کے مطابق مرِدُلا جی نے 1944ء اور 1945ء کے گرمیوں کے ایاّم شیرِ کشمیر کے گھر پر گزارے اور اس دوران مہاراجہ کے خلاف اُن کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

''کشمیر چھوڑو'' تحریک!

نیشنل کانفرنس نے 1944ء میں ایک مسودہ تیار کر کے اسے ''نیا کشمیر'' کا نام دیا، جو بعد میں نیشنل کانفرنس کے برابری اور برادری کے اصول کا بنیادی مواد بنا۔ بتایا جاتا ہے کہ جب مہاراجہ گلاب سنگھ وسطی ایشیاء کے دورے سے واپس آیا تو اُسے سرینگر کے مجاہد منزل علاقہ میں ایک بہت بڑے جلسے میں مدعُو کر کے یہ مسودہ پیش کیا گیا، یہ جون 1944ء کا واقعہ ہے جبکہ اس کے ڈیڑھ سال بعد شیخ محمد عبداللہ نے ''کشمیر چھوڑو تحریک'' کا 1946ء میں آغاز کیا۔ اس سے قبل این،سی نے مہاراجہ سے کہا تھا کہ وہ بھارت میں برطانوی شہنشاہ کی طرح اپنے برتاؤ میں لچک پیدا کریں اور ایک جمہوری طرزِ حکومت کی تشکیل میں این سی کی چنندہ حکومت کو اختیارات تفویض کردیں۔ اس مطالبے نے زور پکڑا تو مہاراجہ نے شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کر کے بند کردیا۔ اُن کی حمایت کے لئے مری (پاکستان) کے راستے پنڈت جواہر لال نہرو نے ریاست میں داخل ہونے کی کوشش کی تو کشمیری سپاہیوں نے اُنھیں گرفتار کرلیا اور اُن کے ساتھ کافی بدسلوکی کی (جس میں ان کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرنا اور گریبان سے پکڑ کر گھسیٹنا بھی شامل تھا) کیونکہ مہاراجہ کو پنڈت نہرو اور ابوالکلام آزاد جیسے بھارتی قائدین کا بار بار کشمیر آنا اور شیخ محمد عبداللہ کی حمایت کرنا قطعی طور پسند نہیں تھا، اور اسی وجہ سے وہ محمد علی جناح، اُن کی جماعت مسلم لیگ اور دیگر پاکستان نواز قائدین کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ دیوان کے مطابق کشمیر میں 1947ء سے کچھ عرصہ قبل جو سیاسی صورتحال پیدا ہورہی تھی۔ اُس میں ہندو مسلم ایک دوسرے کے خلاف نہیں تھے بلکہ یہ تو شخصی راج اور سیکولرازم کے حامیوں کے درمیان ٹکراؤ تھا اور اس میں پنڈت اور مسلمان یکساں سرگرم تھے اور اس دوڑ میں ریاست کے بے شمار ہندو، مسلم اور سکھوں کے علاوہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو نے بھی شیرِ کشمیر کی حمایت کی۔

اِدھر نیشنل کانفرنس شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں کشمیریوں کی ایک بڑی، واحد اور موثر جماعت بن کر اُبھر رہی تھی اور اُسے ہر طرف سے حمایت بھی مل رہی تھی تو دوسری جانب مسلم کانفرنس کے قائدین ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ مسلم کانفرنس کو از سرِ نو منظّم اور مجتمع ہونے میں کافی وقت لگا اور قائدین کو خاصی محنت بھی کرنا پڑی لیکن یہ سب کام چودھر غلام عباس جموں میں کر رہے تھے۔ سرینگر میں این سی کے کارکنوں نے مسلم کانفرنس کے قائدین کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں کو محدود و معطل کر کے رکھ دیا تھا جبکہ چودھری بھی کشمیر صوبے کو چھوڑ کر جموں میں اپنے لوگوں کو متحرک کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے جموں، ڈوڈہ، ادھمپور اور راجوری علاقوں میں کافی تنظیمی کام کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر دلی میں قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ جس میں انہوں نے قائداعظم کو کشمیر کی صورتحال کے بارے میں بتایا۔ وہ لکھتے ہیں:

"**حضرتِ قائداعظم سے دلی میں ملاقات**......اب حکومت کے رویے میں نمایاں معاندانہ اور جانبدارنہ تغیرّ پیدا ہو گیا۔ باہمی رسہ کشی کی وجہ سے ریاستی مسلمانوں کی ہوا اُکھڑ چکی تھی، اسلئے حکومتِ کشمیر نے ہر شعبۂ زندگی میں مسلمانوں سے حکومت اور مہاراجہ کے خلاف اِن کی باغیانہ روش اور قومی تکبر اور شوخ مزاجی کے بدلے گِن گِن کر لینے شروع کر دیئے۔ مسلم کانفرنسیوں کے لئے بالخصوص شہری زندگی ناممکن بنادی گئی۔ جنگِ عظیم کی وجہ سے مسلم کانفرنس کوئی غیر قانونی اور سخت قدم بھی نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ اس شش و پنج کی میں 1944ء میں میں نے قائداعظم سے ملاقات کیلئے دلی جانے کا عزم کیا، جہاں تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی ملاقات میں حضرت قائدِاعظم کو کشمیر کی سابقہ اور موجودہ سیاسی اونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ انہوں نے میری تمام باتیں غور سے سُنیں اور اپنی سیاسی پریشانیوں کا تذکرہ فرما کر مسلم لیگ کی جانب سے مسلم کانفرنس کو ہر قسم کی اخلاقی مدد دینے کا وعدہ فرمایا" اس ملاقات کے تذکرے کے دوران چودھری غلام عباس نے جو اہم اور قابلِ توجہ بات کہی، وہ کچھ اس طرح ہے: "میں جانتا تھا کہ آپ اور مسلم لیگ متعدد سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے فوری طور ہمیں کچھ بھی مدد نہیں دے سکتے، لیکن اس ملاقات کے دوران بالخصوص قائدِ اعظم اور میرے درمیان جو ایک خاص اخلاقی اور روحانی رشتہ قائم ہو گیا، اس سے ہمارے ارادے اور حوصلے زیادہ مضبوط ہو گئے" (کشمکش/غلام عباس/192)

اس ملاقات کے حوالے سے اگر چہ چودھری نے کُھل کر رازونیاز سے پردہ نہیں ہٹایا ہے تاہم مورخین کے مطابق قائداعظم نے مسلم کانفرنسیوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مہاراجہ کے خلاف اپنی جنگ کو فی الحال معطل کر دیں تا کہ بھارت اور پاکستان کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرا لینے کے بعد مہاراجہ اپنی مرضی ومنشاء سے ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کر سکے۔ قائداعظمؒ چونکہ مہاراجہ کے وکیل بھی تھے اور اُن کا جھکاؤ بھارت کی بجائے پاکستان کی جانب زیادہ تھا اس لئے جناح مرحوم اس اعتبار کو برقرار رکھ کر کشمیریوں سے دوراندیشی اور صبر وتحمل سے کام لینے کیلئے کہہ رہے تھے لیکن اس موڑ پر مشکل یہ تھی کہ نیشنل کانفرنس بہت تیزی کے ساتھ دلی کی جانب قدم بڑھا رہی تھی اور دلی کے ساتھ ریاست کے رشتے استوار ہو رہے تھے لہٰذا مسلم کانفرنس والوں کے لئے صبر اور انتظار کرنے کے لئے بہت کم وقت تھا۔ مورخین کے مطابق جب 1947ء میں شمال سے تربیت یافتہ مسلح قبائل نے کشمیر پر حملہ کیا تو قائدِ اعظم نے کہا تھا ''WE have finally lost Kashmir'' ہم نے آخر کار کشمیر کو ہمیشہ کیلئے کھو دیا ہے۔

حال ہی میں کراچی سے شائع کشمیر کے بارے میں ایک کتاب ''میرا پیام اور ہے'' میں مصنف عباس آزاد نے اِن دنوں کے بارے میں کچھ یوں لکھا ہے:

> ''یہ تاریخ کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ 14/اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آتا ہے اور 15/اگست کے روز اس کا بانی بسترِ مرگ سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مہاراجہ کشمیر کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کرتا ہے، مہاراجہ پاکستانی پرچم کو سلام دیتا ہے۔ اِن کے حُکم سے کشمیر میں پاکستانی پرچم لہرائے جاتے ہیں ...... بانیٔ پاکستان اپنے منہ بولے بیٹے کے، ایچ خورشید کو سرینگر روانہ کرتے ہیں اور یکدم ایک گمنام شخص، جو چندروز قبل تک فلسطین کے اُس علاقے میں پایا جاتا تھا جہاں صہیونی ریاست کے قیام کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔ اِن کو خود بھی اس بات کا اعتراف رہا ہے کہ وہ ان سازشوں سے واقف تھے، اچانک نمودار ہو کر ساری صورتحال بدل دیتا ہے۔ مہاراجہ مسلسل امن کی بھیک مانگتا رہا لیکن اُس کی فریاد کسی نے نہ سُنی۔ حالانکہ یہی وہ نہرو ہیں جن کو مہاراجہ نے کشمیر میں داخل ہونے کے جُرم میں کوہالہ پُل سے گرفتار کر کے دلائی کیمپ میں بند کیا تھا اور تب تک رہا نہ کیا جب تک کہ انگریزوں نے اُن کے کشمیر میں دوبارہ داخل نہ ہونے کی ضمانت نہ دی۔

مہاراجہ، کانگریس اور نہرو کے تعلقات اس حد تک خراب تھے کہ مہاراجہ کے ایک مسلمان پولیس آفیسر نے جب کوہالہ پُل پر نہرو کو طمانچہ رسید کیا تو نہرو نے کہا تھا یہ طمانچہ مجھے نہیں مارا گیا بلکہ مہاراجہ نے اپنی تقدیر کو لات ماردی ہے جبکہ اس کے برعکس نہ صرف مسلم لیگ اور بانی پاکستان سے مہاراجہ کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے بلکہ مہاراجہ تمام ریاستوں کی یونین کے صدر تھے اور قائدِاعظم اُن کے قانونی مشیر۔ وہ جب بھی کشمیر گئے، سرکاری پروٹوکول ملا۔ سوال یہ ہے کہ 23/اگست 1947ء کو ایسا کیا ہوگیا، جس کی وجہ سے مہاراجہ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی اور وہ پاکستان سے مایوس ہوکر بھارت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگیا؟ (میرا پیام اور ہے، صفحہ نمبر 3)

18

قائداعظمؒ کا طویل دورۂ کشمیر اور اس کا ردِ عمل!

قائداعظم محمد علی جناح نے تین بار کشمیر کا دورہ کیا، پہلی بار وہ بار ہمولہ کے راستے کشمیر میں داخل ہوئے، دوسری مرتبہ سوچیت گڑھ کے راستے ماہ مئی 1944ء میں جموں کا دورہ کیا اور تیسری مرتبہ چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ کی دعوت پر کشمیر تشریف لائے۔ اس بار انہوں نے سرینگر میں ملاقاتوں کی ایک طویل سیریز کے دوران شیخ کو منانے، مہاراجہ کے خلاف تحریک ختم کرنے اور دو قومی نظریہ کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ بتایا جاتا ہے کہ ملاقاتوں اور گفت وشنید کا یہ سلسلہ تقریباً دو ہفتے جاری رہا۔ یہ ان کا طویل دورۂ کشمیر تھا اور اس دوران وہ سرینگر میں تقریباً اڑھائی ماہ تک مقیم رہے۔ اس دوران وہ صرف قائدین تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ نیشنل کانفرنس کے چیدہ چیدہ رکن بھی اُن سے ملنے کیلئے آتے رہے۔ چودھری کے مطابق ''اس عرصہ میں انہوں نے (این سی ارکان) کے حالات سُنے اور سیاسیات ہند اور ہندو کانگریس کے متحدہ قومیت کے ڈھونگ کی حقیقت اِن پر واضح کی۔ لیکن ان میں سے صرف چند ایک ہی تھے جو قائدِ اعظم کے سرچشمۂ فیض و ہدایت سے بہرہ اندوز ہو سکے مجھے شیخ عبداللہ کی نیت اور عندیہ کا علم ہو چکا تھا۔ وہ خود اپنے حال پر رہتا تو شاید صورت مختلف ہوتی لیکن یہ اُس کی بدقسمتی تھی، وہ کبھی ایک حال پر قائم نہ رہ سکا چنانچہ اس وقت بھی نیشنل کانفرنس کے بائیں بازو نے اُسے بہت حد تک گمراہ کیا۔'' (کشمکش/ چوہدری غلام عباس/صفحہ نمبر 222) محمد علی جناح کے اس دورے کے دوران انہوں نے ایک مرتبہ پھر سے شیخ محمد عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کو اپنے اختلافات مٹا کر متحدہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ آخری کوشش بھی ناکام رہی۔ ان دنوں مولینا محمد سعید مسعودی شیخ محمد عبداللہ کے خاص دستِ راست تھے اور جو آخری ملاقات چوہدری اور شیخ کے درمیان ہوئی اُس میں بھی مولینا مسعودی نے کافی اہم رول ادا کیا تھا، جس کے باعثِ یہ ملاقات ناکام ہوگئی۔ بقول چوہدری ''ملاقات کے دوران اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اصل موضوع کے متعلق مسئلہ چھیڑا لیکن شیخ عبداللہ پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ اُن دنوں، اُس کا ''رِنگ ماسٹر'' مولوی سعید تھا۔ بدقسمتی سے وہ بھی وہاں موجود تھا۔ اُس نے میری باتوں کا جواب دینا شروع کیا، شیخ عبداللہ نے اُس کی باتوں کو

دوہراتے ہوئے مجھے دوٹوک بات کہہ دی کہ دیکھئے چوہدری صاحب! آپ کے سیاسی عقیدے کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور میرے عقیدے کو آپ۔ میرے خیال میں دونوں عقیدوں میں کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھ سے گفتگو کرلیں، اگر آپ مجھے قائل کرلیں گے تو میں اپنا عقیدہ تبدیل کرنے کیلئے تیار ہوجاؤں گا۔لیکن اُس نے صاف کہہ دیا کہ ہمارے راستے الگ ہوچکے ہیں''۔

چودھری کے مطابق اس دورے کے دوران قائدِ اعظم کشمیر میں اڑھائی ماہ تک سرگرمِ عمل رہے اور انھیں ہر طبقہ اور ہر سیاسی جماعت کے افراد کے ساتھ ملاقات کا موقعہ ملا۔ مسلمان تو ایک ایک کرکے اُنھیں ہزاروں کی تعداد میں ملے ہوں گے۔مگر نیشنلسٹ بھی کئی کئی گھنٹے تک اُن سے بحث کرتے رہے اور قائدِ اعظم مُسلم کانفرنسیوں کو ایک شفیق باپ کی طرح اُن کے فرائض اور طریقِ کار سمجھاتے رہے۔ اس دوران شیخ محمد عبداللہ کے راہِ راست پر آنے کی تمام اُمیدیں ٹوٹ گئیں ۔ اس طویل قیام کے دوران قائدِ سے بے شمارے چھوٹے بڑے سرکاری آفسروں ، سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں اور وفود نے ہزاروں کی تعداد میں اُن سے ملاقاتیں کیں اور ان ملاقاتوں میں ہندو، مسلمان سکھ ،عیسائی سب شامل تھے ۔ ایک دن میر واعظ (مولوی محمد یوسف) کے دوساتھی اور میں قائداعظم کی اقامت گاہ پر پہنچے، رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے میر واعظ کو اُردو میں مخاطب کرکے فرمایا'' آپ کو میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سیاسیات سے کنارہ کش رہیں۔ آپ کی حیثیت مذہبی ہے اور اس حیثیت میں ہم آپ کی عزت اُس طرح کرنے کیلئے تیار ہیں جس طرح انگریز آرچ بشپ آف کنٹربری کی کرتے ہیں'' لیکن جس طرح سے آرچ بشپ ، سیاسیات سے دور رہتا ہے، آپ کو بھی رہنا چاہیے، میر واعظ اور اُن کے ساتھیوں کو تو لاجواب ہونا ہی تھا، میں بھی اپنا منہ سا لے کر رہ گیا''(کشمکش صفحہ 228)

قائداعظم کے ساتھ منسوب مولوی خاندان کے اس وقعہ کے حوالہ سے یاد آیا کہ تقریباً اگست 2003ء میں جب راقم کو سرکردہ عالمِ دین اور دارالعلوم دیوبند کے سربراہ مرحوم انظر شاہ کشمیری لولابی سے ملنے اور ''چٹان'' کیلئے اُنکا انٹرویو کرنے کا موقعہ ملا تو انہوں نے راقم کو لال بازار سرینگر کے دارالعلوم قاسمیہ میں ملنے کا وقت دیا تھا۔ دوران انٹرویو وہاں موجودہ میر واعظ اور حریت سربراہ میر واعظ عمر فاروق بھی تشریف لے آئے تھے۔ مولیناؒ تھوڑی دیر کیلئے مجھ سے لاتعلق ہوکر میر واعظ کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے میر واعظ کو بھی کچھ ایسا ہی مشورہ دیا تھا۔ مجھے ان کے الفاظ یاد آرہے ہیں کہ انظر شاہ مرحوم نے کہا'' میر واعظ کا عہدہ اور مقام بہت ہی جلیل القدر اور بلند و بالا ہوتا ہے اور یہاں تک پہنچنے کے لئے

آپکے بزرگوں نے بہت عرق ریزی اور مشقت کی ہے۔آپ کو یہ عہدہ بڑے نصیبوں سے ملا ہے،لہٰذا اسکی قدر کیجئے ، ریاست میں ہورہے خون خرابے سے خود کو دور رکھیے اور اپنی دینی تربیت پر دھیان دیجئے'' مجھے یاد ہے کہ مولینٰا مرحوم نے میر واعظ کو موجودہ سیاسیات سے دور رہنے اور خود کو دینی خدمت کرنے کیلئے وقف کرنے کا بھی مشورہ دیا تھا اس مشورے کا میر واعظ نے کس قدر اثر لیا، اس سے قطع نظر یہ بات بھی صحیح ہے کہ اسکے بعد وہ تہران یونیورسٹی (ایران) سے منسلک ہوگئے اور حضرت شاہ ہمدانؒ کی شہرۂ آفاق تخلیق 'ذخیرۃ الملوک' پر تحقیقی مقالہ مکمل کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی (اتفاق دیکھئے کہ جس دن اس مضمون کی پروف ریڈنگ ہورہی تھی، اسی دن میر واعظ عمر فاروق کو یہ ڈگری بھی عطاء کی گئی)

بہرحال بات ہورہی تھی قائدِ اعظمؒ کے دورۂ کشمیر کی...قائدِ اعظم محمد علی جناح کا یہ طویل دورۂ کشمیر کئی اعتبار سے اہم اور تاریخی تھا۔اگر چہ وہ کشمیر جیسی خوبصورت جگہ پر کچھ وقت آرام وسکون سے گزارنا چاہتے تھے، لیکن اُس وقت برصغیر کی سیاسی اُتھل پتھل اور بے ہنگم حالات اس کی قطعیٔ اجازت نہیں دیتے تھے۔اس کے علاوہ جس طرح لوگوں نے اُنھیں دودو ہاتھ لیا اور سیاسی قائدین اور کارکنوں نے مصروف رکھا اس کی وجہ سے مقامی لیڈران خاص طور پر شیخ محمد عبداللہ، ریاستی حکومت اور غیر مسلموں پر گہرا اور منفی اثر مرتب ہوا۔قائداعظم کی کشمیر میں بڑھتی مقبولیت اور عوام کے جھکاؤ کی وجہ سے مخالفین کے دلوں میں نفرت اور بغض کا پیدا ہونا لازمی تھا۔اس لئے کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ریاست میں فرقہ ورانہ تصادم آرائی شروع ہوگئی اور جن علاقوں میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، وہاں شدید قسم کے فرقہ ورانہ فسادات برپا ہوئے ، خاص طور پر جموں شہر ، جسے اُن دنوں ''پاکستانی مرکز'' سمجھا جاتا تھا اور جہاں کے مسلمان ''اورنگ زیبی مسلمان'' کہلاتے تھے ، عید میلاد النبی کے موقعہ پر شدید فرقہ وارانہ فسادت بھڑک اُٹھے، شہر کے چیدہ چیدہ ہندوؤں نے جن میں پڑھے لکھے لوگ اور عہدیدار بھی شامل تھے ، چند مسلمان دوستوں کو پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ اوّل تو یہ جلوس نکالا ہی نہ جائے ورنہ اس کا راستہ بدل دیا جائے اور اس میں قائدِ اعظم اور پاکستان کے نعروں سے احتراز کیا جائے۔لیکن مسلمان اس جلوس کو ایک سیاسی اہمیت دینا چاہتے تھے اور اس کا راستہ کافی طویل تھا اس لئے اسے رد کرنا یا تبدیل کرنا ناممکن تھا۔اس حوالے سے چوہدری لکھتے ہیں ''میں نے ان حالات کی وجہ سے مسلم کانفرنس کے تمام چیدہ چیدہ کارکنوں کا اجلاس منعقد کرکے ہندوؤں کے مشکوک عزائم کے پیشِ نظر جلوس کے متعلق مشورہ طلب کیا تاکہ متوقع خطرات کا جائزہ لیا جائے ۔ بہرحال جلوس پورے اہتمام کے ساتھ نکلا۔ہم نے سکول کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو سب سے آگے رکھا۔گھروں میں عورتوں کے سِوا کوئی نہ رہا۔جلوس پر

جب ہندو محلّہ اور ایک تنگ بازار میں پہنچا تو ایک دم مکانوں کی چھتوں سے پتھروں اور اینٹوں کی بارش ہوگئی اور کئی جگہوں سے فائرنگ کی آوازیں بھی شروع ہوگئیں، مسلمان نہتے تھے لیکن انہوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق جلوس کے نظم ونسق کو قائم رکھا۔ صرف تین چار مسلمان اضطراری حالت میں گلیوں میں گھُس جانے کی وجہ سے شہید ہوگئے۔ لیکن یہ ایک الٰہی معجزہ تھا کہ مکمل خشت باری کے باوجود ایک بھی مسلمان کو ضربِ شدید نہ آئی۔ میرے سامنے اور اردِگرد ایک ایک فُٹ کی دوری پر متعدد اینٹیں اور پتھر گرے لیکن میں براہِ راست ضرب سے بالکل محفوظ رہا'' (کشمکش/غلام عباس/صفحہ نمبر 238)

یہ صوبۂ جموں کی صورتحال تھی، جہاں بانی پاکستان کے دورے اور اُن کے سیاسی نظریات کے ردِعمل کے طور پر فرقہ ورانہ فسادات کا سیلاب اُمڈ آیا تھا لیکن کشمیر کی صورتحال مختلف تھی۔ یہاں اگرچہ ایک طرف مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن ساتھ ہی وہ ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف نبرد آزما تھے۔ وہ اکثریت میں ہونے کے باوجود مظلوم اور محکوم تھے اور دوم ایک طرف شیخ محمد عبداللہ تھے تو دوسری طرف مولینٰا محمد یوسف، اور دونوں ہی قائدین دو انتہاؤں پر ہونے کے باوجود نہ تو فرقہ وارانہ فسادات کے حامی تھے اور نہ ہی اس کی اجازت دے سکتے تھے۔ اس لئے جموں میں مسلمانوں پر ہونے والے حملوں کے باوجود کشمیر کے غیر مسلم سلامت رہے۔ کشمیری مسلمانوں کی اس روایت پسندی اور امن پسندی کی وجہ سے بھارت میں انگریزوں کے خلاف ایک ہمہ گیر اور فیصلہ کن لڑائی کی قیادت کرنے والے موہن داس کرم چند گاندھی کو کشمیر میں ایک ایسے وقت میں روشنی کی کرن نظر آئی تھی جب پورے برصغیر میں نفرت اور فرقہ پرستی کا گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس روشنی کی کرن کا دوسرا مطلب یہ بھی تھا کہ گاندھی نے محسوس کر لیا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں جاری مہاراجہ مخالف تحریک کا انجامِ آخر کار ''الحاق ہند'' کی صورت میں ہونے والا ہے اور یہ بھی اُن کے لئے کسی روشنی کی کرن سے کم نہ تھا۔

1946ء کے وسط تک یہ خیال تقویت پا چُکا تھا کہ مسلمانوں کیلئے پاکستان کے نام سے ایک الگ ملک بن رہا ہے اور بھارت کی مسلم اکثریتی ریاستیں پاکستان کے ساتھ مِل رہی ہیں، چنانچہ اس لحاظ سے جموں وکشمیر بھی ایک مسلم اکثریتی ریاست تھی اس لئے تحریکِ پاکستان کی حامی کشمیر کی سیاسی جماعت ''مسلم کانفرنس'' نے 19 رجولائی 1946ء میں ''قراردادِ پاکستان'' پاس کر کے پاکستان کے ساتھ جموں وکشمیر کے الحاق کا اعادہ کیا اور ایک جلسے کے دوران پاکستان کے حق میں نعرے بُلند کئے۔ سول نافرمانی کی کال دی گئی تو پولیس نے کئی سرکردہ پاکستان نواز قائدین کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا، جن میں چوہدری غلام عباس بھی شامل تھے تاہم اس موقعہ پر بھی مہاجرِ ملت میر واعظ محمد یوسف شاہ کو پولیس نے گرفتار نہیں کیا۔ دسمبر 1946ء تک منقسم بھارت اور

(نوزائد) پاکستان کا نقشہ دُنیا پر تقریباً واضح ہو چکا تھا۔ پاکستان دوقومی نظریہ کی بنیاد پر مسلمانوں کیلئے جبکہ باقی ماندہ ہندوستان سیکولر بنیادوں پر آزادی کیلئے تیار تھا۔ اعلانِ آزادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ پاکستان 14؍ اگست کو آزادی کے لئے تیار تھا جبکہ بھارتی نجومیوں نے 15؍ اگست 1947ء کے دن کو ''شبھ مہورت'' قرار دیا تھا۔ اسی دوران بھارت کی 565 چھوٹی بڑی ریاستوں پر واضح کر دیا گیا کہ وہ بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنے مستقبل کو جوڑنے کا جلدی فیصلہ کرلیں۔ کسی تیسرے آپشن کی گنجائش موجود نہ تھی۔ تاہم بھارت اور پاکستان کی قیادت متحد تھی اس لئے وہ اپنی قوم کو لے کر آگے بڑھ گئی لیکن کشمیری قیادت کے انتشار نے اس قوم کو سرِ راہ چھوڑ دیا جو آج تک بھٹک رہی ہے۔!

19

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا اعلانِ آزادی!

بھارت اور پاکستان اپنی طویل اور پُر خار جدوجہدِ آزادی کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی اپنی منزلِ مُراد کے بہت قریب تھے۔ الگ الگ اور متضاد لائینوں پر چلتے ہوئے بھی کانگریس اور مسلم لیگ نے تاجِ برطانیہ کو اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ وہ 1947ء کے وسط تک برصغیر سے اپنی بساط سمیٹنے اور یہاں سے چلے جانے کیلئے آمادہ ہو چکا تھا۔ لیکن دوسری جانب ریاستِ جموں و کشمیر کی قیادت تین خانوں میں تقسیم تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ خود کو ایک ہندو راجہ اور ریاست کو ہندو ریاست تصور کرتے ہوئے اوّل تو اپنی ریاست کی خودمختاری کو برقرار رکھنا چاہتے تھے یا پھر اگر کسی ایک کے ساتھ الحاق ضروری ہوتا تو اُس صورت میں وہ دوقومی نظریہ کے اصول پر بننے والے پاکستان کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ اسی مہک کو سونگھتے ہوئے قائداعظمؒ نے مسلم کانفرنس کے قائدین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مہاراجہ کے خلاف اپنی تحریک اُس وقت تک ترک کر دیں، جب تک کہ پاکستان بطورِ آزاد مما لک اپنے آپ کو سنبھال نہ لے قائدِ اعظمؒ کو شُبہ ہی نہیں بلکہ یقین بھی تھا کہ اگر مہاراجہ کو زیادہ پریشان کیا گیا تو وہ مجبور ہو کر بھارت کے ساتھ الحاق کر بیٹھے گا کیونکہ پاکستان دُنیاء کے نقشے پر دو حصوں میں منقسم ایک چھوٹے اور غریب ونو زائد ملک کے طور پر اُبھرنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور اُس کے پاس کشمیر کو بزورِ باز و حاصل کرنے کیلئے نہ تو ذرائع تھے اور نہ ہی قوت۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ فی الحال سیاسی مصلحت سے کام لے کر مہاراجہ کو اپنے ہاتھ میں رکھا جائے لیکن اڑھائی ماہ کی طویل مصروفیات کے باوجود بھی کشمیر میں رہ کر قائدِ اعظم کشمیری قیادت کو کسی ایک مرکزی نکتے پر متفق نہ کر پائے۔ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کے درمیان اختلافات مِٹانے کی کوشش کی لیکن نا کام رہے، وہ مہاجرِ ملت میر واعظ (مرحوم) مولوی یوسف کو سیاسیات سے نکال کر محض دینی ممبر پر دیکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ اس میں بھی نا کام رہے، وہ مہاراجہ کے دوست اور قانونی صلاح کار بھی تھے اور اُنھیں آنے والے طوفانوں کے بارے میں نجوبی علم تھا!

3/ جون 1947ء کو بھارت میں برطانوی گورنر جنرل لارڈ ماونٹ بیٹن نے تقسیم ہند کے منصوبے کا باقاعدہ اور باضابطہ اعلان کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حکومتِ برطانیہ اگلے دو ماہ کے

دوران بھارت سے اپنا بوریا، بستر باندھ کر واپس برطانیہ چلی جائے گی۔ اس ضمن میں وائسرائے نے جو اعلان کیا، اُس کا اُردو ترجمہ محمد علی چراغ نے اپنی کتاب ''تاریخِ پاکستان'' میں کچھ اس طرح نقل کیا ہے:

''ہندوستان کے لئے کوئی آئین ترتیب دینے کے سلسلے میں ہز میجسٹی گورنمنٹ نے کابینۂ مشن کے حوالے سے جو کوششیں کیں، وہ ناکام رہیں کیونکہ مسلم لیگ کسی مشترکہ حکومت میں شرکت کے لئے تیار نہ تھی۔ لہٰذا حکومتِ برطانیہ کی ایماء پر اس کے اعلان کے مطابق کہ ''حکومتِ برطانیہ جون 1948ء سے پہلے پہلے ہندوستان کے تمام اختیارات ہندوستانیوں کو سونپ کر چلی جائے گی'' اس حوالے سے متعدد صوبوں میں اختیارات کی منتقلی کا کام شروع ہو گیا تھا۔ مدراس، بہار، بمبئی، صوبجات متحدہ، مرکزی صوبہ جات، برار، آسام، اُڑیسہ، بنگال، سندھ، پنجاب وغیرہ میں مسلمانوں کی اکثریت کے حوالے سے لیگ نے بھی بہت کام کیا اور بلوچستان کے بارے میں آئینی کام ہو چُکا ہے۔ ہز میجسٹی کی خواہش ہے کہ تمام اختیارات ہندوستان کے لوگوں کی خواہش کے مطابق اُنھیں منتقل کر دیئے جائیں۔ برِاعظم کے تمام سیاسی رہنماؤں کے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس لئے برطانوی حکومت کا یہ کوئی جبر نہیں ہے کہ وہ کسی متحدہ ہندوستان کا آئین بنائے۔ آئین سازی کے معاملات کی ذمہ داری ہندوستانیوں کی اپنی ہے۔ حکومتِ برطانیہ مختلف صوبوں میں قائم وزارتوں کے سلسلے میں بھی مداخلت کرنے کو تیار نہیں۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ان صوبوں میں ابھی اسمبلیاں قائم نہیں ہوئی ہیں، وہاں پر بھی باہمی طور فیصلہ کر کے اسمبلیاں قائم کر لی جائیں، اور یہ طے کر لیا جائے کہ انتقالِ اقتدار کیا جائے گا تاہم اس سلسلے میں کسی کے ساتھ جبر یا سختی نہیں ہو گی!''

وائسرائے کے اعلان نامے کا آگے کا متن کچھ یوں ہے:

''بنگال اور پنجاب کی مجالس قانون سازیہ دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گی۔ یہی دونوں مجالس فیصلہ کریں گی کہ ان صوبوں کو تقسیم کرنا چاہئے یا نہیں! اسمبلیوں کی دو، دو میں تقسیم کا یہ عمل ایک طرح سے ابتدائی مرحلہ ہو گا۔ اس کے بعد جب یہ حتمی طور طے پایا جائے گا کہ مسلمانوں کی اکثرت کے کون کون سے ضلعے ہیں اور ہندو اکثریت کے کون کون سے علاقے ہیں، دوسرے مرحلے کا آغاز بھی خود بخود ہو جائے گا۔ صوبوں اور علاقوں کی حتمی حد بندی کیلئے ایک باونڈری کمیشن بنایا جائے گا۔

صوبۂ سندھ کی مجلسِ قانون سازیہ کو یہ اجازت دی جائے گی کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ وہ صوبۂ سندھ کو کس کے ساتھ شامل کرنا چاہتی ہے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی صورتحال ذرا مختلف ہے۔ اس صوبے کی اسمبلی میں گو مسلمانوں کی نمائندگی موجود ہے لیکن پھر بھی اس میں استصوابِ رائے کرایا جائے

گا کہ وہ کس جماعت کا ساتھ دینا چاہتا ہے۔استصواب رائے کا یہ عمل گورنر جنرل کی زیرنگرانی ہوگا۔ صوبۂ بلوچستان کوبھی پورے اختیارات دیئے جائیں گے کہ وہ جو چاہے، فیصلہ کرے۔

بنگال، آسام اورسلہٹ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان زیادہ کھینچا تانی جاری ہے، اس لئے جب بنگال دوحصوں میں تقسیم ہوجائے گا تو پھر سلہٹ میں استصواب رائے کرایا جائے گا، اور آسام میں بہرحال مسلمان اقلیت میں ہیں۔

صوبوں کی اس تقسیم اورمختلف اضلاع کی حدبندی کے ضمن میں جُملہ اموراور مسائل کا بھی اہتمام کرلیا جائے اور یہ امر واضح بھی کردینا چاہیے کہ تقسیم کا یہ عمل صرف برطانوی ہند پر لاگو ہوگا۔ جہاں تک قبائل اورریاستوں کا تعلق ہے، وہ کسی بھی اسمبلی کے ساتھ الحاق کی مجاز ہوں گی۔

ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں نے تقسیم ہند اور انتقالِ اقتدار کے عمل میں ہزمیجسٹی گورنمنٹ کو بہت ہمدردانہ ذمہ دار محسوس کیا ہے اور یہاں تک اختیارات دیئے ہیں کہ جون 1948ء تک یہ کام ضرور مکمل کرلیا جائے، لیکن کام کی جو رفتار ہے، اس کے تحت انتقال اقتدار اور تقسیم کا عمل جلد از جلد مکمل کرلیا جائے گا'' (تاریخِ پاکستان/محمد علی جوہر/صفحہ نمبر 483)۔ (یہ حوالہ اتفاقاً پہلی بار نقل کیا جارہا ہے کیونکہ مذکورہ کتاب پاکستان میں شائع ہوئی ہے اور کافی نایاب مانی جاتی ہے)

اس حکومتی اعلان کے بعد بنگال اور پنجاب کے مسلم اکثریت والے اضلاع کی نشاندہی 1941ء کے آبادی کے اعداد وشُمار کے مطابق کردی گئی۔ مسلم بنگال میں چٹا کانگ ڈویژن، چٹا کانگ نواکھلی، ٹائی پیرا، ڈھاکہ ڈویژن، باقر گنج، ڈھاکہ، فرید پور، میمن سنگھ، پریذیڈنسی ڈویژن، جسپور، مرشد آباد، راجشاہی ڈویژن، بوگرہ، دیناپور، مالدہ، پنبہ، راجشاہی اور رنگپور جبکہ مسلمانوں کے پنجاب میں جن اضلاع کوشامل کیا گیا، اُن کے نام یوں ہیں۔ لاہور ڈویژن، گوجرانوالہ، گورداسپور، لاہور شیخپورہ، سیالکوٹ، راولپنڈی ڈویژن، اٹک، گجرات، جہلم، میاں والی، راولپنڈی، شاہ پور، ملتان ڈویژن، ڈیرہ غازی خان، جھنگ، لائل پور، منٹگمری، ملتان اور مظفر گڑھ۔

اسی دوران ایک پریس کانفرنس کے دوران ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماونٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ اقتدار کے انتقال کا کام جلد از جلد مکمل ہورہا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ 15/اگست 1947ء کو اس کا اعلان کردیا جائے۔ انتقالِ اقتدار، تقسیم ملک کی یہ سکیم جب دونوں سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور کانگریس نے منظور کرلی تو پھر دونوں جماعتوں کے رہنماؤں کوریڈیو کے ذریعے اپنی اپنی قوم سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔

مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مسلمان اور کانگریس کے پرچم تلے ہندو بھارت اور پاکستان آزادی کے لئے بالکل کمربستہ تھے۔ دونوں کی طویل، خون آشام اور پرمشقت تحریکِ آزادی کی بیل منڈھے چڑھ رہی تھی۔ لیکن ریاست جموں وکشمیر میں منتشر قیادت اور متضاد نظریات کے تحت چلنے والی عوامی تحریک کی آنکھوں پر بدستور پٹی بندھی ہوئی تھی۔

پرویز دیوان کے مطابق:۔ ''بھارت کی 565 ر چھوٹی بڑی ریاستوں، صوبوں اور راجواڑوں کے سامنے تاجِ برطانیہ کی طرف سے صرف دو ہی راستے چھوڑے گئے کہ وہ یا تو خود کو نوزائد پاکستان کے ساتھ جوڑ لیں، یا پھر بھارت کے ساتھ (Indian Independence Act , 1947) کے مطابق ان صوبوں اور ریاستوں کے سامنے آزاد یا خودمختار رہنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مہاراجہ اور اُس کے وزیر اعظم رام چند کاک نے آزادی کے اس منصوبے کو مذاق قرار دیا، شیخ محمد عبداللہ الحاقِ ہند کے حامی تھے جبکہ مسلم کانفرنس اور پنڈت پریم ناتھ بزاز وغیرہ الحاقِ پاکستان کے حق میں تھے۔ رسالہ ''کیمونزم کمبیٹ'' نے مئی 1947ء میں یہ رپورٹ شائع کی ''اکھل راجہ ہندو سبھاء کے ارکان نے بھارت کی شدت پسند ہندو جماعت آر۔ایس ایس کی ایماء پر پریم ناتھ ڈوگرہ کی قیادت میں جموں میں زبردست مظاہرے کر کے ریاست کے الحاقِ ہند کی مخالف کی، انہوں نے ریاستِ جموں وکشمیر کو ایک ''ہندو ریاست'' قرر دیا جو (بقول ان کے) ایک ہندو مہاراجے کی ملکیت تھی۔ اس تنظم نے ایک قراد پاس کر کے ''ایک ہندو ریاست کے الحاقِ ہند'' کی شدید مخالفت کی'' تاہم رپورٹ کے مطابق اس تنظیم نے نظریاتی بنیادوں پر قائم ہونے والے پاکستان کے ساتھ ملنے کی کوئی مخالفت نہیں کی (پرویز دیوان/کشمیر/صفحہ نمبر 88)

مہاراجہ ہری سنگھ کی ذاتی خواہش تھی کہ اُس کی ریاست آزاد اور خودمختار رہے۔ مہاراجہ کے بیٹے اور سابقِ صدرِ ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنی زندگی میں کئی بار اس بات کو دوہرایا کہ ''میرے والد تقسیم ملک کے وقت اس بات پر غور کر رہے تھے کہ آیا وہ بھارت کے ساتھ الحاق کریں یا پاکستان کے ساتھ۔ ہم ایک ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس نے مسلم اکثریتی ریاست پر حکمرانی کی''

لالہ مہر چند نے بھی اس بات کا کئی بار اعتراف کیا کہ ''مسلم کانفرنس کے قائدین نے مجھ سے راز دارانہ انداز میں کئی دفعہ کہا تھا کہ میں مہاراجہ کو اس بات پر راضی کر لوں کہ وہ بھارت کی بجائے پاکستان کے ساتھ الحاق کر لے، جس کے بدلے وہ ہمیشہ مہاراجہ کے وفادار رہیں گے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ ریاست جموں وکشمیر پاکستان کے زیرِ انتظام رہتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت اور خود

مختاری کو برقرار رکھے، اُدھر چترال کے مہتروں اور ہنزہ کے میروں نے بھی مہاراجہ کو کوئی برقی پیغامات بھیج کر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کی صلح دی لیکن اس ساری صورتحال کو نظر انداز کرتے ہوئے نیشنل کانفرنس نے من بنالیا تھا کہ وہ ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کر کے ہی دم لے گی! اس کے باوجود یہ بات انتہائی اہم اور قابلِ ذکر ہے کہ ریاست میں لڑائی صرف شخصی راج اور جمہوریت کے درمیان تھی نہ کہ ہندو اور مسلمان کے درمیان۔

بقولِ لالہ مہر چند قائداعظم نے برملا کہہ دیا تھا کہ ریاستوں کی تقدیر کا فیصلہ کلی طور اُس کے حکمران کے ہاتھ میں تھا اور مہاراجہ کو اس حوالے سے نہ تو کسی سے کوئی صلاح لینے کی ضرورت تھی اور نہ ہی وہ عوام کے سامنے جوابدہ تھا۔ علاوہ ازیں مہاراجہ کو شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے ان خدشات کی بھی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ پاکستان کے ساتھ ہاتھ ملانا اُس کے یا ریاست کے حق میں نہیں ہوگا۔ کیونکہ الحاق پاکستان کے باوجود بھی سارے اختیارات مہاراجہ کے پاس رہیں گے اور وہ ریاست کا مختار کل بنا رہے گا۔ اس سارے تناظر میں مہاراجہ کا تذبذب حق بجانب تھا، اس لئے اُس نے 12/اگست 1947ء کو بھارت اور پاکستان دونوں کو خطوط لکھ کر تجویز پیش کی کہ وہ ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل کے حوالے سے ایک Stand Still ایگریمنٹ (معاہدۂ قائمہ) کو منظور کرلیں!

20

تقسیم برصغیر......
لوٹ ماراور ''قبائلی یلغار''

تاجِ برطانیہ کے اعلان آزادی کے ساتھ ہی برصغیر کی تقسیم کے فارمولے پرعمل ہوگیا اور اقتدار کی منتقلی کا سلسلہ چل پڑا۔ 565 ریاستوں، رجواڑوں اور خودمختار و نیم آزاد علاقوں کے حکمرانوں نے بھارت اور پاکستان کے ساتھ اپنے مستقبل کو جوڑنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ حالانکہ آزادی کے مسودے کے مطابق یہ اختیار صرف اِن ریاستوں کے حکمرانوں کو حاصل تھا کہ وہ اپنے عوام کو اعتماد میں لئے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اس مسودے کی خلاف ورزیاں شروع ہوگئیں۔ شروع میں ریڈ کلف ایوارڈ نامی فراڈ کے ذریعے کئی ایسی ریاستیں اور علاقے جو پاکستان کی طرف جانا چاہتے تھے، کو بھارت کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ ان میں ضلع گورداسپور، امرتسر کی کئی تحصیلیں مثلاً اجنالہ، ہوشیار پور، دسوا، جالندھر، فیروز پور، ہیرا اور لاہور کی تحصیل قصُور کا کچھ حصہ...حالانکہ محمد علی چراغ کے مطابق یہ پہلے ہی طے ہوا تھا کہ سکھوں کی آبادی والے سبھی علاقے بھی پاکستان کو دیئے جائیں گے۔ لیکن ''ریڈ کلف ایوارڈ'' میں اس سے بھی انحراف کیا گیا جبکہ دوسری جانب مشرقی پاکستان میں کلکتہ بھی مسلم اکثریتی علاقہ تھا اس لئے اُسے بھی پاکستان کو دیا جانا تھا لیکن ایوارڈ میں اس کے برعکس ہوا اور باونڈری کمیشن، جو کہ انگریزوں کی طرف سے مقرّر کیا گیا تھا، کی شفارشات کو بھی خاطر میں نہ لایا گیا۔

تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کے دوران اکثر ایسا محسوس ہوتا کہ پاکستان میں کشمیر کے حوالے سے پایا جانے والا جذباتی لگاؤ وہاں زندگی کے ہر شعبے میں یکساں اور جنون کی حد تک پایا جاتا ہے، یہ ایک اچھا رجحان ہے یا بُرا، اس پر تبصرہ کئے بغیر اس بات سے انحراف نہیں ہونا چاہیے کہ تاریخ رقم کرتے وقت حالات وواقعات کو اُن کے صحیح تناظر میں اور ایمانداری کے ساتھ پیش کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت ریاستِ جموں و کشمیر کی تقسیم کو بھی نہیں روکا جا سکا اور مہاراجہ ہری سنگھ جو کل

تک پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے یا کم از کم آزاد رہنے کا ارادہ رکھتے تھے، کوآناً فاناً بھارت کے ساتھ الحاق کرنا پڑا اوراس کی کیا وجوہات ہوئیں اُن پر مفصل نظر ڈالنے سے قبل پاکستانی مورخ محمد علی چراغ کی کتاب ''تاریخِ پاکستان'' کے صفحہ نمبر 491 ر پر موجود اس پیرا گراف کو پیش کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مسئلہ کشمیر:۔ حکومتِ برطانیہ نے جب 1947ء میں قانون آزادیٔ ہند کا مسودہ نافذ کیا تو اس میں '3 ر جون پلان' کے تحت ریاستوں کے بارے میں یہ طے پایا تھا کہ ''ریاستوں کے حکمران دونوں ملکوں، پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ بلا جبر و کراہ الحاق کر سکیں گے''، لیکن اس اجازت سے یہ بات از خود فرض کر لی گئی تھی کہ ریاستوں کے حکمران اپنی اپنی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اپنے عوام کی خواہشات اور ریاست کی جغرافیائی پوزیشن کو بھی مدِ نظر رکھیں گے۔ ریاستِ کشمیر میں تو شروع سے ہی مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے...... جب قانونِ آزادیٔ ہند کا اجراء ہوا تو ریاست کشمیر کے مسلمانوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا ارادہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کشمیری مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس نے اپنی قرارداد مورخہ 19 ر جولائی 1947ء کے تحت اس الحاق کا رسمی طور پر بھی اعلان کیا تھا۔ لیکن مہاراجہ کشمیر، جو کانگریس حکام سے ملا ہوا تھا، نے بزعمِ خویش ہی عوام کو اعتماد میں لئے بغیر 27 ر اکتوبر 1947ء کو کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا حالانکہ اس سے قبل پاکستان نے مہاراجہ کشمیر کے ساتھ عارضی معاہدۂ قائمہ کے تحت کشمیر کے ذرائع رسل و رسائل پر اختیار حاصل کر لیا تھا اور کشمیر کی کئی حکومتی عمارتوں پر آزادی کے وقت پاکستان کا پرچم بھی لہرایا گیا تھا لیکن بعد میں مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا......'' (محمد علی چراغ / تاریخ پاکستان صفحہ نمبر 491)

مذکورہ بالا سطور کا جائزہ لیتے ہوئے ذہن میں کئی سوالات اُبھرتے ہیں اور اسی طرح کے سوالات ایک اور پاکستانی مورخ عباس احمد آزاد کے ذہن میں بھی اُبھرتے ہیں، وہ اپنی کتاب ''میرا پیام اور ہے'' کے ''انتہائے گزارش'' میں لکھتے ہیں کہ ''یہ تاریخ کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ 14 ر اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آتا ہے، 15 ر اگست 1947ء کو اس ملک کا بانی بسترِ مرگ سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مہاراجہ کشمیر کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کرتا ہے، مہاراجہ کشمیر پاکستانی پرچم کو سلامی دیتا ہے، ان کے حکم سے کشمیر کے طول و ارض میں پاکستانی پرچم لہرائے جاتے ہیں، کشمیر کا سارا نظام پاکستان سنبھال لیتا ہے۔ بانی پاکستان مزید اعتماد کی بحالی کے لئے اپنے منہ بولے بیٹے کے ایچ خورشید کو سرینگر روانہ کرتے ہیں اور یکدم ایک گمنام شخص، جو چند روز قبل تک فلسطین کے اُس علاقہ

میں پایا جاتا تھا، جہاں صہیونی ریاست کے قیام کی منصوبہ بندی ہورہی تھی، یہاں وارد ہوجاتا ہے اور ٹھیک ایک ہفتہ کے اندر اندر 23 / اگست 1947ء کو اس معاہدے کی دھجیاں اُڑا دیتا ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف لاکھوں مسلمان شہید اور لاکھوں بے گھر ہوئے بلکہ کئی ماہ تک مہاراجہ امن کی بھیک مانگتا رہا اور معاہدہ کی پاسداری کی اپیلیں کرتا رہا لیکن اُس کی فریاد سُننے والا کوئی نہیں تھا اور آخر کار (اُسے) مجبور ہوکر پاکستان سے منہ موڑ کر پنڈت نہرو کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے...... حالانکہ یہی وہ نہرو ہیں جن کو اُس (مہاراجہ) نے کشمیر میں داخل ہونے کے جرم میں کوہالہ پُل پر گرفتار کرکے دلائی کیمپ میں بند کروا دیا تھا......''

مذکورہ بالا دونوں پاکستانی مورخین کی رائے میں کئی اختلافات اور تضادات موجود ہونے کے باجود دونوں ایک دوسرے کے سوالات کا بھی از خود جواب دیتے ہیں۔ جہاں محمد علی چراغ مہاراجہ کو کانگریس کا آلہ کار قرار دے رہا ہے، وہیں عباس احمد آزاد کوہالہ پُل پر پنڈت نہرو کی گرفتاری اور کشمیر پولیس کے ہاتھوں اُن کی درگت کا تاریخی واقعہ پیش کرکے یہ ثابت کررہا ہے کہ مہاراجہ کانگریس قیادت کو پسند نہیں کرتا تھا، یہ بات بھی تاریخی حوالہ جات سے ثابت ہے کہ مہاراجہ کو کانگریس قائدین اور شیرِ کشمیر کا میل جول اور سرگرمیاں پسند نہیں تھیں بلکہ وہ اِن کے مقابلے میں قائدِ اعظمؒ کو زیادہ پسند کرتے تھے، چراغ پہلی سطر میں لکھتے ہیں کہ قانونِ آزادئ ہند کے مطابق مہاراجہ اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ لینے کے مختار و مجاز تھے لیکن دوسری سطر میں اُنھیں گلہ ہے کہ مہاراجہ نے عوام کو اعتماد میں لئے بغیر ریاست کا الحاق ہندوسان کے ساتھ کردیا......'' اس تناظر میں یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن حالات کا جائزہ بھی لیا جائے کہ جن کی وجہ سے مہاراجہ کو بھارت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑا اور ریاست کو بچانے کیلئے فوج طلب کرنا پڑی۔

غلام احمد میر آف تھنہ منڈی اپنی سوانح حیات ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' میں تقسیم ملک اور ریاست کے اس وقت کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت اور پاکستان کی آزادی کے ساتھ ہی ریاستِ جموں وکشمیر کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست بنائے رکھنے کی تجویز پیش کی تھی، جسے پاکستان نے تسلیم بھی کرلیا تھا۔ جس کی رُو سے ریاست کے ڈاکخانوں پر ''لاہور زون'' ہونے کی وجہ سے پاکستانی جھنڈے لہرائے گئے۔ لیکن ریاست کے عوام کی بدقسمتی تھی کہ بھارت کے مختلف حصوں میں بھڑکے مذہبی فسادات نے اپنا بھیانک

چہرہ ریاست جموں وکشمیر میں بھی دکھایا۔عینی شاہدین کے مطابق اس موقعہ پر راشٹریہ سوئم سیوک دل (RSSD) کے اہلکار اور مہاراجہ آف پٹیالہ کی فوج مہاراجہ ہری سنگھ کی اجازت کے بغیر مہارانی کے بلاوے پر ریاست میں داخل ہوگئی اور اُس نے ریاست کے جموں خطے میں دھنگے شروع کردیئے۔تھنہ منڈی راجوری کے ایک بزرگ مولوی سلام الدین صاحب جو ابھی تک بقید حیات ہیں کے مطابق اس فوج اور ان بلوائیوں کو کسی نے نہیں بلایا تھا البتہ وہ آئے اور جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں سے مسلمانوں کو نکالنے کا عمل شروع کردیا۔ اِن لوگوں کو زبردستی ٹرکوں میں لاد کر پاکستان کیلئے روانہ کردیا گیا لیکن راستے میں (RSSD) کے شرپسندوں نے گھات لگا کر اُن پر حملہ کردیا اور اُنہیں ویرانوں میں موت کے گھاٹ اُتار دیا، جہاں اللہ تعالیٰ کے سِوا اُن مظلوموں کی چیخ و پکار سُننے والا کوئی نہ تھا۔اس طرح جموں شہر، اکھنور، سانبہ اور پونی وغیرہ علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، لاکھوں مسلمانوں کو ابدی نیند سُلا دیا گیا اور ایک اندازے کے مطابق یہ تعداد ساڑھے تین لاکھ سے بھی زیادہ ہے جبکہ 9/لاکھ کے درمیان مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کردیا گیا۔شاہدین کے مطابق جموں کے تالاب کھٹیکاں اور رانی تالاب کے دو مقامات پر پانچ ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو قتل کردیا گیا۔جموں کے مسلم اکثریتی علاقوں میں دھنگوں کی خبریں پہنچیں تو وہاں بھی ردِعمل کے طور پر فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ان علاقوں میں مسلمان چونکہ اکثریت میں تھے لہٰذا اقلیتی فرقہ نشانہ بنا۔چنانچہ مظفرآباد، میرپور، کوٹلی، پلندری، بھمبر، باغ، پونچھ، مینڈر، منڈی، تھنہ منڈی، درہال، بُدھل، راجوری ،نوشہرہ، سُندربنی، پونی، بھارک اور ریاسی کے پہاڑوں میں لگ بھگ سوا لاکھ ہندو اور سکھ فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔جائیدادئیں لوٹ لی گئیں، مکان و دکان نذرِ آتش کردیئے گئے خواتین کو یرغمال بنالیا گیا۔اس قتل و غارت گری، ہجرت اور حکومت کی عدم موجودگی کی وجہ سے مظفرآباد اور آزاد کشمیر کے مختلف علاقوں کے وہ لوگ جو دوسری جنگ عظیم سے فارغ ہوکر گھروں کو لوٹے تھے، نے منظّم ہوکر اپنے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور باقی علاقوں پر قبضہ کرنے کیلئے بھی آگے بڑھنے لگے، یہ لوگ چونکہ پیشہ ور اور ماہر عسکریت پسند (سابق فوجی) تھے اور اُن کے پاس اپنے اپنے ہتھیار بھی

موجود تھے، اس لئے انہوں نے مہاراجہ کی فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکریوں پر حملے کر کے اُن سے ہتھیار چھیننے کا عمل شروع کر دیا۔ مہاراجہ کے کچھ سپاہی مارے گئے اور اُن سے چھینے ہوئے ہتھیاروں کو استعمال کر کے یہ لوگ میرپور کوٹلی، مظفرآباد، باغ سدھنتی اور دیگر علاقوں کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ چونکہ مقامی باشندے تھے اس لئے جغرافیائی صورتحال سے واقف ہونے کی وجہ سے انھیں اردگرد کے علاقوں میں اچھی خاصی کامیابیاں ملنے لگیں۔ ان کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے پاکستان کی نوزائد حکومت نے بھی اُن کی پشت پناہی کی اور ان کی مدد ٹرانسپورٹ اور ہتھیاروں کی صورت میں کی یہ لوگ راولپنڈی روڈ پر کشمیر کے راستے آگے بڑھنے لگے اور ایک طرف سے سنگھپورہ پٹن تک جبکہ دوسری جانب درۂ پیر پنچال کو پار کر کے شوپیان اور پلوامہ تک پہنچ گئے۔ صوبہ جموں میں ان لوگوں نے پونچھ اور راجوری کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اُس وقت ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی کیونکہ مہاراجہ کی فوج میں ان تربیت یافتہ اور دوسری عالمگیر جنگ سے فارغ شدہ فوجیوں کے ساتھ لڑنے کا دم خم نہیں تھا'' (میں نے کشمیر جلتے دیکھا/ غلام احمد میر/صفحہ نمبر 104/ 103)۔ (اس کتاب کی ادارت راقم نے ہی کی ہے)۔...1

غلام محمد میر کی یہ دلیل اگرچہ 1947ء میں ریاست میں ہوئے اُس پاکستانی حملے کے حوالے سے کچھ مختلف اور نئی ہے، جسے عرف عام میں ''قبائلی حملہ'' کہا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس دلیل سے یہ عُقدہ بھی کُھل جاتا ہے کہ یہ سارے حملہ آور محض گمراہ کئے گئے قبائلی نہیں تھے، جنھیں پاکستان نے اپنی اندرونی شورش دبانے کیلئے کشمیر کی جانب موڑ دیا تھا اور نہ ہی وہ محض اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے۔ البتہ سچ ''ففٹی ففٹی'' کے درمیان کہیں پر ہے یعنی جموں صوبے میں مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کا بدلہ لینے کیلئے کچھ سابق فوجی مختلف راستوں سے ریاست کی طرف بڑھے اور اُن کی پیش قدمی اور کامیابی کا پاکستان نے اپنے بانی قائداعظم کی مرضی کے خلاف بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ قائداعظم اُس وقت چونکہ خود بسترِ مرگ پر تھے اس لئے وہ حکومت کی من مانیوں کو روکنے کی پوزیشن میں نہ تھے جبکہ ایسے میں مہاراجہ

1... یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کشمیر پر قبائلیوں نے میجر خورشید اور خان رحیم داد سالار کی قیادت میں حملہ کیا، نہ کہ مقامی باشندوں نے، یہ حملہ مظفرآباد کی طرف سے ہوا....پیر پنچال سے ہوتے ہوئے شوپیان تک جانے کا idea غلام احمد میر کا ہے...ف م ح)

ریاست کواُن کی طرف سے دی گئی گارنٹی، اُن سے کئے گئے عہدہ وپیان اور معاہدے نیز ذاتی دوستی بھی کچھ کام نہ آئی۔ حتیٰ کہ مہاراجہ تب تک خاموش رہا جب تک کہ اُس کا سپہ سالار بریگیڈیئر راجندر سنگھ اِن حملہ آوروں کے ہاتھوں ہلاک نہ ہوگیا۔ دوسری طرف مہاراجہ کے لئے مشکل یہ تھی کہ اُسے پہلے ہی ایک بہت بڑے عوامی لیڈر شیخ محمد عبداللہ اور اُس کی جماعت نیشنل کانفرنس کی سخت مخالفت کا سامنا تھا، اس لئے اُسے اس قدر خراب حالات کے باوجود بھی دلی کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس سارے پس منظر میں پاکستانی مورخین کے اُس سوال کا جواب بھی پوشیدہ ہے کہ جس مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا ارادہ کرلیا تھا، اُسے صرف ایک ہفتے میں اپنا فیصلہ بدل کر دلی کے سامنے گھٹنے کیوں ٹیکنے پڑے؟ مہاراجہ اس لحاظ سے کافی دوراندیش اور غیرت مند ثابت ہوا ہے کیونکہ وہ اپنی مرضی اور عزت ووقار کے ساتھ پاکستان کے ساتھ جانا چاہتا تھا، ایک مفتوح اور شکست خوردہ حکمران کی حیثیت سے نہیں۔ لہٰذا اُس نے دلی سے مدد طلب کی۔ اپنی فوج کو دم توڑتے ہوئے دیکھ کر مہاراجہ نے بے بسی اور بے سروسامانی کے حالت میں دلی سے مدد طلب کی اور مدد کی صورت میں ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کرنے کیلئے دستاویز الحاق بھی ارسال کیا۔ ذیل میں مہاراجہ کے اُس خط کا مفہوم پیش کیا جاتا ہے، جو انہوں نے گورنر جنرل آف انڈیا لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام ارسال کیا تھا:

ترجمہ:

''26/اکتوبر 1947ء

مائی ڈیر لارڈ ماونٹ بیٹن!

میں آپ جناب کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف مبذول کرتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری ریاست میں ایک سخت اور ایمرجنسی آن پڑی ہے اور میں آپ کی حکومت سے اس موقعہ پر فوری مدد کا طلبگار ہوں۔ جیسا کہ جناب والا جانتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر نے ابھی تک نہ تو بھارت کے ساتھ الحاق کیا ہے اور نہ ہی پاکستان کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے۔ جغرافیائی طور پر میری ریاست دونوں ملکوں کے درمیان واقع ہے، اس کے دونوں کے ساتھ گہرے تہذیبی اور اقتصادی روابط ہیں، اس کے علاوہ میری ریاست کی سرحدیں چین اور سویت یونین کے ساتھ بھی ملتی ہیں اور ان دوممالک کے ساتھ ہمارے بیرونی تعلقات کے تناظر میں بھی بھارت اور پاکستان حقائق سے انکار نہیں کرسکتے۔ میں یہ فیصلہ کرنے کیلئے کچھ وقت غور وخوض کرنا چاہتا تھا کہ مجھے (بھارت یا پاکستان میں سے) کس مملکت کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے یا پھر یہ کہ دونوں ممالک کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ میری ریاست آزاد

رہے......اور بے شک......دونوں کے ساتھ اچھے اور دوستانہ تعلقات کے ساتھ۔

اسی لئے میں نے بھارت اور پاکستان سے کہا بھی تھا کہ وہ میرے ساتھ "معاہدِ قائمہ" پر راضی ہو جائیں۔ بھارت نے اس حوالے سے میری حکومت کے نمائندوں کے ساتھ مزید مذکرات کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن میں مندرجہ ذیل پیش آمدہ صورتحال کی وجہ سے اس کا بندوبست نہیں کر پایا۔ حق یہ ہے کہ حکومت پاکستان اس وقت بھی میری ریاست میں ڈاک تار کا نظام چلا رہی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ہم نے پاکستان کے ساتھ "معاہدۂ قائمہ" طے کر لیا ہے اور اُس ملک نے میری ریاست کی مدد بہت تیز رفتاری کے ساتھ غذائی اجناس، نمک پٹرول وغیرہ بھیج کر کی ہے لیکن آفریدی سپاہی، جو کہ سادہ کپڑوں میں ملبوس ہیں اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں کو میری ریاست میں دھکیل دیا گیا ہے۔ وہ پہلے پونچھ میں داخل ہوئے، پھر سیالکوٹ میں اور پھر ہزارہ سے ملحقہ میرے بڑے علاقے میں۔ نتیجہ کے طور پر میری حکومت کی محدود سپاہ کافی خوفزدہ ہے کیونکہ اُسے دشمن کا کئی محاذوں پر مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ جس وجہ سے ان دراندازوں کی لوٹ کھسوٹ اور قتل غارت گری کو روکنا محال بن گیا ہے۔ مہورہ (اوڑی) کا پاور ہاوس، جو کہ سارے سرینگر کو برقی رو فراہم کرتا ہے، کو جلا دیا گیا، خواتین کی بڑی تعداد کا اغواء اور اُن کے ساتھ ہو رہی زیادتیوں پر میرا دل خون بار ہے۔ یہ وحشی فوج اس قدر بے لگام ہے کہ وہ سرینگر پر قبضہ کرنے کیلئے پیش قدمی کر رہی ہے، یہ اُن کا پہلا پڑاؤ ہے، جبکہ میری پوری ریاست اُن کا نشانہ ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اور مسلح دراندازوں کی پیش قدمی جو کہ جنوب مغربی صوبہ (سرحد) کی جانب سے ہو رہی ہے، پاکستانی حکومت اور صوبائی انتظامیہ کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں ہے اور میری حکومت کی بارہا درخواستوں کے باوجود بھی پاکستان نے ان کو نہیں روکا، حتیٰ کہ ریڈیو پاکستان نے یہ تک کہہ دیا کہ (پاکستان نے) ایک صوبائی حکومت کا قیام عمل میں لایا ہے، حالانکہ میری ریاست کے لوگوں، مسلمانوں یا غیر مسلموں نے اس عمل میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔ لہٰذا اس ساری ناگفتہ بہ صورتحال کے تناظر میں میرے لئے کوئی دوسرا چارۂ کار باقی نہیں رہ جاتا کہ میں مملکتِ ہند سے مدد طلب کروں اور میں جانتا ہوں کہ بھارت تب تک میری مدد نہیں کرے گا جب تک کہ میں اس کا الحاق اُس کے ساتھ نہ کروں۔ اس لئے دستاویز الحاق کی ایک کاپی بھی اس خط کے ساتھ شامل کر رہا ہوں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میری ریاست کو ان بدمست لٹیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور ایسے حالات میں کوئی بھی مہذب حکومت قائم نہیں رہ سکتی اور میں بحیثیت حکمرانِ ریاست تب تک ایسا نہیں ہونے دوں گا، جب تک کہ میرے سینے میں آخری سانس تک باقی رہے گی۔ میں

جناب والا کو یہ بھی بتا دینا چاہوں گا کہ آپ چاہیں تو فوری طور پر ایک عارضی انتظامیہ تشکیل دے کر شیخ محمد عبداللہ کو اس کی ذمہ داریاں سونپ سکتے ہیں۔ جو یہ میرے وزیراعظم کے ساتھ مل کر نبھائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ میری مدد کیلئے فوری طور سرینگر میں اپنی افواج ارسال کر دیں۔ اگر اس حوالے سے مزید کسی صفائی یا وضاحت کی ضرورت ہو تو مسٹر مینن ساری صورتحال سے واقف ہیں اور آپ اُن سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

اِنتہائی جلد بازی میں مگر نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کا خیر اندیش!

ہری سنگھ

تاریخ۔26/اکتوبر1947ء"

یہ تھی وہ ساری صورتحال اور واقعات جن سے مجبور ہو کر مہاراجہ ریاست کو پاکستان سے ناطہ توڑ کر بھارت کے ساتھ الحاقِ کرنا پڑا۔ بھارت نے یہاں مہاراجہ کی درخواست پر اپنی فوجیں اُتاریں لیکن پاکستان نے معاہدہ قائمہ Stand still agreement پر دستخط کرنے کے باوجود اپنے تربیت یافتہ سپاہیوں کو بھیج کر ریاست کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا، جو آج تک اُس کے قبضہ میں ہے۔ جبکہ گلگت اور بلتستان کو پاکستان کا حصہ بنانے کی بھی اپنی الگ ایک کہانی ہے۔

21

جموں وکشمیر کی آزادی پر شب خون

کشمیر کے حصول کے لئے پاکستان سے آنے والے حملہ آوروں کی سرگرمیوں سے پریشان ہوکر مہاراجہ نے دہلی سے مدد کی اپیل کی اور ایک خط (جو دراصل ایک درخواست تھی) میں مہاراجہ نے بھارت کے گورنر جنرل (سابق وائسرائے) لارڈ ماونٹ بیٹن کو انتہائی درد بھرے لہجے میں ساری صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ آفریدی سپاہیوں نے پوری ریاست میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے اور وہ بے یارومددگار مردوزن کی آہ وبکاہ کی وجہ سے سخت پریشان ہے، نیز اگر اس نازک موقعہ پر بھی بھارت نے اس کی مدد نہیں کی تو مہاراجہ کے لئے ایک آزاد حکومت کو قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا، مہاراجہ نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ یہ ساری اتھل پتھل حکومتِ پاکستان کی منشاء اور مرضی کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی کیونکہ گوریلے (باغی) اس قدر بپھرے ہوئے ہیں کہ وہ ساری ریاست پر قبضہ کرنے پر آمادہ نظر آرہے ہیں۔ مہاراجہ نے لارڈ کو یہ بھی لکھا کہ انہوں نے اس حوالے سے حکومت پاکستان کو بھی کئی بار مطلع کیا لیکن اس کے باوجود ان سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آرہی ہے، مہاراجہ کی عاجزی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے اس درخواست کے ہمراہ ریاست کے الحاقِ ہند کی دستاویز بھی روانہ کردی کیونکہ اسے علم تھا کہ بھارت تب تک اس کی مدد نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہ ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ نہیں کردیتا۔ پرویز دیوان اپنی کتاب "Pervez Deewan's Kashmir" میں اس حوالے سے ان وجوہات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں، جن کی وجہ سے پاکستان کو اپنے مسلح حمائتیوں کو کشمیر بھیجنا پڑا، وہ لکھتے ہیں کہ پاکستان کی پہلے ہی کشمیر کے حوالے سے نیت خراب تھی کیونکہ اس نے اپنے کیس کی پیروی کے لئے اکتوبر 1947ء کے اوائل میں ہی اپنے ایک فوجی اتاشی میجر شاہ کو کشمیر بھیجا تھا، میجر شاہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، جسٹس رشید کا داماد تھا، اس نے سرینگر میں ریاست کے وزیراعظم میجر جنرل جنک سنگھ اور نائب وزیراعظم آر، ایل بترا کے ساتھ ملاقات کے دوران اپنا کیس پیش کیا اور دلائل دیئے کہ ریاست کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے، میجر شاہ نے انہیں بتایا کہ یہ ریاست کے وسیع تر مفاد میں ہوگا کہ اس کا رشتہ پاکستان کے ساتھ جوڑ دیا جائے، لیکن

اس دلیل کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، اسی اثناء میں پاکستان میں افراتفری پیدا ہوگئی اور پاکستان نے اپنی اندرونی اتھل پتھل کو کم کرنے کیلئے ریاست جموں وکشمیر کے ساتھ کئے گئے معاہدۂ قائمہ (Stand still agreement) کی خلاف ورزی شروع کر دی، بقول پروفیسر رشید، جنوبی پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلم لیگی قائدین نے حکومتِ پاکستان کی ایماء پر صوبہ سرحد کے قبائل کو تربیت اور ہتھیار فراہم کر کے کشمیر پر حملے کے لئے آمادہ کیا اور انہیں (ایک منصوبہ بند طریقے پر) جموں میں سیالکوٹ کے راستے اور کشمیر میں ڈمیل (مظفر آباد) کے راستے، مہاراجہ کو بیدخل کرنے کی نیت سے داخل کر دیا گیا۔ مہاراجہ نے اس دراندازی کے خلاف 18 اکتوبر کے روز حکومت پاکستان سے سخت احتجاج کیا لیکن اس کے چار روز بعد پاکستان نے اس کا جواب ہزاروں دراندازوں کو ریاست میں بھیج کر دیا۔ ان سبھی کو پاک فوج کے سبکدوش شدہ میجر خورشید کی کمان میں دے دیا گیا تھا، انہیں پاک فوج نے ہتھیار اور کمک فراہم کی اور اس وقت بھارتی اعداد وشمار کے مطابق ان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ ان حملہ آواروں نے اسی دن با آسانی سارے مظفر آباد پر قبضہ کر لیا اور اپنی پیشقدمی جاری رکھتے ہوئے بارہ مولہ کے راستے کشمیر میں داخل ہوگئے اور ابھی تک جو مہاراجہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان سے آزاد رکھنے پر آمادہ تھا، کو حقیقت حال کا پتہ چلا تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس نے اپنے نائب وزیر اعظم مسٹر بترا کو دہلی مدد کے لئے روانہ کیا لیکن دلی والوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، کیونکہ بھارت کشمیر میں اپنی افواج بھیجنے سے پہلے ریاست کے ساتھ کسی قسم کا آئینی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا، اگلے دن ان قبائلی دراندازوں نے مہاراجہ کے سپہ سالار بریگیڈئر راجندر سنگھ کو ہلاک کر دیا اور جب مہاراجہ کو اس قتل کی اطلاع ملی تو وہ سرینگر سے جموں بھاگ گیا۔ اسی دن شیخ محمد عبداللہ بھی سرینگر سے دہلی روانہ ہوگئے، جبکہ 25 اکتوبر کو بھارت کے مرکزی سیکریٹری داخلہ وی پی مینن معائدہ الحاق پر بات چیت کے لئے سرینگر وارد ہوئے۔"

یہ ایک مسلمہ اور تاریخی حقیقت ہے کہ ان حملہ آوروں نے اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو روندنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور ان کے راستے میں جو کوئی بھی کھڑا ہوا، اسے اڑا دیا گیا۔ جب یہ حملہ آور بارہمولہ پہنچے تو انہوں نے وہاں بھی کہرام بپا کیا۔ اس واقع کی آنکھوں دیکھی داستان سناتے ہوئے بارہمولہ میں موجود عیسائی عالم جارج شنکس نے اگلے روز آل انڈیا ریڈیو کو بتایا تھا "27 اکتوبر کو صبح سویرے، جب ہم اپنی مذہبی رسومات سے فارغ ہوئے تو ہم نے پورے قصبے میں بلوائیوں کی چیخ و پکار سنی اور پھر آناً فاناً گولیاں چلنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا" نیو یارک ٹائمز کے نمائندے رابرٹ

ٹرمبل (Robert Trumbull) نے اس واقع کے بارے میں اپنی ایک رپورٹ میں لکھا

''مسعودی قبیلہ سے وابستہ ایک حملہ آور پارٹی نے صبح سویرے بارہمولہ میں سینٹ جوزف کانونٹ سکول کی دیواریں پھلانگ کر سرکاری ہسپتال اور چھوٹے گرجے پر حملہ بول دیا، انہوں نے چار ننوں (عیسائی راہباؤں) کے علاوہ وہاں موجود انگریز افسر کرنل ڈائکس اور اس کی بیوی کو بھی ہلاک کر دیا، اس فتح کا جشن بھی قبائلیوں نے اسی احاطے کے اندر منایا'' پرویز دیوان کے مطابق یہ انگریز جوڑا اس وقت ہسپتال میں اس لئے موجود تھا کہ مسز ڈائکس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔

بارہمولہ میں بلوائیوں نے عیسائی مشن کے ساتھ ساتھ خاص طور پر جن لوگوں کو نشانہ بنایا، ان میں نیشنل کانفرنس کے چند اہم ارکان بشمول محمد مقبول شیروانی بھی شامل تھے، شیروانی نے چونکہ قائد اعظم محمد علی جناح کے دورۂ کشمیر کے وقت ان کے خلاف مظاہروں کی قیادت کی تھی اور یہ خبریں متعدد اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھیں اس لئے شیروانی کی تلاش بلوائیوں نے بارہمولہ پہنچتے ہی شروع کر دی تھی۔ دیوان کے مطابق حملہ آوروں نے شیروانی اور متعدد این سی ارکان کو پکڑ لیا اور قتل کر دیا، ان میں شیروانی کے علاوہ این سی رکن ماسٹر عبدالعزیز بھی شامل تھے۔ شیروانی کو ایک لکڑی کی صلیب پر کیل ٹھونک کر پہلے لٹکایا گیا اور بعد میں اسے گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ اس مقام پر کشمیر کے بعض ''سیاسی مورخین'' کیا خیال ہے کہ مرحوم شیروانی نے حملے کے وقت دراندازوں کو بھٹکا دیا تھا اور وہ سرینگر پہنچنے سے رہ گئے تھے، اسی لئے انہوں نے اسے قتل کر دیا، اس دلیل کا نہ تو کوئی تاریخی حوالہ موجود ہے اور نہ ہی اس پر یقین کرنے کی کوئی وجہ، اول تو یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ شیروانی کو بارہمولہ میں ہی قتل کر دیا گیا، دوم یہ کہ بلوائی بھارتی فوج کے وارد کشمیر ہونے سے پہلے پٹن اور شالہ ٹینگ تک پہنچ چکے تھے، بھارتی فوج نے ان بلوائیوں کے ساتھ پٹن میں ایک خونریز مرکہ آرائی بھی کی، اگر بالفرض محال شیروانی نے انہیں بھٹکا دیا ہوتا تو پھر وہ اسے کسی ایسے مقام پر ہلاک کرتے، جہاں تک وہ انہیں لے گیا ہوتا، لہذا اس بات میں کچھ خاص دم نظر نہیں آتا، البتہ یہ بات ممکنات کے بہت قریب نظر آتی ہے کہ بلوائیوں نے انہیں انتقام گیری کے جذبے کے تحت قتل کر دیا تھا۔

شیخ محمد عبداللہ، جو 26 اکتوبر کو دلی گئے تھے، 27 اکتوبر کے روز بھارتی فوج کی سکھ رجمنٹ کو ساتھ لے کر وارد کشمیر ہوئے، ان کے ہاتھ میں مہاتما گاندھی کا لکھا ہوا ایک رقعہ بھی تھا، جس میں مہاراجہ ہری سنگھ کو ہدائت دی گئی تھی کہ چونکہ شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کا 'عارضی منتظم' مقرر کیا گیا ہے، اس لئے وہ انہیں ریاست کا چارج سونپ دیں۔ ریاست کے مہاراجہ کی باضابطہ دعوت اور دستاویز الحاق پر دستخط

کرنے کے بعد، قبائلی حملہ سے کشمیر کو بچانے کے لئے ایک طرف بھارتی فوج ریاست کے اس حصے میں داخل ہوئی تو دوسری طرف شمال مشرقی علاقہ گلگت اوربلتستان پر پاکستانی حکومت نے انگریزوں کی ایما اور منصوبے پر عمل کرتے ہوئے قبضہ کرلیا اور یہ علاقہ ہمیشہ کے لئے ریاست سے کٹ کر رہ گیا۔ گلگت اوربلتستان کو ریاست سے کاٹ کر پاکستان میں ضم کرنے میں انگریزوں نے کیا رول ادا کیا، اس کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے۔ پاکستانی قبضہ والے کشمیر سے 'پاکستان مخالف سرگرمیوں' کی وجہ سے جلاوطن کئے گئے سیاسی رہنماء سردار شوکت علی کشمیری اپنی تصنیف ''چناروں کے سائے میں'' (جو دراصل ان کے ایک انٹرویو پر مشتمل ہے اور راقم نے اسے اگست 2009ء میں ان کے دورۂ کشمیر کے دوران ''پکار'' کے لئے ریکارڈ کیا تھا، میں گلگت بلتستان کے حوالے سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں بتاتے ہیں...''وجہ یہ تھی کہ بلوچستان سے لے کر گلگت تک کے علاقے کی برطانیہ کے نزدیک ''سٹریٹجک'' یعنی جغرافیائی اہمیت تھی، اس لئے کراچی کو مرکز بنایا گیا...اور کشمیر میں قبائلی حملہ، جس کی منصوبہ بندی، صوبہ سرحد میں ہوئی تھی، کے پسِ پردہ بھی یہی وجوہات تھیں۔ اگر اس سلسلے میں برگیڈئر گھنسارا سنگھ کی ڈائری کو پڑھا جائے تو حقائق پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ گلگت بلتستان علاقہ جات کی وہ لیز، جو انگریزوں کے پاس تھی، جب 1935ء میں ختم ہوئی تو انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ اب وہ اس ملک سے جانے والے ہیں۔ اس لئے جب لیز کے خاتمے کے بعد (علاقہ ریاست کو واپس ملا تو) برگیڈئر گھنسارا سنگھ کو وہاں کا گورنر بنا کر بھیجا گیا (مہاراجہ کشمیر کی طرف سے) تو وہاں کے لوگوں نے جشنِ آزادی منایا، لیکن صرف تین دن بعد اس جشنِ آزادی کو بغاوت میں بدل دیا گیا اور اس طرح برگیڈیئر گھنسارا سنگھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ گھنسارا سنگھ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ یہ برطانیہ ہی تھا جس نے اس کے خلاف سازش کی اور میجر براؤن نام کا ایک انگریز حاکم، جسے بعدازاں پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز کا اعلیٰ سول میڈل بطور انعام دیا گیا، اس کی خدمات یہ تھیں کہ اس نے شمالی کشمیر کے یہ علاقے (گلگت وبلتستان) پاکستان کے سپرد کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میجر براؤن نے چلاس اور دیگر علاقہ جات کے دورے کے دوران وہاں کے لوگوں کو یہ کہہ کر ورغلایا تھا کہ آپ لوگ ایک ہندو راجہ کے ساتھ اس کے تسلط میں کیوں رہنا چاہتے ہیں، جبکہ ہم نے آپ کے لئے ایک اسلامی ریاست قائم کی ہے جہاں مسلمان نہایت عزت واحترام کے ساتھ رہ سکیں گے...گلگت سکاوٹس کو بھی ورغلایا گیا اور وہاں کا خزانہ انگریزوں نے مہاراجہ کے سپرد کرنے کے بجائے لوٹ لیا، جس کے نتیجہ میں وہاں ایک خوفناک ماحول پیدا ہوگیا اور بغاوت پھوٹ پڑی...مسئلہ کشمیر کی طویل تاریخ کے کسی بھی گوشے کو آپ چاہے کسی

بھی طرح دیکھ لیں اس کی پیدائش کے پسِ پردہ برطانوی نوآبادیاتی سازشوں کا ہاتھ کارفرما رہا ہے، کیونکہ برطانوی چاہتے تھے کہ جتنے بھی علاقے جغرافیائی اہمیت کے حامل ہیں، وہ سب پاکستان کے پاس ہی رہیں...اس وقت کیونکہ پاکستان میں جاگیردارانہ نظام تھا اور برطانوی تمام جاگیرداروں اور نوابوں کو تحفظ دیتے تھے...''

سردار شوکت علی کشمیری اس کہانی کا ایک پہلو بیان کرتے ہوئے جہاں اس سارے واقعے کی ذمہ داری انگریزوں کے سر ڈالتے ہیں اور انہیں گلگت بلتستان کی آزادی کی پائمالی کے لئے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، اور یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انگریز برصغیر سے چلے جانے کے بعد بھی اس خطے میں اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھنا چاہتے تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنی اگلی نسلوں کی مداخلت کے لئے گنجائش رکھنا چاہتے تھے، وہیں خود گلگت بلتستان کے لوگ اس حوالے سے کیا سوچتے ہیں، اس کے لئے وہاں کے مقامی مورخین کی تحریروں پر طائرانہ نگاہ دالنے کی ضرورت ہے۔ ایک مقامی کالم نگار (نورا) اپنے ایک انگریزی مضمون "Azadi Mubarak to Gilgit, Baltistan" میں چند نامور مقامی مورخین کی کتابوں کے حوالہ جات کے پس منظر میں رقمطراز ہیں'' گلگت بلتستان کے گورنر گھنسارا سنگھ کا گھر محاصرے میں تھا، گلگت سکاوٹس کے چاک و چوبند جوان انتہائی مسلح حالت میں تھے اور انہوں نے اس بات کو یقینی بنالیا تھا کہ گھنسارا سنگھ کسی بھی طور محاصرے سے بچ کر نہ جا پائے۔ گھنسارا سنگھ اکیلا تھا لیکن وہ بزدل نہیں تھا، وہ آخری دم تک سکاوٹس کے خلاف نبرد آزما رہا، جو اسے خودسپردگی کے لئے کہہ رہے تھے۔ سکاوٹس نے اسے رائے دی تھی کہ وہ رات کی تاریکی میں خاموشی سے باہر نکلے اور خود کو ان کے حوالے کردے، لیکن اس نے اس پیشکش کے جواب میں بلا کوئی وقت ضائع کئے ایک گولی چلادی، جو سپاہی آمر حیات کی چھاتی چیرتی ہوئی باہر نکل گئی اور اس طرح آمر حیات اس 'جنگِ آزادی' کا پہلا شہید بن گیا۔ جیسے ہی اس سپاہی کی شہادت کی خبر سکاوٹس کو ملی، انہوں نے اپنے حملے میں مزید تیزی لائی، کچھ ہی دیر بعد گھنسارا سنگھ کا سارا ایمونیشن ختم ہوگیا، وہ اپنے ہاتھ اٹھا کر باہر نکلا اور اسے گرفتار کرلیا گیا، یہ یکم نومبر 1947ء کی صبح تھی...'' کالم نویس نورا مقامی مورخین مرزا حسین کی کتاب ''شمشیر سے زنجیر تک'' شاہ خان کی کتاب ''سکاوٹ کی کہانی'' پروفیسر حسن دانی کے کئی مضامین اور انگریز حاکم میجر براؤن کی تحریر کردہ روداد کا حوالہ دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں'' اسلامی جمہوریہ گلگت کی آزادی کی بناء پڑ چکی تھی اور شاہ رئیس کو اس کا پہلا صدر بنایا گیا، گلگت سکاوٹس کی کمان بابر خان، احسان علی اور شاہ خان کے ہاتھ میں تھی، جبکہ ان کے ساتھ مہاراجہ کشمیر کی فوج میں شامل مسلم افسر اور سپاہی بھی آملے، جن میں

انتہائی کرشماتی خصوصیات کے مالک کرنل مرزا حسن خان، میجر درانی اور میجر جرال بھی شامل تھے۔ان لوگوں نے علاقے کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لیتے ہی ایک ''انقلابی کونسل'' کی تشکیل عمل میں لائی اور کرنل حسن خان کو''انقلابی سکاوٹس'' کا پہلا سپریم کمانڈر بنایا گیااور اس فورس کو تین کمپنیوں میں بانٹ دیا گیا، جن کے نام ٹائیگر، آئیبکس اور اسکیمو تھے ...یہ ایک معمولی موقعہ نہیں تھا...سکاوٹس نے جنگِ آزادی کو جاری رکھتے ہوئے فوری طور پر بونجی چھاونی کا رخ کیا...علاقے کے عوام ایک طویل غلامی کے خلاف سینہ سپر ہو چکے تھے اور حکومتِ پاکستان بھی بعد میں ان کی مدد کے لئے آ چکی تھی اور اس طرح سے ڈوگرہ افواج کو علاقے سے نکال باہر کر دیا گیا..... 72 ہزار مربع میل پر مشتمل علاقے کو آزاد کروالیا گیا تھا...اور وہ بھی ایک معمولی سی تربیت یافتہ نیم فوجی فورس (گلگت سکاوٹس) کی مدد سے ...اسی دوران کچھ مقامی رؤسا اور امراء کی درخواست پر پاکستان حکومت نے اپنے ایک 'نائب تحصیلدار' کو اپنے 'سیاسی نمائندے' طور پر علاقے میں بھیجا اور علاقے کی اس آزادی کو سلب کر لیا گیا، جو صرف پندرہ دن تک قائم رہ پائی، لیکن دکھ کی بات ہے کہ جس شخص کو اس علاقے کا پہلا صدر بنایا گیا تھا، اسے حکومت میں ایک چھوٹے سے عہدے پر تعینات کر دیا گیا اور اس نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی'' نورا اپنے مضمون کی اگلی سطور میں علاقے کی ابتر اور بدتر صورتحال کے بارے میں واویلا کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''علاقے کا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا فیصلہ آج بھی ایک سوالیہ بنا ہوا ہے، کیونکہ مرحوم جناح کے ساتھ ساتھ ان کے پیشرو پاکستانی حکمرانوں مثلاً بھٹو، ایوب خان، بے نظیر، اور مشرف کے وعدوں کے باوجود اس بدنصیب علاقے کی تقدیر آج تک نہیں بدل سکی اور ایسا لگ رہا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی قربانیاں رائگاں ہی چلی گئیں، نہ تو علاقے کے عوام کی بہبود کے لئے کوئی کام ہو رہا ہے اور نہ ہی ان کی قتدار میں زیادہ سے زیادہ شرکت کو یقینی بنایا جا رہا ہے، ہمیں وفاقی کابینہ میں نمائندگی حاصل نہیں ہے اور مقامی اسمبلی بھی ایک کٹھ پتلی سے زیادہ کچھ بھی نہیں.....

22

کشمیر.....

تلوار بازی سے افواہ بازی تک....

☆

وادی کشمیر.....اگر چہ ساری دنیا میں اپنی خوبصورتی اور یہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی کی وجہ سے مشہور رہی ہے لیکن ان دو چیزوں کے علاوہ ایک اور عنصر بھی یہاں کے لوگوں میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے، جس کے لئے کشمیری عوام جانے جاتے ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کشمیریوں نے اپنی بہت سی لڑائیاں اسی عنصر کی بدولت جیتی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اس ''خصوصیت'' یا ہتھیار سے کشمیر کے لوگوں نے کئی بار اپنے بیرونی شمنوں کو بھی ڈرایا اور اندرونی طور بھی بہت سے معرکے سر کئے اور اس ہتھیار کا نام ہے ''افواہ بازی'' کشمیر میں جب کبھی بھی حالات خراب ہوئے، افواہ بازی کا بازار بھی گرم ہوا اور اس فن میں کشمیریوں نے ایسی مہارت کا مظاہرہ کیا کہ ساری دنیا انگشت بدنداں حیرانی سے ہمارا منہ تکتی رہ گئی۔ یہ افواہ بازی کبھی ''برم برم چوک'' کی صورت میں جاری رہی، کبھی ''بھوت'' کی صورت میں اور مسلح تحریک کے آغاز کے ساتھ کشمیریوں نے اس فن کو ایک بالکل ہی نرالے انداز میں اپنایا۔ مسلح جوانوں کے ساتھ چونکہ تحریک کے آغاز میں عوام کو سخت ہمدریاں تھیں اس لئے افواہ بازی ان کے حق میں اور فورسز کے خلاف ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر اگر کسی عام آدمی سے کسی جھڑپ کے بارے میں پوچھا جاتا تو جواب ہوتا کہ ''مجاہدین نے ایک فوجی چوکی پر گھات لگا کر حملہ کیا، سات دن تک جھڑپ جاری رہی، جس میں فوجی کیمپ پوری طرح تباہ ہو گیا، ایک سو فوجی مارے گئے، ساری بیرکیں جل کر تباہ ہو گئیں، تین سو فوجی سخت زخمی ہیں، جن میں سے زیادہ تر شدید زخمی ہیں اور ان میں سے خال خال ہی کوئی بچ سکتا ہے، تاہم سارے مجاہدین صحیح سلامت محاصرے سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے جبکہ وہ جاتے جاتے مردہ فوجیوں کے ہتھیار بھی اپنے ساتھ لے گئے وغیرہ وغیرہ'' اس طرح کی افواہوں سے کشمیری عوام نے بھارت کے خلاف نصف سے

زیادہ ''جنگ'' آزادی جیت لی تھی، جبکہ ان سے متاثر ہوکر ان کشمیری جوانوں نے بھی ہتھیار اٹھا لئے جو گھر سے باہر نکلنے سے بھی گھبراتے تھے، تاہم یہ بات الگ ہے کہ انہوں نے ہتھیار لا کر فوج کے سپرد کردیے اور لڑنے یا معرکے جیتنے والے جانباز تھوڑے ہی ثابت ہوئے۔ البتہ اس افواہ بازی کا فائدہ یہ ہوا کہ بھارتی افواج کی تعداد کشمیر میں سات لاکھ سے زیادہ تجاوز کرگئی اور ابھی تک اس کی یہاں موجودگی بھارت کے لئے سفید ہاتھی ثابت ہورہی ہے۔ اسی طرح ساٹھ کی دہائی میں بھی کشمیر میں آتشزنی کی مسلسل وارداتوں کے پیچھے اگرچہ سیاسی جماعت (این سی) کے مفادات پوشیدہ تھے لیکن اس عمل کو بھی کشمیری عوام نے 'بخوبی' انجام دیا اور دورانِ شب مکانات پر سنگباری اور آتشزنی سے سینکڑوں عمارتوں کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ خوف و دہشت کا سماں بھی قائم کیا گیا۔ اسی طرح چرارِ شریف محاصرے کے دوران (سال 1995-96) میں بھی مست گل کے حوصلے بڑھانے کے لئے اس 'ہتھیار' نے کافی سہارا دیا۔ محاصرے پر تعینات فورسز کی تعداد کو بڑھایا گیا اور مست گل کے ساتھیوں کی تعداد کو گھٹایا اور ان کی جانبازی اور جنگی مہارت کو بلند کیا گیا، اس عمل سے لوگوں کے حوصلے بلند ہوئے اور انہوں نے مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اس واقع کو عالمگیر سطح پر پبلسٹی دلائی۔ نتیجے کے طور چرارِ شریف کی ساری بستی جل گئی اور مست گل پاکستان چلا گیا، جہاں پہنچتے ہی کشمیر کے اس ''سپر ہیرو'' کو وہاں کی حکومت نے گرفتار کرلیا۔ (وجوہات نامعلوم)

1947ء میں تقسیمِ ریاست کے وقت جب ایک طرف ریاست کا آدھا حصہ پاکستان نے چھین لیا اور اسے 'آزاد کشمیر' کا نام دے دیا اور دوسرے حصے کو بلوائیوں سے بچانے کے لئے شیخ محمد عبداللہ بھارتی افواج کو لے کر کشمیر لوٹے تو دوسری جانب کشمیر کا الحاق بھارت اور پاکستان کے ساتھ کرنے کے حوالے سے بھی افوہ باز سرگرم ہوگئے، حالانکہ اس موقعہ پر افواہ باز اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے کچھ خود ساختہ کہانیاں گھڑ کر انہیں صوفیاء اور اولیائے کرام سے منسوب کردیا۔ اس عمل کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ چونکہ کشمیری عوام کو اولیائے کرام کے ساتھ بے حد عقیدت ہے اور ان سے منسوب کسی بھی کہانی پر عوام کا اعتماد کرنا ازبس لازمی ہے۔ مختلف تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جو کہانیاں سامنے آتی ہیں، ان کے مطابق جب شیخ محمد عبداللہ بھارتی فوج کو لے کر سرینگر پہنچے تو اسی کے ساتھ نیشنل کانفرنس اور شیخ کے حامیوں نے الحاقِ ہند کو مضبوطی عطا کرنے کے لئے طرح طرح کی کہانیاں بنا کر عوام میں مشہور کردیں۔ ان کہانیوں کا پلاٹ کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ ان میں مذہبی جذبات کو بھی شامل کرلیا جاتا اور ان پر عمل کرنا عوام کے لئے ایک طرح کا ''مذہبی فریضہ'' بن جاتا۔ مثال

کے طور پر غلام احمد میر کی کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' اور پرویز دیوان کی کتاب ''کشمیر'' سے چند اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں۔

غلام احمد میر لکھتے ہیں ''ایک طرف شیخ محمد عبداللہ بھارت کے ساتھ ناطہ جوڑنے کے لئے کوشاں تھے تو دوسری طرف بعض بھارت نواز افواہ باز بھی پوری طرح سرگرم ہوگئے۔ انہوں نے طرح طرح کی کہانیاں بنا بنا کر عوام کے مذہبی جذبات اور عقائد کے ساتھ کھلواڑ کا سلسلہ شروع کر دیا تاکہ سادہ لوح کشمیری عوام پر باور کرایا جاسکے کہ بھارت کے ساتھ کیا جانے والا الحاق کشمیر کے اولیائے کرام کی مرضی سے ہو رہا ہے اور چونکہ کشمیر میں اولیائے کرام کے تئیں عوام کے عقائد کافی راسخ اور مضبوط ہیں، اس لئے افسانے تراش کر انہیں اولیائے کرام کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا'' میر پرویز دیوان کی کتاب سے ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''تحریک پاکستان کے آغاز کے ساتھ ہی کشمیر کے چپے چپے میں یہ بات پھیل گئی کہ 1944ء میں ایک دن کشمیر کے سارے اولیائے کرام بجبہاڑہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے کشمیر کے بارے میں گفت وشنید کی اور اس کے مستقبل کا نقشہ پیش کیا۔ اس نقشے میں کشمیر کو پاکستان کا حصہ دکھایا گیا تھا، (قصے کے مطابق) اسی دوران علماء اور اولیاء کی اس مجلس میں حضرت مخدوم صاحبؒ حاضر ہوئے اور انہوں نے یہ نقشہ پھاڑ کر پھینک دیا، کیونکہ بقولِ ان کے یہ مخدوم صاحب ہی تھے، جنہوں نے کشمیر کو بھارت کے ساتھ جوڑنے کے لئے مغل افواج کو کشمیر بلوایا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

اسی طرح کی ایک اور خود تراشیدہ کہانی کچھ اس طرح تھی:

1947ء کے اکتوبر مہینے میں جب بھارتی فوجیں کشمیر آچکی تھیں تو انہی صوفیائے کرام نے ایک اور خصوصی نشست بلائی،، جس میں کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ملانے کے بارے میں غور وخوض کیا گیا، جلسے میں شمس الدین پاندانیؒ، محی الدین اندرابیؒ اور میر غلام محی الدینؒ وغیرہ اولیاء شامل تھے، کافی غور وخوض کے بعد جب مسئلے کا کوئی حل نہ نکلا تو پاندانی صاحبؒ نے اپنی علمی طاقت (یا جادو) کے ذریعے عالمِ ارواح سے حضرت مخدوم صاحبؒ کو بلوایا اور ان سے کوئی ترکیب پوچھی، (افواہ باز) کہتے ہیں کہ مخدوم صاحب جلسہ گاہ میں حاضر ہوئے اور شرکائے اجتماع کو جھنڈیاں اور ٹوپیاں دے کر کہا کہ وہ سرینگر کے عید گاہ میں جا کر دیکھیں اور جو لوگ انہیں وہاں سب سے پہلے ملیں، یہ ٹوپیاں اور جھنڈے ان کو دے دیں۔ چنانچہ بقولِ ان کے عید گاہ میں بھارتی فوجی موجود تھے اور جب یہ لوگ ٹوپیاں اور جھنڈیاں لے کر وہاں پہنچے تو انہوں نے یہ چیزیں ان کو تھما دیں، اس طرح کشمیر کا الحاق بھارت کے

ساتھ پکا کر دیا گیا..... (دروغ برگردنِ روای)

میر غلام احمد ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں" یہ قوم غلامی میں کتنی خوش رہتی ہے کہ اس کے حصول کے لئے کوششیں بھی کرتی ہے اور ایسی ایسی جھوٹی کہانیاں گھڑ کر عوام کے جذبات اور عقائد کو مجروح کرتی ہے، جن کا تعلق اولیائے کرام سے ہوتا ہے... اللہ تعالیٰ ایسے افواہ بازوں کو ہدائت بخشے...

میر بھارتی افواج کی کشمیر آمد کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں "المختصر یہ کہ 29 اکتوبر 1947ء کو ہندوستان کی پہلی سکھ رجمنٹ کشمیر میں داخل ہوئی اور انہوں نے حملہ آوروں کے ساتھ کئی مقامات پر دوبدو جنگ چھیڑ دی، 30 اکتوبر کو شیخ محمد عبداللہ کو ایمرجنسی انتظامیہ کا انچارج بنا دیا گیا اور مہاتما گاندھی نے ہری سنگھ کو ہدائت دی کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کو قتدار سونپ دیں۔ اسی سال دسمبر کی 25 تاریخ کو کرسمس کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا" پاکستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا تھا لہٰذا کشمیری حکمرانوں اور عوام کی درخواست پر ہندوستان کو وہاں اپنی فوج بھیجنا پڑی، لیکن ہماری نیت کشمیر پر قبضہ کرنے کی نہیں ہے اور یہ ایک عارضی اقدام ہے، اس لئے جب وہاں امن وامان قائم ہو جائے گا تو وہاں کے عوام کو یہ موقعہ دیا جائے گا کہ وہ الحاقِ ہند کی توسیع، تنسیخ یا تصدیق کریں"

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کشمیر میں حملہ آوروں اور بھارتی افواج کے درمیان جنگ جاری تھی اور انہوں نے صوبہ جموں میں مسلمانوں کا قتلِ عام، سرحدی علاقوں میں زبردستی ہجرت اور نقلِ مکانی کا سلسلہ جاری رکھا، جبکہ ہوائی فوج کی بمباری کا قہر... آہ و بکاہ اور کشت وخون کا ایک لامحدود سلسلہ ریاست کے کونے کونے میں جاری تھا لیکن اس کے باوجود مہاتما گاندھی کو کشمیر میں "روشنی کی کرن" دکھائی دی تھی"

مہاراجہ کے افرادِ خانہ نے کشمیر سے بھاگتے ہوئے بانہال سے جموں تک آہ وزاری اور ماتم شروع کر دیا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور بال کھول کر بین شروع کر دیئے، جس کے ردِعمل میں جموں کے فرقہ پرست ہندوؤں نے ہزاروں مسلمانوں کا لہو بہا دیا۔ بٹوٹ اور خونی نالہ آج بھی ان خون آشام واقعات کی گواہی دے رہا ہے۔ میر کے مطابق کشمیر میں امن بھی قائم ہوا، بلوائی (قبائل) بھی واپس چلے گئے لیکن مہاتما گاندھی کا وہ وعدہ آج تک پورا نہیں ہوا، حالانکہ بعد میں کشمیر کے سیاست دانوں نے اس وعدے کو بگاڑنے اور بھارت کا قبضہ مضبوط کرنے میں خود بھی اہم رول ادا کیا، اس پر اگلی اقساط میں تفصیلاً روشنی دالی جائے گی

1947ء کے واقعات کے بارے میں اگرچہ کشمیر صوبے یا پھر وادی کشمیر میں کافی کچھ لکھا گیا ہے اور سرینگر کے مرکزی مقام ہونے کی وجہ سے یہاں مورخین کی موجودگی ان حالاات کو قلمبند کرنے میں معاون ثابت ہوئی لیکن صوبہ جموں کے حالات صفحہ ہائے قرطاس سے اس وجہ سے بھی غائب رہے کیونکہ وہاں آباد پڑھے لکھے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور جو باقی لوگ یہاں بچ گئے، وہ کئی دہائیوں تک خود کو نہ سمبھال سکے اور جب وہ ہوش میں آئے، تب تک کافی دیر ہو چکی تھی، میر رغلام احمد اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں ''ہندوستانی افواج نے جموں کے مسلم اکثریتی علاقہ جات میں، جہاں کافی عرصہ سے حریت پسند اور پاکستانی افواج قابض تھیں، اترتے ہی قہر نازل کر دیا، جو کوئی بھی سامنے آیا، اسے گولی سے اڑا دیا گیا یا گلا کاٹ دیا گیا۔ مکانات اور تعمیرات کو پوری طرح خاکستر کر دیا گیا، پونی بھارک سے لے کر پونچھ منڈی تک کے ایک وسیع وعریض علاقے کو پوری طرح تباہ کر دیا گیا۔ چند لوگ جو ہجرت نہ کر سکے تھے، تباہی اور ہولنا کی کے یہ مناظر دیکھ کر وہ بھی بھاگ نکلے، جہاں پیدل فوج نہ پہنچ سکی، وہاں ہوائی جہازوں نے بم گرائے، جس کے باعث ہزاروں بے گناہ اور معصوم لوگ موت کا نوالہ بن گئے۔ بھارت کے دیگر علاقوں میں پھیلے ہوئے فسادات جب ریاست جموں و کشمیر میں داخل ہوئے تو یہاں (جموں) کے مسلمانوں کو بھی مال و جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ عزت وعصمت لٹ کر رہ گئی، سینکڑں خواتین کو مالِ غنیمت سمجھ کر اغوا کر لیا گیا اور ان کی عزت کو تار تار کیا گیا، اس کے جواب میں مسلم اکثریتی علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو بھی قتل وغارت گری کا نشانہ بننا پڑا، کئی ایک کو مذہب تبدیل کرنا پڑا اور دیگر مظالم کا شکار ہونا پڑا، اس ساری صورتحال کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں پلنے والا صدیوں کا پیار، محبت، بھائی چارہ اور آپسی تال میل کا کچھ ہی دنوں میں کباڑہ ہو گیا۔ حدتو یہ ہے کہ اس رنجش اور کشیدگی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا رہا۔

23

تقسیم برصغیر

بھارت کے دو ٹکرے ہوئے تو کشمیر کے پانچ!

ریاست جموں وکشمیر کے پانچ صوبے یا یوں کہیں کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کی پانچ ریاستیں برصغیر کی تقسیم (بھارت کی آزادی اور انگریزوں کی پسپائی) کے ساتھ ہی بندریا کی اُن معصوم بچوں کی طرح منتشر ہوگئیں جسے یا تو شیر جھپٹ لیتا ہے یا پھر ہوس کی آگ میں جلنے والا بندر اُٹھا لیجاتا ہے۔ بندر کی ہوس دیکھ کر کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو بندر کی اولاد قرار دینے والے ڈاروِن نے سب سے پہلے اپنے اس فرسودہ اور بے سر و پاء فلسفے یا تصوّر کو کسی بندر کی طرف سے اپنی بندریا پر ڈھائے جارہے مظالم سے متاثر ہوکر ہی اپنے دماغ (یا پھر تحت الشعور) میں جگہ دے دی ہوگی۔ اور پھر یہ خیال اُس کو ایسا دامن گیر ہوا کہ اُس نے اس کو سچ ثابت کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی ضائع کر دی۔ کیونکہ بندر بالکل ایک اَن پڑھ اور غیر مہذب انسان کی طرح اپنی بندریا پر ظُلم ڈھاتا ہے اور اُسے اپنے پاؤں کی جوتی بنا کر رکھتا ہے، اسی بے بس بندریا کے پانچ بے سہارا بچوں کی طرح ریاست جموں وکشمیر کے یہ صوبے بھی بکھر گئے، منتشر ہوکر رہ گئے اور انھیں سنبھالنے والا کوئی نہ بچا۔ بندریا کے بچے صرف اپنی ماں کے بچے ہوتے ہیں، کبھی کوئی بندر اپنے بچوں کو پہچانتا ہے اور نہ ہی اِن کی پرورش میں (انسان کی طرح) حصہ لیتا ہے۔ لیکن شاید بندروں کے آخری چشم و چراغ ڈارون کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ انسان باپ اپنے بچوں کیلئے کماتا ہے، اُنھیں کھلاتا پلاتا ہے، اُن کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر دھیان دیتا ہے اور اُن کیلئے مکان، زمین، جاگیر اور اثاثے اکٹھے کرتا ہے۔ جبکہ بندر باپ ہمیشہ اپنی اولاد کا دشمن بنا رہتا ہے۔

بہر حال تقسیم برصغیر کے ساتھ ہی ریاست کے لئے اکتوبر 1947ء کا مہینہ اس بات کیلئے سب سے منحوس اور سیاہ ترین ثابت ہوا اور صرف اکتوبر کے وسط سے لے کر نومبر کے وسط تک بھارت اور پاکستان نے اس کے پانچ صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ جیسا کہ ایک گزشتہ قسط میں بتایا گیا کہ نومبر

1947ء کے اوائل میں مہاراجہ کشمیر کے مقرّر کردہ گورنر برائے گلگت وبلتستان بریگیڈئر گھنسارا سنگھ نے جب انگریزوں سے یہ صوبہ واپس حاصل کیا اور اس کی آزادی کا اعلان کیا تو پاکستان پر پہلے سے ہی مائل بہ کرم انگریزوں کو یہ بات ناگوار گزری۔...1 انہوں نے جغرافیائی اعتبار سے اس اہم ترین پہاڑی اور ٹھنڈے علاقے کو پاکستان کے ساتھ ملانے کیلئے سازش رچی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ میجر براؤن کو اس سازش کی کامیابی کیلئے ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ دوسری طرف ریاست کے ایک حصے پر (مہاراجہ ہری سنگھ کے بقول) اپنے تربیت یافتہ آفریدی دراندازوں کے ذریعے مظفر آباد پر قبضہ کر کے اسے آزاد کشمیر کا نام دے دیا گیا۔ (حالانکہ یہ عملی طور پر پاکستان کا پانچواں صوبہ ہی رہا)۔ دوسری طرف مہاتما گاندھی نے اس وعدے کے ساتھ کشمیر، لداخ اور جموں میں اپنی فوجیں داخل کی تھیں کہ یہاں امن وامان کے قیام کے ساتھ ہی عوام کو ''رائے شماری'' کا موقعہ دیا جائے گا۔ لیکن دو نوں ممالک بخوبی جانتے تھے (اور جانتے ہیں) کہ اِن پانچوں صوبوں کو اپنے قبضے میں رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس تنازعے کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں کبھی بھی قیامِ امن کی کسی بھی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ لیڈر بکتے رہے، سیاست منتشر ہوتی گئی اور لوگ آپس میں لڑتے رہے ساتھ ہی دونوں کا قبضہ بھی قائم رہا

گلگت اور بلتستان کے بارے میں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ یہ صوبہ معاہدۂ امرتسر کے تحت سکھوں نے انگریزوں کو بطور لگان سونپ دیا تھا۔ لیکن جب لگان کی رقم ڈوگروں نے چکا دی تو انگریزوں نے یہ صوبہ 1846ء میں ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو دے دیا جسے باقی ریاست بھی فروخت کر دی گئی تھی۔ اس معاہدۂ کے تحت انگریزوں نے گلاب سنگھ کو کشمیر، لداخ اور بلتستان کے علاقہ جات دیئے جبکہ جموں سے ہماچل تک کا علاقہ پہلے سے ہی اُن کے پاس تھا، اس طرح گلگت اور بلتستان ریاست کا حصہ بنا۔ لیکن کچھ ہی دہائیاں گزرنے کے بعد انگریزوں اور اُن کے خیالی دشمن، روس کے درمیان ایک زبردست کھیل کا آغاز ہوا۔ انگریزوں نے از خود یہ سوچ رکھا تھا کہ روس کبھی نہ کبھی جنوبی ایشاء کے پورے خطے پر قابض ہونا چاہے گا اور وہ اپنے حملوں کی شروعات گلگت، بلستان اور اس سے ملحقہ شمالی علاقہ جات سے کرسکتا ہے۔ دوسری جانب گلگت کے مشرق میں بھی چین نام کا ایسا ہی ایک اور پڑوسی ملک موجود تھا، جہاں روس اور بھارت کے بارے میں ایسی ہی سوچ پائی جاتی تھی اور چین بھی گلگت و بلتستان کی جغرافیائی اور جنگی اہمیت سے نہ تو بےخبر تھا اور نہ ہی بےحس۔ انگریزوں نے اسی تصّور کے تحت مہاراجہ کے شمالی علاقہ جات میں مداخلت شروع کردی اور ''گلگت ایجنسی'' کا قیامِ عمل میں لایا۔ جس کی

رُو سے انگریزوں نے اس علاقے پر نگاہ رکھنے کیلئے اپنے ایک سیاسی ایجنٹ کے قیام کی گنجائش پیدا کر لی۔ یہ سلسلہ 1913ء تک اس حد تک پہنچ گیا کہ انگریزوں نے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے اس حصے میں ''گلگت سکاوٹس'' کے نام سے چھ ہزار افسروں اور جوانوں پر مشتمل اپنی ایک مضبوط فوج تیار کر لی جسے اس ''سیاسی ایجنٹ'' کے تابع کر دیا گیا۔ یہ ایک نیم فوجی فورس تھی اور اس علاقے کے سات بادشاہوں کے بیٹے ان کے کمانڈر تھے۔لیکن ایک ویب سائٹ (Geocities) کے مطابق 1911ء میں یہ بات واضح ہوگئی کہ اس علاقے میں ایسا کوئی درّہ موجود نہیں ہے جس کے ذریعے روس اپنی فوجیں داخل کر کے ہندوستان یا جنوبی ایشیاء پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

پرویز دیوان کے مطابق ''بھارت اور پاکستان کی آزادی اور تقسیم سے تقریباً پندرہ دن قبل برٹش ایجنٹ نے اِس علاقے کا چارج بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کو سونپ دیا۔اُس وقت میجر ولیم براؤن گلگت سکاوٹس کا کمانڈنٹ تھا۔ براؤن ایک انگریز آفیسر تھا اور اُس نے یہ ذمہ رضا کارانہ طور لیا تھا کہ وہ یہ علاقہ ازخود نئے آزاد حکمرانوں کے سُپرد کرے گا۔اس لئے اُس نے قبل از وقت ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ یہ نئے حکمران کون ہوں گے۔کیمبرج یونیورسٹی کی تحقیق کے مطابق براؤن اور اُس کے ماتحت کمانڈر میتھی سن (Mathieson) نے منصوبہ بنایا تھا کہ وہ گلگت سکاوٹس کی مدد سے ایک ''بغاوت'' کا ڈرامہ کر کے پہلے اس علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیں گے اور پھر اسے پاکستان کو دے دیں گے۔(بحوالہ سینٹر آف ساوتھ ایشین سٹیڈیز، ہینڈلسٹ آف پیپرس گیرٹ Centre of south Asian studies/Handlist of papers Garrett)

میجر براؤن، ایک پیشہ ور دیانتدار فوجی آفیسر نہیں تھا،اُس نے یا تو اپنے دِل میں بد دیانتی پال رکھی تھی یا پھر اپنے آقاؤں کے اشاروں پر کام کرتا تھا،اُس کے بارے میں گلگت کے مورخ قطب الدین عزیز کا کہنا ہے ''سکاٹ لینڈ کا یہ دلیر فوجی آفیسر ''پاکستان'' کا سخت حامی تھا اور اُسے پٹکے باندھنے والے ڈوگروں، خاص طور پر مہاراجہ ہری سنگھ اور اُس کے سرینگر میں موجود حواریوں (چمچوں) سے سخت نفرت تھی۔ڈوگرہ مخالف بغاوت (گلگت ایجنسی) میں میجر براؤن نے اگرچہ ڈوگروں کے خلاف محض آواز بلند کی لیکن ڈوگروں کے اس ازلی دشمن نے قراقرم کی سفید چوٹیوں سے لے کر گلگت بلتستان، ہنزہ نگر پنیل تک کے علاقوں کو پاکستان کی جھولی میں ڈالنے میں اصل مدد کی۔اور یہ سارا کام سال 1947ء کے موسمِ خزان (نومبر) میں اپنی تکمیل کو پہنچا'' دی ڈان'' کراچی/مورخہ 4ستمبر 2002ء)

پرویز دیوان میجر براؤن کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''اُس نے 1947ء کے ماہ اگست کے اوائل سے ہی گلگت بلتستان کے گورنر گھنسارا سنگھ اور مہاراجہ ہری سنگھ پر واضح کر دیا تھا کہ اُن کیلئے یہی بہتر ہوگا کہ وہ ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کر دیں۔ اُس کا ماننا تھا کہ گلگت بلتستان، ہنزہ، نگر اور چترال کے مسلم اکثرتی علاقوں کا پاکستان کے ساتھ جانا ضروری تھا اور اگر ایسا ہو جائے تو اُسے یقین تھا کہ اس سے یہاں کے عوام بہت خوش اور مطمئن ہوں گے، کیونکہ اس خطے کے لوگوں کی امن پسندی اور مذہبی رواداری کی ایک لمبی تاریخ تھی اور اُنھیں ڈوگروں یا کسی غیر مسلم سے کوئی نفرت بھی نہیں تھی۔ پاکستان کے ایک دفاعی مبصر کرنل یحیٰی لکھتے ہیں کہ ''کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی خبر کا اس علاقے میں کوئی سنجیدہ نوٹس نہیں لیا گیا، یعنی اس کی وجہ سے یہاں کوئی مذہبی یا فرقہ وارانہ تناؤ پیدا نہیں ہوا۔''

اسی دوران والیٔ سوات نے چلاس پر حملہ کر دیا۔ جبکہ چترال کے راجہ نے کوہ گیز راور کوہ یاسین پر قبضہ کرنے کیلئے اپنی بھاری فوج کو جھونک دیا۔ میجر براؤن نے سکاوٹس کو حکم دیا کہ وہ برگیڈئر گھنسارا سنگھ کو حراست میں لے لیں (شاید اُسے تحفظ دینے کیلئے) کیونکہ یکم نومبر 1947ء کو میجر براؤن نے اعلان کیا تھا کہ اس علاقے میں ہندوراج ختم ہو گیا ہے اور گلگت نے اپنا مستقبل پاکستان کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور اس کام کے بعد پاکستان نے اپنے اس غم خوار سپاہی کو نظر انداز نہیں کیا اور اُسے ''ستارۂ پاکستان'' کے اعزاز سے نوازا گیا (پرویز دیوان/صفحہ نمبر 95/96)

داناؤں نے انتہائی غور وخوض کے بعد اور اپنے تجربے کی بنیاد پر کہا ہے کہ جب کسی گھر کا مالک، کسی قوم یا گروہ کا سردار یا پھر کسی ملک کا حاکم اتنا کمزور اور بے پرواہ ہو جائے کہ اُسے اپنے بُرے دنوں میں پڑوسیوں پر انحصار کرنا پڑے تو اُس گھر، قوم یا ملک کا بکھرنا، منتشر ہو جانا اور صفحۂ ہستی سے مٹ جانا اُس کا مقدر بن جاتا ہے۔ کشمیر کا مہاراجہ عین اُس موقعہ پر جب اُس کی سلطنت پر چاروں طرف سے دُکھ کے بادل منڈلا رہے تھے، سرینگر میں محض چند شورش پسندوں کی سرگرمیوں میں پھنس کر رہ گیا تھا اور اُسے پائین شہر کے جلوسوں اور پتھراؤ کے چند واقعات نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اُسے اپنی سلطنت کی اُن دور دراز اور وسیع وعریض مگر دشوار گزار سرحدوں پر ہونے والی پڑوسیوں اور دشمنوں کی سازشوں اور سرگرمیوں کے بارے میں نہ تو کچھ علم تھا اور نہ ہی اس بارے میں سوچنے کی فرصت۔ اُس نے ہمالہ اور قراقرم کی چوٹیوں کو ہی بقولِ علامہ اقبال ''پاسبان'' سمجھ رکھا تھا اور بے فکر ہو گیا تھا۔ بمبہ اور کھکھہ (یا

کھوکھر)افواج نے اُسے کئی بار اپنے پیروں تلے لتاڑا لیکن اُسے کوئی احساس نہ ہوا۔آفریدی چھاپہ مار محض چند گھنٹوں میں سارے مظفرآباد پر قابض ہوگئے اور وہ دلی سے فوجوں کی آمد کا انتظار کرتا رہا، گلگت اور بلتستان میں اُس کے گورنر کو سازش کر کے گرفتار کر لیا گیا، اُس کی سلطنت کے ایک اچھے خاصے اور زرخیز حصے کو کاٹ کر پاکستان کے حوالے کر دیا گیا اور وہ اُس وقت بھی کچھ نہ کر پایا۔ اچانک اور بے موسم کی برسات نے اُس کی ساری سلطنت میں طغیانی بپاء کر دی لیکن وہ تنکوں کا سہارا ڈھونڈ تا رہا۔ ایک ایسا راجہ، جس نے اپنی سلطنت کے دارالخلافہ سے باہر نکل کر سرحدوں کا دورہ کرنے یا وہاں کے حالات جاننے تک کی کوشش نہ کی ہو، اُس کے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ بندریا کے بچوں کی طرح اُس کی سلطنت کے حصے بھی بکھرے ہو جائیں اور منتشر ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ ایسے حالات میں جبکہ ہوائی، حملہ آور اور چھاپہ مار اُس کے سر پر آن پہنچے، اُس نے مقابلہ کرنے کے بجائے عوام کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اپنے آبائی وطن (جموں) کی راہ لی اور اُس کے اِس اقدام کے ردِعمل میں جموں صوبے میں ہزاروں لوگ دھنگوں اور فسادوں کا نوالہ بن گئے۔ بھارت کی تقسیم ہوئی تو اس کے محض دو ٹکرے ہوئے لیکن ریاست جموں وکشمیر کے پانچ صوبے تین حصوں میں بٹ گئے۔ اِن حالات میں جو کچھ ہوا، وہ لازمی بھی تھا اور قدرتی بھی لیکن چہار سو کی مخالفت، احتجاج اور ناراضگی کے باجود جس شخص نے عزم، جواں مردی اور حوصلے کا مظاہر کر کے باقی تین صوبوں کو دست برد ہونے سے بچایا اور کم از کم کشمیر اور کشمیریت کی لاج رکھی، اُس کا حق بنتا تھا کہ وہ اس طوفان وطغیان کے عالم میں شیرِ کشمیر بن کر اُبھرے اور قوم نے اُن حالات میں اگر شیخ محمد عبداللہ کو یہ خطاب عطاء کیا تو وہ اس کے واقعی مستحق بھی تھے۔ تاہم وہ اِس عزم وارادے میں کہاں تک کامیاب رہے اور لوگوں کی توقعات پر کہاں تک کھرے اُترے، اِس کا فیصلہ آگے کے حالات کریں گے، اس حوالے سے توپ، تلوار، راکٹ اور مزائل تو اپنا نشانہ خطا کر سکتے ہیں یا کسی کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اُسے معاف کر سکتے ہیں لیکن ''نوکِ قلم' ایک ایسا ہتھیار ہے' جو کسی کو معاف نہیں کرتا۔ ہلاکو، چنگیز خان، ابولہب، راون اور فرعون کو ولی اللہ قرار دینے کا مطلب اِن کے مخالفین کی عظمت، سچائی اور حق پرستی سے انکار کرنا ہے اور ایسا کرنے والا کوئی دیانتدار قلم کار نہیں ہوسکتا۔ ہاں ضمیر فروش اور زرخرید منشی ضرور ہوسکتا ہے! ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کرنے کی شرط پر بھارتی افواج کشمیر میں داخل ہوگئیں، شیخ محمد عبداللہ کو ''کام چلاؤ منتظم'' بنا دیا گیا، تاہم معاہدۂ الحاق کی رُو سے ہری سنگھ بدستور'' مہاراجہ'' رہا۔ لیکن اُس کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، اس کے بدلے ریاست میں آئین ساز اسمبلی وجود میں آئی، جس کی تشکیل 15/نومبر 1952ء کو عمل میں لائی گئی۔ تاہم شخصی

راج'' پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس اسمبلی نے بھی مہاراجہ کے بیٹے'' کرن سنگھ'' کو'' یوراج'' یعنی ولی عہد مقرر کیا اور اسے صدرِ ریاست بنایا گیا، ڈاکٹر کرن سنگھ اس عہدے پر 9/اپریل 1965ء تک قائم رہے، اس کے بعد مرکز نے اپنی مداخلت کی کاروائیوں کو جاری رکھتے ہوئے صدرِ ریاست کا عہدہ ختم کردیا اور وزیراعظم کی کُرسی بھی ختم کردی۔ صدر کی جگہ مرکز کا نمائندہ (بالکل اُسی طرح جیسے کہ گلگت میں کبھی انگریز ایجنٹ ہوا کرتا تھا) گورنر بن کر آگیا اور وزیراعظم کا سائز کاٹ کر وزیرعلیٰ کردیا گیا۔ یہ بات اور ہے کہ مرکز نے ڈاکٹر کرن سنگھ کو ہی پہلا گورنر بھی مقرر کیا اور وہ اس عہدے پر 1967ء تک قائم رہے۔ اس طرح کسی نہ کسی صورت میں جو ڈوگرے 1846ء میں کشمیر کو انگریزوں سے خریدنے کے بعد مہاراجے بن کر کشمیر میں داخل ہوئے تھے۔ 1967ء تک یہاں کے اقتدار منصبِ اقتدار پر قائم رہے۔ لیکن ابھی کشمیر کی تاریخ 1948ء کے آس پاس رُکی ہوئی ہے کیونکہ ریاست بٹ چکی ہے، بھارت نے کشمیریوں کے 'مال وجان کے تحفظ' کا ذمہ اپنے سر لے لیا ہے اور اس حوالے سے بہت کچھ ہونا باقی ہے۔

---

[1] پاکستان پر انگریز مائل بہ کرم نہیں تھے بلکہ انھوں نے کھوکھلا پاکستان بنایا، انگریزوں نے مسلمانانِ برصغیر کو تین ملکوں میں بانٹ دیا بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان جبکہ انگریزوں نے ہی مسلم ڈسٹرکٹ گورداسپور کو ہندوستان کے حوالے کرکے بھارت کو دلی اور سرینگر کے درمیان راستہ فراہم کیا تھا...ف م ح

24

موجودہ جنگ بندی لائن کن مجبوریوں کے تحت قبول کی گئی؟

ہند کی عظیم سرزمین بھارت اور پاکستان نام کے دوحصوں میں بٹ گئی اور ایک بہت بڑی ریاست جموں وکشمیر تین حصوں میں بٹ کر ان دونو زائدہ ممالک کے پنجوں میں پھنس چکی تھی اور اس کے باوجود لوگ خوش تھے کہ انہیں تقریباً دوصدیوں کے بعد انگریز سامراج کی غلامی سے نجات ملی تھی، اتنی بڑی اور بری غلامی بھارت یا پھر برصغیر کے اس خطے نے، جسے بیرونی دنیا کے لوگ 'سونے کی چڑیا' کے نام سے جانتے تھے، اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، بھارت پر مسلم حکمرانوں نے محمد بن قاسم کے حملے 714ء سے لے کر بہادر شاہ ظفر 1857ء تک (تقریباً 1143 سال) حکومت کی، اور یہ دور بھارت کی اس سرزمین کے لئے سب سے زیادہ بہترین اور سنہرا دور گردانا جاتا ہے کیونکہ اگرچہ پہلے پہل چند ایک مسلم حملہ آوروں نے بھارت پر اس لئے حملے کئے کہ ان کا نشانہ یہاں کا سونا اور دیگر خزائن تھے، لیکن بعد کے مسلم حملے بھارت کو لوٹنے کے لئے نہیں بلکہ اس ملک کو اسلامی خلافت میں شامل کرنے کی غرض سے اور اس پر دین اسلام کا جھنڈا لہرانے کے لئے کئے، ان حملوں میں نہ تو خزانے لوٹے گئے اور نہ ہی قتل وغارت گری ہوئی سوائے اس کے کہ جو ان سے ٹکرایا، اسے راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس دوران مسلم حکمرانوں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی رہی کہ انہوں نے رجواڑوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے اس بھارت، جس کے حکمران ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے، کوسری لنکا سے تبت تک ایک خوشحال اور طاقتور ملک بنائے رکھا، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان لوگوں کو اپنے ہوش کے ناخن لینے چاہیں، جو مسلمانوں پر علیحدگی پسندی کا الزام عائد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کا کبھی بھی یہ نعرہ یا منشور نہیں رہا ہے کہ وہ اللہ کی اس سرزمین کی چھاتی پر لکیریں ڈال ڈال کر اسے ریزہ ریزہ کریں بلکہ اسلامی خلافت کا تقریباً ایک ہزار سالہ دور اس بات کا گواہ ہے کہ مسلمانوں نے ان سرحدوں کو تقریباً تقریباً دنیا کے نقشے سے مٹا ہی دیا تھا۔ لیکن مصطفیٰ کمال اتاترک نے مغربی مشیروں

کے بہکاوے میں آ کر خلافت کی قبا کو چاک کر کے مسلمانوں کے ماتھے پر ایک بدنماء داغ لگا دیا، جس کے لئے شائد ہی اللہ اسے کبھی معاف کرے۔

بہر حال بات ہو رہی تھی کشمیر کی تقسیم کی، انگریزوں نے جاتے جاتے بھارت کے دو ٹکڑے کئے اور کشمیر کے تین، ایک حصہ بھارت کے زیر قبضہ آ گیا اور دوسرا پاکستان کے ہاتھ لگ گیا جبکہ پاکستان نے انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر کے گلگت اور بلتستان کو بطور تحفہ پاکستان کو دے دیا، لیکن اس عظیم اور وسیع ریاست کی سرحدوں کو بدلنے کے باوجود بھی وہ اس کے مشترکہ کلچر، تہذیب و تمدن اور خاص طور پر اس کی منفرد شناخت کو نہیں بدل سکے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی میر پور سے لے کر اسکردو تک اور لیہہ سے لے کر لکھنپور تک کی اس منقسم دھرتی پر رہنے والے لوگ خود کو کشمیری تصور کرتے ہیں اور اس دوران وہ اپنی اپنی مذہبی شناخت کو بھی ایک لمحے کے لئے بھول جاتے ہیں اور کوئی یاد بھی رکھتا ہے تو اس حد تک کہ وہ ایک مسلم کشمیری ہے، ہندو کشمیری ہے یا پھر بودھ کشمیری ہے لیکن اس دوران بھی وہ اپنی وطنی شناخت سے غافل نہیں ہو پاتا۔ دو بڑے اور طاقتور مما لک کی خاردار دیواروں کی موجودگی کے باوجود آج بھی ایک حصے کا کشمیری دوسرے حصے کے کشمیری سے ملنے، اس سے بات کرنے اور اس کا حال چال جاننے کے لئے ہمہ وقت بے چین اور بیقرار رہتا ہے اور میں یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ وطنیت کے معاملے پر اگر چہ بھارت کی منقسم ریاست پنجاب، راجستھان اور گجرات نے صبر کر کے اسے اپنا مقدر سمجھ لیا لیکن صرف اور صرف کشمیر ہی ایک ایسی ریاست ہے، جہاں کے لوگوں نے 1947ء کی تقسیم کو نہ تو دل سے تسلیم کیا اور نہ ہی دماغ سے، جس کا ثبوت آج بھی اس ریاست میں عسکری، سیاسی اور سفارتی جدوجہد کی شکل میں موجود ہے اور اسے ساری دنیا تسلیم بھی کر رہی ہے۔...1

1947ء کے الحاق کے مطابق بھارت نے کشمیری عوام کے مال و جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لیا تھا، جبکہ پاکستان نے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ "معاہدۂ قائمہ" پر دستخط کرنے کے باوجود ریاست کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر کے اسے آزاد کشمیر کا نام دے دیا، اس طرح سے دیکھا جائے تو بھارت کی یہ ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ ریاست کے ان حصوں کو پاکستان سے آزاد کروا کر ریاست کی تقسیم سے پہلے کی پوزیشن کو بحال کروائے تا کہ اس کے بعد یہاں اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق استصوابِ رائے (رائے شماری) کروانے کی راہ ہموار ہو سکے، لیکن بھارت چونکہ اپنے زیرِ قبضہ علاقے پر قابض رہنا چاہتا تھا اور پاکستان اپنے حصے کو سارا کشمیر سمجھ بیٹھا تھا اور اسے نہیں کھونا چاہتا تھا، اس لئے دونوں ملکوں نے چار چھوٹی، بڑی جنگوں کے باوجود ایک دوسرے کی سرزمین کے اندر داخل

ہونے یااس پر اپنا حق جتلانے کی کوشش نہیں کی۔اس حوالے سے پرویز دیوان لکھتے ہیں:

''کشمیر کے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ بھارتی افواج نے کشمیر میں داخل ہوتے ہی یا پھر اس کے بعد کشمیر کے ان حصوں کو پاکستان سے واپس کیوں نہیں لیا، جن پر اس نے جبری قبضہ کرلیا تھا، اس حوالے سے ایک خاص سیاست دان (شیخ محمد عبداللہ) کا نام لیا جاتا ہے، لیکن یہ بات اس آدمی پر منحصر ہے جو اس حوالے سے بات کر رہا ہو، مثال کے طور پر مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں رہنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ اس پار والے حصے میں لوگوں کی اکثریت پہاڑی بولنے والوں کی تھی، اس لئے یہ سیاست دان نہیں چاہتا تھا کہ وہ کشمیری بولنے والوں پر حاوی ہو جائیں، لہٰذا جب بھارتی افواج موجودہ لائن آف کنٹرول پر پہنچیں تو انہیں مزید پیش قدمی سے روک دیا گیا۔ کیونکہ ڈر یہ تھا کہ پہاڑی، ڈوگرے اور گوجر لوگ چونکہ تقریباً ایک جیسی سماجی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے وہ مل کر 'اصل کشمیری' عوام پر حاوی ہو جاتے اور کشمیری اقلیت میں تبدیل ہو کر رہ جاتے، اس لئے اس مخصوص سیاست دان نے اسی میں بھلائی جانی کہ جو علاقہ جات پاکستان کے پاس ہیں، انہیں اسی کے پاس رہنے دیا جائے، کیونکہ وہ چاہے کچھ بھی تھے لیکن کم از کم کشمیری بولنے والے نہیں تھے'' (کشمیر/پرویز دیوان/صفحہ نمبر 98)

یہ سنسنی خیز انکشاف اگرچہ پرویز نے بڑے حوصلے اور ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی کتاب میں پہلی بار کیا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی یہ شکوہ اُس پار کے لوگوں کے ساتھ ساتھ اس پار آباد ان لوگوں کے دلوں میں، جو کشمیری زبان نہیں بولتے، ہمیشہ موجود رہا ہے، جس کی گواہ اس وقت بھی کشمیر کو منقسم کرنے والی ''عارضی جنگ بندی لائن'' ہے، حالانکہ اُس پار کے بعض کشمیریوں کا بھی یہ خیال ہے کہ پاکستانی افواج اگر 1947ء میں دیانت داری کے ساتھ پیش قدمی کرتیں تو وہ با آسانی سارے کشمیر پر قبضہ کر سکتی تھیں، کیونکہ بقولِ ان کے تقسیم کے وقت مہاراجہ خوابِ خرگوش میں محو تھا اور اندرونِ کشمیر کی صورتحال بھی اس کے خلاف تھی، اس لئے اگر ''قبائلی حملہ'' ایک منصوبہ بند طریقے سے کیا گیا ہوتا تو سارے کشمیر کو پاکستان میں شامل کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی، ان کا کہنا ہے کہ پاک افواج جنگ بندی سے قبل پونچھ، راجوری، جھنگڑ اور چھمب سیکٹروں میں نہایت کامیابی کے ساتھ پیش قدمی کر رہی تھیں اور یہاں کے ایریا کمانڈر میجر جنرل اکبر خان پر اس وقت گویا بجلی گر پڑی جب پاکستان نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا، یہ وہ وقت تھا، جب پاک افواج جموں شہر کے بہت قریب تھیں۔ یہاں تک بھی کہا جاتا رہا ہے کہ اکبر خان نے اس وقت پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والی جنگ بندی کو نظر انداز کر کے کشمیر میں اپنی جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کام میں اس کے کچھ خاص فوجی

کمانڈر بھی اس کے ساتھ تھے،لیکن جنرل ایوب خان، جو بعد میں فیلڈ مارشل بنا، نے ان کی یہ کوشش ناکام بنادی، نتیجتاً جنرل اکبر خان اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا اور ان کا کورٹ مارشل بھی کیا گیا۔لیکن بھارت کے ایک سرکردہ مورخ سی داس گپتا کا نظریہ مختلف ہے،ان کا کہنا ہے کہ اس سارے کام کے لئے نہ تو شیخ محمد عبداللہ تنہا ذمہ دار تھے اور نہ ہی پنڈت جواہر لال نہرو بلکہ وہ بھارت کے پہلے گورنر جنرل لارڈ ماونٹ بیٹن اور انڈین ائرفورس اور فوج کی دیگر شاخوں میں موجود انگریز افسروں، جو کہ آزادی کے بعد بھی چند سال یہاں تعنات رہے، کو بھی برابر اس کے لئے ذمہ دار (مجرم) ٹھہراتے ہیں،اس نظریے سے یہ متھ بھی جھوٹ ثابت ہوجاتی ہے کہ کشمیر پر بعض قبائل نے اچانک ہی حملہ کردیا تھا۔سی داس گپتا کا کہنا ہے کہ جواہر لال نہرو اس بات پر مصر تھے کہ جنگ کے دوران پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر کے علاقوں میں اہم فوجی ٹھکانوں کا مواصلاتی نظام تباہ کردیا جائے،لیکن بھارتی فوج کے انگریز کمانڈر ان چیف جنرل لوکھارٹ اس ضد پر اڑے رہے کہ ایسا کرنا اگلے بہار کے موسم تک ممکن نہیں ہوسکتا کیونکہ پونچھ اور راجوری کے پہاڑی علاقوں سے راستے کھل جانے تک ''قبائل'' کو باہر نکالنا ناممکن ہے،علاوہ ازیں انگریز فوجی افسروں نے ان علاقوں میں ائرفورس استعمال کرنے کے معاملے میں بھی بھارت کی اس وقت کی حکومت کا ساتھ نہیں دیا،اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت زیادہ تر پائلٹ انگریز تھے اور انگریزوں کا جھکاؤ شروع سے ہی پاکستان کی طرف تھا اس لئے وہ اپنے پائلٹوں کو اس خطرناک علاقے میں بھیج کر ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے(اس دلیل سے کم از کم شیخ محمد عبداللہ کو پہاڑیوں کے الزامات سے بچنے کا ایک معمولی سا موقعہ ضرور ملتا ہے)....2

اس حوالے سے اگر چہ مزید تحقیق اور بحث کی ضرورت اور گنجائش باقی ہے لیکن ایک اخبار کے محدود کالموں میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس طرح کے حساس اور تاریخی نوعیت کے معاملات کی تہہ تک پہنچا جاسکے،لہذا اس تحقیق یا نکتہ نظر کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔تاریخ نویسی بھی داستان گوئی کی ہی ایک شاخ ہے اور یہ داستان گو پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کسی کہانی کو کس انداز میں اور کس پیرایئے میں بیان کرتا ہے،ہم نے بھی جو کچھ سنا، وہی بیان کیا اور اگر اس پر کسی کو اعتراض ہو تو اسے اپنی صفائی یا نکتہ نظر پیش کرنا چاہیے کیونکہ اس کا تعلق ایک قوم کے ساتھ ہے۔

یکم جنوری 1948ء کو بھارت نے مجبور ہوکر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے رجوع کیا اور اپنی درخواست میں کہا کہ عالمی ادارہ پاکستان کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ بھارت کے قبضہ میں ریاست کے اس حصے میں مداخلت بند کردے اور وہاں سے اپنی سپاہ واپس منگوالے،جس پر اس نے ایک سازش

کر کے قبضہ کر لیا ہے، جبکہ 5 مارچ 1948ء کے روز شیخ محمد عبداللہ کو ریاست جموں وکشمیر کے پہلے وزیر اعظم کا حلف دلایا گیا، حالانکہ وہ 25 اکتوبر 1947ء سے ہی ریاست کے عارضی منتظم تھے۔ ادھر پاکستان نے اپنے سپاہیوں کی امداد واعانت کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے 5 مارچ 1949ء تک انہیں بھارتی افواج کے ساتھ مصروفِ جنگ رکھا، یعنی بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے معاملے پر ہونے والی پہلی جنگ اکتوبر 1947ء سے جنوری 1949ء تک کے ایک سال چار ماہ تک جاری رہی۔ حالانکہ بھارتی افواج نے پونچھ، راجوری، کٹھوعہ، کرگل اور لیہہ کے کئی علاقوں کو پاکستانی فوجیوں سے واپس چھین لیا لیکن انہیں وادی کشمیر میں کوئی خاص کامیابی نہیں ملی، اس سے ایک اور بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ بھارتی افواج کے ساتھ تقریباً ۱۶۔ ماہ تک جنگ وجدل کرنے والے لوگ محض قبائیل نہیں ہو سکتے تھے، جو پاکستانی حکومت کی اعانت کے بغیر بھارت کی باضابطہ افواج کے ساتھ لڑ رہے تھے بلکہ اس دوران پاکستانی افواج باضابطہ طور اس جنگ میں شامل ہو چکی تھیں اور انہوں نے پوری ریاست پر اپنا جھنڈا لہرانے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن یکم جنوری 1949ء کو بھارت اور پاکستان اقوامِ متحدہ کی مداخلت سے جنگ بندی کے معاہدے پر راضی ہو گئے۔ اس معاہدۂ جنگ بندی کا مطلب یہ تھا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ریاست کے جن حصوں کی وجہ سے جنگ وجدل جاری ہے اور جو حصے پاکستان کے زیر قبضہ تھے، وہ اسی کے زیر انتظام رہے حالانکہ اس سے قبل اقوام متحدہ کے مبصرین، بھارت اور پاکستان کے درمیان طے پانے والے پہلے معاہدہ مجریہ 13 اگست 1948ء کی رو سے پوری متنازعہ ریاست کے فساد زدہ حصوں کو بھارت اور پاکستان کے مشترکہ انتظام میں اس لئے دے دیا گیا تھا کہ 'یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا حل بھارت اور پاکستان کو باہمی طور پر نکالنا چاہیے بالالفاظ دیگر یہ دونوں ملکوں کے درمیان یہ ایک حل طلب مسئلہ ہے۔ اس موڑ پر، اس چھوٹے سے نکتے پر اگر چند لمحوں کے لئے غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اقوام متحدہ کا عالمی ادارہ بھی تقسیم برصغیر کے وقت برطانیہ یا پھر مغرب کے کافی زیر اثر تھا، یا پھر دوسری جنگِ عظیم کی مار نے یورپ کو اندر ہی اندر اتنا کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ محض اپنی سیکورٹی کے لئے دنیا کے سینے پر کچھ ایسے رینگتے ہوئے سانپ موجود رکھنا چاہتا تھا، جو ضرورت پڑنے پر اس کے کام آسکیں، اسی لئے انہوں نے ایک منصوبہ بند طریقے سے برصغیر کو تقسیم کروایا اور بعد میں دونوں کو ساری عمر الجھائے رکھنے کے لئے کشمیر جیسے تنازعات کو بھی خود ہی جنم دیا اور پھر انہیں زندہ رکھنے کا سامان بھی کیا۔ ادھر بھارت عالمی ادارے میں از خود کشمیر کا کیس لے کر گیا اور اس ادارے کے فیصلے یا مداخلت کا انتظار کرتا رہا، لیکن ادھر پاکستان ایک منصوبہ بند طریقے سے اپنا کام کرتا رہا، اس نے ریاست کے''

حاصل شدہ'' حصوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے انہیں تین زونوں میں بانٹ دیا۔ جنوبی علاقہ جات، جن کی سرحدیں بھارتی اضلاع پونچھ، راجوری اور بارہمولہ کے ساتھ لگتی تھیں، انہیں 'آزاد کشمیر' کا نام دے دیا، اس نے (بقولِ پرویز دیوان) کرگل ضلع کا ایک اچھا خاصا حصہ چین کو دے دیا تا کہ اس کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حمائت حاصل کر سکے، جبکہ ریاستِ جموں و کشمیر سے کاٹے گئے تیسرے حصے (گلگت اوربلتستان) کو پاکستان ''شمالی علاقہ جات'' کا نام دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔3؎

1.. ؎ یہ صحیح نہیں ہے، کوئی ڈوگرہ اپنے کو ڈوگرہ کشمیری نہیں کہتا اور نہ ہی کوئی لداخی خود کو کشمیری لداخی کہتا ہے۔

..2... کشمیر کا معاملہ پنڈت نہرو نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا، اور پٹیل وغیرہ سے کہہ دیا تھا کہ یہ معاملہ میں خود دیکھوں گا .فوج بھیجنے اور روکنے کے اختیارات بھی نہرو نے اپنے ہاتھ میں رکھے تھے، شیخ عبداللہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی کہ وہ ہندوستانی افواج کو اوڑی کے مقام پر روک لیتا.... میرا خیال ہے، صحیح یا غلط کہ پنڈت نہرو، وزیراعظم ہند اور لیاقت علی وزیراعظم پاکستان دونوں ہی U P کے تھے، جب ہندوستانی افواج کوہالہ کی جانب گامزن تھیں، لیاقت علی خان نے پنڈت نہرو کو یہ پیغام بھجوایا'' کیا تم مجھے وزیراعظم کی کرسی سے ہٹانا چاہتے ہو؟ حالانکہ ہم دونوں دوست رہ چکے ہیں'' پنڈت نہرو نے سوچا کہ آگے بڑھنا ہند کو مشکلات میں ڈالے گا اور ہند کے لئے گلگت اوربلتستان میں لڑنا مشکل ہو جائے گا، اس لئے سوچا کہ فوج کو روک لیا جائے.. نفسیاتی طور پر شیخ محمد عبداللہ طالب علمی کے زمانے سے ہی پنجابیوں کے خلاف تھے، جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں شیخ کو ''ہتو'' کے نام سے پکارا جاتا تھا اور انہوں نے FSC کے دو سال بہت اذیتوں کے درمیان گزارے، لاہور داخلے کے لئے گئے تو دیکھا کہ وہاں بھی کشمیریوں کو ''ہتو'' کے حقارت انگیز نام سے پکارا جاتا تھا، انھیں لگا کہ پنجابی خواہ وہ جموں کا ہو یا پنجاب کا، کشمیریوں کو ہتک آمیز نگاہوں سے دیکھتا تھا... اس کا نفسیاتی اثر ہمیشہ شیخ صاحب پر رہا۔ ان کو ڈر تھا کہ اگر کشمیر پاکستان کے ہاتھ لگ گیا تو یہی پنجابی کشمیر کی ساری زمین خرید کر کشمیر پر قابض ہو جائیں گے اور کشمیریوں سے بیگار لیں گے... پنجابیوں کی اسی خصلت کی وجہ سے بنگلہ دیش بنا اور اسی خصلت نے پاکستان میں سندھی، بلوچ اور پختون تفکرات کو بھی جنم دیا...

3؎ یہ پروپگنڈا ہے کہ پاکستان نے یہ علاقہ چین کو دے دیا، یہ علاقہ پاکستان کے پاس کبھی تھا ہی نہیں، وہ چین کو کیا دیتا، چین نے پہلے لداخ کے اردگرد اپنی سرحدیں استوار کر لیں تھیں اور اکسائی چن کے ساتھ ساتھ اس علاقے پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ (ف م ح)

25

رائے شماری

اوراقوامِ متحدہ کی قراردادیں!

کشمیر میں پچھلے 22 برسوں یعنی عسکری تحریک کے آغاز سے جس بات کو مسئلہ کشمیر کا بنیادی نکتہ اور محور بنا کر بہت شور شرابہ کیا جا رہا ہے اور جس بنیاد پر بھارت سے کہا جا رہا ہے کہ وہ کشمیر سے اپنی افواج باہر نکال کر اس مسئلہ کے حل کے لئے ماحول تیار کرے، وہ بنیادی نکتہ ہے اقوامِ متحدہ کی کشمیر مسئلہ کے حوالہ سے تقریباً ایک درجن قراردادوں کا، جے کے ایل ایف سے لے کر حزب المجاہدین اور پیپلز کانفرنس سے لے کر عوامی ایکشن کمیٹی تک میدان میں سرگرم ایسی کوئی بھی کشمیری تنظیم نہیں، جو اس نکتے کو اپنی جدوجہد کی بنیاد بنا کر بھارت سے مطالبہ نہ کرتی ہو کہ ان قراردادوں کی رو سے ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا تعین ہونا ابھی باقی ہے اور اس کو انہی قراردادوں کے تناظر میں حل کیا جائے۔ بات صحیح ہے اور حق بجانب بھی لیکن ان قراردادوں کی رو سے ریاست میں بھارت اور پاکستان پر اس عالمی ادارے نے کیا کیا شرائط عائد کر رکھی ہیں اور اس حوالے سے خاص طور پر پاکستان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور رائے شماری سے قبل اس ملک کو کیا کیا اقدامات کرنے ہوں گے، اس بارے میں شائد کسی نے سوچنے کی بھی کوشش نہیں کی اور اگر اقوامِ متحدہ کل ریاست میں رائے شماری کے لئے تیار بھی ہو جاتا ہے تو کیا واقعی پاکستان اس کے لئے تیار ہوگا اور انہی قراردادوں کے تحت ریاست میں بھارت کے لئے وہ ماحول سازگار کرنے میں معاون ثابت ہوگا بھی ہے یا نہیں؟...اگر اس حوالے سے 5 جنوری 1949ء کی قرارداد پر نظر ڈالی جائے تو اس بارے میں پاکستانی اخبار ''دی ڈان'' کراچی میں شائع پاکستان کے سرکردہ مبصر اور صحافی ایم۔ پی۔ بھنڈارا کے ایک مضمون کی ان سطور کا بغور جائزہ لینا کافی سود مند ثابت ہوسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں مندرجہ ذیل باتیں درج ہیں، مثلاً یہ کہ پاکستان اس علاقے (جموں و کشمیر) سے اپنی افواج، بشمول اپنے ان مجاہدین، جنہیں کہ قبائل قرار دیا جاتا رہا ہے، پوری طرح سے واپس بلائے گا۔ بھارت اپنی کم سے کم

فوج یہاں رکھے گا اور رائے شماری بھی بھارت کے ہی زیرِ انتظام کروائی جائے گی اور یہ 'کم سے کم' بھارتی فوج اقوامِ متحدہ کے اس سٹاف کی مدد کرنے کے لئے ریاست میں موجود رہے گی، جو یہاں رائے شماری کے عمل کو تکمیل تک پہنچائے گا، تو کیا یہ ممکن ہے کہ حکومت پاکستان اس بات کی، ان شرائط کے تحت اجازت دے سکتی ہے؟ اس لئے ہم (پاکستان) کو ان قراردادوں کو مسترد کر دینا چاہئے، خاص طور پر ان کی موجودہ حالت میں'' (دی''ڈان'' کراچی، پاکستان، اگست 1999ء)

ریاست کے ایک سابق بیوروکریٹ اور مورخ پرویز دیوان اسی مضمون کے تناظر میں اپنی کتاب 'کشمیر' میں لکھتے ہیں:

''یہ وہ دن تھے کہ اگر ریاست میں رائے شماری کرائی گئی ہوتی تو اس کا نتیجہ پوری طرح سے بھارت کے حق میں آیا ہوتا لیکن پاکستان اس بات کو اچھی طرح سے جانتا تھا، اس لئے اس نے سب سے پہلے اس عمل کو روکنے کے لئے اپنے زیرانتظام علاقے سے نہ تو اپنی افواج کو نکالا اور نہ ہی قبائل کو بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے قبضے کو مزید تقویت اور استحکام دیتا رہا، اس کے بعد اس نے ریاست کو پانچ حصوں میں بانٹ دیا (حالانکہ پاکستانی مبصر نے صرف چار علاقوں کا ذکر کیا ہے) وہ شمالی علاقہ جات گلگت، بلتستان اور 'آزاد جموں و کشمیر کو ایک ہی حصہ قرار دیتا ہے، حالانکہ ہنزہ نام کا ایک چھٹا علاقہ بھی ہے، جسے پاکستان نے 1947ء میں اپنے اندر ضم کر لیا تھا''

ادھر ایک اور مورخ Alastair lamb، جو کہ پاکستان نوازی اور بھارت دشمنی کے لئے جانے جاتے ہیں، بھی اس بات پر متفق ہیں کہ اگر اس جھگڑے کے ابتدائی ایام میں کشمیر اور جموں کے عوام کو رائے شماری کا موقعہ دیا گیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ ریاست میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کبھی بھی پاکستان کے حق میں ووٹ نہ دیتی البتہ عین ممکن ہے کہ اس مقابلے میں بھارت کو زیادہ ووٹ ملے ہوتے۔ Lamb اس حوالے سے ابتدائی ایام میں پیش آنے والے کئی اہم واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اکتوبر 1947ء میں معاہدہ قائمہ پر دستخط کرنے کے باوجود پاکستان نے ریاست پر حملہ کیا اور کئی علاقوں پر قبضہ کر کے عوام کی مرضی کے خلاف ان پر قبضہ جاری رکھا، اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں عائد شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ریاست کو دوبارہ متحد کرنے میں رکاوٹیں پیدا کیں اور شمالی علاقہ جات کو اپنے اندر ضم کر لیا جبکہ اکسائی چن اور شاکسگام علاقہ جات کو پاکستان نے

ہی چین کو دے دیا، اس طرح سے Lamb پاکستان کے حامی ہونے کے باوجود انہیں ریاست کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے اور اپنے زیر انتظام علاقوں پر قبضہ جاری رکھنے کا الزام عائد کرتے ہیں۔

تقسیم سے پہلے ریاست جموں و کشمیر کے رقبے کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ریاست 32,2,236 مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی (دیوان کے مطابق 2,22,236 مربع کلومیٹر) اور اتنا بڑا علاقہ اس وقت ایسے چھ حصوں میں منقسم ہے، جن کو از سرِ نو متحد کر کے اپنی پرانی شکل میں لانا تقریباً تقریباً ناممکن ہے، (اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے) اس عمل کے لئے یکسوئی کے ساتھ کشمیری عوام کی ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے لیکن سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ کشمیری سیاست کی کشتی عجیب و غریب گرداب میں پھنسی ہوئی ہے، کسی کی نظر بھارت پر ہے، کوئی پاکستان سے امیدیں لگائے بیٹھا ہے اور کوئی چین سے، جبکہ ان لوگوں کی بھی کمی نہیں جو آسمانی امداد کی امیدوں پر زندہ ہیں اور اگرچہ اصل حقیقت بھی یہی ہے لیکن اس کے لئے علامہ اقبال کے 'جوابِ شکوہ' کا بغور مطالعہ کر کے اپنے اعمال کا احتساب کرنا بھی لازمی ہے۔ اس وقت پاکستان کے قبضہ میں ریاستِ جموں و کشمیر کا 78,114 مربع کلومیٹر کا رقبہ ہے، اکسائچن نامی برفانی علاقے کا 37,555 مربع کلومیٹر علاقہ 1962ء کی جنگ کے دوران چین نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور بھارت اقوامِ عالم کے سامنے کشمیریوں کے مال و جان کی حفاظت کا ذمہ لینے کے باوجود یہ قبضہ نہ چھڑا سکا۔ اس میں سے بھی شاکسگام کا 5,120 کلومیٹر علاقہ ایسا ہے، جسے مبینہ طور پاکستان نے ازخود چین کے حوالے کر دیا ہے جبکہ اس وقت بھارت کے زیر قبضہ ریاست کا 447, 101 مربع کلومیٹر حصہ ہے۔ ادھر صحافی اور مورخ پی جی رسول اپنی کتاب 'مملکت کے آخری ایام' میں اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ ''بقولِ اے جی نورانی پاکستان نے شمشال وادی میں مزید 700 مربع میل کے رقبے پر قبضہ کر رکھا ہے، اور اصل مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان نے کسی بھی علاقے کی وہ ہیئت باقی نہیں رہنے دی ہے، جو کہ اگست 1947ء سے پہلے تھی، تاکہ بعد کی قراردادوں پر عمل کروانا ناممکن بن جائے''

پاکستانی مبصر بھنڈارا نے اس جغرافیائی الجھن پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن قراردادوں کی ہم لوگ دہائی دے رہے ہیں، ان کی ہوا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کب کی نکل چکی ہے۔ علاوہ ازیں 1947ء سے اب تک ریاست کی علیٰحدگی پسند قیادت اور کشمیریوں کے مطالبہ حقِ خودارادیت کی حمائت کرنے والا پاکستان صرف اور صرف ان قراردادوں کا ذکر اپنے بیانات کی حد تک ہی کرتا آیا ہے ان میں سے، بشمولِ پاکستانی حکومت اور قیادت کے، کوئی بھی

اب تک اقوامِ متحدہ کی فائلوں میں بند پڑی ہوئی ان قراردادوں کی دُھول صاف کروانے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکا ہے اوراس طرح عالمی ادارے(UN) کےاصولوں کے حساب سے یہ قراردادیں 'سردخانے' میں سڑ رہی ہیں اور بےاثر ہوچکی ہیں۔

کشمیر کی تاریخ کسی بھنور، گرداب یا سراب سے کم نہیں، اس میں غوطہ لگانے والا شخص ہر قدم کے ساتھ گہرائی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اوراس کے کنارے اور سرحدیں بھی ہر لمحے کے ساتھ ساتھ وسیع اور دراز ہوتی جاتی ہیں، خاص طور پر تقسیمِ برصغیراوراس کے بعد کے حالات میں اس قدر الجھاؤ اور مخمصہ پایا جاتا ہے کہ اس سے باہر نکلنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستانی حملہ، بھارت کے ساتھ الحاق اوراس کے بدلے اس کی افواج کا ریاست میں داخلہ، پاکستان کے ایک وسیع علاقے پر قبضہ اور اقوامِ متحدہ کی ہدایات کے باوجود انہیں خالی نہ کرنا، بھارت کی طرف سے کشمیری قیادت کو انتشار اور اندرونی چپقلش میں مبتلا کر کے اپنے علاقوں پر قابضہ قائم رکھنا اوراس قبضے کو استحکام بخشنے کے لئے یکے بعد دیگرے، قیادت کو اقتدار کی نیلم پری کا رقص دکھانا اوراب عوامی تحریک کو بزورِ بازو دبانے کے لئے خون خرابہ جاری رکھنا، یہ سب ایسے مرحلے ہیں، جن کو پیش کرتے ہوئے ایک مورخ یا قلمکار کو فولاد کے چنے چبانے پڑتے ہیں، خاص طور پر اس قیادت کا تذکرہ، جو ابھی تک مصروفِ عمل ہے، میرے حساب سے اور بھی زیادہ مشکل مرحلہ ہوگا، لیکن قلم کسی کا رشتہ دار یا دشمن نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی مصلحت کو تسلیم کرتا ہے، تاہم موجودہ مخمصے سے باہر نکلنے کے لئے ایک بار پھر سے 1948ء کے اوائل کی طرف جانا ہوگا، جب ریاست کی ترجمانی کرنے کے لئے بھارت، پاکستان اور جموں کشمیر کے نمائندے پہلی اور آخری بار اقوامِ متحدہ کے اس ایوان میں اکٹھے ہوئے تھے، جس میں کشمیر کی ترجمانی اس وقت کے وزیرِاعظم شیخ محمد عبداللہ نے کی تھی۔ سیکورٹی کونسل کے اس اجلاس میں اس وقت شیخ محمد عبداللہ کی تقریر کا جو مواد اس وقت دستیاب ہے، اس کے مطابق انہوں نے اپنے ایک طویل خطاب کا آغاز کچھ اس طرح کیا تھا:

> ''میں نے اس اجلاس کے دوران پاکستانی ڈیلی گیشن کے ممبران، بھارتی ممبران اوراپنے ہمراہ آئے ڈیلی گیشن کے ممبران کے بیانات کو انتہائی غور اور نہایت صبر کے ساتھ سنا اور ان پر غور بھی کیا، میں نے کونسل کے اس ایوان میں ہورہے سارے مباحثے کو بھی غور سے سنا...اور یہ سب سننے اوراس پر سوچنے کے بعد مجھے کچھ تذبذب بھی ہورہا ہے، کیونکہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ آخر جھگڑا کس بات پر اور اختلاف کس نکتے پر ہے اور کیوں ہے؟ اور جیسا کہ پاکستانی مندوب نے

ساری بات اس نکتے پر ختم کی ہے کہ مسئلہ کشمیر کی وجہ سے ریاست کے مہاراجہ کا وجود خطرے میں پڑ رہا ہے، میں اس بات کو نہیں مانتا کیونکہ یہ ہمارا بنیادی نکتہ ہے ہی نہیں۔سیکورٹی کونسل کے روبرو اس وقت ریاست کی انتظامیہ میں پائی جانے والی خرابیاں نہیں ہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ریاست نے قانونی اور آئینی طور پر بھارت کے ساتھ الحاق کیا ہے، ریاست کی دوسری طرف سے قبائلی حملہ آور میری مملکت میں داخل ہو گئے ہیں، پاکستانی حکومت نے ان کی پہلے بھی مدد کی ہے اور اب بھی کر رہا ہے، جس کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے درمیان ٹکراؤ کے سامان پیدا ہو رہے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ پاکستانی نمائندے کی طرف سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کا ملک نہ تو ریاست میں قبائلیوں کی اعانت کر رہا ہے اور نہ ہی ان کی افواج وہاں سرگرمِ عمل ہیں۔اس طرح سے اس وقت جو پاکستان کشمیر کی آزادی کا چیمپئن بنا بیٹھا ہے، اسی کے موجودہ گورنر جنرل (محمد علی جناح) نے میری 'کشمیر چھوڑ و تحریک' 1846ء کے وقت میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ 'یہ محض چند سر پھرے لوگوں کی تحریک ہے اور اس کا ریاست کے مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے، مسلم کانفرنس نے میری تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی وفاداریاں مہاراجہ کو تفویض کر دیں (یعنی الیکشن میں حصہ لیا) اور آج یہ الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے بھارت کے ساتھ ہاتھ ملا لئے ہیں، الحاق کر لیا ہے، لیکن کوئی یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ میرے اس اقدام کا ریاست کے عوام نے کس طرح سے خیر مقدم کیا ہے اور وہ اس سے کس قدر خوش ہیں، ایسا کس لئے ہوا، شائد صرف اس لئے کہ ہم نے اس بات کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا کہ ریاست کے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ اقوام ہیں۔ہم دو قومی نظریہ کو بھی تسلیم نہیں کرتے، نہ ہم فرقہ وارانہ منافرت میں یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی فرقہ پرستی وغیرہ ہمارا عقیدہ ہے۔ہمارا یقین ہے کہ (دنیاوی) سیاست میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے، جب ہم نے 'کشمیر چھوڑ و تحریک' کا آغاز کیا تو اس میں صرف مسلمانوں نے ہی حصہ نہیں لیا بلکہ ہمارے کارکنان میں ہندو اور سکھ کامریڈ بھی شامل تھے، جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ قربانیاں دیں اور مصائب برداشت کئے، عوام کے سیلاب اور بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے خوفزدہ ہو کر مہاراجہ نے مجھے اور

میرے ساتھیوں کو رہا کیا...اور ہماری رہائی کے وقت ایسے حالات بن چکے تھے کہ ہمیں سوچنا پڑا کہ آیا کشمیر کو بھارت کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے، پاکستان کے ساتھ خود کو جوڑنا چاہیے یا پھر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے الگ رہنا چاہیے، لیکن حالات ایسے تھے کہ ہم اس نازک اور اہم فیصلے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے تھے، کیونکہ ہم پہلے (مہاراجہ کی غلامی سے) آزاد ہونا چاہتے تھے اس لئے ہم نے یہ نعرہ دیا ''الحاق سے قبل آزادی''میں نے سرینگر میں کچھ پاکستانی دوستوں کو بھی یہ بات اچھی طرح سے سمجھائی تھی، اتنا ہی نہیں، میں نے اپنے کچھ خاص ساتھیوں کو پاکستان بھیج کر وہاں کے وزیر اعظم لیاقت علی خان اور مغربی پنجاب کے کچھ بڑے عہدیداروں سے بھی گزارش کی تھی کہ وہ ہمیں اس اہم مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے کچھ مہلت دیں، میں نے اپنی گزارش میں پاکستان سے کہا تھا کہ وہ پہلے ہمیں ایک غلامی سے نکلنے میں مدد کرے اور اپنے مستقبل کے حوالے سے کوئی فیصلہ لینے کا موقعہ دے، نہ کہ وہ ہم پر اپنی یکطرفہ رائے ٹھونسے اور ہمیں جلد بازی میں کوئی غلط فیصلہ لینے پر مجبور کرے...اور ایک ایسے موقعہ پر جب کہ مذاکرات کا یہ سلسلہ جاری تھا، ایک صبح مجھے خبر ملی کہ پاکستان نے کشمیر صوبے کے مظفر آباد قصبے پر باضابطہ حملہ کر دیا ہے، یہ حملہ آور ہماری سرزمین میں داخل ہوگئے اور وہاں بلا لحاظ مذہب وملت قتلِ عام شروع کر دیا اور ہمارے علاقہ جات پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری جائیدادوں کو بھی نقصان پہنچایا.....اس ساری صورتحال کے تناظر میں ہمیں یہی لگا کہ پاکستان نہ تو ڈوگروں کے خلاف ہماری مدد کرے گا اور نہ ہی ہمیں سوچنے کا موقعہ دے گا، بلکہ اس کا ارادہ تو کچھ اور ہی ہے، مدد کرنا تو درکنار تھا، الٹا ہمیں مظفر آباد، سرینگر اور دیگر قصبہ جات میں اپنے رشتہ داروں کی سلامتی کی فکر دامن گیر کر دی گئی، اور اس تناظر میں ہمیں اپنا مال و جان اور وطن بچانے کے لئے کسی دوسرے (ہندوستان) سے مدد لینا پڑی۔(شیخ محمد عبداللہ کی یہ تقریر کافی اہم ہے، اس لئے اس کا باقی حصہ اگلی قسط میں پیش کیا جائے گا

26

مسئلہ کشمیر اقوامِ متحدہ میں.....

کشمیر کا متنازعہ مسئلہ پاکستانی امداد والے قبائل کے حملے کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے ہاتھوں سے نکل کر اقوامِ متحدہ کے ایوانوں میں جا پہنچا تھا اور ایک خود مختار ریاست کا فیصلہ کرنے کے لئے تین فریق اس عالمی ادارے میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ بھارت کی شکایت پر اقوامِ متحدہ نے پاکستان کو حکم دیا کہ وہ اپنے تمام حملہ آوروں اور فوجیوں کو ریاست سے باہر نکل جانے کا حکم دے، بھارت سے کہا گیا کہ وہ اپنی فالتو افواج کو باہر نکال کر صرف اتنی ہی نفری کو یہاں رکھے، جتنی کہ یہاں اقوامِ متحدہ کے زیرِ سایہ رائے شماری کروانے کے لئے کافی ہو، جبکہ پاکستان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ ریاست میں استصوابِ رائے کروانے میں بھارت کا تعاون کرے اور اس کام کو جس قدر جلد ممکن ہو سکے، انجام دے دیا جائے۔ سابقہ قسط میں ہم نے لکھا تھا کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اجلاس سے اپنے طویل خطاب میں ریاست کے اس وقت کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے کہا تھا کہ انہیں بھارت پاکستان اور کشمیر سے آئے ہوئے مندوبین کی تقریریں سن کر حیرت بھی ہوئی اور تعجب کے ساتھ ساتھ تذبذب بھی کہ آخر جھگڑا کس بات پر ہے اور اختلاف کس نکتے پر..؟ اپنی تقریر میں انہوں نے مزید کہا:

> ''.... پاکستانی قبائل کے حملے کے باعث ریاست میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے، ان کی وجہ سے ریاست کے مہاراجہ اور عبوری حکومت، دونوں نے بھارت سے درخواست کی کہ وہ ریاست کو بچانے کے لئے اپنی فوجی امداد روانہ کرے اور اس کے عوض ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق قبول کرے، یہ ایسے حالات تھے کہ جب بھارت موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آسانی سے کہہ سکتا تھا'' ٹھیک ہے، ہمیں یہ الحاق قبول ہے اور ہم آپ کو فوجی کمک دینے کے لئے بھی تیار ہیں'' بھارتی وزیر اعظم کو یہ بات کہنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی '' بھارت اس وقت کشمیر کی اتھل پتھل اور غیر یقینیت کا فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا، اس لئے ہم اس الحاق کو اس وقت تو

قبول کرتے ہیں لیکن ایک بار جب ریاست سے سارے حملہ آور، لٹیرے اور قاتل وغیرہ باہر نکل جائیں گے، اس وقت ایک پرامن ماحول میں ریاستی عوام کو اس الحاق کی توسیع کا موقعہ دیا جائے گا اور اگر وہ چاہیں تو بھارت کے ساتھ رہیں یا پھر اپنی منشاء کے مطابق اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں'' حالانکہ کشمیریوں نے یہ نہیں کہا تھا بلکہ یہ پیشکش خود بھارتی وزیراعظم نے اپنی طرف سے کی تھی۔ یہی وہ پیشکش تھی جو کشمیریوں کی طرف سے پاکستان کی حکومت سے کی گئی تھی کہ ہمیں ایک غلامی سے باہر نکل جانے دیجئے تاکہ ہم سکون سے یہ فیصلہ کرسکیں کہ ہمیں اپنے مستقبل کا کیا فیصلہ کرنا ہے، لیکن پاکستان کا یہ گمان تھا کہ وہ صرف ایک ہفتے میں کشمیر پر قبضہ کرلے گا اس لئے اس نے ہماری یہ پیکش ٹھکرادی اور اپنے حملہ آور اندر بھیج کر سارا ماحول بدل دیا۔

بہرحال ہم لوگ اس ایوان میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں بحث و تمحیص کرنے آئے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہم یہاں ''شہزادے کے بغیر گاؤں'' والا ڈرامہ کھیل رہے ہیں، سیکورٹی کونسل کو اس مسئلہ کو الجھانا نہیں چاہیے، اس وقت ہمارے سامنے سوال یہ نہیں کہ ہمیں اندرونی آزادی چاہئے یا نہیں، سوال یہ نہیں ہے کہ مہاراجہ ایک خودمختار حکمران ہے یا نہیں، یہ بھی سوال نہیں کہ اس نے اس ریاست کو کس طرح حاصل کیا تھا، یہ بھی سوال نہیں کہ آیا ریاست نے قانونی طور بھارت کے ساتھ الحاق کیا ہے یا غیر قانونی طور، جیسا کہ پاکستان نے سوال اُٹھایا ہے، یہ سارے نکتے اس وقت موضوعِ بحث ہیں ہی نہیں، اگر ہوتے تو ہم ان پر گفت وشنید کر رہے ہوتے، ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کشمیر نے قانونی طور پر بھارت کے ساتھ الحاق کیا ہے اور پاکستان کو اس حوالے سے اعتراض یا سوال اٹھانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، یہ سارے مسائل اس وقت موضوعِ بحث نہیں ہیں اس لئے ان پر بات کر کے ہمیں اس ایوان کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے، پاکستان جو دعویٰ کر رہا ہے اور بھارت نے جو شکایت کشمیر کے حوالے سے اس عالمی ادارے کے سامنے لائی ہے، اس کا جائزہ لینے اور سچ اور جھوٹ کا پتہ لگانے کے لئے سیکورٹی کونسل کو ایک کمیشن پاکستان بھیجنا چاہیے تاکہ وہ جائے واردات پر جا کر راز خود پتہ لگا سکے۔ اس کے بعد یہ ہمارا کام

اور ذمہ داری ہوگی کہ ہم یہ ثابت کریں کہ جوالزامات ہم نے عائد کئے ہیں، وہ لفظ بہ لفظ درست اور صحیح ہیں، یہ آخری اور واحد مدد ہے، جو ہم اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل سے چاہتے ہیں،اور کچھ نہیں....''

ریاست کے سابق وزیرِاعظم اور بعد کے وزیرِاعلیٰ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں یہ تقریر پاکستانی قبائل کے حملے، ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق اور بھارت کی جانب سے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے خلاف دائر کی گئی شکائت کے بعد اس عالمی ادارے میں کافی اہمیت کی حامل تھی،اس تقریر نے پوری بین الاقوامی برادری کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آخر کشمیر میں ایسے کون سے حالات پیدا ہوگئے تھے،جن کی وجہ سے اس قدر کنفیوژن پیدا ہوگیا اور بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے خلاف آمادہ بہ جنگ ہیں، بلکہ پہلے ہی ایک جنگ لڑ چکے ہیں؟ اس سارے مخمصے کا جواب ایک ہی تھا کہ پاکستان، جسے پہلے ہی تاجِ برطانیہ کا سپورٹ اور پشت پناہی حاصل تھی، مذہب کی بنیاد پر کشمیر کو اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا، وہ اس ریاست کو اپنی 'شہہ رگ' قرار دے چکا تھا اور وہ اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔اس نے 'معاہدۂ قائمہ' پر دستخط کرنے اور کشمیر کو ایک خودمختار صوبہ تسلیم کرنے کے باوجود اکتوبر 47ء میں ریاست پر حملہ کیا اور اس کا ایک اچھا خاصہ حصہ چھین لینے میں کامیاب بھی ہوگیا، جبکہ اس کے بعد جب بھارت نے الحاقِ ریاست کے بعد اقوامِ متحدہ سے اس بارے میں شکایت کی تو پاکستانی مندوب نے جواب میں کہا کہ کشمیر میں خود کشمیری گوریلے برسرِ پیکار ہیں اور وہاں پاکستان کا کوئی بھی فوجی یا قبائل وغیرہ موجود نہیں،لیکن مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی اس تقریر کے بعد اقوامِ متحدہ نے جب یہ اعلان کیا کہ بھارت اور پاکستانی قبضہ والے کشمیر کے علاقہ جات میں دونوں ملکوں کی فوجی نقل وحرکت پر نگاہ رکھنے کے لئے اقوامِ متحدہ کے فوجی اتاشیوں پر مشتمل ایک گروپ (UNMOGIP)(اقوامِ متحدہ کے فوجی مبصرین برائے بھارت و پاکستان) کا قیامِ عمل میں لایا گیا تو پاکستان نے اپنا سابقہ بیان بدل کر کہہ دیا کہ اس کے کچھ فوجی باغی ہوگئے ہیں اور وہ کشمیری جنگجوؤں کی مدد کر رہے ہیں،لہذا پاکستان کو کچھ وقت دیا جائے تاکہ وہ اپنے بھگوڑوں پر قابو پالے، پاکستان کو وقت دیا گیا لیکن آج تریسٹھ سال گزر جانے کے باوجود بھی نہ تو وہ اپنے بھگوڑوں کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوا ہے اور نہ ہی اقوامِ متحدہ کے یہ فوجی اطاشی دونوں منقسم حصوں سے واپس گئے۔ان فوجی مبصرین کی ریاست میں موجودگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس ریاست کے مستقبل کا تعین ہونا ابھی باقی ہے اور بھارت اور پاکستان ان کی موجودگی میں یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ ریاست ان دونوں میں سے کسی ایک

کی ملکیت یا جا گیر ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ عالمی مبصرین یہاں موجود نہ ہوتے۔

اس موقعہ پر حالات کی مناسبت سے بھارت کے اس شکایت نامے کا جائزہ لینا بھی کافی سود مند ثابت ہوسکتا ہے، جو اس نے UNO کے سامنے پیش کر کے اس عالمی ادارے کی مداخلت چاہی تھی۔ یکم جنوری 1948ء کو بھارتی نمائندے نے اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے سامنے یہ شکایت اس مقصد سے پیش کی تھی تاکہ بین الاقوامی برادری کے سامنے یہ بات تسلیم کروائی جائے کہ ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کچھ شرائط کے تحت ہوا ہے اور پاکستان نے اس ریاست کے عوام پر فوجی شبخون مارا ہے اور غیر قانونی طریقے سے ریاست کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا ہے اور چونکہ ریاست کے مستقبل کا تعین ہونا ابھی باقی ہے، اس لئے عالمی ادارہ پاکستان پر دباؤ ڈالے کہ وہ اپنے فوجیوں اور حملہ آوروں کو اس سرزمین سے باہر نکل جانے کا حکم دے۔ اس خط پر یکم جنوری 1948ء کی تاریخ درج ہے اور اس کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے۔ (بھارتی نمائندہ سلامتی کونسل کے سیکریٹری جنرل کے نام لکھتا ہے)

''بھارت کی حکومت نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ تک مندرجہ ذیل ٹیلی گرام پہنچادوں:

1 اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں شامل دفعہ 35 کے تحت اس ادارے کے کسی بھی ممبر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسا کوئی بھی معاملہ ادارے کے روبرو پیش کرے، جس کی وجہ سے دو ممبران کے درمیان نزع کی حالت پیدا ہوگئی ہو اور امن عامہ کو برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہو اور کچھ اسی طرح کی صورت حال اس وقت بھارت اور پاکستان کے درمیان پیدا ہو رہی ہے، کیونکہ پاکستان کے شمال مغربی علاقہ جات سے تعلق رکھنے والے قبائل کی ایک بڑی تعداد پاکستان کی امداد اور حمائت کے بل بوتے پر، ریاست جموں و کشمیر میں داخل ہو چکی ہے اور ریاست، جس کا الحاق بھارت کے ساتھ ہو چکا ہے، کو ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ معاہدۂ الحاق کی رو سے بھارت اس بات کے لئے مجبور ہے کہ وہ ان حملہ آوروں کے خلاف فوجی کاروائی کرے، اس وقت یہ حملہ آور، ان کو ملنے والی پاکستانی امداد اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں اس یاداشت میں تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ بھارت اس عالمی ادارے سے اپیل کرتا ہے کہ وہ پاکستان کو اس کی تشویش کے بارے میں آگاہ کرے تاکہ ان ساری سرگرمیوں کا خاتمہ ہو سکے، جنہیں بھارت اپنے خلاف ایک حملہ تصور کرتا ہے اور اگر پاکستان اس میں ناکام رہتا ہے تو بھارت اس بات کے لئے مجبور ہو جائے گا کہ وہ پاکستانی قبضہ والے علاقہ جات میں داخل ہو کر ان عناصر کے خلاف فوجی کاروائی کر کے ان کی سرگرمیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے یہ مسئلہ انتہائی نازک،

حساس اور فوری اہمیت کا حامل ہے اور اقوامِ متحدہ سے گزارش ہے کہ اس طرف فوری توجہ دی جائے تاکہ ایک عالمی معاہدے کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے....''

بھارت کی جانب سے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کئے گئے اس شکایت نامہ میں ان تمام باتوں کی تفصیل درج ہے، جو اس حملے کی وجہ سے درپیش تھیں اور بھارت اور پاکستان تقسیم کے فوراً بعد پہلی جنگ بھی لڑ چکے تھے۔ اس خط کی مزید تفصیل اگلے شمارے میں پیش کی جائے گی۔

27

اقوامِ متحدہ میں
کشمیر کے حوالے سے بھارت کی شکایت

.........بھارت کی جانب سے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کئے گئے اس شکائت نامہ میں ان تمام باتوں کی تفصیل درج ہے، جو اس قبائلی حملے کی وجہ سے درپیش تھیں اور بھارت و پاکستان تقسیم کے فوراً بعد پہلی جنگ بھی لڑ چکے تھے اور حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ دنوں مما لک کے درمیان مزید کشیدگی کو روکنے اور اس کی اصل وجہ 'مسئلہ کشمیر' کو حل کرنے کے لئے اس بین الاقوامی ادارے کی مداخلت کا سہارا لینا پڑا، گزشتہ قسط میں ہم نے پڑھا تھا کہ بھارتی نمائندے نے اپنی حکومت کے حکم کے مطابق یو این او کی سلامتی کونسل میں اپنے شکائت نامے میں کہا تھا کہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی دفعہ 35 کے تحت اگر دو ممبر مما لک کے درمیان کسی مسئلہ پر اس قدر حالتِ نزع پیدا ہو جائے کہ معاملہ کشیدگی اور امنِ عامہ کے خطرے تک پہنچ جائے تو ایک ممبر ملک کا یہ حق بنتا ہے کہ وہ ادارے سے مداخلت کی اپیل کرے اور بین الاقوامی برادری کو اس بارے میں مطلع کرے، اس لئے بھارت نے اس مسئلہ کو اس عالمی فورم میں پیش کر کے مداخلت طلب کی....

شکایت نامے کی دوسری شق میں کہا گیا ہے:

''2...حکومت ہند کو ستمبر 1947ء کے وسط سے یہ اطلاعات ملنا شروع ہو گئی تھیں کہ ریاست جموں و کشمیر کے صوبہ جموں کے مغربی حصوں میں پاکستانی مسلح حملہ آوروں کی دراندازی شروع ہو گئی ہے، جموں کی سرحدیں مغربی پنجاب کے ساتھ ملتی ہیں، جو کہ پاکستان کا حصہ ہے، ان حملہ آوروں نے اپنی سرگرمیوں کے دوران کافی مالی اور جانی نقصان کیا ہے اور ایک بڑے حصے پر اپنا ناجائز قبضہ بھی جما لیا ہے، 24 اکتوبر کو بھارت کو پاکستان کے صوبۂ سرحد کی جانب سے وادیٔ کشمیر میں ایک بڑے حملے کی اطلاع ملی، جس میں تقریباً دو ہزار کے قریب پوری طرح مسلح حملہ آوروں نے حصہ لے کر ریاست میں دراندازی کی، انہوں نے مظفر آباد قصبے میں بہت سے لوگوں کو ہلاک کر کے اس علاقے پر قبضہ کرنے

کے بعد جہلم ویلی شاہراہ سے ہوتے ہوئے پیش قدمی کی اور وادئ کشمیر میں داخل ہو گئے، جو کہ ریاست کی موسمِ گرما کی راجدھانی بھی ہے۔اس دوران حملہ آوروں نے راستے میں پڑنے والے قصبہ جات اور دیہات میں تباہی مچائی، دیہات اور قصبوں میں آتشزنی کی، قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور ان کو اپنے قبضے میں لے لیا، سرینگر سے تقریباً پچاس میل (آج کل ایک سو کلومیٹر) دور قصبۂ اوڑی کو بھی کچھ دیر تک اپنے قبضے میں رکھا، اس دوران حملہ آوروں نے مہورہ کے پاور ہاؤس کو بھی جلا ڈالا، جو کہ وادئ کشمیر کو برقی رو فراہم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

3.....26 اکتوبر 1947ء کو یہ صورت حال تھی کہ ان حملہ آوروں کو ریاست کے فورسز اور عوام نے بارہ مولہ قصبہ میں کافی دیر تک پیشقدمی کرنے سے روکے رکھا تھا لیکن بارہ مولہ سے سرینگر تک حملہ آوروں کے راستے میں کوئی خاص رکاوٹ نہیں تھی، اس لئے اس بات کا شدید خطرہ لاحق تھا کہ یہ حملہ آور فوری طور سری نگر شہر تک پہنچ سکتے ہیں اور وہاں (ہندو اور مسلمانوں کا قتلِ عام کر کے) بڑے پیمانے پر تباہی مچا سکتے ہیں، ریاست کی محدود سی افواج مختلف علاقوں میں منتشر حالت میں تھیں اور زیادہ تر کو جموں کی مغربی سرحدوں میں تعینات کیا گیا تھا، یہ دستے چونکہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے، اس لئے ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ حملہ آوروں کے خلاف کوئی دفاعی یا جارحانہ کاروائی شروع کر سکیں، ڈر اور خوف کی وجہ سے زیادہ تر سرکاری عہدہ دار وہاں سے فرار ہو چکے تھے اور سول انتظامیہ تقریباً مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔اس دوران اگر کوئی رکاوٹ حملہ آوروں اور سرینگر کے درمیان باقی تھی تو وہ صرف اور صرف وہاں کے (غیر مسلح) عوام کے تمام طبقوں کا حوصلہ اور جوانمردی تھی، جنہوں نے انہیں روکے رکھا۔ یہ ایک ایسا موقعہ تھا جب سرینگر میں ہندو اور سکھ طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی موجود تھی، جو تقسیمِ ہند کے بعد پاکستانی علاقوں سے (ڈر کی وجہ سے) ہجرت کر کے وہاں پناہ لے چکے تھے، اس لئے اس بات کا قوی امکان تھا کہ اگر حملہ آور سرینگر پہنچ گئے تو سب سے پہلے انہی رفیوجیوں کا قتلِ عام کر دیں گے۔

4....ریاست جموں و کشمیر میں حملے کے فوراً بعد، بھارت کی طرف سے ریاست کے الحاق کی پیشکش اور اس کے بدلے ان حملہ آوروں کے خلاف فوجی کمک کی مانگ پر جلدی غور کرنا پڑا (یہ بات الگ طریقے سے تفصیلاً واضح کی جائے گی کہ یہ ریاست بھی 15 اگست 1947ء تک تاجِ برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدے کے ذریعے جڑی ہوئی تھی اور اس نے اس کے خارجہ معاملات کے ساتھ ساتھ اس کے دفاع کا بھی ذمہ لے رکھا تھا اور اس کا حکمران ایک خودمختار فرمانروا تھا اور تاجِ برطانیہ سے آزادی

کے بعد بھارت کی دیگر ریاستوں کی طرح اس ریاست کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے اور بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرے)

5...حالات وواقعات تیزی سے ابتر ہوتے چلے گئے اور قتل وغارتگری کی وجہ سے پوری وادیٔ کشمیر ایک قبرستان میں بدلنے لگی، جس کی وجہ سے ریاست کے مہاراجہ شری مہاراج ہری سنگھ جی نے 26 اکتوبر کو بھارتی حکومت سے انتہائی عجلت میں فوجی امداد کی اپیل کی، انہوں نے یہ بھی اپیل کی کہ ریاست جموں وکشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق تسلیم کیا جائے، مہاراجہ ریاست کے ساتھ ساتھ اسی قسم کی ایک اور درخواست بھارت کو ریاست کی مقبول ترین جماعت نیشنل کانفرنس، جس کی سربراہی شیخ محمد عبداللہ کررہے ہیں، کی جانب سے بھی انہی حالات میں موصول ہوئی۔ اس طرح سے نہ صرف حکومت ریاست (مہاراجہ) بلکہ عوامی سطح پر بھی (نیشنل کانفرنس) کی طرف سے بھی حکومتِ ہند کو ریاست میں اپنی افواج بھیجنے اور ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کرنے کی درخواست موصول ہوئی اور ریاست میں حملہ آوروں کی وجہ سے جوڈر اور خوف کا ماحول قائم ہوگیا تھا، اس کا تقاضہ تھا کہ بھارت اس حوالہ سے کوئی مزید تاخیر نہ کرے، اس لئے ان دونوں درخواستوں پر انتہائی جلدی میں فیصلہ لینا پڑا۔ اس لئے یہ اب بھارت کی ترجیحات میں شامل تھا کہ اس ریاست کا دفاع کیا جائے، لیکن ساتھ ہی ساتھ بھارت ریاست کی اس غیر یقینی صورت حال کا ناجائز فائدہ بھی نہیں اٹھانا چاہتا تھا اس لئے یہ بات واضح کی گئی کہ ایک مرتبہ جب ریاست میں معمول کی صورت حال بحال ہوجائے گی تو وہاں کے لوگوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا (رائے شماری کے ذریعے) موقعہ دیا جائے گا، اور اس دوران وہاں کے عوام اس بات کے مجاز ومختار ہونگے کہ وہ بین الاقوامی برادری کے زیرِ نگرانی آزادانہ طریقے سے اپنے مستقبل کا رائے شماری یا ریفرینڈم کے ذریعے فیصلہ کریں۔

7.....حکومت ہند نے ریاست کی درخواست پر اس کے دفاع کی ذمہ داری مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیاد پر اپنے سر لی ہے:

(۱) بھارت اپنے قریبی پڑوسی (جموں وکشمیر) میں غیرملکی دباؤ اور دھونس کے بل پر اس ریاست میں حالات کو بدلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا

(۲) ریاست کے بھارت کے ساتھ قانونی طور پر ہوئے الحاق نے بھی بھارت کو اس بات کا پابند کردیا تھا کہ وہ اس ریاست کے عوام اور حکومت کی ان مشکل حالات میں مدد کرے۔

8.....حکومتِ ہند کی مداخلت سے فوری طور پر شہر سرینگر کو حملہ آوروں کے ہاتھوں میں جانے

اور یہاں قتل و غارت کا بازار گرم ہونے سے بچ گیا،حملہ آوروں کو واپس بارہمولہ کے راستے اوڑی سے پیچھے دھکیل دیا گیا اور انہیں (ابھی تک) وہاں بھارتی فرسز نے روکے رکھا ہوا ہے، اس وقت بھی اس علاقے میں تقریباً 19000 مسلح اور آمادہ بر جنگ گوریلے موجود ہیں، جو بھارتی افواج کی مزاحمت کا سامنا کررہے ہیں، جب سے ریاست پر حملوں کا یہ سلسلہ شروع ہوا ہے، پاکستانی پنجاب کی جانب سے بھی بھارت کو کافی دباؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اگر چہ اس وقت صحیح اعداد و شمار فراہم کرنا ممکن نہیں ہے تاہم اندازے سے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اس علاقے میں مزید 15000 کے قریب مزاحمت کار سرگرم اور موجود ہیں، ریاستی فوجی دستے کئی مقامات پر محصور ہوکر رہ گئے ہیں،حملہ آوروں نے ان علاقوں میں خواتین کے ساتھ دست درازیوں، عام لوگوں کا قتلِ عام، جائیدادوں اور تعمیرات کو جلانے کا سلسلہ، اغوا کاری،لوٹ مار اور دہشت کا ماحول قائم کررکھا ہے۔اس علاقے سے مالِ غنیمت اکٹھا کرکے صوبۂ سرحد پہنچایا جارہا ہے تاکہ ریاست میں اپنے قبضے کو مزید تقویت دینے کے لئے ہتھیار خریدے جائیں اور مزید نفری فراہم کی جاسکے۔ یہ بھی اطلاعات ملی ہیں کہ حملوں میں حصہ لینے والوں کے علاوہ مغربی پاکستان میں مزید ایک لاکھ رضا کاروں (قبائلیوں) کو جمع کرکے ان کو پاکستانی فوجیوں کی طرف سے جنگی تربیت دی جارہی ہے تاکہ انہیں بھی آنے والے دنوں میں اس جنگ میں دھکیلا جاسکے۔انہیں پاکستانی علاقے میں تیار کیا جارہا ہے، ان کی تربیت، کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے اخراجات بھی پاکستانی حکومت (خاص طور پر فوج کی طرف سے) برداشت کئے جارہے ہیں،انہیں ہتھیار اور رسل و رسائل کی سہولیات فراہم کرکے ریاست جموں و کشمیر کی سرحدوں تک پہنچایا جارہا ہے اور اس جنگ میں شامل کیا جارہا ہے اور اس سارے عمل میں پاکستانی افواج اور سول انتظامیہ کے افسران اور عہدیداران حصہ لے رہے ہیں۔۔۔

9....جیسا کہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے کہ حملہ آور، جو کہ وادی میں ماہِ اکتوبر میں داخل ہوئے تھے، میں سے زیادہ تر قبائلی علاقوں سے آئے اور کشمیر کی سرحد کے نزدیک پاکستان کے شمال مشرقی صوبہ میں جمع ہوئے،انہوں نے پاکستانی علاقہ پار کیا اور اپنے حملے کا آغاز جنوب مغربی سرحد سے کیا، جو کہ پاکستان میں پڑتی ہے، اتنا ہی نہیں پاکستانیوں نے بھی ان حملوں میں حصہ لیا، ان حملہ آوروں کو دی جانے والی پاکستانی حمائت اور اعانت ابھی تک جاری ہے جبکہ حال ہی میں ریاست کی مغربی اور جنوب مغربی سرحدوں کے راستے ان لوگوں نے اپنے حملوں میں مزید تیزی لائی ہے اور ان حملوں میں بھی یہی قبائل اور پاکستانی شہری حصہ لے رہے ہیں۔ یہ حملہ آور جدید ہتھیاروں سے لیس ہیں، ان کے پاس

مارٹر گن اور درمیانہ درجے کی مشین گن جیسے ہتھیار بھی ہیں، یہ لوگ باضابطہ فوجیوں کی طرح جنگی لباس پہنتے ہیں، حالیہ ایام میں ان کی طرف سے کئے گئے حملے باضابطہ، تربیت یافتہ، ماہر اور پیشہ ور فوجیوں کی عکاسی کرتے ہیں اور ان حملوں میں جدید فوجی حکمت عملی کا بھی استعمال کیا گیا ہے، ان کے پاس انتہائی جدید وائرلیس سیٹ ہیں اور انہوں نے mark V نام کی زیر زمین بارودی سرنگوں کا بھی استعمال کیا ہے، اپنی آمد و رفت کے لئے وہ لوگ موٹر گاڑیوں کا استعمال کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ انہیں پاک افواج کی جانب سے تربیت دی جاتی ہے، ان کی غذائی اور دیگر ضروریات بھی پاکستان ہی پوری کر رہا ہے۔

10.....ان حقائق سے مندرجہ ذیل باتوں پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے کہ:

(ا) پاکستان ان حملہ آوروں کو اپنی سرزمین میں کشمیر کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دے رہا ہے

(ب) پاکستان انہیں اپنی سرزمین کو بھارتی علاقے کے خلاف 'بیس کیمپ' کے طور استعمال کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔

(ج) پاکستانی شہری بھی ان کا نہ صرف ساتھ دے رہے ہیں بلکہ وہ ان حملوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔

(د) وہ اپنے مصارف، بشمول موٹر گاڑیاں، پیٹرول، راشن اور دیگر ضروریات پاکستان سے حاصل کرتے ہیں اور....

(ہ) پاکستانی فوجی افسران انہیں تربیت دیتے ہیں، ان کو ہتھیار فراہم کرتے ہیں اور عملی طور ان کی ہر قسم کی مدد بھی کرتے ہیں.

اقوامِ متحدہ کے ایوان میں پیش کئے گئے بھارتی نمائندے کے اس شکائت نامے کی حکائت ابھی جاری ہے اور اس میں کچھ ایسے سنسنی خیز انکشافات بھی شامل ہیں، جن سے ابھی تک پردہ اٹھانا باقی ہے، لیکن طوالت کی وجہ سے اگرچہ اس شکائت نامے کو ایک ہی قسط میں پیش نہیں کیا جا سکتا تاہم اس کی اہمیت اور تاریخی ضرورت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

28

بھارت، پاکستان اور اقوامِ متحدہ!

(گزشتہ سے پیوستہ) ''...ان باغی گوریلوں کے پاس صرف پاکستان ہی ایک ایسا واحد ذریعہ ہے، جو انہیں اس طرح کا جدید اسلحہ، تربیت، اخراجات اور اتنی بھاری مقدار میں جنگی ساز و سامان فراہم کر سکتا ہے، بھارت کی طرف سے کئی ایک بار پاکستان سے کہا جا چکا ہے کہ وہ ان جنگجوؤں کی امداد و اعانت بند کر دے کیونکہ بھارت اسے اپنے خلاف ایک براہِ راست حملہ تصور کرتا ہے لیکن اس کا کوئی جواب نہیں ملا اور نہ ہی کوئی فائیدہ ہوا اور اس طرح کی آخری درخواست پاکستان سے ۲۲ دسمبر کے روز بھی کی گئی تھی، اس دن بھارتی وزیرِ اعظم نے بذاتِ خود پاکستانی وزیرِ اعظم کو ایک خط تھمایا تھا، جس میں واضح طور پر پاکستان کی جانب سے ان لڑاکوں کو ملنے والی مختلف قسم کی مدد اور حمائت کے بارے میں انہیں آگاہ کیا تھا لیکن اس کا نہ تو کوئی مثبت جواب ملا اور نہ ہی کوئی فائیدہ ہوا، حالانکہ اس حوالے سے 26 دسمبر کو ایک بار پھر بذریعہ فون یاددہانی کرائی گئی تھی لیکن سب بے کار ثابت ہوا'' بھارتی نمائندے نے کشمیر کے حوالہ سے اپنے شکائت نامے میں اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کو بتایا۔

شکایت نامے کی شق نمبر 11 میں مزید درج ہے:

11۔ بھارت رواں مذاکرے میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ حالات و واقعات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پاکستان ان تخریب کاروں کی وہ امداد و اعانت بند کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، جو انہیں پاکستانی حکومت کے علاوہ فوج اور سول حکام نیز پاکستانی شہریوں کی جانب سے مل رہی ہے، یہ برتاؤ نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ بھارت کے خلاف ایک کھلی جنگی جارحیت کے مترادف بھی ہے، جس کا کہ ریاست جموں و کشمیر اب ایک باضابطہ حصہ ہے۔

12۔ بھارتی حکومت نے اس حوالے سے انتھک کوششیں کی تھیں کہ دونوں ممالک کے درمیان اس حوالے سے کوئی راستۂ صلح جوئی نکل سکے لیکن ہر موڑ پر کی گئی ہر کوشش بے کار ثابت ہوئی، اس کی وجہ سے بھارت کے سامنے ایک انتہائی پیچیدہ صورتحال پیدا ہو گئی ہے اور ہمارے لئے ان حملہ آوروں کو اپنے ہی علاقے سے باہر نکالنا اور یہاں امن بحال کرنا کافی دشوار ہوتا جا رہا ہے، پاکستان کی

جانب سے ان جنگجوؤں کی مدد کر کے ہمارے ملک کے ایک حصے کی سلامتی کے ساتھ کھلواڑ کیا جا رہا ہے، حملہ آور ابھی تک ریاست جموں وکشمیر کی سرزمین پر موجود ہیں اور ریاست کے عوام کو ایک انتہائی سخت اور ظالمانہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بھارت کی سرحدوں کے ساتھ لگنے والے پاکستانی علاقوں میں ان بے لگام جنگ بازوں کی موجودگی پورے بھارت کے لئے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی ہے، موجودہ کاروائیوں کے لامحدود تسلسل کی وجہ سے ریاستی عوام کے غم وغصے میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے، جو کہ ایک قدرتی عمل ہے، نہ صرف یہ بلکہ یہ سلسلہ بھارتی معاشیات پر بھی ایک بہت بڑا بوجھ ثابت ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے درمیان امن کا قیام بھی محال ہوتا جا رہا ہے، ان حالات میں بھارت کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی بھی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے اس علاقے کے تحفظ کے لئے مزید فوجی کاروائیاں جاری رکھے تاکہ ان حملہ آوروں کو باہر نکلنے پر مجبور کیا جا سکے۔

13۔ پاکستانی علاقے سے ہونے والی ان مسلسل کاروائیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بھارت کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے فوجی دستوں کو پاکستانی علاقے میں بھیج کر وہاں موجود تخریب کاروں کا خاتمہ کرے اور ان کے ڈھانچے کو مسمار کر دے۔ صرف یہی ایک راستہ ہے جس کی مدد سے ان حملہ آوروں کو اپنے ذرائع، پاکستانی امداد اور حمائت سے محروم کیا جا سکتا ہے اور ان کا تعاقب کر کے اس علاقے کو پاک کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی واضح رہے کہ بین الاقوامی قانون کے تحت یہ بھارت کا حق بنتا ہے کہ وہ اپنے مسلح دستوں کو بھیج کر ان حملہ آوروں کا خاتمہ کرے، جو پاکستانی امداد سے بھارت کے خلاف اپنی کھلی جارحیت جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن بھارت سمجھتا ہے کہ اس طرح کی کوششوں سے پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک باضابطہ جنگ چھڑ جائے گی، جس سے اس پورے خطے کا امن اور سلامتی درہم برہم ہو سکتی ہے، لیکن بھارت چاہتا ہے کہ یہ سارا معاملہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور ضابطہ اخلاق کے مطابق حل ہو، اس لئے ہماری خواہش ہے کہ ہم اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی دفعہ نمبر 35 کے تحت اس عالمی ادارے کو اپنی تشویشات سے آگاہ کریں علاوہ ازیں ہم خود کو اس بات کے لئے بھی حق بجانب سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو بتا دیا جائے کہ:

1. وہ اپنے شہریوں، حکومتی اداروں اور افواج کو اس سارے معاملے سے دور رکھے۔

2 وہ اپنے اُن شہریوں کو بھی واپس بلائے، جو اس کام میں کسی طرح کی حمائت یا عملی اعانت کرتے ہیں۔

3 وہ ان حملہ آوروں کو مندرجہ ذیل چیزیں بند کر دے:

(ا)اپنی وہ سرزمین، جسے کہ وہ کشمیر کے خلاف میدان جنگ کے طور پر استعمال کرتے ہیں

(ب)فوجی اور دیگر مختلف اقسام کی کمک وغیرہ

(ج) امداد وحمائت کی ایسی تمام اقسام، جن کی وجہ سے حملہ آوروں کے لئے اس جارحت کو زیادہ دیر تک قائم اور جاری رکھنے میں مدد ملے۔

14۔ حکومتِ ہند چاہے گی کہ اس کی شکایت کا فوری نوٹس لیا جائے اور پاکستان کے خلاف ایسے اقدامات بھی فوری طور پر اٹھائے جائیں، جو حالات کو مزید بگڑنے سے بچانے میں معاون ثابت ہو سکیں، بھارت یہ بھی باور کرانا چاہتا ہے کہ جس قوت اور رفتار سے حالیہ ایام میں ان حملہ آوروں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں، ان کے پیشِ نظر بھارت کو اپنے دفاع میں اقدامات کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر صورت حال یہی رہی تو بھارت اس حق کا استعمال کرنے میں بھی آزاد ہوگا۔ ساتھ ہی ایک ایسی فوجی کاروائی کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ جس کا حالات تقاضا کرتے ہوں۔

15۔ حکومتِ ہند کو اس بات پر سخت افسوس ہے کہ اس ساری صورت حال کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان رشتوں میں سخت کڑواہٹ اور تناؤ پیدا ہوا، پاکستان نہ صرف بھارت کا ایک ہمسایہ ہے بلکہ ابھی حال ہی میں تقسیم کے نتیجہ میں بھارت سے ہی الگ ہونے والا ایک ایسا ملک ہے، جس کے ساتھ ہماری متعدد اقدار مشترک ہیں، بھارت صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے اس قریب ترین ہمسایہ کے ساتھ صرف اور صرف امن وامان اور دوستانہ شرائط پر ہی زندہ رہے، امن میں ہی دونوں ممالک کا فائیدہ مضمر ہے اور ساری دنیا کا فائیدہ بھی اسی میں ہے کہ اس خطے میں امن وامان کا دور دورہ رہے، حکومتِ ہند اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل سے صرف یہی امید رکھتی ہے کہ کونسل کی فوری اور موئثر مداخلت سے امن قائم ہو جائے۔

16۔ مندرجہ بالا عبارت کو بذریعہ تار حکومتِ پاکستان تک بھی پہنچایا جا رہا ہے۔''

16 نکتوں پر مشتمل بھارت کا یہ شکایت نامہ نہ صرف ایک تاریخی دستاویز ہے بلکہ اس کے مشمولات پر توجہ مرکوز کرنے سے ان پوشیدہ حقیقتوں سے بھی پردہ اٹھتا ہے کہ پاکستان کی جانب سے کشمیر پر 1947ء میں جو حملہ کیا گیا تھا، وہ محض چند بھپرے ہوئے قبائلی دراندازوں کی شرارت نہیں تھی بلکہ پاکستان کے ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا، جس کا واحد مقصد کشمیر کو اپنا صوبہ بنانا تھا اور یہ نو زائد ملک اس کام کے لئے کوئی بھی جائز یا ناجائز حربہ یا طریقہ اختیار کرنے پر آمادہ تھا، جبکہ الحاقِ

ریاست کی وجہ سے بھارت ایک عجیب ''دھرم سنکٹ'' میں پھنسا ہوا تھا، اس نے عارضی الحاق کی وجہ سے کشمیریوں کے مال و جان اور عزت کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا تھا، جس میں وہ بری طرح سے ناکام رہا، پاکستان یہ سمجھتا تھا کہ چونکہ ریاست ایک مسلم اکثریتی علاقہ ہے اس لئے برطانوی فارمولہ کے تحت اس کا مستقبل پاکستان سے جڑنا چاہئے جبکہ پریشانی یہ تھی کہ ریاست میں کوئی بھی مقامی سیاست دان اس پوزیشن میں نہیں تھا جو مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے سامنے کھڑا ہو کر حالات کی لہر کو پاکستان کے حق میں موڑ سکتا، نیشنل کانفرنس اور شیخ عبداللہ ایک سکے کے دو ایسے چہرے تھے، جس کا بھاؤ ریاست اور بھارت کے بازار میں کافی اونچا تھا۔ پاکستان نے یہ حملہ کر کے ریاست میں اپنے واحد حلیف اور دوست مہاراجہ ہری سنگھ کے اعتماد کو بھی بری طرح سے ٹھیس پہنچائی تھی، وہ مہاراجہ جو اندر ہی اندر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے یا کم از کم خود مختار رہ کر پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا اور بھارتی سیکولرازم سے کنارہ اختیار کرنا چاہتا تھا، اب خود اسی بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے سامنے عرضی لے کر حاضر ہوا، جسے اس نے کبھی ریاست کی حدود پار کرنے کے الزام میں نہ صرف بے عزت کیا تھا بلکہ حراست میں بھی رکھا تھا، یہ اور کئی دیگر باتوں پر مشتمل صورتحال کو بدلنے میں نہ تو کوئی صدی لگی اور نہ ہی زمانہ بلکہ یہ سب محض چند ہفتوں کے اندر اندر ہوا اور اس کا اثر اس قدر زیادہ تھا کہ آج ستر سال گزر جانے کے باوجود بھی پورے برصغیر میں اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

بھارت کے اس شکائت نامے اور مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی طویل اور اہم تقریر کو سننے کے بعد اقوام متحدہ کی اسی سلامتی کونسل میں کشمیر کے حوالے سے پہلی قرارداد پیش کی گئی اور جو اکثریت سے پاس بھی کی گئی، اس قرارداد کو ''13 اگست 1948 کی قرارداد'' کہا جاتا ہے، جس کا ترجمہ اور پسِ منظر اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیے!

29

...جب پاکستان کو 'حملہ آور' قرار دیا گیا
اقوامِ متحدہ کی پہلی قرارداد

...ایک طویل اور گرما گرم مجادلے اور بحث و تمحیص کے بعد اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے کشمیر کے حوالے سے ایک قرارداد پاس کی اور اسے 13 اگست 1948ء کی قرارداد کا نام دیا گیا ہے۔ اس قرارداد کو کشمیر مسئلے کے حوالے سے کافی اہم اور تاریخی نوعیت کی دستاویز کا نام دیا گیا ہے۔ اس قرارداد کو بنیاد بنا کر اگرچہ کشمیر میں پچھلے 20 برسوں کے دوران کشمیر کی آزادی پسند اور علیٰحدگی پسند قیادت نے بھارت اور اقوامِ متحدہ کے خلاف بہت سارا زہر اگلا ہے اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے، لیکن اگر اس قرارداد کے مشمولات کا جائزہ لیا جائے تو بہت سارے سنسنی خیز انکشافات سامنے آتے ہیں اور کافی سارے سربستہ رازوں سے بھی پردہ ہٹ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ اس قرارداد کے ذریعے پاکستان سے کہا گیا تھا کہ وہ کشمیر سے اپنی افواج اور ان گوریلوں کو چار دن کے اندر باہر نکالے، جو اکتوبر 1947ء میں دراندازی کر کے اندر گھس آئے تھے اور اپنی کاروائیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس قرارداد کو بغور پڑھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پاکستان اپنے اس دعوے میں کہ اس کی افواج، شہری اور گوریلے کشمیر میں مصروفِ جنگ و جدل نہیں تھے، میں بری طرح سے ناکام رہا اور پاکستانی وزیراعظم کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اس بات کو تسلیم کر لے کہ کشمیر میں ہونے والے خون خرابے اور غیر یقینیت میں اس کا براہِ راست ہاتھ تھا اور جیسے ہی ایک بار پاکستان نے یہ بات تسلیم کی تو اسے عالمی ادارے (UNO) کی طرف سے بتا دیا گیا کہ وہ یہ مداخلت بند کر دے اور اپنے آمادہ بر جنگ عناصر کو اس سرزمین سے باہر بلا لے، حالانکہ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ پاکستان نے اب تک ایسا نہیں کیا اور یہی بات بھارت کو اس خطۂ زمین پر اپنا قبضہ جاری رکھنے کے لئے مددگار بھی ثابت ہو رہی ہے۔ کشمیر کے حوالے سے پاس کی گئی اس قرارداد کا آزادانہ اردو ترجمہ کچھ اس طرح سے ہو سکتا ہے:

''یونائٹڈ نیشنز کمیشن برائے بھارت و پاکستان....

بھارت اور پاکستان کے نمائندگان کی طرف سے اس ایوان میں پیش کی گئی بحث اور دلائل پر اچھی طرح سے غور وخوض کرنے کے بعد یہ ادارہ (UN) اس نتیجے پر پہنچا ہے اور سمجھتا ہے کہ:

ریاستِ جموں و کشمیر میں اس وقت جو صورتحال پائی جاتی ہے، اس کی وجہ سے امنِ عالم کو شدید خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، لہٰذا اس جگہ پر قیامِ امن انتہائی ضروری بن جاتا ہے اس لئے یہ ادارہ چاہتا ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کو اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ مدد کرے تا کہ اس مقام پر تناؤ اور کشیدگی کا خاتمہ ہو سکے۔ اس لئے بھارت اور پاکستان کو مندرجہ ذیل تجویز نامہ ایک ساتھ بھیجا جاتا ہے:

حصۂ اول. جنگ بندی کا حکم نامہ

(ا) بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ایک ساتھ اپنے اپنے ماتحت فورسز اور افواج کے نام ایک مقررہ تاریخ یا تاریخوں پر جنگ بندی کا ایک حکمنامہ جاری کریں گی اور یہ تاریخیں دونوں ممالک باہمی طور پر اس حکم نامے کے اجراء کے چار دن کے اندر اندر کسی بھی وقت طے کی جاسکتی ہیں۔

(ب) دونوں ملکوں کی اعلیٰ قیادت اس بات پر متفق ہے کہ وہ اس حکم نامے کے اجراء کے بعد اپنی ماتحت افواج کی طاقت کا ریاست جموں و کشمیر میں کوئی بھی استعمال نہیں کریں گی (مذکورہ معائدہ کی عمل آوری کے لئے اس میں تمام قسم کی افواج شامل ہوں گی، چاہے وہ باضابطہ افواج ہوں یا منتشر، سرکاری افواج ہوں یا غیر سرکاری (گوریلے) جنگ میں مصروف فورسز ہوں یا پھر اپنی بیرکوں میں موجود پرامن دستے۔

(ج) دونوں ملکوں کے کمانڈر انچیف اپنے اپنے علاقے میں کوئی بھی ایسی تبدیلی کرنے سے باز رہیں گے، جس کی وجہ سے جنگ بندی کے اس معائدے کی عمل آوری میں رکاوٹ پیدا ہو۔

(د) (اقوامِ متحدہ کا) یہ کمیشن اگر مناسب سمجھے گا تو اپنی استطاعت اور ضرورت کے مطابق اپنے فوجی مبصرین کو مقرر کرے گا، جو کمیشن کے زیرِ نگرانی اور بھارت اور پاکستان کی کمانڈ کے تعاون سے اس علاقے میں جنگ بندی معاہدے کی نگرانی کریں گے (یہ فوجی مبصرین آج تک منقسم کشمیر کے دونوں حصوں میں تعینات ہیں)

(ہ) بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اس بات پر بھی متفق ہیں کہ وہ اپنے اپنے عوام سے اپیل کریں گی کہ وہ ایک ایسا ماحول بنانے میں ان کی مدد کریں، جو قیامِ امن کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے مزید گفت وشنید کرنے میں معاون ثابت ہو سکے۔

حصہ دوم... صلح نامہ

(A)

اس قرارداد کو تسلیم کرتے ہی، ایک ساتھ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں یہ بھی تسلیم کرنے کی پابند ہوں گی کہ وہ مندرجہ ذیل اصولوں کو بھی تسلیم کریں، جن کو 'صلح نامہ' کی بنیاد تصور کیا جائے گا، اس کی شرائط دونوں ممالک کے نمائندگان اور یہ کمیشن باہمی طور پر طے کریں گے.

(1) متنازعہ علاقہ (جموں و کشمیر) میں پاکستانی افواج کی موجودگی ایک 'ٹھوس' (جغرافیائی) تبدیلی کا باعث بن رہی ہے، جیسا کہ پاکستانی حکومت کی طرف سے سیکورٹی کونسل کے سامنے تسلیم کیا گیا ہے، اس لئے (اس قرارداد کے تحت) پاکستانی حکومت یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنی تمام افواج کو اس ریاست سے واپس بلائے گی.

(2) حکومتِ پاکستان اپنے تمام تر اور بہترین وسائل کو بروئے کار لاکر اس بات کو یقینی بنائے گی کہ ریاست سے اس کی افواج، قبائل اور شہریوں کا محفوظ اخراج اور واپسی ممکن بن سکے اور ایسے تمام لوگ، جو اس ریاست کے باشندے نہیں ہیں مگر جنگ و جدل اور قبضہ کرنے کی غرض سے داخل ہوئے ہیں، پرامن طریقے سے واپس چلے جائیں گے۔

(3) جب تک کوئی حتمی انتظام نہ کر لیا جائے، تب تک خالی شدہ علاقوں کی نگرانی مقامی انتظامیہ اس کمیشن کے تعاون سے کرے گا۔(یعنی جن علاقوں سے پاکستانی افواج اور قبائل چلے جائیں گے، انہیں مقامی انتظامیہ کے سپرد کیا جائے گا اور وہ اقوامِ متحدہ کے کمیشن کے تعاون سے اس کا نظم و نسق چلایا جائے گا)

(B)

1۔ جب کمیشن کو بھارت کی جانب سے یہ بتادیا جائے گا کہ مقبوضہ علاقے سے پاکستانی افواج، قبائل اور گوریلوں کی واپسی مکمل ہوگئی ہے، جیسا کہ اس قراداد کی شق نمبر II,A,2 میں درج ہے، تو بھارتی نمائندے کی طرف سے بیان کی گئی صورتحال کے مطابق کہ وہاں بھارتی افواج کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، یہ بات یقینی ہوجانے کے بعد کہ پاکستانی افواج بھی

واپس جا چکی ہیں، بھارتی حکومت اس بات پر اتفاق کرتی ہے کہ وہ اپنی افواج کا زیادہ تر حصہ(51%) اس علاقہ سے مختلف مراحل میں (اس کمیشن کے ساتھ تعاون کر کے) واپس بلائے گا۔

2. جب تک کہ اس ریاست کے مستقبل کا کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر لیا جاتا، بھارت اس بات کو یقینی بنائے گا کہ وہ جنگ بندی لائن پر نگرانی کرنے کے لئے اپنی کم سے کم فوجی طاقت موجود رکھے گا جو مذکورہ کمیشن کے مطابق مقامی انتظامیہ کی مدد اور امن وقانون بنائے رکھنے کے لئے ضروری ہوگی، کمیشن اس بات کی نگرانی کے لئے اپنے مبصرین کو اُن مقامات پر تعینات کرے گا، جہاں وہ ضروری اور مناسب سمجھے

3۔ حکومتِ ہند اس بات کو یقینی بنائے گی کہ ریاستِ جموں وکشمیر کی حکومت ریاست میں امن و امان کے قیام اور تحفظ عامہ کا خاطر خواہ انتظام کرے تاکہ یہاں ہر قسم کے انسانی، سیاسی اور سماجی حقوق کے تحفظ ہو سکے اور لوگ اپنی رائے کا ازادانہ استعمال کر سکیں۔

4 اس صلح نامے پر دستخط ہو جانے کے بعد، بھارت اور پاکستانی حکومتیں ان شرائط اور اصولوں سے عوام کو باخبر کریں گی، جو اس قرارداد کے ذریعے دونوں حکومتوں نے تسلیم کی ہیں۔

حصہ سوئم...

حکومتِ پاکستان اور حکومتِ ہند اس بات کا اعادہ کرتی ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل کا فیصلہ اس ریاست کے باشندوں کی مرضی ومنشاء کے ذریعے طے کیا جائے گا، اس قرارداد کے ذریعے دونوں ممالک اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ریاست میں ایک خوشگوار، پرامن اور موافق ماحول تیار کرنے میں اپنی اپنی بساط کے مطابق تعاون کریں گے اور آزادئ اظہارِ رائے کو یقینی بنایا جائے گا۔ ☆☆☆

مذکورہ بالا قرارداد اگست 1948ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پاس کی گئی اور اس پر بھارت اور پاکستان کے حاکمانِ اعلیٰ نے اپنے دستخط کر کے اس میں شامل تمام شرائط اور اصولوں کو تسلیم کیا، قرارداد میں شامل نکتوں اور مشمولات کا بغور جائزہ لیا جائے تو جولُبِ لباب سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ عالمی ادارے نے پاکستان کو کلی طور ایک حملہ آور تسلیم کیا ہے اور اسے صرف چار دنوں کے اندر اندر اپنی مصروفِ جنگ افواج، قبائل اور شہریوں کو واپس بلانے کا پابند بنایا گیا ہے، پاکستانی نمائندہ اس عالمی ادارے میں اپنا کیس پیش کرنے اور اسے منوانے میں بری طرح سے ناکام رہا ہے اور وہ اس بات کو قطعی

طور ثابت نہیں کر پایا کہ اس کی افواج، شہریوں یا قبائل کی موجودگی اس علاقے میں کسی بھی طور پر جائز ہے، وہ یہ بھی نہیں منوا پایا کہ ریاست میں وہاں کے باشندے آزادی کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ بھی کہ بھارتی افواج کی کشمیر میں موجودگی غیر قانونی یا غیر اخلاقی ہے، جب کہ عالمی ادارے نے ایک محدود مقدار اور تعداد میں بھارتی افواج کی ریاست میں موجودگی کو بھی تسلیم کیا ہے اور بھارت سے کہا گیا ہے کہ وہ تب تک اپنی فوج کا کم سے کم حصہ جو کہ 49% سے کم بنتا ہے، یہاں موجود رکھے گا جب تک کہ عالمی ادارے کی نگرانی میں ریاستی عوام اپنے مستقبل کا آزادانہ فیصلہ نہیں کر لیتے، ریاست کے دونوں حصوں میں اقوامِ متحدہ کے فوجی مبصرین کی تعیناتی اور ان کی اب تک موجودگی کے ساتھ یہ شرط بھی جڑی ہوئی تھی کہ بھارت اس ادارے کے ساتھ باہمی صلح ومشورہ کر کے مقامی انتظامیہ کی اعانت کرے گا، یعنی اپنی فوجی قوت یا تعداد کو بڑھاتے وقت اِن مبصرین سے رابطہ قائم کیا جائے گا، انہیں اس بارے میں آگاہ کیا جائے گا اور اپنی نقل وحرکت سے باخبر رکھا جائے گا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا اور یہ مبصرین دونوں جانب اپنے اپنے دفاتر میں قیدی ہو کر رہ گئے ہیں۔ پچھلے بائیس برسوں میں کشمیری عوام کی طرف سے ان کو پیش کی گئی درجنوں یاداشتیں اور فریادیں کوڑے دان میں ڈال دی گئی ہیں۔ خاص طور پر پاکستانی علاقے میں ان کی موجودگی اور خاموشی انتہائی درجے کی معنی خیز ہے۔ پاکستان کو اپنے جنگجو عناصر کو باہر نکالنے کے لئے صرف چار دن دیئے گئے تھے، لیکن تریسٹھ سال گزر جانے کے باوجود 'یہ چار دن' پورے نہیں ہوئے اور وہ ملک اس ریاست پر اس کے بعد بھی حملوں اور سازشوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے، جس کی وجہ سے بھارت کو ریاست کے چپے چپے پر اپنا قبضہ اور بھی مضبوط کرنے کا موقعہ مل رہا ہے، یہ اس ریاست اور اس کے عوام کی سب سے بڑی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے.....؟

30

دفعہ 370 اور قرار دادِ یقین دہانی!

اقوامِ متحدہ کے اس عالمی ادارے نے، جو آج کل امریکہ اور اس کے مٹھی بھر یورپی ممالک کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا ہے اور فلسطین، عراق، افغانستان اور کشمیر سمیت متعدد ایسے مسائل سے آنکھ چرانے اور انہیں پسِ پشت میں ڈالنے کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہے، اگست 1947ء میں اپنی پہلی قرارداد کے ذریعے ریاست جموں و کشمیر کو عارضی بنیادوں پر بھارت کے سپرد کر دیا (دیکھیں قسط نمبر 29) اسے ریاست کا محدود گارڈئین بنادیا گیا اور پاکستان سے کہہ دیا گیا کہ وہ اپنے جنگجوؤں، فوجیوں اور ان شہریوں کو فی الفور یہاں سے واپس بلالے، جو غیر قانونی طور پر ریاست کی حدود میں جنگ و جدل کی غرض سے داخل ہوئے ہیں اور ریاست کے اس حصے کو خالی کر کے مقامی انتظامیہ کے سپرد کر دے، جو اس نے اکتوبر 1947ء کی یلغار کے دوران ہڑپ کر لیا تھا، بھارت اور پاکستان سے کہا گیا کہ وہ چار دنوں کے اندر جنگ بندی کا اعلان کریں اور اپنی اپنی افواج کو کسی ایسے کام کے لئے استعمال نہ کریں، جس کی وجہ سے اس قرارداد کی عمل آوری میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو، بھارت سے کہا گیا کہ وہ اپنی بیشتر افواج کو ریاست سے واپس بلائے اور ایک محدود افرادی قوت کو سرحدوں کی نگہبانی اور مقامی انتظامیہ کی مدد کے لئے یہاں چھوڑ دے، اس کے علاوہ دونوں ملکوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے یہاں ایسا ماحول قائم کریں، جس سے ریاست میں رائے شماری کرانے میں آسانی ہو اور ریاست کے عوام کو آزادانہ طور پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقعہ مل سکے... ان شرائط کے ساتھ عالمی ادارے میں کشمیر کا کیس لاکھوں فائلوں کے ڈھیر کے نیچے دب گیا اور آج تک دبا ہوا ہے۔ نہ تو پاکستانی قبضے والے علاقے خالی ہوئے، نہ وہاں سے پاکستانی افواج باہر نکلیں اور نہ ہی بھارت نے ریاست میں اپنے قبضے کو تقویت دینے کے حربے ترک کئے۔ محدود فوج رکھنے کی اجازت ملی تو بھارت نے اس کی تعداد سات لاکھ تک بڑھا دی۔ پاکستان ناجائز طور داخل ہونے والوں کو باہر کیا نکالتا، اس نے کشمیر کے باقی حصوں کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں جاری رکھیں، کبھی براہ راست اپنی افواج کا استعمال کر کے اور کبھی کشمیریوں کو اس میں الجھا کر قدرت کے اس حسین خطے میں افراتفری جاری رکھی۔

قارئینِ 'پکار' کو یاد ہوگا کہ زیرِ نظر سلسلۂ مضامین کی کئی اقساط میں ہم نے 1947ء اور اس کے آس پاس کے حالات کا ہی ذکر کیا، اور ابھی تک ہم اس دور سے باہر نہیں نکل پا رہے ہیں، وجہ صاف ہے کہ یہی وہ دور تھا جب ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ بدل گئی، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس ریاست کی تقدیر بگڑ گئی اور اس میں رہنے والے عوام کئی حصوں میں بٹ کر رہ گئے، گھروں کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا اور خاندانوں کے خاندان تقسیم ہو گئے، تو بے جا نہ ہوگا۔ بھارت کی تقسیم دراصل پورے برِصغیر کی تقسیم تھی اور دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ کشمیری عوام کی مشکلات اور پریشانیوں کے آغاز کے ساتھ ہوا۔

پاکستان نے کوہالہ سے لے کر اسکردو اور سائچن گلیشر تک کے ایک وسیع و عریض علاقے کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس کو "آزاد کشمیر" کا نام دے دیا گیا، جبکہ اوڑی سے لکھنپور تک کا حصہ بھارت کو مفت میں مل گیا اور موجودہ صورت حال یہ ہے کہ لداخ کے ایک ایسے علاقے پر چین قابض ہے، جس کا رقبہ ساڑھے تین ہزار مربع کلومیٹر سے بھی زیادہ ہے۔

بھارت پاکستان کے ساتھ لڑی جانے والی پہلی کشمیر جنگ میں "دوہرا فاتح" بن جانے کے بعد ایک بار پھر اپنے اندرونی مسائل کی جانب متوجہ ہوا اور یہ دور، جو کہ 1949 سے 1952 تک کے زمانے پر مشتمل تھا، بھارت میں آئین اور قانون سازی کا عمل جاری رہا، کشمیر کا الحاق چونکہ بھارت کے ساتھ عارضی بنیادوں پر ہوا تھا، اس لئے بھارتی آئین میں اس حوالے سے کوئی نہ کوئی دفعہ رکھنا ضروری تھا، جس سے اس ریاست کا اپنا ایک الگ وجود باقی رہے اور جس سے اس علاقے کو بھارت کی دیگر ریاستوں سے ممتاز اور مختلف حیثیت مل سکے، اس لئے بھارتی آئین میں دفعہ 370 کو شامل کیا گیا، جس کی رو سے ریاست جموں و کشمیر کو کچھ تحفظات حاصل رہیں، مثال کے طور پر بھارت کا کوئی بھی شہری اس ریاست میں مستقل طور رہائش اختیار نہیں کر سکتا، نہ ہی یہاں زمین، جائیداد خرید سکتا ہے اور نہ ہی ریاست میں براہ راست قانون نافذ کرنے کا بھارتی اداروں کو حق حاصل ہوگا (حالانکہ اصل صورتحال اس سے مختلف رہی اور بھارت اپنی ہر کوشش میں براہِ راست یا کسی وساطت سے کامیاب رہا اور یہ کام ریاست کے سیاستدان کرسی کی خاطر خود ہی انجام دیتے رہے) اس دفعہ کی تاریخ اگرچہ 1952ء سے بھی کافی پہلے سکھ دور سے اس وقت شروع ہوئی تھی، جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں قحط سالی کے دوران فاقہ کشی سے بچنے کے لئے کشمیریوں نے بھاری تعداد میں ہمسایہ ریاستوں کی طرف ہجرت شروع کی تھی، اس کے بعد ڈوگرہ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے تقریباً 1907ء میں 'اردو تحریک' کے دوران، جب پنجابی بابوؤں کی کشمیر میں آمد شروع ہوئی، ایک ایسا ہی قانون بنایا، جس کی رو سے باہر کے لوگ کام

یا ملازمت کی غرض سے کشمیر آسکتے تھے لیکن وہ یہاں کے مستقل باشندے نہیں بن سکتے۔اس قانون کا چونکہ ریاست کے عوام نے جوش وخروش کے ساتھ استقبال کیا تھا،اس لئے مرحوم شیخ محمد عبداللہ اس کی اہمیت اور موجودگی سے بخوبی واقف تھے۔اسی لئے اقوامِ متحدہ کی جانب سے 1948ء میں ہی ایک اور قرارداد، جسے Resolution of assurances کا نام دیا گیا، پاس کی گئی،اس قرارداد کے حوالے سے بھارت کو اور بھی اختیارات حاصل ہوئے اور اس قرارداد کا لب لباب کچھ اس طرح تھا:

قراردادِ یقین دہانی

1. ریاست جموں وکشمیر کی حفاظت کا ذمہ حکومتِ ہند کے کاندھوں پر ہوگا۔
2 ریاستی حکومت کے اختیار اعلیٰ پر پوری ریاست کی حدود میں کوئی سوال نہیں اٹھائے گا (یعنی اس کا دائرہ اختیار ان علاقوں پر بھی ہوگا، جو پاکستان کے قبضہ میں ہیں،اسی لئے ریاستی اسمبلی میں 25 نشستیں خالی چھوڑ دی جاتی ہیں)
3 خود ساختہ 'آزاد کشمیر' کی حکومت کو کوئی بھی مسلمہ حیثیت حاصل نہیں ہوگی
4 جو علاقہ پاکستان کے قبضے میں ہے اسے ریاست کا قابلِ تنسیخ حصہ تصور نہیں کیا جائے گا۔
5 جن علاقوں کو خالی کیا جائے گا، انہیں ریاست کو واپس کر دیا جائے گا اور ان کا تحفظ بھارت کے ذمہ ہوگا، جو (اگر ضروری سمجھے تو) ان علاقوں کی حفاظت کے لئے اپنے فوجی ٹھکانے قائم کر سکتا ہے تاکہ قبائل اور ایسے ہی دیگر حملہ آوروں کی روک تھام کی جا سکے۔
6 پاکستان کو ریاست کے تمام معاملات سے الگ رہنا ہوگا، خاص طور پر رائے شماری کے حوالے سے کہ جب بھی وہ کروائی جائے گی۔
7 اگر کمیشن کے لئے ریاست میں رائے شماری کروانا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو، ایسی صورت میں کمیشن دوسرے متبادل طریقوں پر بھی توجہ دے گا، جن سے ریاستی عوام اپنے مستقبل کا آزادانہ طور پر فیصلہ کر سکیں۔
8 بھارت پر تب تک رائے شماری کی شرط لاگو نہیں ہوگی، جب تک کہ پاکستان 13 اگست 1948ء کو پاس کی گئی قرارداد میں شامل Part I اور part II میں درج شرائط کو پورا نہیں کرتا (اس قرارداد میں پاکستان سے کہا گیا تھا کہ وہ ریاست سے اپنی افواج کو پوری طرح باہر نکالے گا۔

جہاں تک آئینِ ہند کی دفعہ ۳۷۰ کا تعلق ہے، اس حوالہ سے پرویز دیوان لکھتے ہیں: "

بھارت کی منتخبہ اور قانون ساز اسمبلی (پارلیمنٹ) ایک لمبے عرصے سے بھارتی آئین کی تکمیل میں مصروف تھی، 17 اکتوبر 1949ء کو اس اسمبلی نے آئینِ ہند کی دفعہ 370 کو تسلیم کیا۔ اس دفعہ کی رو سے بھارت اور ریاستِ جموں وکشمیر کے رشتوں اور تعلقات کو حتمی شکل دی گئی، اس کی رو سے ریاست کو ایسا تحفظ حاصل ہوا، جو بھارت کی کسی دسری ریاست کو حاصل نہیں، یہ بھارت کی جانب سے 'دستاویزِ الحاق' میں تسلیم شدہ وعدوں کی تکمیل کا ایک ثبوت تھا'' (کشمیر / صفحہ نمبر/101/)

اس دفعہ کے تحت ریاست کو جو سب سے بڑی حیثیت ملی، وہ یہ تھی کہ اس ریاست کا اپنا ایک علیحدہ آئین ہوگا، یہ حیثیت بھارت میں کسی اور ریاست کو حاصل نہیں اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بھارت اس ریاست میں شرط وشرائط کے تحت موجود ہے، اسی قانون کی رو سے ریاست کو اپنا الگ جھنڈا رکھنے کا حق حاصل ہوا، اس کی رو سے بھارت نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بھارتی پارلیمنٹ کو ریاست میں اپنے قوانین نافذ کرنے کا محدود اختیار حاصل ہوگا، یعنی وہ صرف انہی معاملات میں مداخلت کرسکتی ہے، جن کو دستاویزِ الحاق میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی قانون کے تحت ریاست کا اپنا وزیر اعظم بھی ہوتا تھا، جو سیاستدانوں کی بعد کی غلطیوں یا پھر خود غرضانہ ''سیاسی مجبوریوں'' کی وجہ سے گھٹ کر ''وزیر اعلیٰ'' تک سمٹ گیا۔ اس موڑ پر میرے خیال سے آئینِ ہند کی اس اہم دفعہ کا خلاصہ پیش کرنا مناسب رہے گا

<u>دفعہ 370</u>

1 ریاستِ جموں وکشمیر کے حوالے سے (بھارت کی) عارضی شرائط:

(a) (بھارتی آئین کی) دفعہ 238 کی شرائط کا اطلاق ریاست جموں وکشمیر پر نہیں ہوگا

(b) بھارتی آئین کا دائرۂ اختیار مذکورہ ریاست کے لئے قانون بنانے اور انہیں وہاں نافذ کرنے کے حوالے سے (مندرجہ ذیل شرائط کے تحت) محدود ہوگا:

(I) ایسے معاملات، جو کہ وفاقی فہرست میں شامل ہیں اور مشترکہ فہرست میں شامل ہیں، یعنی دستاویزِ الحاق کی رو سے تسلیم شدہ ہیں، کے حوالے سے وہ قوانین، جن کو لاگو کرنا صدر ہنڈ کے دائرۂ اختیار میں ہے، کو ریاستی حکومت کی وساطت سے ہی لاگو کیا جاسکتا ہے.

(II) ایسے معاملات، جو کہ ان فہرستوں میں شامل ہیں، اور جن کے بارے میں ریاستی حکومت کا اشتراک ضروری ہے، کے حوالے سے صدرِ ہند ایک حکمنامے کے ذریعے جانکاری دیں گے۔

وضاحت: اس دفعہ کے حوالے سے، ریاستی حکومت کا مطلب وہ شخص ہوگا، جسے صدر وقتی

طور پر منتخب کرے گا، جیسے کہ صدر ہند کی ہدائت پر ریاست کے مہاراجہ نے کونسل آف منسٹرس کی ہدایت پر وقتی طور اپنے دفتر کا کام کاج جاری رکھا تھا (مورخہ 5مارچ 1948)

(c) آئین کی دفعہ نمبر ایک اور مذکورہ دفعہ کی شرائط کا اطلاق ریاست کے ساتھ (بھارت کے) رشتوں پر ہوگا۔

(d) آئین کی باقی دفعات کا اطلاق ریاست پر صدرِ مملکت کی طرف سے نشاندہی شدہ تحفظات اور تبدیلیوں حد تک ہی ہوگا، اور صدر ہند رکی طرف سے کوئی ایسا حکم نامہ تب تک جاری نہیں کیا جائے گا، جس کا تعلق دستاویز الحاق کی شق نمبر 1 کی زیریں شق نمبر (b) میں تسلیم شدہ شرائط کے ساتھ ہو، جب تک کہ اس حوالہ سے ریاستی حکومت کو اعتماد میں نہ لے لیا جائے، علاوہ ازیں یہ بھی شرط ہوگی کہ کوئی بھی حکمنامہ، جس کا تعلق اس دستاویز کے ساتھ نہ ہو، تب تک لاگو نہیں کیا جائے گا، جب تک کہ اس کی منظوری ریاستی سرکار نہ دے۔

(2) اگر ریاستی حکومت کی منظوری، شق نمبر 1 کی ذیلی دفعہ 2 کے پیراگراف (II) یا پھر second proviso کے sub-clause کے حوالہ سے ضروری ہو تو ریاستی قانون ساز اسمبلی اس پر غور وخوض کرنے کے بعد اس کی منظوری دے سکتی ہے، اس حوالہ سے جو فیصلہ اسمبلی کرے گی، وہی قابلِ تسلیم ہوگا۔

(3) یہ فعہ اور اس میں شامل تمام شرائط اور باتیں تب تک لاگو رہیں گی، جب تک کہ اس حوالہ سے صدر باضابطہ پبلک نوٹیفکیشن جاری نہ کریں کہ یہ دفعہ فلاں تاریخ سے پوری طرح یا بعض تبدیلیوں کے ساتھ لاگو رہے گی، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہوگی کہ اس کے لئے ریاست کی قانون ساز اسمبلی کی جانب سے سفارشات موصول ہوں (جیسا کہ شق نمبر 2 میں درج ہے)اور ایسا صدر ہند کی جانب سے نوٹیفکیشن جاری کرنے سے پہلے ضروری ہوگا۔

31

دفعہ 370 کو 'دفع' کرنے کی طویل تاریخ....!

ریاست جموں وکشمیر، جس کے لئے ہم صرف 'کشمیر' کا لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں، کے ساتھ تاریخ کے ہر موڑ پر کچھ ایسی زیادتیاں ہوئی ہیں، جن کے بارے میں عام طور پر سوچا بھی نہیں جاسکتا، یہ وہ بدقسمت خطۂ زمین ہے، جسے کبھی غیروں نے لوٹا تو کبھی اپنوں نے، غیروں کی غلامی سے نجات پانے کے ساتھ ہی جہاں اس کے اپنے باشندوں نے پھر سے بیرونی حکمرانوں کو دعوتیں دیں اور اپنی تقدیر ان کے سپرد کر ڈالی، وہیں دوسری جانب اس کو حاصل مرتبہ ومقام اور عزت واحترام کو بھی سرِ عام نیلام کرنے میں اپنوں کا ہی ہاتھ رہا، سیاست دانوں نے اپنے حقیر مفادات کے حصول کے لئے کبھی اس کی خود مختاری اور آزادانہ حیثیت کو ختم کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور کبھی اس کو حاصل خصوصی پوزیشن کی عمارت کو منہدم کروانے کے لئے دوسروں کا سہارا لیا۔ اگر تقسیمِ ریاست (1947 سے لے کر عسکری تحریک کے آغاز (1989) تک کے 42 برسوں کی تاریخ کو ہی دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کشمیری سیاست دانوں نے دلی اور پاکستان کی مدد سے اس ریاست کی تاریخ کو ایسا مسخ کیا ہے کہ اس کا نہ تو کہیں سر ملتا ہے اور نہ ہی پیر۔ اقوامِ متحدہ کے عالمی ادارے نے اپنی کئی قراردادوں کے ذریعے اس ریاست کا مستقبل محفوظ کر دیا تھا لیکن بھارت اور پاکستان کی اجارہ داری پر چوٹ لگی تو انہوں نے ان قراردادوں کو بے اثر اور بے کار بنانے کے لئے ہر وہ حربہ اختیار و استعمال کیا، جو ان کے بس میں تھا۔ دفعہ 370 کو بھارت کے آئین میں شامل کر کے بظاہر ریاست کو بھارت کے ساتھ الحاق کرنے والی دیگر ریاستوں میں ایک ممتاز حیثیت عطاء کی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بیخ کنی کے اقدامات بھی شروع ہو گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، جو کہ بھارت کے پہلے وزیرِ اعظم تھے، کے زمانے میں یہ دفعہ بھارتی آئین میں شامل ہوئی اور انہی کے دور میں اس دفعہ کو 'دفع' کرنے کی کوششیں بھی شروع ہو گئیں۔ انہوں نے خود 27 نومبر، 1963ء کو بھارتی پارلیمنٹ (لوک سبھا) سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ دفعہ 370 کو بے اثر اور بیکار بنانے کی کوششیں جاری ہیں اور آئندہ چند مہینوں کے دوران اس عمل کو مکمل کر لیا جائے گا. برصغیر کے نامور صحافی

اے جی نورانی نے اس موضوع پر اپنی کتاب Nehrus Legacy in foriegn "affairs " میں کچھ اس طرح سے روشنی ڈالی ہے:

''یہ نہرو ہی تھا، جس نے بھارتی آئین کی دفعہ 370 کو مسخ کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا تھا، جو کہ اب محض برائے نام ہی رہ گئی ہے، اس بات کا اشارہ نہرو کے اپنے ہی اس بیان سے ملتا ہے، جو انہوں نے لوک سبھا کے ایک اجلاس سے، 27 نومبر 1963 کو خطاب کرتے ہوئے دیا تھا اور جس میں انہوں نے کہا تھا'' یہ دفعہ (370) ختم ہو چکی ہے، اس حوالے سے پچھلے چند برسوں کے دوران بہت کچھ کیا جا چکا ہے، جس سے ریاستِ جموں و کشمیر اور بھارت کے رشتوں میں دُوریاں کافی حد تک کم ہو چکی ہیں، اب اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ کشمیر اب مکمل طور بھارت کا اٹوٹ انگ ہے، مجھے لگتا ہے کہ اس دفعہ کو دھیرے دھیرے پوری طرح سے ختم کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جانا چاہیے، اس ضمن میں کچھ تازہ اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں اور انہیں اگلے ایک یا دو مہینوں کے دران مکمل کر لیا جائے گا۔ مجھے لگتا ہے اس طرح کے اقدامات کو جاری رکھا جانا چاہیے لیکن میرے خیال سے اس دفعہ کو پوری طرح سے ختم نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ اسے اس طرح سے غیر موئثر کیا جانا چاہیے کہ یہ محض برائے نام باقی رہ جائے۔ ہمیں اس حوالے سے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کشمیری عوام کے فیصلے کا ہی انتظار کرنا چاہئے۔ (یعنی ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ خود کشمیری حکومت اس دفعہ کے خاتمے کے لئے بھارت سے رجوع کرے) اور ہمیں اس فیصلے کو تسلیم کر لینا چاہیے اور یہ عمل جاری ہے۔.... ہم اس حوالے سے ریاستی حکومت اور عوام کی مدد سے کوئی بھی تبدیلی کرنے کے مجاز ہیں، اور یہی سب سے بڑی بات ہے''

پنڈت نہرو، جنہوں نے اقوامِ متحدہ میں کشمیر مسئلہ کو پیش کر کے پاکستان کو ایک حملہ آور اور بھارت کو ریاست کا ''نگران'' قرار دلایا تھا اور بھارتی آئین میں اس ریاست کے مستقبل کے تحفظ کے لئے دفعہ 370 کو اس میں شامل کروایا تھا، صرف ڈیڑھ دہائی گزرنے کے بعد اس قدر بدل چکے تھے کہ وہ ریاست اور مرکز کے درمیان ہوا گزرنے کی جگہ بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسے خاموش اور سست قدم عمل میں مصروف تھے، جس کا مقصد ریاست کو آخر کار بھارتی یونین کا ناقابلِ تنسیخ

حصہ بنانا اور اس کی ہر اُس خصوصی پوزیشن کو ختم کرنا تھا، جس کی وجہ سے دلی اور سری نگر کے درمیان کوئی خلیج یا خلل باقی رہے"

اے جی نورانی اپنی کتاب میں آگے لکھتے ہیں:

"یہ نہرو کا انداز تھا کہ وہ کس طرح سے اپنی 'ضد اور ہٹ دھرمیوں' کو عملی جامہ پہناتے تھے..ان کا ہر معاملے میں یہی طریقہ کار تھا، نہرو نے نہ صرف شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کا حکم صادر کیا تھا، بلکہ اس نے اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ کچھ وقت کے لئے ان سے کوئی بھی نہ مل سکے اور نہ ہی انہیں کسی قسم کی راحت حاصل ہو سکے ...یہ بھی نہرو ہی تھا، جس نے تین ایسے انتخابات کی سرپرستی کی، جن میں دھاندلیاں کر کے مرکز نے اپنے من پسند لوگوں کو کرسی پر بٹھایا تاکہ وہ اپنے ارادوں اور منصوبوں میں رنگ بھر سکے۔ ان میں سے پہلا الیکشن 1951ء کا تھا، جس میں شیخ محمد عبداللہ کو جیتوایا گیا، دوسرا 1957ء اور 1962ء کا تھا، جس میں نہرو نے اپنے منظورِ نظر بخشی غلام محمد کو کرسیِ اقتدار پر بٹھایا۔" نورانی نے بخشی غلام محمد کے لئے "ٹھگ" کا لفظ استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے "نہرو نے اس ٹھگ کا بالکل اسی طرح سے ساتھ دیا، جیسے اس نے پنجاب کے بے رحم اور راشی وزیراعلیٰ پرتاب سنگھ کیروں کا ساتھ دے کر اسے اقتدار پر براجمان کیا تھا۔...9151ء کے انتخابات، جن میں شیخ محمد عبداللہ کو 75 میں سے 73 نشستیں (بلا مقابلہ) حاصل ہوئی تھیں اور اسی قانون ساز اسمبلی نے ریاست کا آئین بھی ترتیب دیا تھا۔ اس الیکشن کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے نہرو نے کہا تھا "کشمیری عوام نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ نیشنل کانفرنس اور بھارت کے ساتھ ہیں" لیکن اس کے چند برس بعد 1957ء میں جب 75 نشستوں کا انتخاب ہوا تو اس میں سے وادی کی 41 نشستیں بخشی غلام محمد کی نیشنل کانفرنس نے بلا مقابلہ جیت لیں۔ اس وقت شیخ محمد عبداللہ سلاخوں کے پیچھے تھے، اس وقت نامزدگی کے کاغذات کو 'کمزور' بنیادوں پر مسترد کر دیا گیا، بخشی کو 75 نشستوں کے ایوان میں 68 نشستوں کی بھاری اکثریت دلائی گئی۔ 1962ء کے انتخابات میں بخشی کی این سی نے 70 نشستیں حاصل کیں، جن میں سے 32 بلا مقابلہ جیت لی گئیں، اس کے بعد 1967ء میں کانگریس حکومت کی سرپرستی کرتے ہوئے غلام

محمد صادق نے ایک نیا حربہ آزمایا، انہوں نے نہ صرف کاغذاتِ نامزدگی کو خارج کر دیا گیا بلکہ اسی کے ساتھ اپوزیشن لیڈروں اور عہدیداروں کی گرفتاری بھی عمل میں لائی۔ ان کے دور میں 22 نشستوں کو بلا مقابلہ کامیاب قرار دیا گیا، جبکہ 17 امیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی کو مسترد کر دیا گیا، جس سے 39 نشستوں پر ان کی جیت آسانی کے ساتھ ممکن ہو پائی تھی، اس بار دلی والوں نے شیخ محمد عبداللہ اور اس کے ساتھی مرزا محمد افضل بیگ کو بری طرح سے دبا دیا تھا۔ جس کا اعتراف بعد میں گانگریس کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے اپنی کتاب "My life and Times" میں بھی کیا ہے اور اس بات کو بھی مانا ہے کہ 1972ء کے انتخابات میں دھاندلیاں ہوئی تھیں۔ اس الیکشن میں کانگریس نے 57 نشستیں حاصل کیں اور حزبِ اختلاف کے لئے صرف 17 نشستیں چھوڑی گئیں''

اس طرح سے بدعنوانیوں اور زیادتیوں کے ایک طویل دور کا جائزہ لینے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سید میر قاسم نے اپنے دور میں نیشنل کانفرنس کو تقریباً تقریباً غیر موثر کر چھوڑا تھا اور خود کانگریس میں شرکت اختیار کر لی تھی، ان کی حکومتیں بدعنوانیوں پر مشتمل انتخابات کے نتیجے میں تشکیل پائی تھیں، جن کا ایک ہی مقصد تھا کہ کس طرح سے ریاست کو ایک منفرد مقام دلانے والی دفعہ 370 کو ریاستی (کٹھ پتلی) حکومت کے ہاتھوں 'دفع' کیا جا سکے اور اس بات کا اعتراف خود نہرو نے لوک سبھا میں اپنے خطاب کے دوران بھی کیا تھا...اس بات میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے''

اے جی نورانی کی مذکورہ کتاب مرکزی سرکاروں کی زیر سرپرستی ریاستِ جموں و کشمیر میں انتخابی دھاندلیوں کا ایک جامع احاطہ کرتی ہے اور انہوں نے اس سلسلے کو 1987ء کے ان انتخابات کے ساتھ ملا دیا ہے، جن میں بدعنوانیوں اور دھاندلیوں کے تمام ریکارڈ مات کر دیئے گئے اور نورانی کو اس بات میں کوئی شک و شبہہ نہیں کہ ریاست میں موجودہ عسکری تحریک کے آغاز کی بنیاد بھی اسی بدعنوان الیکشن نے فراہم کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں ''1987ء کی انتخابی بدعنوانیوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں 'ہار جانے' (یا ہرائے جانے) والے امیدواروں پر جان لیوا حملے کئے گئے، ان کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں، ان میں وہ سید صلاح الدین بھی شامل تھے، جو اب حزب المجاہدین کے سرپرست ہیں، ان کو ہرا کر غلام محی الدین شاہ کو کامیاب قرار دے دیا گیا۔ عسکری میدان کو فراہم ہونے

والی قیادت کا بیشتر حصہ اسی انتخابی بدعنوانی کا نتیجہ تھا، جس نے اس 'جمہوری عمل' میں حصہ لیا تھا۔ اس الیکشن میں این سی کو 39 سیٹیں ملی تھیں، کانگریس(I) کو 24، مسلم متحدہ محاذ کو صرف چار (جن میں آج کے حریت رہنماء سید علی گیلانی، محمد سعید شاہ اور غلام نبی سمجھی بھی شامل تھے) آزاد امیدواروں کو چار نشستیں ملی تھیں اور بی جے پی کو دو'

ان سارے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس بات میں کوئی شک وشبہہ باقی نہیں بچتا کہ آئینِ ہند کی دفعہ 370، جس کو ریاست جموں وکشمیر کو ایک خصوصی پوزیشن عطاء کرنے کی غرض سے اس میں شامل کیا گیا تھا، کو ایک منصوبہ بند طریقے سے ختم کرنے کا ایک سست رفتار مگر طویل سلسلہ اس دفعہ کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو کر برابر آج تک جاری ہے۔ جو شیخ محمد عبداللہ 1947ء میں بھارت کا واحد غمخوار، مگر طاقتور دوست بن کر سامنے آیا اور کشمیر کو ایک مسلم اکثریتی ریاست ہونے کے باوجود پاکستان کے قبضہ میں جانے سے بچانے میں بھی معاون ثابت ہوا، وہی 1957ء میں، صرف دس برس بعد بھارت کا سب سے بڑا 'دشمن' بن چکا تھا اور اسے ہرانے اور نیست ونابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، اسے جیل میں ڈال کر بخشی غلام محمد کو میدان میں اتار دیا گیا اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے اسے مضبوط حکومت بنا کر دی گئی اور آگے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا گیا تا کہ ریاستی حکومتوں کو اس بات کے لئے استعمال کیا جائے کہ وہ مرکز اور ریاست کے درمیان حائل اس دیوار، جس کا نام 'دفعہ 370' تھا کو ڈھانے میں مددگار ثابت ہو سکیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ریاستی حکومتیں وقتاً فوقتاً یہ کام انجام دیتی رہیں اور مرکز کے کام کو آسان بنانے میں ان کا کافی ہاتھ شامل رہا۔

جہاں تک شیخ محمد عبداللہ کا تعلق ہے، انہوں نے 1952 کے دہلی ایگریمنٹ کے فوراً بعد اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ ریاست کی خودمختاری کو بھارتی وفاق میں تحلیل کرنے کا عمل ایک ''قانونی غلطی' ہوگی، اس لئے انہوں نے اس معاہدے کو اہمیت دینے میں کافی احتیاط سے کام لیا، انہوں نے دلی کی حکومت سے اصرار کیا کہ وہ اس معاہدے پر نظرِ ثانی کرے یا پھر اسے سرے سے ہی کالعدم تصور کرے لیکن دہلی والوں نے ان کی ایک نہ مانی اور ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ پہلے سے نافذ العمل دہلی معاہدے پر عملدرآمد کریں اور یہی وہ بنیادی اختلاف تھا، جس کی وجہ سے شیخ محمد عبداللہ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان دوریاں پیدا ہونے لگیں۔ پرویز دیوان اس حوالے سے لکھتے ہیں: ''(دونوں کے درمیان اس قدر اختلافات بڑھ گئے کہ)9 اگست 1953 کو بھارت سرکار نے ڈاکٹر کرن سنگھ، جو کہ اس وقت صدرِ ریاست تھے، کو حکم دیا کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کو وزیراعظم کے عہدے سے برطرف کر دیں،

ان کی گرفتاری عمل میں لائیں اوران کی جگہ بخشی غلام محمد کو وزیراعظم بنا دیا جائے، اس دوران شیخ محمد عبداللہ کے قریبی ساتھی مرزا محمد افضل بیگ کی گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی۔اس وقت خود بخشی بھی کابینہ میں شامل تھے۔

32

این سی کی بغاوت اور محاذ رائے شماری کا قیام!

پنڈت جواہر لال نہرو کی کشمیر پالیسی اب عیاں ہو چکی تھی، اس نے مسلسل تین بار اسمبلی انتخابات میں اپنا خاص کردار ادا کر کے کشمیر کی گدھی پر اپنے من پسند وزرائے اعظم کو بٹھا کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ریاست جموں و کشمیر کو بھارتی وفاق کا ایک نا قابلِ تنسیخ حصہ بنا دینے پر بضد ہیں اور اپنے منصوبے کو کسی بھی جائز یا ناجائز طریقے سے عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں، انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے بعد بخشی غلام محمد اور سید میر قاسم کو کشمیر کے اقتدار کی طوائف کا دیوانہ بنا کر بالآخر شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کروا کر جیل بھیج دیا اور اپنے اگلے مورچوں پر سرگرم رہے۔ 9اگست 1953ء کو شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کروا کے جیل بھیج دیا گیا، یہ ایک ایسا دور تھا، جب شیخ محمد عبداللہ کو عوام کے تقریباً تمام طبقوں میں اچھا خاصا مقام اور مرتبہ حاصل ہو چکا تھا، خاص طور پر کشمیر اور دوڈہ کے مسلمانوں اور جموں کی پسماندہ ہندو ذاتوں کے درمیان شیخ محمد عبداللہ کے انتظامی اقدامات کی وجہ سے ان کا قد کافی اونچا ہو چکا تھا، خاص طور پر ان کی طرف سے متعارف کرائی گئی زرعی اصلاحات کی وجہ سے کشمیر کا تقریباً ہر غریب کنبہ مستفید ہوا تھا، اس لئے ان کی گرفتاری کے وقت ان کے مداحوں نے ریاست بھر میں احتجاجی جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کا اہتمام کیا اور حکومت کے خلاف اپنی ناراضگی درج کروائی۔ پرویز دیوان کے مطابق شیخ کی گرفتاری کی وجہ سے کشمیر میں کئی مہینوں تک زندگی کا کاروبار ہی تھم کر رہ گیا، حد یہ تھی کہ وادی اور جموں کے ڈوڈہ اور بھدرواہ کے علاقوں میں امن و قانون کو برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ انتظامیہ کو مجبوراً پولیس فورس کو استعمال کرنا پڑا اور اس دوران نیشنل کانفرنس کے درجنوں کارکن مارے گئے اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ لیکن بدقسمتی سے ان دنوں کے حالات کا بھی وہی حال ہوا ہے، جو 90 کے اوائل کے حالات کا ہوا، جب موجودہ عسکری تحریک کا آغاز ہوا۔ 1953 کے حالات درج کرنے والوں نے بھی اسی طرح سے حقائق کو مسخ کیا ہے اور بعض قلم کاروں نے اگرچہ اسے طوفانِ بدتمیزی سے تعبیر کیا ہے تاہم بعض نے لکھا ہے کہ اقتدار کی یہ منتقلی پرامن تھی۔ کیا شیخ کی گرفتاری ضروری تھی؟ اس حوالے سے تجزیہ کرتے ہوئے سرکردہ مبصر ای این دتا اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں: ”ایک طویل اور سخت ترین

عدالتی کاروائی کے باوجود بھی شیخ محمد عبداللہ کے خلاف عائد کیا گیا کوئی بھی جرم ثابت نہیں ہوسکا، عدالت کواپنا کیس خارج کرنا پڑااورایک بارپھرنہرو کی ہی مداخلت پرشیخ کورہا کردیا گیا۔

شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے بعد ایک نئی بات یہ ہوئی کہ نیشنل کانفرنس کے بے شمار ممبران نے این سی چھوڑ کر''محاذ رائے شماری''تشکیل دیا اور 9اگست1955ءکواس کا پہلا صدر مرزا محمد افضل بیگ کو بنایا گیا(مرزا محمد افضل بیگ کو اسی سال کے اوائل میں جیل سے رہا کردیا گیا تھا)اس محاذ کا مطالبہ تھا کہ عوام کو ریاست کے مستقبل کا تعین کرنے کا موقعہ دیا جائے تاکہ وہ فیصلہ کرسکیں کہ وہ اپنے سیاسی مستقبل کے حوالے سے کیا چاہتے ہیں،شیخ محمد عبداللہ نے اگرچہ اس محاذ کی حمائت کی لیکن وہ اس کے باضابطہ ممبر کبھی نہیں بنے،اس محاذ کو1975ءمیں تحلیل کردیا گیااوراسے پھرسے نیشنل کانفرنس میں ضم کردیا گیا۔اس محاذ پر1971 میں اس وقت پابندی عائد کردی گئی تھی،جب بھارت میں یہ قانون بنا کہ ان تنظیموں اورشخصیات کی سرگرمیوں کومحدود کردیا جائے،جو بھارتی وفاق سے خودمختاری یاعلیحدگی کا مطالبہ کرتی ہیں،محاذ کے خاتمے کے بعد جولوگ واپس نیشنل کانفرنس میں نہیں لوٹے،ان کولے کر بخشی غلام محمد نے نیشنل کانفرنس کااپنا ٹولہ برقراررکھا۔

ادھر1954ءمیں مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے حالات اس قدرصاف ہونے لگے تھے کہ بھارت نے پاکستانی وزیراعظم محمد علی بوگڑہ کو بھارت آنے کی دعوت دی اور کشمیر کے حوالے سے مذاکرات کے دوران یہ طے پایا کہ اپریل1954میں دونوں ملک مشترکہ طور پر ریاست کے لئے ایک ''رائے شماری منتظم''(Plebsite adminstrator) مقرر کریں گے،جو ریاست کے عوام کی رائے جان کر دونوں ملکوں کو اپنی رپورٹ پیش کرے گا،تاکہ اس کے بعد آگے کا لائحۂ عمل تشکیل دیا جائے۔دونوں ملکوں کی اس تجویز پر اقوامِ متحدہ کی طرف سے'سر اون ڈکسن(Sir Owen Dixon) کواس کام کے لئے تعینات کیا گیا۔اس موقعہ پر ہلال احمد وار اپنی کتاب(Realities behind Kashmir problem)میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عین اس موقعہ پر جب اقوامِ متحدہ کی جانب سے ڈکسن کوکشمیر میں رائے شماری منتظم بنا کر بھیجا گیا،پاکستان نے ایک اور غلطی یہ کی کہ اس نے ریاست کے گلگت اوربلتستان علاقے کوروس کے خلاف امریکی فوجی سرگرمیوں کے لئے کھول دیا،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس نے اقوامِ متحدہ میں امریکہ کے خلاف ووٹ دیا،جس سے بھارتی منصوبوں کوتقویت ملی اور مسئلہ کشمیر کونقصان پہنچا۔ہلال وار پاکستان کی اس کوشش کو مسئلہ کشمیر کے تئیں اس ملک کی من مانیوں اورغلط پالیسیوں کی لمبی فہرست میں سے ایک اورغلطی قرار

دیتے ہیں۔

''1956ء تک بھارت ریاستِ جموں وکشمیر کے پورے علاقے، بشمولِ آزاد کشمیر کو ایک متنازعہ خطہ قرار دیتا رہا اور اس کے مستقبل کا تعین کرنے کے لئے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کو عملا نے پر زور دیتا رہا لیکن اسی سال کے آخیر تک بھارتی سٹینڈ میں ایک نمایاں تبدیلی رونماء ہوئی اور بھارت نے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کو زائد المیعاد قرار دیتے ہوئے یہ نکتہء نظر اپنایا کہ یہ ریاست بھارت کا ایک ناقابلِ تنسیخ حصہ ہے، جبکہ 17 نومبر 1956ء کو ریاستی قانون ساز اسمبلی نے بھی اپنے آئین میں ایک نئی دفعہ (دفعہ 3) کو شامل کر کے اس بات کو تسلیم کیا کہ ''ریاستِ جموں وکشمیر بھارت کا ناقابلِ تنسیخ حصہ ہے اور ہمیشہ رہے گا'' (پرویز دیوان / کشمیر / صفحہ نمبر 103) اسی آئین کی دفعہ 4 میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ''ریاستِ جموں وکشمیر کا مطلب وہ سبھی خطے اور علاقہ جات ہیں، جو کہ 15 اگست 1947 کے دن ریاست کے حکمران (مہاراجہ) کے زیرِ قبضہ تھے، یعنی جموں، کشمیر، لداخ، آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان کے شمالی علاقہ جات پر مشتمل ایک وسیع وعریض سرزمین کے بارے میں اسمبلی نے تسلیم کیا کہ یہ علاقہ بھارت کا ''اٹوٹ انگ'' بنا رہے گا۔ نام نہاد قانون ساز اسمبلی کی طرف سے ان قوانین کو منظوری دینے کے بعد بھارت کا کشمیر کے بارے میں موقف تبدیل ہو گیا اور اس دن کے بعد اس نے اس ریاست کو بھارت کا 'اٹوٹ انگ'' کہنا شروع کر دیا، اب بھارت کا جھگڑا پاکستان کے ساتھ صرف اُس کے زیرِ قبضہ علاقہ جات تک ہی محدود رہ گیا تھا اور اس سے پہلے جو بھارت پاکستان کو ایک حملہ آور قرار دیتا تھا، اب اس کو محض اپنے چند علاقوں پر قابض قرار دینے لگا۔ یہی وہ مقصد اور منزل تھی، جو بھارتی وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو ریاست میں اپنی مرضی کی سرکاریں قائم کر کے حاصل کرنا چاہتے تھے اور اسی لئے انہوں نے دہلی ایگریمنٹ کی مخالفت کرنے والے اپنے اولین دوست شیخ محمد عبداللہ کو تب تک جیل میں ار رکھا، جب تک کہ انہوں نے کانگریس کی حکومت کے ذریعے یہ مقصد حاصل نہ کر لیا۔

اگر ایک نظر میں 1953 سے 1975ء تک کی ریاستی حکومتوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حکومتیں ایک لحاظ سے کافی ''عوام دوست'' ثابت ہوئیں، وجہ صاف تھی کہ ان حکومتوں کو مرکز کی آشیرواد حاصل تھی، ونوں ایک دوسرے کا کام انجام دے رہی تھیں، ریاستی سرکار مرکز کے منصوبوں میں رنگ بھر رہی تھی اور بدلے میں مرکز نے ان کے لئے اپنے خزانوں کے در و دیوار کھول رکھے تھے۔ ریاستی عوام کی غربت، مفلوک الحالی، پسماندگی اور افلاس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے

کانگریس نے مرکز سے لے کر ریاست تک عوام کو مفت خوری اور مراعات کا ایسا غلام بنا ڈالا کہ وہ یہ تک نہ سمجھ سکے کہ انہیں دھیرے دھیرے اثر کرنے والے ایک خطرناک مگر میٹھے زہر سے ختم کرنے کا ایک سست رفتار عمل جاری تھا۔ عوام کو سستا چاول اور سستی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی دراصل انہیں جامع سیاسی عمل سے دور رکھ کر اپنے دور رس منصوبوں کی تکمیل کرنا تھی اور حکومتیں اس میں اچھی طرح سے کامیاب ہو رہی تھیں۔ اور حد یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی کبھی کبھار بڑے بزرگ بخشی صاحب اور صادق صاحب کے دور کو ''عوام دوست'' قرار دیتے ہوئے نہیں تھکتے، تاہم اس دوران ایک بات قابلِ ذکر تھی کہ ریاست کے حاکمِ اعلیٰ کو وزیراعلیٰ کی بجائے وزیراعظم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس دوران شیخ محمد عبداللہ کی حراست کا سلسلہ جاری رہا اور انہیں کبھی ان کے گھر میں اور کبھی کسی جیل یا ویران جگہ پر نظر بند رکھا گیا، سرینگر کے سینٹرل جیل میں اپنی نظر بندی کے دوران مصنف نے بھی اس سیل کے آثار دیکھے تھے، جس میں کبھی شیخ محمد عبداللہ کو نظر بند رکھا گیا تھا۔ 90ء کے بعد جب عسکریت پسندوں کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں تو انہوں نے اس سیل کا نام ونشان مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اگر چہ اس کی دیواریں مٹا دی گئی ہیں لیکن ابھی تک یہ سیل کسی نہ کسی حال میں جیل کے شمالی حصے میں ''سنگین'' کے قریب موجود ہے۔ مصنف اپنی طویل حراست کے دوران شام کے وقت جب بھی اس سیل کے سامنے سے گزرا تو قدم خود بخود اس جگہ رُک گئے کیونکہ اس کا تعلق کشمیر کی آزادی سے تھا اس کے علاوہ انہیں سرینگر جموں شاہراہ پر واقع کدھ کے مقام پر، بھدرواہ کے قلعے میں اور تامل ناڈو کے پہاڑی مقام 'اوٹی' میں بھی نظر بند رکھا گیا اور اس سب کا مقصد صرف اور صرف شیخ محمد عبداللہ کو عوام سے دور رکھنا تھا، جو عوام کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ ان کی شناخت اور قومیت کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، تاریخی مضامین کے رواں سلسلے کی اگلی چند اقساط میں ریاست کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے تقسیم برصغیر سے لے کر اندرا عبداللہ ایکارڈ تک کے ریاستی حکمرانوں کے حالات زندگی اور سیاسی مجبوریوں پر سرسری بحث کی جائے گی اور ان حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی، جن کے تحت وہ مرکز کے 'آلۂ کار' بنے رہے اور ریاست کی خصوصی پوزیشن کو ختم کرنے کا باعث بھی بنے۔

33

منقسم کشمیر کے وزرائے اعظم ...1

1... مہر چند مہاجن

ریاستِ جموں و کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے دوران مہاراجہ کو اختیارِاعلیٰ حاصل ہوتا تھا، یعنی وہ ایک شخصی حکمران کی حیثیت رکھتا تھا اور اپنی مرضی کے مطابق ریاست کا کام کاج چلانے کے لئے اپنے وزراء کی ایک کونسل قائم کر کے انہیں مختلف محکمہ جات سونپ دیتا تھا۔ اس کونسل کے سربراہ اور مہاراجہ کے سامنے جوابدہ وزیر کو وزیراعظم کہا جاتا تھا، ریاست کی تقسیم کے وقت جب کہ بھارت اور پاکستان اپنی آزادی کی طرف بڑھ رہے تھے، کشمیری قیادت کی پریشانی یہ تھی کہ وہ ایک نئ غلامی کو گلے لگانے کے لئے بیتاب بیٹھے تھے، کشمیر میں مہاراجہ ہری سنگھ کو بھارت اور پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے میں قدرے تامل ہی تھا لیکن مسلم قیادت دوانتہاؤں پر منقسم ہو کر ایک طرف ریاست کو بھارت کے حوالے کرنے کے لئے کوشاں تھی اور دوسری طرف پاکستان کو اپنا آقاء اور ماویٰ بنانے پر آمادہ۔ مہاراجہ یہ سمجھتا تھا کہ اسے تقسیم برصغیر کی صورت میں بھارت اور پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی الحاق نہیں کرنا چاہیے بلکہ دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات برقرار رکھتے ہوئے اسے ایک رابطے کے پُل کی طرح کام کرنا چاہیے، حالانکہ اسے اس بات کا احساس بھی تھا کی مشرق میں چین اور روس جیسے دو طاقت ور مما لک کشمیر کو کبھی بھی ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے طور پر دیکھنا پسند نہیں کریں گے اور ان سے بچنے کے لئے اسے کسی بڑے ملک کا دامن تھامنا ہی پڑے گا لیکن اس کے باوجود وہ کم از کم بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کی بجائے پاکستان کی جانب زیادہ مائل و قائل تھا لیکن جیسا کہ سابقہ اقساط میں بیان کیا جاچکا ہے کہ بھارت کی جانب رجوع کرنے کے لئے اول تو پاکستانی حملہ آوروں نے اسے مجبور کیا، دوم شیخ محمد عبداللہ اس وقت تک ایک تنہاء اور موثر قائد کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آچکے تھے اور حالات کی رو پوری طرح سے ان کے ہاتھ میں تھی، ان کا جھکاؤ بھارت کی جانب تھا اس لئے مہاراجہ قبائلی حملہ کے وقت دو پل کے لئے سوچ بھی نہ سکے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے، لہذا انہیں بھارت سے فوری امداد کے لئے رجوع کرنا پڑا، لیکن اس دوران شیخ محمد عبداللہ کے علاوہ ایک اور ایسا کردار بھی موجود تھا، جس نے

ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کے لئے راہ ہموار کی اوراس کردار کا نام تھا مہر چند مہاجن، جواس وقت مہاراجہ کا وزیراعظم تھا۔

''وکی پیڈیا انسائکوپیڈیا'' کے مطابق مہر چند مہاجن کا جنم 23دسمبر1889ء میں ٹیکہ نگروٹہ، ضلع کانگڑہ میں ہوا، وہ 1947ء کے آس پاس (شیخ محمد عبداللہ سے پہلے) مہاراجہ کا وزیراعظم بنا، اس نے ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کے حوالے سے اہم رول ادا کیا، اسے کانگریس نے 'ریڈکلف ایوارڈ' کے دوران اپنا نمائندہ نامزد کیا، اس کمیشن کو انگریزوں نے بھارت اور پاکستان کی سرحدیں تعین کرنے کا کام سونپا تھا، مہاجن نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک قابل وکیل کے طور پر کیا، اس کے بعد وہ ایک جج بنا، اس نے ایک موثر سیاستدان کے طور اپنا رول نبھایا۔1913ء میں ہماچل پردیش کے دھرم شالہ قصبے میں ایک وکیل کی حیثیت سے کام شروع کیا، ایک سال کے بعد وہ مزید تعلیم کے حصول کے لئے گورداسپور چلے گئے جہاں وہ چار سال تک رہے،1919ء میں لاہور چلے گئے اور باضابطہ طور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہاں انہوں نے اپنی زندگی کے 25سال اسی پیشے میں گزارے، 1938ء میں انہیں لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کا صدر بنایا گیا، وہ اس عہدے 1943 تک پر پورے15 سال قائم رہے۔

لاہور سے آنے کے بعد وہ مہاراجہ ہری سنگھ کے کافی قریب آگئے اور بعد میں ریاست کے وزیراعظم کی حیثیت سے انہوں نے مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ انہیں پاکستان کی بجائے بھارت کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے، حد بندی کمیشن کے دوران ان کی ہی کوشش کی وجہ سے گورداسپور ضلع کو پاکستانی لاہور کی بجائے بھارتی پنجاب کے ساتھ جوڑا گیا۔

تقسیم کے دوران مہاجن نے ریاست میں جو رول بھارت کے حق میں ادا کیا تھا، اس کے بدلے میں انہیں 4 جنوری1954ء میں بھارت کے چیف جسٹس کی کرسی پیش کی گئی، وہ بھارت کے نظامِ قانون کے تقریباً ایک سال تک سربراہ رہے حتیٰ کہ 22 دسمبر1954ء کو نوکری سے سبکدوش ہو گئے۔اس سے قبل انہیں 1948ء میں بھی آزاد بھارت کا پہلا جج بنایا گیا اور وہ اس عہدے پر 4اکتوبر1948سے 3 جنوری1954ء تک فائز رہے۔

مہر چند مہاجن اس کے علاوہ جن عہدوں پر فائز رہے، ان میں1933 تا1944 تک وہ پنجاب نیشنل بینک کے ڈائریکٹر رہے،1938سے1943 تک وہ DAV کالج کی مینجنگ کمیٹی کے صدر رہے،1940 سے1947ء تک پنجاب یونیورسٹی کے فیلو پروفیسر رہے،1943ء میں لاہور ہائی

کورٹ کے جج بنے،1946ء میں میوٹنی کمیشن کے ممبر رہے۔1947ء سے1948ء کے درمیانی سال میں ریاستِ جموں وکشمیر کے وزیراعظم بنے،1947 میں ہی انہیں پنجاب باؤنڈری کمیشن کاممبر بھی بنایا گیا،1948ء میں مہاراجہ آف بیکانیر کے قانونی مشیر رہے،1948ء میں ان کو پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے LLD کی اعزازی ڈگری بھی عطاء کی گئی۔ جبکہ اس کے بعد انہیں پنجاب فروٹ ڈیولپمنٹ بورڈ کاممبر بھی بنایا گیا۔

2....شیخ محمد عبداللہ!

شیخ محمد عبداللہ کا زمانہ ریاستِ جموں وکشمیر کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا، جب جنگِ عظیم دوم کے بعد پوری دنیا کا سیاسی نقشہ تبدیل ہورہا تھا، برطانوی نوآبادیات کا خاتمہ ہورہا تھا،مختلف قومیں اپنی آزادی کیلئے برسرِ پیکارتھیں اور برصغیر میں انگریزوں کےقدم اکھڑ چکے تھے، بقولِ پی این دھر یہ ایک ایسا وقت تھا، جب بھارت اور پاکستان اپنی آزادی کیلئے کوشاں تھے اور کشمیری ایک نئی غلامی کےطلوع کیلئے چپ چاپ منتظر تھےاور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ بدلتی ہوئی صورتحال میں انہیں کیا کرنا چاہئے اور اپنی آزادی اور خودمختاری کو کیسے بچانا چاہیے، انہوں نے ایک انٹرویو کے دوران اس نمائندے کوسال2004ء میں بتایا تھا کہ جب1943ء کےآس پاس انہوں نے چند کشمیری دانشوروں کومشورہ دیا کہ انہیں برصغیر کی بدلتی ہوئی صورتحال کے پیش نظرکم ازکم اپنی معاشیات کےحوالے سےکوئی پالیسی وضع کرنی چاہیےتاکہ اس چھوٹی سی ریاست کودونوں کا نوالہ بننے سے بچایا جاسکےتو اس کے جواب میں انہیں بتایا گیا تھا ”پنڈت لڑکا جوانی کے جوش میں دیوانوں جیسی باتیں کرتا ہے، بھلا بھارت اور پاکستان کی آزادی کا کشمیر پرکیااثر پڑسکتا ہے؟“اس بات سے مایوس ہوکر دھرکشمیرچھوڑکرافغانستان چلے گئےاوروہاں استادکاپیشہ اختیارکرلیااور چندسال بعد جب تقسیم کاسیلاب اٹھ آیاتو کشمیریوں کوسینگ سمانے کی بھی جگہ نصیب نہ ہوئی...اورشیخ محمد عبداللہ نے ایسے ہی نامسائد حالات میں کشمیر کی قیادت کواپنے ہاتھ میں لیااورریاست کاالحاق بھارت کےساتھ کرواکرہی دم لیا۔

شیخ محمد عبداللہ،جنہیں کشمیر میں’شیرِکشمیر‘کےنام سےبھی جاناجاتاہے،کاجنم5دسمبر1905ء کوسرینگر کےملحقہ صورہ علاقے میں ہوا،ان کی وفات8ستمبر1982ءکوسرینگر کی ایم اے رروڈ کی رہائش گاہ پرہوئی،انہوں نے پہلےمسلم کانفرنس نام کی سیاسی جماعت کی بنیادڈالی اور بعدمیں11جون 1939ءمیں اسےنیشنل کانفرنس میں بدل دیا،جس کی وجہ سے ریاست کے غیرمسلم بھی ڈوگروں کے خلاف ان کےساتھ جاملےاوراس جماعت کوریاست کی پچھلی سات دہائیوں کی تاریخ میں کافی عمل

دخل حاصل رہا ہے اور موجودہ زمانے میں بھی اسی کی حکومت قائم ہے۔اس حوالہ سے شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات ''آتشِ چنار'' میں بھی غلطی ہوئی ہے، صفحہ نمبر ۱۶۷ پر شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں ''مجھے اپنی قید کی عیاد پوری کرنے پر ۲۸ فروری ۱۹۳۹ء کو جیل سے رہا کر دیا گیا'' جبکہ اسی صفحے کے اگلے پیرا گراف میں درج ہے ''۱۱ جون ۱۹۳۸ء کو مسلم کانفرنس کا خاص اجلاس شاہی مسجد میں بلایا گیا، اس کی صدارت خواجہ غلام محمد صادق نے کی، جس میں نیشنل کانفرنس کا اعلان کیا گیا''

بہرحال شیخ محمد عبداللہ نے 1933ء میں مائکل ہیری نیڈو کی صاحبزادی بیگم اکبر جہاں کے ساتھ اپنا رشتۂ ازدواج باندھا، نیڈو ایک امیرِ زماں یوروپی پراپرٹی ڈیلر اور کئی ہوٹلوں کے مالک کا اکلوتا بیٹا تھا، جن میں ایم اے روڈ پر واقع نیڈوز ہوٹل بھی شامل تھا۔انہوں نے ایک کشمیری لڑکی مرجان کے ساتھ شادی کی تھی، جن سے بیگم اکبر جہاں تولد ہوئیں۔ایک کشمیری قلمکار تارق علی کا دعویٰ ہے کہ بیگم اکبر جہاں کی پہلی شادی ایک عربی باشندے کرم شاہ کے ساتھ ہوئی تھی، جس کے بارے میں کلکتہ کے ایک اخبار ''دی لبرٹی'' نے انکشاف کیا تھا کہ وہ دراصل ایک انگریز تھا، جو برطانیہ کی ایک سراغ رساں ایجنسی کے لئے کام کرتا تھا۔اس خبر کے شائع ہوتے ہی وہ کہیں لاپتہ ہو گیا، طارق کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اکبر جہاں کی پہلی طلاق 1929ء میں ہوگئی تھی جبکہ اس کے چار سال بعد 1933ء میں وہ شیخ صاحب کے عقد میں آئیں۔شیخ محمد عبداللہ نے مہاراجہ کی شخصی حکمرانی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور سیلف رول کا مطالبہ پیش کیا، جس میں انہیں عوام کی بے پناہ پشت پناہی نصیب ہوئی اور انہیں اکتوبر 1947ء میں بھارت کے ساتھ متنازعہ الحاق کے بعد پہلے ریاست کا عارضی منتظم بنایا گیا اور بعد میں منقسم (یا آزاد) ریاستِ جموں وکشمیر کا پہلا وزیر اعظم۔اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے انہیں کبھی جیل میں ڈال دیا گیا اور کبھی جلاوطن کیا جاتا رہا 1974/75ء میں انہوں نے بھارتی وزیر اعظم کے ساتھ ایک اور ایکارڈ کیا، جس کے بعد انہیں ریاست کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا، اس طرح سے وہ ریاست کے پہلے وزیر اعظم بھی تھے اور آخری بھی۔وہ اپنی وفات، 8 ستمبر 1982 تک ریاست میں ایک قد آور سیاستدان کی حیثیت سے سرگرم رہے۔مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی زندگی کی تاریخ متعدد اُتار اور چڑھاؤ سے بھری پڑی ہے، جو تاریخی مضامین کی رواں سیریز میں وقتِ ضرورت بیان کی جاتی رہے گی ۔

☆☆☆☆

34

منقسم کشمیر کے وزرائے اعظم....(2)

شیخ محمد عبداللہ..(گزشتہ سے پیوستہ)

شیخ محمد عبداللہ کی تقدیر اس لئے بھی کافی اچھی تھی کہ انہیں کشمیر کی تاریخ کا رخ موڑنے کا موقعہ ایک ایسے وقت میں ملا، جب پوری دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی، بہار کی آمد سے قبل جیسے نرگس کی ننھی سی کونپلیں بھاری بھرکم اور ٹھنڈی زمین کا سینہ چیر کر باہر آنے کی کوشش کرتی ہیں، بالکل اسی طرح سے یہ دور بھی کچھ ایسا تھا کہ دنیا کے نقشے پر نوآبادیاتی دور کا خاتمہ ہو رہا تھا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا بھر کی دبی کچلی اقوام اسی نرگس کی ننھی کونپل کی طرح سخت اور بنجر زمین سے باہر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پڑھی لکھی، مہذب اور بیدار اقوام کی بات ہی نہیں، کشمیر جیسی سرزمین، جس پر کئی صدیوں سے غلامی کے مہیب سائے منڈلاتے رہے تھے اور جہاں انسانوں کو جانوروں سے بھی بدتر تصور کیا جاتا تھا، میں بھی امید کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، عوام نے ڈوگرہ شاہی کے خلاف اعلانِ جنگ کر تو دیا تھا لیکن عوام کی اس بھیڑ کو صحیح راستے پر آگے لے کر جانے والا دور دور تک کوئی نہ تھا، ایسے حالات میں شیخ محمد عبداللہ نہ صرف یہ کہ ایک چھوٹے سے گھر سے اُٹھ کر منظرِ عام پر آئے بلکہ انہوں نے اپنی وہ ہر بات بھی منوائی، جو وہ منوانا چاہتے تھے، انہوں نے مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈال کر اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا لیکن کچھ دور جا کر انہیں محسوس ہوا کہ شخصی راج کے خاتمے کے لئے انہیں ریاست کی باقی اقلیتوں کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہیے، اس لئے انہوں نے ہندو، مسلم سکھ اتحاد کا نعرہ دیا اور مسلم کانفرنس سے الگ ہو کر نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی، انہیں ابتداء میں بھارتی قیادت، خاص طور پر پنڈت جواہر لال نہرو پر کافی بھروسہ تھا اور اس بھروسے کی وجہ سے وہ بھارت کے بہت قریب چلے تو گئے لیکن وقت نے ثابت کیا کہ ان کا یہ بھروسہ ایک ایسی کچی عمارت تھی، جسے محض ایک ہلکا سا ہوا کا جھونکا تہ و بالا کر سکتا ہے، اقوام متحدہ کی قراردادوں اور بھارتی آئین میں ریاست کے منفرد مقام اور شناخت کے تحفظ کی غرض سے شامل کی گئی دفعہ 370 کے بعد جواہر لال نہرو کو خیال آیا کہ ریاست جموں و کشمیر کو تو بھارت کا اٹوٹ انگ ہونا چاہیے، لیکن تب تک کافی دیر ہو چکی تھی، انہوں نے پہلے شیخ محمد عبداللہ کو دہلی ایگریمنٹ پر آمادہ کیا لیکن

بعد کے دنوں میں نہرو یہ چاہتے تھے کہ شیخ صاحب کابینہ میں اپنی اکثریت کا استعمال کرکے دفعہ 370 کو دفع کردیں اور ریاست کو بھی دیگر ریاستوں کی طرح بھارت کا ناقابلِ تنسیخ اور غیر متنازعہ حصہ بنا ڈالیں لیکن تب تک شیخ کو بھی یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگر انہیں سیاستِ کشمیر میں اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کا مستقبل محفوظ کرنا ہے تو انہیں 'عوام دوست' نظریہ اختیار کرنا ہوگا۔ انہوں نے نہرو کے اشاروں پر ناچنا بند کردیا اور انہیں دہلی ایگریمنٹ واپس لینے کے لئے کہا جبکہ اسی کے ساتھ وہ بھارت (یا پھر نہرو) کے سب سے بڑے دشمن بھی بن گئے۔ انہیں کرسی اقتدار سے اُتار کر قیدخانوں کی زینت بنا دیا گیا اور تب تک کانگریس کی مرکزی اور ریاستی سرکاروں کا استعمال کرکے ریاستی آئین کے ساتھ کھلواڑ کرتے رہے، جس کا اظہار انہوں نے خود بھی اپنی تقریروں میں کیا ہے، جس کا تذکرہ سابقہ قسط میں حوالہ جات کے ساتھ کیا گیا ہے۔

دورۂ پاکستان اور پنڈت نہرو کی وفات

شیخ محمد عبداللہ منقسم ریاستِ جموں وکشمیر کے پہلے وزیر اعظم تھے، انہیں اس عہدے کا حلف 17 مارچ 1948ء کو دلایا گیا، یہ ایک ایسا وقت تھا، جب پاکستان نے نہ تو انہیں کشمیر کا حاکم تسلیم کیا اور نہ ہی کشمیریوں کا جائز نمائندہ بلکہ انہیں نہرو اور بھارت کا ایجنٹ قرار دے کر ان کی ملامت کی گئی لیکن 1964ء تک آتے آتے پاکستان کے نظریہ میں اس حد تک تبدیلی آچکی تھی کہ جب وہ دورۂ پاکستان پر گئے تو پاکستانی عوام نے شیخ محمد عبداللہ کا شاندار استقبال کیا اور انہیں عزت واحترام سے بھی نوازا، بتایا جاتا ہے کہ وہ چودھری غلام عباس، جو کہ مسلم کانفرنس کے وقت ان کے سب سے قریبی ساتھی تھے اور تقسیم سے قبل شیخ سے خفاء ہوکر پاکستان چلے گئے تھے، انہوں نے اس دورہ کے دوران شیخ صاحب سے معذرت طلب کی، اپنے فیصلے پر افسوس کا اظہار کیا اور ان سے کہا کہ وہ بھی واپس آکر اپنے وطن میں اپنے لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، لیکن تب تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ چودھری غلام عباس، جس نے اپنی کتاب ''کشمکش' میں شیخ محمد عبداللہ کو ایک قومی غدار قرار دیا تھا، اس دورہ کے دوران شیخ صاحب کو گلے لگانے والوں میں وہ سب سے آگے تھے، اس موقعہ پر چودھری نے اپنی تقریر میں شیخ محمد عبداللہ کو بر صغیر کا سب سے قدآور، عظیم لیڈر اور مسلمانوں کا ہمدرد قرار دیا۔ اس موقعہ پر صدر ایوب خان اور اس کے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ان کے ساتھ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے جو گفتگو کی، اسے تاریخی نوعیت کا قرار دیا جاتا ہے۔ غلام احمد میر اپنی تصنیف 'میں نے کشمیر جلتے دیکھا' میں اس حوالے سے ایک باب میں رقمطراز ہیں:

'1964ء میں مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے فوراً بعد اس وقت بھارتی وزیراعظم پندت جواہر لال نہرو نے انہیں ایک اہم ملاقات کے لئے دہلی طلب کیا....اس ملاقات کے بعد ایسے حالات بننے لگے تھے، جن سے لگتا تھا کہ کشمیر کا الجھا ہوا مسئلہ اب سلجھ جائے گا...چنانچہ مئی 1964ء میں دونوں رہنماؤں کے درمیان ایک اہم اور خفیہ ملاقات ہوئی، اس ملاقات کو اگرچہ صیغۂ راز میں رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن ملاقات کے بعد دونوں رہنماؤں کی باڈی لینگوئج سے یہ بات عیاں تھی کہ مسئلہ کشمیر کے کسی حتمی حل پر اتفاق ہو چکا تھا....شیخ محمد عبداللہ کشمیر آکر اپنی ایک ٹیم کے ہمراہ پاکستان روانہ ہو گئے، وہاں اس وقت جنرل ایوب خان حکمران تھے، جبکہ ذوالفقار علی بھٹو ان کے وزیر خارجہ تھے۔ پاکستان کے حکمران طبقے کے ساتھ بھی ان کے اچھے اور خوشگوار ماحول میں بات چیت ہوئی اور دونوں فریق کشمیر کا تنازعہ حل کرنے کے حوالے سے ایک فارمولے پر رضامند ہو گئے...لہذا طے پایا کہ شیخ محمد عبداللہ مظفرآباد پہنچ کر آزاد کشمیر حکومت کے اشتراک سے ایک جلسہ بلوائیں اور اس میں اس معاہدے کا اعلان کریں، جو دونوں ممالک کی حکومتوں کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کے دوران طے پایا تھا۔ مظفرآباد میں ایک جلسہ بلوایا گیا، جس میں 'نئی بات' سننے کے لئے ہزاروں لوگ شامل ہوئے...شیخ صاحب نے سٹیج پر آکر اپنی تقریر کا آغاز حسبِ دستور تلاوتِ قرآنِ پاک سے کیا اور وہ عوام کو اس اہم فیصلہ سے باخبر کرنے ہی والے تھے کہ ایک اجنبی نے سٹیج پر آکر شیخ صاحب کے کان میں کہا "بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو چل بسے ہیں...." یہ کشمیری عوام کی بدقسمتی تھی یا تقدیر کا فیصلہ کہ ان دو رہنماؤں کے درمیان طے پانے والا یہ تاریخی معاہدہ ہمیشہ کے لئے دھرا کا دھرا رہ گیا...اس تاریخی جلسے کو تعزیتی جلسے میں بدل دیا گیا اور شیخ صاحب نے جلسے سے کہا کہ یہ جلسہ، جو کہ ایک تاریخی اعلان کی غرض سے بلوایا گیا تھا، ماتمی جلسے میں بدلا جاتا ہے، انہوں نے پنڈت نہرو کو شردھانجلی (خراجِ عقیدت) پیش کرنے کا اعلان کیا اور وہیں سے سیدھے نئی دہلی روانہ ہو گئے، تاکہ نہرو کی میت کو کندھا دے سکیں ادھر" انٹرنیٹ انسائکلو پیڈیا Wiki pedia, encyclopedia کے مطابق اس دورے کے دوران پاکستان نے شیخ محمد عبداللہ کو سرکاری مہمان کا درجہ دیا تھا،

گرفتاری اور رہائی:

شیخ محمد عبداللہ کو پہلی بار 8 اگست 1953ء میں گرفتار کیا گیا، صدرِ ریاست داکٹر کرن سنگھ نے انہیں وزیراعظم کے عہدے سے برطرف کر کے ان کی جگہ بخشی غلام محمد کو کشمیر کا وزیراعظم بنا دیا، شیخ صاحب پر الزام تھا کہ وہ کابینہ میں اعتماد کھو چکے ہیں، حالانکہ کابینہ میں انہیں اپنی اکثریت ثابت کرنے

کا موقعہ بھی نہیں دیا گیا، شیخ عبداللہ کو اس بار گیارہ برس کی قید کاٹنا پڑی، انہیں 8اپریل1964ء کو رہا کر دیا گیا، ریاستی حکومت نے ان کے خلاف سارے الزامات واپس لے لئے ، وہ رہا ہو کر کشمیر پہنچے تو لوگوں کے ایک سمندر نے ان کا استقبال کیا۔ اس رہائی کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے پرانے 'دوست' پنڈت نہرو کے قریب آ گئے اور ان کے کہنے پر پاکستان کا دورہ کیا، لیکن نہرو کی موت کے بعد شیخ کے لئے پھر سے کانٹوں کا تاج تیار کر لیا گیا اور انہیں 1965 سے 1968 تک کے تین سال کے لئے کشمیر سے باہر 'جلاوطن' کر دیا گیا اور یہ سلسلہ 1971ء تک جاری رہا، اس دوران 'محاذ رائے شماری' پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔

1971ء میں مشرقی پاکستان (آج کے بنگلہ دیش) میں پاکستانی افواج اور بنگلہ عوام کے درمیان ناچاکی کا واقعہ پیش آیا اور بھارتی فوجیوں کی ایک بڑی تعداد 'مکتی باہنی' کی شکل میں بنگلہ دیش میں داخل ہو گئی، گھمسان کی جنگ ہوئی اور پاکستان کے تقریباً نوے ہزار فوجیوں کو سرینڈر کرنا پڑا، اسی دوران بھارت اور پاکستان کے درمیان بھی جنگ چھڑ گئی، جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان، مغربی حصے سے کٹ گیا اور بنگلہ دیش کے نام سے ایک اور آزاد مملکت معرض وجود میں آ گئی۔ اس جنگ کی ایک الگ کہانی ہے اور اپنے وقت پر بیان ہو گی لیکن جنگ کے بعد 1974ء میں شیخ محمد عبداللہ کا سامنا بھارت کی وزیر اعظم 'خاتونِ آہن' اندرا گاندھی سے تھا، جس نے شیخ کو ''اندرا عبداللہ ایکارڈ'' پر دستخط کرنے پر آمادہ کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کی ''آتشِ چنار کی خاکِ ارجمند' سرد پڑ چکی تھی اور دہلی ایگریمنٹ کو ختم کرنے والے عبداللہ نے بھارت کے ساتھ ایک اور معاہدے پر دستخط کر کے نہ صرف کشمیر کو بھارت کی جھولی میں پوری طرح ڈال دیا بلکہ ریاست سے 'وزیر اعظم' کے عہدے کو ختم کر کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ بصد خلوص و خوشی قبول کر لیا۔ اس طرح سے اگر شیخ محمد عبداللہ منقسم ریاست کے پہلے وزیرِ اعظم تھے تو وہی آخری بھی تھے۔

شیخ محمد عبداللہ کی سیاست سے ان کے ہمعصروں اور سیاسی مخالفین کا اختلاف رائے اپنی جگہ لیکن ایک بات، جو ان کے بارے میں غیر متنازعہ ہے، وہ یہ ہے کہ جب تک وہ سیاست کے دریا میں موجود رہے، ایک بہت بڑے مگر مچھ کی طرح رہے، انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں کشمیر میں کسی اور سیاست دان کا سر اور قد اونچا نہیں ہونے دیا، انہیں اگر چہ ہر وقت مرکز کی جانب سے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا اور مرکز نے اپنے کئی چہیتوں کو بھی ان کے مقابلے میں لا کھڑا کیا اور انہیں اپنا ہر ممکن سپورٹ بھی دیا لیکن اس کے باوجود بھی وہ شیخ محمد عبداللہ کا قد کم نہ کر سکے۔

شیخ محمد عبداللہ کا سالِ پیدائش 1905ء ہے اور ایک ستارہ شناس نجومی نے بتایا تھا کہ 1905 علم الاعداد (ابجد) کے حساب سے ''درختِ آتش'' بنتا ہے، نجومی نے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ شیخ محمد عبداللہ کی وفات کے بعد کشمیر میں ہر سو آگ لگ جائے گی اور اس آگ سے کوئی بھی گھر نہیں بچ پائے گا، اس آگ کی لپٹوں سے کوئی ڈالی اور کوئی پھول بچ نہیں پائے گا اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی موت کے صرف چھ سال بعد 1989ء میں کشمیر میں یہ بھیانک آگ چہار سو پھیل چکی تھی اور اس کا آغاز بھی ان ہی کے صاحبزادے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ہاتھوں 1987ء کے انتخابات میں آج کے بہت سے علیٰحدگی پسند لیڈروں کو ہرانے سے ہوا تھا۔

☆☆☆☆

35

منقسم کشمیر کے وزرائے اعظم....(3)

بخشی غلام محمد...

بخشی غلام محمد سال 1907ء میں پیدا ہوئے، انہوں نے اپنی تعلیم ٹائنڈل بسکو سکول میں مکمل کی اور ریاست کے دور دراز علاقہ اسکردو اور لیہہ میں ایک استاد کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا، بعد میں 'آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن' ((All India Spiners Association)) کے ساتھ وابستہ ہو گئے لیکن 1927 میں صرف 20 سال کی عمر میں، جب کشمیر میں ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف کشمیریوں کی تحریک زوروں پر تھی، وہ شیخ محمد عبداللہ کے کافی قریب آ گئے، یہ ایسا وقت تھا جب شیخ محمد عبداللہ، چودھری غلام عباس اور میر واعظ مولوی محمد یوسف ایک ساتھ مل کر کشمیری عوام کے سیاسی اور مذہبی تشخص کی جنگ لڑ رہے تھے۔1930ء کے آس پاس جب مسلم کانفرنس کی بنیاد پڑی تو بخشی غلام محمد نے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی سخت محنت اور جہدِ مسلسل کے بل پر اس نئی جماعت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا کام انجام دیا، انہوں نے اس کام کے لئے طلباء اور کارکنوں کو اکٹھا کیا، ان کی ذہنی تربیت کی اور انہیں ایک شخصی حکمران کے خلاف صف آرا ہونے پر آمادہ کیا، تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ انہیں کشمیر کی تحریکِ آزدی کے دوران کئی مرتبہ گرفتار کیا گیا اور قید و بند کا نشانہ بنایا گیا، جس میں ریاسی سب جیل میں 16 مہینوں پر مشتمل ایک طویل عرصہ بھی شامل ہے، وہ اپنے موقف پر سختی سے ڈٹ جاتے تھے اور اسی وجہ سے انہیں نیشنل کانفرنس والے 'خالدِ کشمیر' کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔

1938ء تک آتے آتے کشمیری مسلمانوں کی تحریکِ آزادی پوری ریاست میں پھیل چکی تھی اور اب اسے دوسرے فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی حمائت بھی مل رہی تھی اور پوری ریاست میں ایک ذمہ دار اور جوابدہ انتظامیہ کی مانگ زور پکڑ رہی تھی، اسی دوران مسلم کانفرنس کا نام بدل کر ''نیشنل کانفرنس'' کر دیا گیا اور اپنی سخت ترین تحریک پسندی کی وجہ سے بخشی غلام محمد نے یہ عرصہ ایک زیرِ زمین کارکن کی حیثیت سے گزارا اور ریاستی پولیس (ڈوگرہ پولیس) سے بچتے رہے۔بخشی غلام محمد تقریباً سولہ ماہ تک بھارت کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے اور اس دوران انہوں نے کشمیر کی آزادی کے لئے

بیرونِ ریاست کافی ہمدردیاں بھی جٹالیں، مہاتما گاندھی کے دورۂ کشمیر کے بعد ان کے خلاف ڈوگروں کی طرف سے جاری کردہ گرفتاری کا وارنٹ واپس لے لیا گیا اور وہ سولہ ماہ کی جلا وطنی کے بعد گھر لوٹے۔1947ء میں جب شیخ محمد عبداللہ کو جیل سے رہا کیا گیا اور گاندھی کی ہدائت پر کشمیر کا وزیر اعظم (ایڈمنسٹریٹر) بنا دیا گیا تو بخشی غلام محمد کو نائب وزیر اعظم کا عہدہ دیا گیا اور وزارتِ داخلہ کا قلمدان بھی سونپا گیا۔

1948ء میں جب شیخ محمد عبداللہ اقوام متحدہ میں بھارت کے حق میں کشمیر کیس کی وکالت کر رہے تھے، بخشی غلام محمد کو کشمیر کا منتظمِ اعلیٰ بنایا گیا، اگست 1953 میں بھارت کی وکالت کرنے والے شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کر کے سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تو بخشی غلام محمد ریاستی کابینہ کے ووٹوں سے ریاست کے وزیر اعظم بھی بنے اور نیشنل کانفرنس کے صدر بھی۔

تاریخ کی کتابوں میں موجود حوالہ جات کے مطابق اپنی زبردست صلاحیتوں اور تعمیری کاموں کی وجہ سے بخشی غلام محمد ایک قابل منتظم ثابت ہوئے ہیں اور انہیں ''جدید کشمیر کا معمار'' بھی قرار دیا گیا۔انہوں نے ''نیا کشمیر'' کے نظریے کو عملی جامہ پہنایا اور کشمیر کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عوام کے ساتھ قریبی رابطے میں رہتے تھے اور ان کے مسائل کو سنتے اور حل کرتے تھے، جس کی وجہ سے انہیں عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔بخشی غلام محمد کو سیاسی سطح پر محاذِ رائے شماری کی وجہ سے(1955میں) کافی مخالفتوں کا سامنا تھا لیکن وہ سختی کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے،1963ء میں جب کانگریس ضمنی انتخابات میں بری طرح سے ہار گئی تو کانگریس کی ہائی کمان نے فیصلہ کیا کہ کچھ مرکزی وزراء اور ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو اپنے مناصب سے مستعفی ہو جانا چاہیے تاکہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پارٹی کو مضبوط کرنے میں صرف کر سکیں، اس کام کا حتمی فیصلہ پنڈت جواہر لال نہرو پر چھوڑ دیا گیا، انہوں نے بخشی غلام محمد سے رجوع کیا، حالانکہ وہ اس وقت کانگریس میں نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود پنڈت نہرو کے اصرار پر بخشی نے استعفیٰ دے دیا اور دیگر پانچ ریاستی وزرائے اعلیٰ اور کئی مرکزی وزراء کے ہمراہ ان کا استعفیٰ بھی قبول کر لیا گیا، اس طرح سے پنڈت نہرو نے ایک انتہائی دانشمندانہ کام انجام دے کر ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا، جو ان کی صاحبزادی اور بعد میں بھارت کی وزیر اعظم بننے والی اندرا گاندھی کے سخت ترین سیاسی دشمن ثابت ہو سکتے تھے۔

بخشی غلام محمد پورے گیارہ سال تک کشمیر کے وزیر اعظم رہے اور یہ تاریخِ کشمیر میں ایک

انتہائی اہم اور پُر امن دور تھا، اس دور میں کشمیر کے سبھی خطوں میں کافی ترقی ہوئی، وجہ صاف تھی کہ مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی اور ریاست میں ان کا خاص وفادار وزیر اعظم تھا، دونوں الگ الگ سیاسی جماعتوں سے وابستہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے دلوں کے کافی قریب تھے، ان کے نظریات اور خیالات میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی، اس لئے دینے والے اور لینے والے میں اگر محبت کا رشتہ قائم ہوجائے تو لین دین کا حساب نہیں رکھا جاتا.... بخشی نے اس فارمولے کو بخوبی آزمایا اور اسے سے بھر پور فائدہ بھی اٹھایا۔ بخشی اگر چہ کانگریس میں بھی شامل تھے اور مرکز کے چہیتے بھی رہے لیکن اس کے باوجود وہ بھارت کے ساتھ ریاست کے رشتوں اور کشمیر کی خصوصی پوزیشن کے حوالے سے کافی حساس تھے، انہوں نے کشمیر کے تشخص کے حوالے سے ایک کشمیری ہونے کا بھی بھر پور ثبوت دیا اور آخری وزیر اعظم ہونے کے ناطے وہ اس موقف پر سختی سے ڈٹے بھی رہے۔

1964ء تک آتے آتے ریاست سے وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا تھا اور اس دوران سید میر قاسم ریاست کے وزیر اعلیٰ بن چکے تھے، بخشی کو اس حکومت میں حزبِ اختلاف کے لیڈر کی حیثیت سے بیٹھنا پڑا، لیکن تاریخ خود کو دوہراتی ہے اور ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، 1964ء کے آخیر میں کانگریس ممبرانِ اسمبلی نے بخشی کو سرکار کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کے لئے مجبور کیا، انہوں نے ایسا کیا بھی اور اپنی تحریک جیت بھی گئے لیکن اس سے قبل کہ وہ زمامِ اقتدار سمبھالتے، انہیں بھارتی دفاعی قوانین کے تحت گرفتار کرلیا گیا، سلاخیں سخت تھیں اور بخشی کا وجود جواب دے چکا تھا، جیل میں ان کی صحت بری طرح سے متاثر ہوگئی اور انہیں دسمبر 1964ء میں ناسازئی صحت کی بنیادوں پر رہا کردیا گیا، جون 1965ء میں انہوں نے کانگریس اور مرکز سے مایوس ہوکر رضا کارانہ طور پر سیاست سے سبکدوش ہوجانے اور ایک عام آدمی کی زندگی گزارنے کا اعلان کردیا، لیکن 1967ء میں ایک بار ان کے اندر کا سیاستدان جاگ اٹھا اور انہوں نے اپنی توہین کا انتقام لینے کے لئے کانگریس کے امیدوار علی محمد طارق کو بھاری اکثریت سے ہرا کر نیشنل کانفرنس کے ٹکٹ پر لوک سبھا انتخابات میں کامیابی حاصل کرلی، وہ اس کرسی پر 1971ء تک براجمان رہے اور جولائی 1972ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

بخشی غلام محمد کے دور کے بارے میں مختلف مورخین کی مختلف آراء ہیں، اگر چہ انہیں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ 'دھوکہ دہی' کا مرتکب بھی ٹھرایا جاتا ہے اور شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح حیات ''آتش چنار'' میں اس حوالے سے کافی 'آتشباری' بھی کی ہے لیکن پرویز دیوان کا کہنا ہے کہ بخشی کا دور تقسیم

ریاست کے بعد کا سب سے اچھا دور اس لئے بھی رہا کہ وہ مرکز میں کانگریس، خاص طور پر پنڈت جواہر لال نہرو کے کافی قریب تھے، جنہوں نے اپنے دورِ اقتدار کے دوران ریاست پر اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیئے، بخشی نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست میں ترقیاتی کاموں کو ترجیح دی اور خاص طور پر غذائی اجناس کو اس قدر سستا کر دیا گیا کہ بھوکے پیاسے بھی سیر شکم ہوتے رہے، لیکن بعض مورخین اس دور کو کشمیری عوام میں 'مفت خوری' کی عادات پیدا کرنے اور انہیں کام چور بنانے کی کوششوں سے بھی تعبیر کرتے ہیں، تاہم پرویز اس بات پر متفق ہیں کہ جب بخشی اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوئے تو ہماری ریاست کا شمار بھارت کی دس سب سے غریب ریاستوں میں ہوتا تھا لیکن انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں ریاست کو بھارت کی پانچ ترقی پذیر ریاستوں میں شامل کر دیا۔

36

پاک، بھارت جنگ1965ء

آپریشن جبرالٹر.......(1)

تقسیم برصغیر کی صدائے بازگشت نہ جانے کشمیری عوام اور اس ریاست کے دیار و کوہ کو کب تک سنائی دیتی رہے گی، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا، ہر دو دہائیوں کے بعد اس ریاست میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں، جن کی وجہ سے یہاں جان و مال اور عزت و ناموس کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا ہے اور ایک سیلاب اس ریاست کے عوام کی ساری کمائی کو بہالے جاتا ہے،1947ء کا قبائلی حملہ ہو یا اس کے بعد کی در پردہ یا کھلے عام جنگیں....ان سبھی چیزوں کا تعلق براہ راست تقسیم برصغیر کے ساتھ ہے، پرویز دیوان اپنی کتاب ''کشمیر'' میں لکھتے ہیں:

> ''چند ایک برسوں میں ایک بار، یہ پاکستان کا شیوہ رہا ہے کہ وہ کشمیر کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں کرتا رہتا ہے، لیکن پاکستان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کام کے لئے اپنی باضابطہ افواج کو اندر بھیج سکے، جبکہ اس کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ وہ اپنے ملک کے ان پڑھ اور بے روزگار نوجوانوں کو اس کام کے لئے تربیت دیتا ہے اور انہیں اسلحہ وغیرہ فراہم کر کے کشمیر میں فورسز کے ساتھ لڑنے کے لئے بھیج دیتا ہے، یہ نوجوان بھارتی افواج کے ساتھ لڑتے ہیں اور اگر کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پاکستان اس پر اپنا قبضہ جمالیتا ہے لیکن اگر وہ ہار جاتے ہیں تو پاکستان اس سے اپنا دامن بچالیتا ہے اور اپنے ان مہروں کے ضائع ہو جانے پر اسے افسوس تک نہیں ہوتا، اسی طرح کی ایک کاروائی پاکستان نے اگست1965 میں بھی انجام دی، صدر پاکستان جنرل ایوب خان نے فوجی سربراہ جنرل موسیٰ کو ہدائت دی کہ مسئلہ کشمیر کو ''سرد خانہ'' سے باہر نکالنے اور بھارت کو مذاکرات کے میز پر لانے کی کوئی ترکیب کی جائے، جنرل ایوب کا خیال تھا کہ یہ کام بہت آسان ہے اور محض چند ایک

گولوں اور گولیوں کی آواز بھارت کو اس کام کے لئے مجبور کردے گی، بشرطیکہ یہ کام ایک اچھے موقعہ پر اور صحیح انداز میں انجام دیا جائے۔ چنانچہ 5اور 6اگست 1965ء کو پاکستان کے سینکڑوں تربیت یافتہ اور مسلح جنگجوؤں نے حدِ متارکہ کو پار کر کے بھارتی زیرِ انتظام علاقے میں پناہ لے لی اور بھارت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، اس جنگ کا نام ''آپریشن جبرالٹر رکھا گیا تھا'' (پرویز دیوان/ کشمیر/ صفحہ نمبر 106)

اسی جنگ کے حوالے سے انسائکلو پیڈیا Wikki pedia میں کچھ اس طرح سے درج ہے:

''یہ جنگ بھارت اور پاکستان کے درمیان پائی جانے والی روائتی پُرخاش کا ایک اور نتیجہ تھی، جو اپریل اور ستمبر 1965ء کے درمیان لڑی گئی، اس جھگڑے کو بھارت اور پاکستان کے درمیان دوسری جنگ کے نام ے بھی جانا جاتا ہے کیونکہ کشمیر کی وجہ سے دونوں ملکوں نے پہلی جنگ 1947ء (اکتوبر) میں لڑی تھی، جس میں پاکستان نے ریاست کے ایک بڑے حصے کو اپنے قبضے میں لے کر اسے ''آزاد کشمیر '' کا نام دے دیا۔ یہ جنگ پاکستان کے آپریشن جبرالٹر کی وجہ سے شروع ہوئی، جس کے ذریعے پاکستان نے اپنے دراندازوں کو بھارت کے زیرِ انتظام علاقے میں داخل کر کے ایک درپردہ جنگ کا آغاز کیا۔ پانچ ہفتوں کی مسلسل جنگ کی وجہ سے ہزاروں لوگ مارے گئے اور ہزاروں بے گھر ہوگئے، یہ جنگ اقوامِ متحدہ کی مداخلت اور تاشقند معاہدے پر دونوں ملکوں کے دستخط سے بعد ختم ہوئی، اس جنگ کا زیادہ تر حصہ دونوں ممالک کے درمیان موجود بین الاقوامی سرحدوں پر لڑا گیا اور اس دوران جموں و کشمیر نے پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں افواج کا جماؤ دیکھا، اس جنگ میں دونوں بھاری اور ہلکے قسم کے ہتھیاروں کے علاوہ ہوائی طاقت کا بھی استعمال کیا گیا اور باقی پاک بھارت جنگوں کی طرح اس جنگ کی بہت سی حقیقتیں بھی ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں پوشیدہ ہیں''

اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں، اتفاق یا منشائے رب، کہ اس جنگ کے ایک چشم دید گواہ میر غلام احمد آف تھنہ منڈی سے راقم کی ملاقات سینٹرل جیل کوٹ بھلوال کی اندھیری کوٹھڑیوں میں (۲۰۰۴ تا ۲۰۰۶ء) اپنی اسیری کے دنوں میں ہوئی، میر نے اس واقعے کے تمام حالات کو ایک ڈائری میں لکھ کر نہ جانے کب سے اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ وہ اسے ایک کتابی شکل دیں

گے لیکن کئی وجوہات کی بنا پران کا یہ خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا تھا، جب 2006ء میں راقم کو چوتھی بار پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت مذکورہ جیل میں پہنچادیا گیا تو دل ودماغ کی دنیا میں بری طرح سے اتھل پتھل مچی ہوئی تھی لیکن ایسے میں میر صاحب نے یہ ڈائری مجھے تھماتے ہوئے کہا کہ میں اس کام کو انجام دے دوں، اس سے ایک تو ان کا کافی پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا، ساتھ ہی میرا وقت بھی کٹ جائے گا، حالانکہ میں ابھی ''شبستانِ وجود'' اور ''قدم قدم تعزیر'' کے ساتھ مصروف ہی تھا لیکن میر صاحب کی ڈائری پڑھ کر میں نے اپنا کام کچھ دیر کے لئے موخر کردیا اور اس میں مصروف ہو گیا اور تقریباً تین ماہ کی محنتِ شاقہ کے بعد جو چیز ہمارے ہاتھ میں آئی، وہ تھی ایک بڑی سی کتاب اور اس کا نام تھا ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' اس کتاب میں میر صاحب آپریشن جبرالٹر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''تمام ضروری اقدامات کرنے کے بعد بھٹو نے 2 اگست 1965ء کو اس منصوبے کو ہری جھنڈی دکھادی اور 5/ اگست کو' آزاد کشمیر' فورسز کی ایک بھاری تعداد کو بھارتی (جموں وکشمیر) میں بھیج دیا گیا۔ یہ فورسز اس وقت پاکستان کی اعلیٰ درجے کی مدد گار فورسز تسلیم کی جاتی تھیں۔ اس یلغار سے قبل پاکستان نے ریاست جموں و کشمیر میں اپنے تربیت یافتہ فوجیوں کے ذریعے یہاں کے اہم پلوں، شاہراؤں اور فوجی تنصیبات کا ایک جامع سروے کرایا تھا اور ان مقامات پر مزدوروں اور مستریوں کے بھیس میں اپنے فوجیوں کو تعنات کروادیا تھا اور انہیں ضروری اسلحہ اور گولہ بارود بھی دیا گیا تھا۔ آپریشن جبرالٹر (جبل الطارق) کے تحت کی جانے والی اس کاوائی کے ذریعے 9 اگست 65ء کے دن ان فورسز کو لکھن پور سے لے کراوڑی اور پونچھ سے لے کر کرگل تک کے تمام پلوں اور شاہراؤں کو بیک وقت تباہ کرنا تھا، جموں اور سرینگر کے ہوائی اڈوں پر قبضہ کرنا تھا اور تمام اہم فوجی تنصیبات کو نقصان پہنچانا تھا۔ پاکستانی افواج میں ان دنوں ابھی تک برطانوی افواج کی تربیت کا اثر باقی تھا اور ان دنوں پاکستان کے فوجی لنگر خانوں میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی، جس کے دلدادہ خود جنرل ایوب خان بھی تھے اور بدقسمتی سے یہی عادت اس آپریشن کی ناکامی کا باعث بھی بنی''

میر مزید لکھتے ہیں ''سرینگر کے کسی شراب خانے میں دراندازی کر کے آنے والے فوجیوں نے جی بھر کے پی لی اور شراب خانے کے اندر ہی کسی شخص کے ساتھ جھگڑا کرلیا، پولیس جھگڑا کرنے

والوں کو پکڑ کر تھانہ رام منشی باغ میں لے گئی اوران کی جامہ تلاشی کے دوران ایک گرفتار شدہ شخص کی جیب سے پاکستانی فوج کا شناختی کارڈ برامد کرلیا گیا، نشے میں دھت دراندازوں پر پولیس کے دو ہاتھ پڑے تو انہوں نے سب راز فاش کر دیا، وہ شرابی، پاکستانی فوج کا کپتان تھا...اس نے مہنہ کھولا تو بھارت کی فوج اور خفیہ ایجنسیاں متحرک ہو گئیں، تمام تنصیبات اور ٹھکانوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا لہذا آپریشن جبرالٹر دھرا کا دھرارہ گیا۔لیکن اس دوران ریڈیو صدائے کشمیر نے اعلان کر دیا تھا کہ 9 اگست کے دن جموں وکشمیر پرایک منصوبہ بند حملہ کرکے قبضہ کرلیا گیا ہے،اس لئے محض چندہی مقامات پر یہ فوجی حملہ کر پائے ، پونچھ اور راجوری کے کچھ پُلوں کو اڑا دیا گیا اور سرینگر کے بٹہ مالو (ٹوگراؤنڈ) کے علاوہ پٹن کے ایک فوجی کیمپ کو تباہ کر دیا گیا،جس سے اس منصوبے کی تصدیق تو ہوگئی لیکن آپریشن بذاتِ خود دھرا کا دھرارہ گیا۔اس دوران ریاست کے بہت سے علاقوں پر اندرونی طور' آزاد کشمیر فورسز' نے بھی قبضہ کرلیا تھا۔ اس فوج میں چند آفیسروں کو چھوڑ کر سارے لوگ اسی ریاست کے باشندے تھے،جنہوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ یہ لڑائی لڑی۔ایک اندازے کے مطابق دراندازوں کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان کی مہارت اور پھرتی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد اندرونی انتظامیہ بھی تشکیل دے دی تھی'

تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ یہ درانداز 24 ستمبر 1965 تک ریاست کے مختلف حصوں میں لڑتے رہے کیونکہ یہ منصوبہ بند طریقے سے ریاست کے تمام حصوں، پہاڑوں،جنگلوں، دیہات، اور قصبہ جات میں اپنا قبضہ جما چکے تھے، یہاں کے لوگوں نے اپنی گھڑیاں تک پاکستان کے معیاری وقت کے ساتھ ملالی تھیں،صوبہ جموں میں ان دراندازوں کو کافی کامیابیاں ملیں اور لوگوں کی طرف سے آؤ بھگت بھی ہوئی لیکن کشمیر میں اس کے برعکس ہوا۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ (شائد) اس منصوبے کے حوالے سے کشمیر میں کسی کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا یا پھر اس حوالہ سے کوئی "گراؤنڈ ورک" نہیں کیا گیا تھا اور ایسا لگتا ہے کہ وہاں یہ حملہ یکا یک اور بےخبری کے عالم میں ہوا تھا،اس لئے لوگ جلد بازی میں فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔اس کے برعکس جموں کے بیشمار لوگ حملہ آوروں کے ہمنوا بن گئے تھے اوران کی طرف سے تشکیل دی گئی اندرونی (عبوری) انتظامیہ میں بھی شامل ہو گئے تھے، پونچھ اور راجوری میں اس وقت جو سول انتظامیہ تشکیل دی گئی،اس کے اسسٹنٹ کمشنر ماسٹر عبدالعزیز وانی آف تھنہ منڈی اور قاضی عزیز الدین آف بہروٹ راجوری تھے،اس انتظامیہ کی ہنگامی نوعیت کی نشستیں بلائی جاتی تھیں،اس انتظامیہ کا لقب "ہنگامی کونسل آف جموں وکشمیر، ہیڈ کوارٹر

راجوری'' تھا جسے انگریزی میں یوں لکھا گیا "Revolutionary Council of Jammu and Kashmir, HQ: Rajouri" راجوری اور پونچھ کا ڈپٹی کمشنر نذیر احمد میر آف راجوری کو بنایا گیا تھا....اس صورتحال سے پریشان ہوکر بھارت نے آخری حربے کے طور پر لاہور کے راستے بین الاقوامی سرحد سے پاکستان پر حملہ کردیا، کیونکہ اسے پہلے چھمب اور جوڑیاں میں کوئی بھی کامیاب حملہ نہیں ہو پایا تھا اور پاکستان اس دھوکے میں رہا کہ انٹرنیشنل بارڈر پر بھارت حملہ نہیں کرے گا کیونکہ ایسا کرنا بین الاقوامی ضابطوں کی خلاف ورزی ہوگا، ادھر کشمیر میں پاکستانی دراندازی کی شکائت یو این او کی جنرل اسمبلی میں چلی گئی، مقدمہ بھارت نے خود پیش کیا اور اس کی پیروی کے لئے بھارت کی جانب سے ڈی پی دھر (کشمیری پنڈت) کو مقرر کیا گیا، جبکہ پاکستان کی جانب سے اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو بھیجا گیا۔اقوام متحدہ میں بحث کے دوران پاکستانی نمائندے نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ کشمیر میں کوئی دراندازی نہیں ہوئی ہے اور وہاں کے لوگ بھارت کے خلاف بغاوت کرکے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، جبکہ بھارتی نمائندے نے دعویٰ کیا کہ پاکستان کی باضابطہ افواج نے دراندای کرکے بھارت کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی ہے۔چنانچہ فیصلہ ہوا کہ حقیقت کا پتہ لگانے کے لئے UNO کی ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی تشکیل دی جائے، جو جائے واردات پر (یعنی جموں وکشمیر میں) جا کر یہ پتہ لگائے گی کہ وہاں کون لوگ، کس کے خلاف برسرِ پیکار ہیں، اس فیصلے سے پاکستانی موقف اور اقدامات کو شدید دھچکہ لگا، چنانچہ انہوں نے اپنی فورسز کو جموں وکشمیر سے واپس چلے جانے کا حکم دیا، حکم جاری ہوتے ہی ان فوجیوں (دراندازوں) نے ریاست بھارتی قبضے والے علاقوں سے انخلاء شروع کردیا اور 24 ستمبر کی درمیانی رات کو اکثر درانداز واپس چلے گئے، جو پیچھے رہ گیا، وہ یا تو مارا گیا یا پھر گرفتار ہوگیا (اس افراتفری میں غلام احمد میر بھی پاکستانی دراندازوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور بہت مشکلات کا سامنا کیا، اس کا سارا حال ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' میں درج ہے) اس دوران سینکڑوں پاکستانی فوجی گرفتار ہوگئے، جن کو بعد میں جنگی قیدیوں کے تبادلے کے دوران چھڑایا گیا''

یہ جنگ کل پچاس روز تک جاری رہی، اس دوران درہ حاجی پیر (اوڑی) اور چکن نیک کا علاقہ پاکستان کے قبضے میں آ گیا، 24 ستمبر کے روز ہی کشمیر سے لے کر لاہور تک بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ بندی کا عمل مکمل ہوگیا اور بھارتی فوجیں لاہور سیکٹر سے واپس آ گئیں۔ایک افراتفری ختم ہوئی تو دوسری کا آغاز ہوا، پاکستانی دراندازوں کے چلے جانے کے ساتھ ہی بھارتی افواج نے کشمیر

کا رُخ کیا اورایک بار پھر 1947ء کے واقعات کو دوہرایا گیا۔ علاقہ درانداز وں سے صاف کرنے کے بہانے سینکڑوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، مکانات اور املاک کو نذرِ آتش کر دیا گیا، بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں، لاکھوں لوگوں کو ہجرت کر کے سرحد کے اس پار جانا پڑا، خواہ یہ سرکار کی پالیسی تھی یا فوج کے ذاتی اقدامات، لیکن ہر طرح سے انسانی حقوق اور قدروں کی خلاف ورزی تھی۔

☆☆☆☆

37

پاک بھارت جنگ 1965ء

آپریشن جبرالٹر.... (2)

سنہ 1965 کی پاک بھارت جنگ کے بارے میں میر غلام احمد آف تھنہ منڈی اپنی خود نوشت ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' میں مضمون کے آخر میں اپنی آنکھوں دیکھی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علاقہ صاف کرنے کے بہانے بھارتی افواج نے سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، مکانات اور املاک کو نذرِ آتش کر دیا گیا، بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں، لاکھوں لوگوں کو خوف وہراس کی وجہ سے سرحد پار ہجرت کرنا پڑی، خواہ یہ سرکار کی پالیسی تھی یا پھر فوج موقعے کا فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سرحد پار دھکیل دینا چاہتی تھی، لیکن یہ عمل ہر طرح سے انسانی حقوق اور قدروں کے خلاف تھا، راجوری اور پونچھ کا علاقہ ایک بار پھر سے اجڑ گیا، مسلمان فوج کے مظالم سے تنگ آ کر بڑی تعداد میں دوسری جانب چلے گئے جبکہ ہندو اور سکھ پہلے ہی اگست کے مہینے میں وہاں سے ہجرت کر کے جموں اور دیگر ہندو اکثریتی علاقہ جات میں منتقل ہو چکے تھے، حالانکہ یہ کوئی حوصلہ افزا اقدام نہ تھا، لیکن وقتی طور جان بچانے کے حوالے سے بالکل صحیح قدم تھا''

میر آگے لکھتے ہیں:

''یہ دور بھی گزر گیا، افراتفری کے بعد یہاں کی حکومت نے اس اجڑی بستی کو دوبارہ آباد کرنے کا کام ہاتھ میں لیا، جس کے لئے بھارت سرکار نے بھی دل کھول کر مدد فراہم کی، لوگوں کو غلہ، کپڑے اور مکانات تعمیر کرنے کا مٹیریئل وغیرہ (بعض علاقوں میں) مفت اور وافر مقدار میں فراہم کیا گیا۔ فوج کی جن بٹالینوں نے

یہاں کی بستیوں اور آبادیوں کو نقصان پہنچایا تھا، ان کو بھی سزائیں دی گئیں۔...المختصر یہ کہ 1965ء کے اس طوفان نے یہاں کے عوام کے دلوں میں بھارت کے خلاف نفرت کے زخموں کو نہ صرف ہرا کر دیا بلکہ ان میں نئے زخموں کا اضافہ بھی کیا۔ کچھ وقفہ بعد سرحدوں کو عارضی طور پر کھول دیا گیا اور ہجرت کرنے والوں کو واپس اپنے گھروں کو آنے کی ترغیب دی گئی۔ کئی مقامات پر اس کام کے لئے لاؤڈ سپیکر وغیرہ بھی لگائے گئے.....اس کال پر ہزاروں لوگ واپس آ گئے لیکن پھر بھی ہزاروں اُس پار ہی رہ گئے۔(اس دوران بھی قتل و غارتگری اور کشت و خون کا سلسلہ بند نہیں ہوا اور) ایک دلسوز واقعہ یہ پیش آیا کہ واپس آ رہے مہاجرین کا ایک گروپ علاقہ مینڈھر کے ایک فوجی کیمپ میں آ کر رُکا، تھکے، ہارے لوگوں نے پہلے کھانا کھایا اور جب وہ گہری نیند سو گئے تو انہیں مشین گنوں سے بھون ڈالا گیا۔ اس دلدوز واقعہ کے بہت سے عینی شاہدین ابھی بھی (اس کتاب کی اشاعت تک) پونچھ اور راجوری کے علاقوں میں بقیدِ حیات ہیں، یہ واقعہ انسانیت سوز بھی تھا اور قابلِ سزا و مذمت بھی لیکن اس کا الزام دوسری طرف کی فوج پر عائد کر دیا گیا، جس سے نفرت کے لپکتے شعلوں کو اور بھی ہوا ملی''(صفحہ نمبر 122)

بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے حصول کے لئے لڑی گئی یہ دوسری جنگ بھی ختم ہو گئی اور دونوں جانب کی افواج اپنی اپنی پہلی پوزیشنوں پر واپس چلی گئیں لیکن ایک سوال اپنے پیچھے چھوڑ گئیں کہ آیا اس جنگ میں بھارت اور پاکستان میں سے کس کو فتح ملی اور کس کے حصے میں شکست آئی۔ اس حوالے سے مختلف محققین اور مورخین کی آراء بھی مختلف ہیں۔ پاکستانی کالم نگار ایاز آمر نے اس جنگ کے تقریباً 37 برس بعد اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح لکھا: ''پاکستان میں اس جنگ سے پہلے ایک عام تصور یہ تھا کہ جنگ اور لڑائی کے مقابلے میں ایک پاکستانی مسلمان دس بھارتی ہندوؤں کے برابر ہے، لیکن اس جنگ میں جس تیاری اور منصوبے کے ساتھ پاکستان نے بھارت پر حملہ کیا اور جس طرح سے بھارت نے محض چند جھٹکوں میں اس کا جواب دیا، اس سے ہماری ساری متھ دھری کی دھری رہ گئی، پاکستان اس جنگ کو یاد کر کے ''جشنِ فتح'' بھی مناتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس میں جشن منانے والی کوئی بات تھی''(روزنامہ گریٹر کشمیر، مورخہ 3 جون 2003)

ایک مغربی قلم کار کرسٹینا لیمب کا کہنا ہے کہ اس جنگ میں پاکستان کو شکست ہوئی، جمال نامی

ایک قلمکار کا کہنا ہے ''اس جنگ کی شکست پاکستان کے سر مڑھنے والوں کو یہ بات بھی سوچنا چاہیے کہ اس کی وجہ سے دونوں ملکوں کی معاشیات اور اقتصادیات بری طرح سے متاثر ہوئیں، دونوں کو فوجی اعتبار سے بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور انسانی جانوں کا بھی بھاری اتلاف ہوا''

پرویز دیوان اپنی کتاب میں کشمیری علیحدگی پسند ''مورخ'' ہلال احمد وار کی کتاب سے ایک حوالہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''ہلال وار کا کہنا ہے کہ اس جنگ کے دوران جب بھارت نے پاکستان کے خلاف لاہور، سندھ اور پنجاب میں محاذ کھولا تو، اس کے لئے بہت مشکلات پیدا ہوگئیں، اول تو اس کی تاریخی ''بہادری' کا بھانڈا پھوٹ گیا اور دوم اس کے لئے خود پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا'' دیوان ہلال وار کے بارے میں اپنے نوٹ میں لکھتے ہیں'' ہلال وار ''کشمیر اسلامک سٹوڈنٹس لیگ'' نامی تنظیم کے بانی ممبران میں سے ہیں، جس کے اکثر ممبران بعد میں ملی ٹنٹ بنے، ہلال وار کی سیاست کچھ بھی ہو لیکن یہ بھارت کے حق میں نہیں'' (کشمیر، صفحہ نمبر 107)

اس جنگ کا حاصل جمع کسی بھی مرکزی نکتے پر منتج ہوتا ہو، قطع نظر اس کے اگلے برس یعنی 1966ء کے اوائل میں بھارت اور پاکستان نے جنگ کے واقعات کا جائزہ لینے اور کوئی مستقبل کی پالیسی طے کرنے کی غرض سے سویت یونین (موجودہ روس) کے شہر تاشقند میں ایک ہنگامی نشست طلب کی جس میں جنگ بندی کے بارے میں ایک معائدہ پر دستخط کئے گئے، جسے تاشقند معائدہ کے طور پر جانا جاتا ہے، اس معاہدے کے مطابق دونوں ممالک جن بنیادی نکتوں پر متفق ہوئے ان کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے:

> ''دونوں ممالک اپنی اپنی افواج کو جنگ سے پہلے یعنی 1949ء کی پوزیشن پر لے جائیں گے اور جنگ بندی لائین کا احترام کریں گے۔ ایک تاریخی حوالہ کے مطابق 10 جنوری 1966ء کی صبح تاشقند میں ہونے والی یہ بات چیت تقریباً تقریباً تعطل کا شکار ہونے والی تھی۔ اس میں پاکستانی صدر فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم (جواہر لال نہرو کے پیشرو) لال بہادر شاستری حصہ لے رہے تھے، یہ مذاکرات کبھی بھی کامیاب نہ ہوئے ہوتے اگر اس وقت کے روسی وزیراعظم کوسی جن (Kosygin) ان دونوں رہنماؤں کے درمیان اس وقت تک موجود نہ رہے ہوتے، جب تک کہ وہ کسی راضی نامے پر نہ پہنچ گئے، اس دوران ایک اور خاص واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری اس بات پر

راضی ہوگئے کہ پاکستان نے جنگ کے دوران جن علاقوں پر قبضہ کرلیا ہے، وہ ان پر بنا رہے گا، اسی رات شاستری دل کا دورہ پڑ جانے کی وجہ سے اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور یہ بھارت کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھا.اس بارے میں میر غلام احمد کی کتاب سے ایک اہم حوالہ ملتا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔''اس وقت کا سویت یونین بھارت اور پاکستان، دونوں کا دوست تھا، اس نے دونوں متحارب ملکوں کے درمیان صلح کروانے کی غرض سے درمیانہ دار کا رول نبھایا اور تاشقند میں دونوں ملکوں کے رہنماؤں کی ایک میٹنگ کا اہتمام کیا۔جس میں تاشقند معاہدے پر دستخط کئے گئے، جنوری66ء میں منعقد ہونے والی اس میٹنگ میں روس کے زبردست اصرار پر یہ طے پایا کہ دونوں مما لک مسئلہ کشمیر کو پُر امن اور غیر فوجی طریقوں سے حل کریں گے اور دونوں فریق گزشتہ برس کی جنگ کے دوران ایک دوسرے کے چھینے ہوئے علاقوں کو واپس کر دیں گے جبکہ لال بہادر شاستری کو بھارت میں ہدایت دی گئی تھی کہ پاکستان سے چھینے ہوئے علاقوں کو واپس نہیں کیا جائے گا، جن میں چکن نیک اوحاجی پیر (اوڑی) کے علاقے بھی شامل تھے،اس بات کا اعلان انہوں نے تاشقند جانے سے پہلے ایک پریس کانفرنس میں بھی کیا تھا لیکن روس پہنچنے کے بعد حالات بدل گئے اوران کو نیا بیان جاری کرنا پڑا، جو پہلے بیان کے برعکس تھا،اس اعلان سے بھارت میں مظاہرے پھوٹ پڑے، لاکھوں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور ملک میں افراتفری کا عالم پیدا ہوگیا، لال بہادر شاستری کے لئے وطن واپس لوٹنا مشکل ہوگیا تھا ، ان پر تاشقند میں ہی دل کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ وہاں ہی وفات پا گئے۔اس طرح پنڈت جواہر لال کے بعد یہ بھارت کا دوسرا قابل ترین وزیر اعظم تھا، جو مسئلہ کشمیر کی بلی چڑھ گیا (نہرو کے بارےء میں ہم نے پچھلی قسط میں لکھا تھا کہ وہ1964ء میں اس وقت انتہائی پراسرار حالات میں وفات پا گئے تھے، جب مرحوم شیخ محمد عبداللہ دورۂ پاکستان کے بعد مظفرآباد میں ایک اہم اعلان کرنے والے تھے کہ عین موقع پر انہیں بتایا گیا کہ نہرو چل بسے،اس کے بعد اس تاریخی جلسے کو ماتمی جلسے میں بدلنا پڑا تھا، کچھ اسی طرح کا واقعہ شاستری کے ساتھ بھی پیش آیا۔

یہ بات1947ء میں قبائلی حملہ سے لے کر1972ء کے شملہ معاہدے تک عیاں رہی ہے

کہ پاکستان نے کئی بار کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے یا ثابت کرنے کی کوششیں کیں، اس دوران زیادہ تر اگرچہ درپردہ جنگوں کا ہی سہارا لیا گیا لیکن کئی بار اس نے اپنی افواج کو بھی استعمال کیا اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں درج اس حقیقت کے باوجود کہ کشمیر میں رائے شماری کرائے جانے کی صورت میں پاکستان کو اپنے زیرِ انتظام کشمیر کے علاقہ جات کو پہلے خالی کر کے بھارت کے سپرد کرنا ہوگا اور رائے شماری بھارت کی مدد سے اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی ہوگی، وہ ہمیشہ ان قراردادوں پر عمل درآمد کرنے کا حامی رہا ہے لیکن ایک بات جو اس دوران پیش آنے والے واقعات سے نمایاں ہے، یہ ہے کہ پاکستان اپنی ہر کوشش کے بعد جب بھارت کے ساتھ مذاکرات کے میز پر آیا تو وہ کشمیر پر اپنے دعویٰ کے حوالے سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سوائے تاشقند معاہدہ کے کیونکہ اس جنگ میں پاکستان کے ہاتھ چکن نیک اور درۂ حاجی پیر کی کچھ اہم چوٹیاں لگیں، جو اب تک اس کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ یہ چوٹیاں سرحد کی نگرانی کے حساب سے بھی کافی اہم ہیں ۔

تاشقند معاہدہ..(1966)

1966ء کے آغاز کے ساتھ ہی بھارت اور پاکستان کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مخاصمت اور ٹکراؤ کا راستہ اختیار کر کے زیادہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتے۔1965 کی جنگ، جو ریاستِ جموں وکشمیر میں سول وردیوں میں ملوث پاکستانی فوجی فوجیوں کی دراندازی کے ساتھ شروع ہوئی اور بعد میں باضابطہ جنگ میں بدل گئی، کی وجہ سے دونوں ممالک کی معاشیات اور اقتصادیات بری طرح متاثر ہو رہی تھیں، اندرونی اور بیرونی دباؤ بڑھ رہا تھا اور حکومتوں کے لئے اس سلسلے کو زیادہ دیر تک قائم رکھنا محال ہو رہا تھا۔ادھر اقوامِ متحدہ کی جانب سے جائے واردات کا جائزہ لینے کے لئے قائم کئے گئے پاک بھارت کمیشن نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ ریاست میں اندرونی بغاوت جیسی کوئی بات نہیں بلکہ بھارت اور پاکستانی فوجیں آپس میں لڑ رہی ہیں اور نہ صرف جنگ بندی کائن پر بلکہ بین الاقوامی بارڈر پر بھی جنگ جاری ہے،اس لئے اول تو جنگبندی کا اعلان کرنا پڑا اور دوم مستقل قیامِ امن کے لئے کسی ایسے معاہدہ پر پہنچنا بھی لازمی بن گیا تھا،جس کے ذریعے دونوں پڑوسی ممالک کو شرط وشرائط کا پابند بنایا جائے،اس دوران چونکہ روس ان دنوں عروج پر ہونے کی وجہ سے اقوامِ متحدہ میں اپنی خاص پوزیشین کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بھارت اور پاکستان کا نزدیکی ہمسایہ بھی تھا لہذا روسی صدر کوسی جن نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے علاقے میں اپنا دبدبہ برقرار رکھنے کے لئے دونوں ممالک کے سربراہوں کو روس کے شہر تاشقند بلایا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ دونوں کو ایک معائدہ پر دستخط کرنا پڑا اور اسی معائدہ کو''تاشقند معائدہ'' کا نام دیا گیا۔اس حوالہ سے سابقہ قسط میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ ایک بار تاشقند میں میں اس معاہدے تک پہنچنے کے دوران ایسے بھی حالات پیدا ہو گئے تھے کہ جب عین ممکن تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جاری مذاکرات تعطل کا شکار ہو جاتے لیکن کوسی جن نے اپنی ساری مصروفیات کو ترک کر کے تب تک کوئی کام نہیں کیا، جب تک کہ بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور پاکستانی صدر جنرل ایوب خان اس معائدہ پر دستخط کرنے پر آمادہ نہیں ہو گئے. مذکورہ معاہدے کا جو متن اس وقت دستیاب ہے،اس کا آزادانہ ترجمہ کچھ اس طرح

سے کیا جا سکتا ہے:

تاشقند معاہدہ

''بھارتی وزیر اعظم اور پاکستانی صدر، جو کہ دونوں ممالک کے موجودہ حالات پر تبادلہ خیال کرنے کی غرض سے تاشقند میں مل رہے ہیں اور ایک طویل ور مفصل سلسلۂ گفتگو کے بعد دونوں رہنماء اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں ممالک کے درمیان معمول کے حالات بحال کئے جائیں، دونوں ممالک کے عوام کے درمیان دوستانہ تعلقات اور خیر سگالی کو فروغ یا جائے، دونوں رہنماء سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے اقدامات کے ساتھ دو ملکوں میں بسنے والے چھ سو ملین عوام کی فلاح و بہبود اور مفادات وابستہ ہیں۔

(۱) بھارتی وزیر اعظم ور پاکستانی صدر اس بات پر آمادہ اور متفق ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ملک کے اندر ایسے تمام اقدامات کریں گے اور تمام وسائل کو بروئے کار لائیں گے، جن سے دونوں جانب دوستانہ اور خوشگوار ماحول قائم ہو سکے، جیسا کہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مطابق دونوں پر لازمی ہے۔ اس معاہدہ کے تحت وہ اس بات کا اعادہ بھی کرتے ہیں کہ وہ مستقبل میں اپنے باہمی معاملات کو صرف پر امن طریقہ سے ہی حل کریں گے اور اس سلسلے میں کسی زور زبردستی یا طاقت کا استعمال نہ کریں گے۔ دونوں رہنماؤں کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ مسلسل جنگ وجدل سے دونوں جانب کے عوام کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا ہے، خاص طور پر برصغیر ہندو پاک میں بسنے والے عوام اس سے بری طرح سے متاثر ہو رہے ہیں، مذاکرات کے دوران ریاستِ جموں وکشمیر کی موجودہ صورتحال کے بارے میں بھی تفصیلاً بحث وتمحیص کی گئی اور یہ اخذ کیا گیا کہ موجودہ صورت حال اس حوالہ سے کسی بھی طرح سے موزون نہیں، اس سلسلے میں بھی دونوں فریقین نے اپنی اپنی پوزیشن واضح کر دی ہے۔

(۲) دونوں ملکوں کے سربراہ اس بات پر بھی آمادہ ہوئے ہیں کہ وہ اپنی اپنی مسلح افواج کو اپنی پرانی پوزیشنوں پر واپس بلائیں گے اور یہ پوزیشن 5 اگست 1965ء سے پہلے کی پوزیشن ہوگی اور دونوں فریق اپنی اپنی جانب جنگ بندی کا اہتمام کریں گے اور اس کو برقرار رکھنے کا ہر ممکن اقدام کریں گے

(۳) دونوں ممالک اپنے اپنے ملک میں کسی بھی مخالف اور منفی پروپگنڈہ کی مخالفت کریں گے اور ایسے پروپگنڈہ کو فروغ دیں گے، جس کی وجہ سے دونوں جانب کے عوام میں دوستانہ ماحول قائم ہو سکے گا اور دوستانہ ماحول کو فروغ ملے گا۔

(۴) دونوں رہنماء اس بات پر متفق ہیں کہ پاکستان میں بھارتی سفارت خانہ اور بھارت میں پاکستانی سفارت خانہ اپنی اپنی پرانی پوزیشنوں پر بحال ہو جائیں گے، دونوں سفارت خانے آزادانہ ماحول میں اپنا اپنا کام کریں گے اور اس سلسلے میں دونوں جانب سے سفارتی تعلقات کے حوالے سے 'ویانا کنونشن 1961' کا احترام کیا جائے گا۔

(۵) دونوں رہنماء اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ اپنے معمول کے تجارتی تعلقات کو بحال کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں فروغ بھی دیں گے اور دونوں جانب سے ثقافتی اور تمدنی تبادلے اور تعلقات کو فروغ دیا جائے گا اور دونوں ممالک اپنے درمیان پہلے سے موجودہ تمام سمجھوتوں اور معاہدوں کو عملانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

(۶) دونوں رہنماء اس بات کا بھی اعادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ملک میں موجود ایک دوسرے کے جنگی قیدیوں کی رہائی کی بھی فوری طور ہدایات جاری کریں گے۔

(۷) دونوں رہنماء اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ مہاجرین، پناہ گزینوں اور غیر قانونی طور ترک مکانی کرنے والوں کے مسائل کو جلد سے جلد نمٹانے کی کوششیں کریں گے، دونوں جانب ایسے حالات کو فروغ دیا جائے گا. جس سے عوام کو جنگ کی وجہ سے ہونے والے نقصانات اور مشکلات سے فوری طور نجات مل سکے

(۸) دونوں رہنماء اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ہر سطح پر ملاقاتوں اور تبادلہ خیالات کا سلسلہ جاری رکھیں گے، جن میں فوری نوعیت کے اور براہ راست معاملات کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی، اس کے علاوہ دونوں جانب سے یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ ایک مشترکہ پاک بھارت اعلیٰ سطحی کمیشن قائم کریں گے، جو اپنی اپنی حکومتوں کے ساتھ رابطہ رکھ کر مستقبل کے حوالہ سے ایک لائحہ عمل تیار کرے گا اور اس حوالہ سے ضروری اقدامات کرنے کا مشورہ بھی دے گا۔

(۹) بھارتی وزیر اعظم اور پاکستانی صدر قیام امن کے اس معاہدے کی کامیابی کے حوالے سے سوویت یونین (موجودہ روس) کی قیادت کی طرف سے کی گئی کوششوں کے حوالے سے اپنے نیک خیالات اور احساسات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اس قریبی پڑوسی اور ہمسایہ دوست کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں، خاص طور پر چیئر مین کونسل آف دی منسٹرس (USSR) کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جنھوں نے اس معاہدے کے حوالہ سے نا قابلِ

فراموش اور تعمیری کوششیں کیں، اس کے علاوہ دونوں رہنماء ازبکستان (جہاں تاشقند شہر واقع ہے) کے عوام کا ان کے شاندار استقبال اور مہمان نوازی کے لئے بھی ان کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں، ساتھ ہی دونوں رہنماء چیئرمین آف دی منسٹرس کونسل سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس معاہدہ پر ایک گواہ کی حیثیت سے دستخط کریں (تاکہ سند رہے)''

تاشقند معاہدے کا بغور جائزہ لیا جائے تو ایک بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس معاہدے میں پاکستان کو اگرچہ وقتی طور کچھ نقصانات اٹھانا پڑے لیکن کل ملا کر کشمیر کے حوالے سے اس کا کچھ فائدہ بھی ہوا، مثال کے طور پر اول تو اس نے اس جنگ میں جیتے ہوئے درۂ حاجی پیر اور چکن نیک (مرغے کی گردن) نامی اہم سرحدی علاقوں کو بھارت کو نہیں لوٹایا، یہ سرحدی چوکیاں بلندی پر واقع ہیں اور علاقے کی نگرانی کے حوالے سے کافی فائدہ مند ہیں۔ دوم یہ کہ یہ معاہدہ چونکہ اقوامِ متحدہ کے اصرار پر ہوا اور روس اس وقت اس عالمی ادارے میں 'ویٹو پاور' کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے اس معاہدہ میں درج شرائط کافی اہمیت رکھتی ہیں اور اس حوالے سے یہ بات پاکستان کے لئے کافی اچھی تھی کہ معاہدے کی شرط نمبر ۲ میں یہ بات درج کی گئی کہ دونوں ممالک اپنی افواج کو 5 اگست 1965ء کی پوزیشن پر واپس لے جائیں گے، جبکہ اس سے قبل اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں پاکستان کو ایک حملہ آور قرار دے کر یہ کہا گیا تھا کہ وہ 15 اگست 1947ء کی پوزیشن پر واپس چلا جائے اور ریاست کے وہ حصے، جن پر اس نے قبضہ کر لیا تھا، بھارت کے سپرد کئے جائیں، تاکہ بھارت کی سربراہی میں ریاست میں استصوابِ رائے کرایا جاسکے، لیکن تاشقند معاہدے کی وجہ سے پاکستان سے کہا گیا کہ وہ 5 اگست 1965ء کی پوزیشن پر واپس جائے اس طرح سے بھارت نے پاکستانی قبضے والے علاقہ جات پر اس ملک کے قبضے کو بھی تسلیم بھی کیا اور اس حوالے سے باضابطہ معاہدے پر دستخط بھی کیے۔ معاہدے کے متن کو پڑھنے اور جن حالات میں یہ طے پایا، ان کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ گویا بھارت اس وقت کسی سخت دباؤ کا شکار تھا اور پاکستان ایک فاتح کی حیثیت سے اس سے اپنی شرائط منوا رہا تھا...اور شائد یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بھارت نے کبھی نہ تو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے کی بات کہی اور نہ ہی پاکستانی قبضے والے علاقوں کو اپنی ریاست کا حصہ قرار دے کر ان کو واپس حاصل کرنے کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش کی۔ جب کہ اس معاہدے کے صرف چند برس بعد یعنی 1971ء میں پاکستان میں اندرونی انتشار پیدا ہو گیا اور مشرقی پاکستان نے بغاوت کر کے الگ بنگلہ دیش قائم کر لیا۔ اسی دوران حالات ایسے

ہوئے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک اور معاہدہ ''شملہ معاہدہ'' کے نام سے طے پایا، جس کی تفصیلات اگلی اقساط میں آرہی ہیں۔

39

جماعتِ اسلامی
نظریہ پاکستان سے بھارتی انتخابات تک

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور اس کے بعد تاشقند معائدے کی وجہ سے بھارت اور پاکستان، دونوں کی معیشت اور باہمی تعلقات بری طرح سے متاثر ہوئے تھے، دونوں کے زخم ابھی تازہ تھے اوران واقعات کا ریاستی عوام پر بھی کافی برااثر پڑا تھا، خاص طور پر سرحدی علاقوں میں رہنے والے وہ لوگ، جو1947ء کی جنگ اور تقسیم کی وجہ سے لٹ جانے کے بعد ابھی بمشکل اپنے آپ کو سمبھال ہی رہے تھے کہ ایک بار پھر سے لٹ کر رہ گئے، گھروں کو جلا دیا گیا، زمین وجائدادیں چھن گئیں، کچھ ہجرت کر کے ایک نئی دنیا میں داخل ہوگئے اور کچھ واپس تو آ گئے لیکن واپسی پر ان کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا، ان اجڑے ہوئے لوگوں کو ایک بار پھر سے اپنی عمارتِ زندگی کی بنیادیں استوار کرنا پڑیں، اجڑے ہوئے دیار کو بسانا مشکل ضرور تھا لیکن اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہ تھا، اُدھر دونوں ملک اپنی اپنی جگہ انتقام اور بدلے کی آگ میں جھلس رہے تھے تو اِدھر عوام اپنے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف، اس دوران اگر چہ ریاست کا سیاسی تلاطم کچھ خاموش ہی رہا لیکن اس کے بعد اس میں ایک مرتبہ پھر سے اچھال آیا اور زمانے نے اپنی کروٹ کچھ اس طرح سے بدلی کہ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایسے بھی حالات پیدا ہوجائیں گے۔ یہ وہ دور تھا جب نیشنل کانفرنس نے 'محاذ رائے شماری' قائم کر کے ریاست میں یہ مطالبہ شروع کر رکھا تھا کہ ریاستی عوام کو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق بین الاقوامی ادارے کی نگرانی میں استصوابِ رائے کی اجازت دی جائے، لیکن اس جنگ میں پاکستان کی پہل اور تاشقند معاہدہ کی وجہ سے محاذ کے ایک دھڑے میں مایوسی پیدا ہوگئی اور اس کے، اُس وقت کے جنرل سیکریٹری علی محمد نائک نے اپنے کچھ ساتھیوں سمیت محاذ سے علیحدگی اختیار کر کے انتخابی عمل میں کودنے کا فیصلہ کرلیا، ان میں سے دو نے1967ء کے اسمبلی الیکشنوں میں حصہ لیا اور کامیابی بھی حاصل کر لی لیکن شیخ محمد عبداللہ نے اسے تسلیم نہیں کیا اور علی محمد نائک کو اس کے باغی حامیوں سمیت محاذ سے بیدخل کر دیا گیا۔

پرویز دیوان کے مطابق اسی دوران کشمیر میں ایک عجیب وغریب واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک کشمیر پنڈت لڑکی پرمیشوری نے ایک مسلمان لڑکے کے ساتھ شادی کر لی، جس کی وجہ سے کشمیری مسلمانوں اور پنڈتوں کے درمیان کافی تناؤ کی صورتحال پیدا ہوگئی، اس نے آگے چل کر کافی تیزی پکڑ لی اور ریاستی حکومت کے لئے امن و قانون کا سنجیدہ مسئلہ پیدا ہوگیا، کشمیری پنڈتوں نے اس واقعے کو لے کر زبردست احتجاجی تحریک چلائی اور عین خطرہ تھا کہ صورت حال حکومت کے ہاتھوں سے نکل جاتی کیونکہ دونوں طبقوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ کے امکانات بڑھ گئے تھے لیکن اسی دوران محاذ رائے شماری، جس کو اس وقت کافی مقبولیت حاصل تھی، رضا کارانہ طور پر سامنے آیا اور غلام محمد صادق کی حکومت کو اس مسئلہ سے نکالنے کے لئے اپنے تعاون کی پیشکش کی، اس پیشکش کے کافی مثبت نتائج سامنے آئے اور اس کے بدلے میں خیر سگالی کے طور پر حکومت نے شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ پر عائد کردہ نقل و حمل کی پابندیاں ہٹالیں''

اکثر مورخین کے مطابق اس جنگ کی وجہ سے ریاست میں پاکستانی حمایت کو ایک بار پھر دھچکہ لگا اور لوگوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ پاکستان ریاستِ جموں وکشمیر کو بزورِ بازو اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے اور اس کے بار بار کے حملوں کی وجہ سے یہاں تباہی کے سواء کچھ بھی حاصل نہیں ہو رہا ہے، اگلے سال یعنی 1968ء میں شیخ محمد عبداللہ کو 'گھریلو قید' یعنی ''ہاؤس اریسٹ'' سے آزاد کر دیا گیا اور سیاسی ریل گاڑی ایک مرتبہ پھر سے پٹڑی پر چل پڑی۔ اسی سال دلی کے کچھ سرکردہ قانون دانوں نے مجاہد منزل سرینگر میں نیشنل کانفرنس کے صدر دفتر پر کشمیر کی تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل ایک ''کل جماعتی کانفرنس'' کا اہتمام کرایا اور اس کانفرنس میں دوسروں کی مرضی کے خلاف بخشی غلام محمد نے یہ سٹینڈ لیا کہ ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کر دیا جائے، ایک سرکردہ کشمیری وکیل عبدالرشید شاہ کی قیادت میں ممبران کی ایک بڑی تعداد نے استصوابِ رائے کا مطالبہ کیا جبکہ جن لوگوں نے بھارت کی حمائت کی ان میں مولانا محمد سیعد مسعودی اور غلام محی الدین قرہ بھی شامل تھے۔

''اس کانفرنس میں ایک واحد ممبر ڈیلی گیٹ یعنی سید علی شاہ گیلانی نے پاکستان کی حمایت کی اور ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرانے کا مطالبہ کیا، گیلانی اس وقت دائیں بازو کی اسلامی تنظیموں کی نمائندہ جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ تھے اور انہوں نے اپنی جماعت کا نکتہ نظر سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیئے'' پرویز دیوان / کشمیر / صفحہ نمبر 108)

دیوانؔ آگے لکھتے ہیں "...لیکن یہ ایک عارضی انتظام تھا اور انہوں (گیلانی) نے جلد ہی (کچھ دیر کے لئے) پاکستان کا خیال ترک کر دیا اور تب تک اگر چہ جماعت اسلامی نے (بھارت اور پاکستان میں کہیں بھی) انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا تاہم اس کے بعد جماعت نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا اور 1972ء کے انتخابات میں اس کے تین سرکردہ لیڈران، بشمول سید علی گیلانی انتخابات جیت گئے، انہوں نے بھارتی آئین کے تحت حلفِ وفاداری لیا اور اسمبلی میں داخل ہو گئے اور پورے پانچ سال تک اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخابات کی نمائندگی کرتے رہے۔ گیلانی نے اس کے بعد بھی مزید دو انتخابات میں حصہ لیا اور سوپور حلقہ انتخاب سے سال 1977 اور 1987ء میں کامیابی حاصل کی"

ادھر ریاست میں اگرچہ سیاسی مخاصمت کچھ کم ہوئی اور الحاقِ پاکستان کے حامیوں نے انتخابات جیت کر اسمبلی میں داخلہ لے لیا لیکن ادھر دوسری جانب بھارت اور پاکستان کے دل و دماغ میں پلنے والے دشمنی کے جراثیموں نے ایک بار پھر سے اپنی اچھل کود شروع کر دی، اس کے لئے اگرچہ حالات کہیں اور پیدا ہوئے لیکن فریقین چونکہ موقعہ اور حالات کا فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھے، لہٰذا دونوں ممالک ایک بار پھر سے جنگ و جدل میں الجھ کر رہ گئے اور اس جنگ کو بنگلہ دیش جنگ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ بعض مورخین اگرچہ معترض ہیں اور مانتے ہیں کہ بنگلہ دیش جنگ کا تعلق کشمیر کے ساتھ نہیں تھا لیکن اتنا تو سبھی مانتے ہیں کہ یہ جنگ اسی دشمنی کا نتیجہ تھی، جو بھارت اور پاکستان، دونوں کے دلوں میں کشمیر کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی جبکہ بھارت کے دل و دماغ پر 1965ء کی پاکستانی شرارت کے زخم بھی ابھی ہرے تھے۔ دونوں اس وقت تک اس وجہ سے دو باضابطہ جنگیں لڑ چکے تھے اور فیصلہ پھر بھی نہیں ہو پایا تھا، بھارت ریاست کے مزید کچھ حصے کھو چکا تھا اور پاکستان اطمینان کے ساتھ ریاست کے ان حصوں پر حکومت کرنے لگا تھا، جن کو خالی کرنے کے لئے اسے 1947 میں اقوامِ متحدہ نے اسے صرف چار دن کی مہلت دی تھی۔

میر غلام احمد اپنی سوانح حیات "میں نے کشمیر جلتے دیکھا" میں اس حوالہ سے رقم طراز ہیں:

"تقسیم برصغیر کے وقت قائدِ اعظم محمد علی جناح سخت بیمار تھے، پاکستان چونکہ دنیا کے نقشے پر ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے ابھر چکا تھا اور باؤنڈری کمیشن کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ وہ پوکستان کو مسلم اکثریتی علاقوں کی نشاندہی کر دے، لیکن اس دوران پاکستانی قائدین نے ایک بہت بڑی غلطی یہ کر دی کہ انہوں نے پاکستان کے مرکز اسلام آباد سے بہت دور مشرق میں مغربی بنگال کا ایک حصہ کاٹ کر اسے "مشرقی پاکستان" کی حیثیت

سے اپنے ساتھ ملا لیا، اس حصے کا مغربی حصوں کے ساتھ رابطہ کافی دور کا تھا اور پاکستان کو بھارتی فضاء کے اوپر سے ہزاروں کلومیٹر کا سفر طے کر کے جانا پڑتا تھا، یہ تقسیم قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کس مجبوری کے تحت تسلیم کی تھی؟ اس بارے میں وہی بخوبی جانتے تھے۔مشرقی پاکستان میں ایک ہی قوم یعنی بنگالی لوگ آباد تھے جبکہ مغربی پاکستان میں سندھی، بلوچ اور پنجابی آباد تھے، اس طرح سے اس ملک کا وجود تیکنکی اعتبار سے کافی ناقص بنیادوں پر عمل میں آیا تھا، بنگالی عوام، جو کہ تعلیمی اور سماجی لحاظ سے کافی بیدار اور ترقی یافتہ تھے، کو یہ احساس بُری طرح ستائے جا رہا تھا کہ ان پر ہزاروں میل دور بیٹھے پنجابی، سندھی اور بلوچی حکومت کرتے ہیں اور ان کو اس میں بہت کم شراکت دی جا رہی ہے، جو کسی حد تک سچ بھی تھا''

اُدھر بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت اور تناؤ میں اضافہ ہو رہا تھا تو اِدھر کشمیر میں انہی دنوں 'الفتح' نامی ایک کشمیری علیحدگی پسند تنظیم منظر عام پر آئی، جو بھارت سے ریاست کی علیحدگی کے لئے سرگرم ہوئی، تاریخی شواہد کے مطابق یہ پہلی کشمیری تنظیم تھی، جس نے اگرچہ بہت کم وقت کے لئے ہی سہی لیکن مسلح جدوجہد کا اعلان کیا اور بھارت کو کھلے عام للکارا۔ پرویز دیوان کی کتاب میں اس حوالے سے درج ہے کہ'' 30 جنوری 1971ء کو جموں اور سرینگر کے درمیان چلنے والے ائر انڈیا کے ہلکے طیارے ''گنگا'' کا اغواء کر کے اسے لاہور لیجایا گیا، اغوا کاروں نے دعویٰ کیا کہ وہ کشمیری ملی ٹنٹ ہیں، اس دوران ایک بچگانہ حرکت یہ کی گئی کہ لاہور میں پاکستانی ذمہ داروں نے اغوائی کاروں کو گرفتار کرنے کی بجائے انہیں اس بات پر اکسایا کہ وہ جہاز میں آگ لگا دیں، چنانچہ اغوا کاروں کو پیٹرول فراہم کیا گیا اور جہاز کو لاہور ہوائی اڈے پر اڑا دیا گیا، اسی کے ساتھ ایک کشمیری اغوا کار ہاشم قریشم قریشی کا نام بھی منظر عام پر آیا، جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اپریل 1970 میں پاکستان گیا تھا، جہاں اسے لبریشن فرنٹ کے چیف مقبول بٹ نے اغواء کی تربیت دی تھی.....(نوٹ: اس اغواء کا تعلق چونکہ ایک حساس معاملے کے ساتھ ہے اور اس کے 'ملزم' ہاشم قریشی ابھی بقیدِ حیات ہیں اس لئے بہتر ہوگا کہ ان سے رابطہ قائم کر کے اس بارے میں صحیح جانکاری حاصل کی جائے۔

40

گنگا ہائی جیک.... حقیقت اور افسانہ(1)

اکثر مورخین اس بات کے قائل رہے ہیں کہ 1971ء میں کشمیری نوجوان ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے ہاتھوں سرینگر سے لاہور ہائی جیک ہونے والے بھارتی مسافر بردار طیارے 'گنگا' کے اغواء کے پسِ پردہ بھارت کی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ تھا اور انہوں نے ہاشم اور اشرف قریشی نامی دو چچیرے بھائیوں کو اس لئے اس کام میں ملوث کیا تا کہ اس کے بدلے ایک جواز پیدا کر کے بھارتی فضائی حدود سے گزرنے والے مغربی پاکستان کے ہوائی جہازوں کی نقل و حمل بند کر کے بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) میں پھنسی ہوئی پاکستانی افواج کے تمام راستے مسدود کر دیئے جائیں اور پاکستان سے 1965ء کی جنگ کا بدلہ لیا جائے، جس میں بھارت کو کافی حزیمت اور شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ جس روز 'گنگا' نامی اس طیارے کو لاہور ائیر پورٹ پر آگ لاگا کر تباہ کر دیا گیا، اسی روز بھارتی وزیر اعظم مسز اندا گاندھی نے پاکستان کو سخت لہجے میں 'خطرناک نتائج' کی دھمکی بھی دی اور اس کے سارے ہوائی جہازوں کی نقل و حرکت کو بھارتی حدود کے اندر ممنوع قرار دے دیا، جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانی فوجیوں کو کمک نہیں مل سکی اور انھیں بالآخر بھارتی افواج 'مکتی باہنی' کے سامنے سرینڈر کرنا پڑا۔ اگر چہ موٹے الفاظ میں یہ سبھی باتیں صحیح ہیں لیکن اس ساری صورتحال کے پیچھے کارفرما اُن نازک پہلوؤں اور گوشوں سے پردہ اٹھانا بھی کافی اہم اور ضروری معلوم ہوتا ہے، جن پر ابھی تک یا تو مصلحتاً کوئی بات نہیں کی گئی یا پھر اس حوالے سے معلومات کی کمی رہی ۔تاریخ کی کتابوں اور حوالہ جات سے ہٹ کر ان خطوط اور عدالتی بیانات کو، جو کشمیر کے شہید اول مقبول بٹ نے لکھے یا پھر اس کیس کے حوالے سے مختلف لوگوں نے عدالتوں میں دئے ،کافی غور سے پڑھنے اور سمجھنے سے اس واقعہ کے بارے میں جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ پہلے کی ساری تصاویر سے کافی مختلف اور انوکھی ہے اور اگر ان حقائق کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ گنگا اغواء محض ایک ڈرامہ نہیں تھا بلکہ پاکستان کی ایک بہت سوچی سمجھی اور منصوبہ بند کوشش تھی، جس کو پہلے اگر چہ کسی اور مقصد سے عملایا گیا تھا لیکن بعد میں پانسہ پلٹ گیا اور پوری کہانی کا رُرخ افسانوی انداز میں موڑ دیا گیا۔ اس

کیس میں ملوث سب سے اہم اغواء کار ہاشم قریشی ایک لمبے عرصے تک یورپ کے مختلف ممالک میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے، ماسٹر مائنڈ شہید محمد مقبول بٹ کو دلی کی تہاڑ جیل میں ۱۱ فروری 1983 کو پھانسی دے دی گئی، لیکن اس کے ساتھ یہ کہانی ختم نہیں ہوئی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب یہ باتیں سامنے آرہی ہیں کہ 1971ء تک کشمیر میں بھارت مخالف اور مزاحمتی مزاج رکھنے والے نوجوانوں میں یہ سوچ پیدا ہو رہی تھی کہ انہیں بھارت سے کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے کسی دوسرے ملک کی فوجی امداد پر مزید انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے بل بوتے پر کوئی مزاحمتی تحریک برپا کر کے یہ کام انجام دینا چاہیے۔ ہاشم قریشی، جو کہ اس وقت کشمیر کے سرکردہ حریت پسندوں اور مزاحمت کاروں میں گنے جاتے ہیں (اور جموں وکشمیر ڈیمکریٹک لبریشن پارٹی کے صدر بھی ہیں)، نے 'گنگا اغوا کیس' کے حوالے سے کافی کچھ لکھا ہے اور وہ آج بھی اس بات کو بیانگِ دہل تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام محمد مقبول بٹ، جو کہ اس وقت پاکستان میں موجود تھے، کے کہنے پر کیا تھا اور جب وہ طیارہ اغوا کرنے کے بعد لاہور ہوائی اڈے پر جہاز سے باہر آئے تو پاکستان کے اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ان کا استقبال کیا اور انھیں شاباشی دیتے ہوئے گلے سے بھی لگایا تھا۔

ہاشم قریشی ''شہیدِ اعظم مقبول بٹ اور گنگا ہائی جیکنگ'' کے نام سے اپنے ایک رسالے، جس میں انہوں نے اسے حوالے سے بہت اہم معلومات اکٹھی کی ہیں، کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

> ''1971ء میں ہائی جیکنگ سے کشمیری قوم کو ایک نئی جدوجہد یعنی مسلح جدوجہد قومی آزادی کے تشخص کی بنیاد پر ڈالنے کا راستہ ملا تھا، بیرونی ایجنسیوں اور طاقتوں کے بجائے کشمیر کے ہی لوگوں نے ایک تنظیم اور ایک ذہین لیڈر یعنی مقبول بٹ شہید کی سربراہی میں Independent کشمیر کی مومنٹ شروع کی تھی اور جہاز کے اغواء سے کشمیری عوام کے اندر ایک نیا سیاسی حوصلہ اور امنگ ابھر گئی تھی کہ ہم بھی الجزائر اور ویت نام کی طرح اپنی آزادی کی جنگ خود لڑ سکتے ہیں۔ لوگوں نے مکار سیاسی بازیگروں کو آرو پار شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا تھا اور جموں وکشمیر کے لوگوں کو سیاسی افق پر ایک نیا سورج مقبول بٹ کی شکل میں نظر آنے لگا اور ان کو ہاشم اور اشرف قریشی کی شکل میں دو قومی ہیرو مل تو گئے لیکن دونوں ملکوں (بھارت اور پاکستان) نے کشمیری قوم کے خلاف پھر ایک سازش رچائی اور ریاستِ جموں وکشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ مرحوم صادق صاحب سے بیان دلوایا گیا کہ یہ ہندوستان کی

سازشت ہے، اور ایک سنہا نامی فوجی آفیسر سے کتاب لکھوائی گئی کہ یہ ہندوستان کی سازش ہے، ستم ظریفی دیکھئے کہ پاکستان، جو کہ ریاستِ جموں وکشمیر کی حکومت کو کٹھ پتلی کہہ رہا تھا، نے اسی وزیرِاعلیٰ (صادق صاحب) کا بیان خصوصی عدالت میں گواہی کے طور پیش کیا...اصل میں دونوں ملکوں نے ریاستِ جموں کشمیر کو تقسیم کے عذاب میں مبتلاء رکھنے کے لئے یہ سازش رچی تھی......''

اسی دوران پاکستان کی اس خصوصی عدالت میں سرکردہ کشمیری سیاستدان کے ایچ خورشید کا وہ بیان بھی کافی اہمیت رکھتا ہے، جس میں گنگا اغواء کیس میں شامل ''قومی ہیروز' کے خلاف ہندوستانی ایجنٹ ہونے کے الزام میں کیس چل رہا تھا۔ مرحوم کے ایچ خورشید اپنے اس بیان میں کہتے ہیں:

''2 فروری 1971ء کو تقریباً سات بجے میری پارٹی کے ایک رکن فاروق سہیل نے مجھے لاہور ایر پورٹ سے فون کیا، اس نے مجھے بتایا کہ جاوید صغیر کو ائر پورٹ سے ہٹا دیا گیا ہے اور مجاہدین آزادی کو کھانا نہیں دیا جا رہا ہے، یہ بھی خطرہ تھا کہ کچھ گرفتاریاں ہوں گی۔ میں ائر پورٹ گیا اور وہاں میری سیکورٹی آفیسر سے ملاقات ہوئی، اس کا نام زبیر تھا، اس نے مزید بتایا کہ پی آئی اے نے یہ کہہ کر کھانے کی سپلائی بند کر دی ہے کہ مجاہدینِ آزادی ان کے مسافر نہیں ہیں، دوسری بات یہ کہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے اور وہ کسی قسم کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتے...میں پہلے مقبول بٹ سے ملا، میں ان سے کھانے کی سپلائی کے بارے میں پوچھ ہی رہا تھا کہ اسی دوران ایس ایس پی عبدالوکیل خان ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے، میں نے مقبول بٹ سے کھانا بند کرنے کی وجہ پوچھی، انہوں نے اس خبر کی تصدیق کی کہ ہاشم قریشی نے کہا کہ وہ صرف وہی کھانا کھائے گا، جسے پہلے ایس ایس پی چکھے گا، میں نے کہا کہ یہ مطالبہ بالکل انسانی ہے، چاہے اس کا سیاسی رخ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ ہمیں ہائی جیکروں کی جان کی فکر تھی اور ان کی روزانہ ضرورتوں مثلاً ان کا کھانا وغیرہ، ان چیزوں کی فکر تھی.....وہ (ہاشم) مجھ سے نہیں بلکہ مقبول بٹ سے بات چیت کر رہا تھا، اور میں پاس ہی بیٹھا ہوا ان کی بات چیت سُن رہا تھا، ہاشم نے مقبول بٹ کو بتایا کہ ان آفیسروں نے اسے طیارہ جلانے کے لئے کہا تھا، آفیسروں سے مراد میں نے ایس ایس پی عبدالوکیل اور ڈی ایس پی باقر علی شاہ لیا، مقبول کا خیال تھا کہ

طیارہ جلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، البتہ اسے ہلکا سا نقصان پہنچانا چاہیے، اس کے بعد ہاشم نے پوچھا ''نقصان سے کیا مراد؟'' مقبول بٹ نے کہا کہ اس کے دروازے، کھڑکیاں اور ڈائل توڑ دیئے جانے چاہئیں، اس کے بعد وہ طیارے کو جلانے یا نہ جلانے کے فائدے اور نقصان پر غور کرتے رہے۔ مقبول بٹ کا خیال تھا کہ کھڑکیاں وغیرہ توڑنے کے نتیجے میں ایک انجینئر اس کی مرمت کے لئے آئے گا اور اس طرح بھارتی حکومت کو سوچنے کے لئے مزید موقعہ مل جائے گا کہ اُن لوگوں کو رہا کرنا ہے، یا نہیں کہ جن کے لئے طیارہ اغواء کیا گیا ہے.... ہم تقریباً دس منٹ وہاں رُکے اور اس کے بعد وہاں سے چل پڑے، میں پہلے اٹھا، پھر نواب وکیل، پھر مقبول بٹ، اس موقعہ پر ایس ایس پی نواب وکیل نے مندرجہ ذیل الفاظ بڑبڑائے ''خدا کے لئے ہماری جان چھوڑ و اور جہاز کو اڑا دو''.... میں اور مقبول کمرے سے باہر آ گئے اور ہاشم کو پولیس آفیسر لے گئے، مجھے نہیں معلوم کہ ہاشم کو کون سا پولیس آفیسر لے گیا۔۔۔ میں ائرپورٹ چھوڑنے ہی والا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ طیارے کو آگ لگا دی گئی ہے۔''

.اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے جسٹس یعقوب علی خان نے روزنامہ ''جنگ'' پاکستان کو (12فروری1992ء) اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ 1971ء میں بھارتی طیارے گنگا کے اغواء میں ملوث ملزمان کے خلاف مقدمے کی سماعت کرنے والی خصوصی عدالت کے جج اور سابق چیف جسٹس آف پاکستان یعقوب علی خان نے کہا تھا کہ خصوصی عدالت نے ہائی جیکروں، اشرف قریشی، ہاشم قریشی اور اُن کے لیڈر مقبول بٹ پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام مسترد کر دیا تھا لیکن پاکستان کے سیکریٹری خارجہ اکرم ذکی نے گنگا ہائی جیکنگ کیس کو بھارتی سازش قرار دے کے سخت زیادتی کی ہے ....یعقوب علی خان نے کہا ہے کہ اکرم ذکی کنٹرول لائن پار کے فیصلے پر تنقید کرنے کا حق رکھتے ہیں... لیکن انہوں نے گنگا ہائی جیکنگ کے ساتھ ساتھ کنٹرول لائن پار کرنے کے فیصلے کو بھی بھارت کی ممکنہ سازش قرار دے کر اچھا نہیں کیا، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا'' (صفحہ نمبر 14)

گنگا ہائی جیکنگ سے متعلق پاکستان کے انتہائی معزز سیاست دان کے ایچ خورشید اور جسٹس یعقوب علی کے یہ بیانات کافی اہمیت رکھتے ہیں اور اس کی اہمیت اس حوالے سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ انہوں نے اس پاکستانی عدالت میں دیئے، جہاں 'کشمیری مجاہدین' کو اغواء کار بنا کر انہیں دُشمن کا آلہ کار قرار دیا جا رہا تھا اور ان کے اس کام کو، جس کے عوض وہ انعام و اکرام کی توقع کرتے تھے، انہیں قید و بند

کی سختیاں اور زنجیریں عطاء کی گئی تھیں، ان بیانات سے جو سب سے زیادہ غور طلب بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آخر وہ کون سی ایسی مجبوری تھی، جس کے تحت پاکستان کی حکومت کو ایسا کرنا پڑا، حالانکہ طیارے کے لاہور پہنچنے پر اغواء کاروں کا استقبال اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے سرکاری اعزاز کے ساتھ کیا اور انہیں سینے سے بھی لگایا، لیکن اس کے فوراً بعد ان کا کھانا بند کر دیا گیا اور ہاشم قریشی کو اپنی سلامتی کا خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے کھانے میں کسی ممکنہ زہر کی ملاوٹ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا... اس حوالے سے لاہور ہوائی اڈے پر اغوا کاروں سے ملنے اور جہاز کی تلاشی لینے والے پاک فوج کے آفیسر میجر رحیم شاہ نے جو بیان عدالت مذکورہ میں دیا، اس سے اس اغوا کے بارے میں مزید جانکاری ملتی ہے، میجر شاہ کا کہنا ہے کہ اس نے ائر پورٹ پر اغوا کاروں میں سے ہاشم قریشی کے پاس ایک 9MM پستول دیکھا اور اشرف قریشی کے ہاتھ میں ہینڈ گرینیڈ، لیکن بعد میں انہیں احساس ہوا کہ یہ دونوں ہتھیار نقلی تھے، لیکن تب تک کافی دیر ہو چکی تھی، ان کا کہنا ہے کہ اگر انہیں ائر پورٹ پر ذرا بھی شبہہ ہوا ہوتا کہ یہ ہتھیار نقلی ہیں تو انہوں نے اغوا کاروں کو غیر مسلح کر لیا ہوتا... میجر شاہ کو اس وقت تک پاکستانی فوج میں سترہ سال گزر چکے تھے اور وہ انفنٹری سکول کوئٹہ میں اسلحہ اور ٹیکٹکس انسٹرکٹر بھی رہ چکے تھے (لیکن اس کے باوجود انہیں اصلی اور نقلی ہتھیاروں میں فرق معلوم نہیں ہو سکا) اس بارے میں مزید باتوں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، جس پر اگلی قسط میں تفصیلاً بات ہوگی۔

گنگا ہائی جیک.....حقیقت اور افسانہ (2)

...۲ فروری ۱۹۷۱ء کو سرینگر سے جموں جانے والے بھارتی طیارے ''گنگا'' کو ہائی جیک کر کے پاکستانی شہر لاہور کے ہوائی اڈے پر شعلوں کے سپرد کر دینے کا واقعہ بظاہر ایک معمولی واقعہ تھا لیکن اس کے ردِعمل میں جن تاریخی واقعات نے جنم لیا، ان کا اثر پورے برصغیر پر بہت ہی گہرا پڑا اور یہ کافی دوررس نتائج کا حامل بھی تھا۔ مشرقی پاکستان کا کٹ جانا اور بنگلہ دیش کے نام سے ایک اور مملکت کا قائم ہونا، مسئلہ کشمیر، جو کہ اس وقت تک بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک بین الاقوامی نوعیت کا حل طلب مسئلہ تھا، شملہ معاہدے کے بعد 'آپسی مسئلہ' بن کر رہ گیا اور بنگلہ دیش، جو اس وقت تک بھارت کا دشمن تھا، ایک عرصے تک اس کا قریبی دوست بن گیا اور بنگلہ دیش کے بہت سے حساس اور سنجیدہ لوگ آج بھی اپنے ملک کے معرضِ وجود میں آنے اور آزادی کی نعمتوں سے مالا مال ہونے کے حوالے سے بھارت کو ہی اپنا مسیحا تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ اگر بھارتی افواج 'مکتی باہنی' کے روپ میں بنگلہ دیش میں داخل نہ ہوئی ہوتیں تو پاکستانی افواج نے بنگلہ دیش کی تاریخ بدل کر رکھ دی ہوتی....اتنے سارے واقعات کی بنیاد کے طور پر اکثر تاریخ دان 'گنگا ہائی جیکنگ' کا ہی نام لیتے ہیں اور اگر چہ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ یہ سارے واقعات اس ایک واقعہ کے بعد ہی پیش آئے لیکن خود طیارہ ہائی جیک کرنے والے ہاشم قریشی کا بیان اس سے کافی مختلف ہے، ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے جہاز کو اغواء کیا اور اسے لاہور میں اپنے ہاتھوں سے جلایا بھی لیکن اس کا تعلق بنگلہ دیش پاکستان جنگ کے ساتھ بالکل بھی نہیں تھا، ان کا کہنا ہے کہ اس کا سارا خاکہ شہید مقبول بٹ نے بنایا تھا اور اس کے عوض کشمیر میں بھارت کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے مزاحمتی قائدین کی رہائی مطلوب تھی اور پوری دنیا کی توجہ کشمیر کی متنازعہ حیثیت کی جانب دلانا بھی، لیکن لاہور میں ان کے ساتھ کئے گئے وعدوں کی دھجیاں اڑاتے ہوئے حکام نے جہاز کو بہت ہی جلد بازی اور عجلت میں نذرِ آتش کروا دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس واقعہ کے وقت ائیر پورٹ پر آزاد کشمیر کے سابق صدر اور قائداعظم کے پرسنل سیکریٹری کے ایچ خورشید اور ایس ایس پی لاہور سردار عبدالوکیل بھی وجود تھے، ان کا اس بات سے بھی قطعی انکار ہے کہ اس قسم

(جہاز کو جلانے) کے احکامات شہید مقبول بٹ نے دیئے تھے، وہ کہتے ہیں کہ بٹ اس ساری کاروائی کے خلاف تھے، وہ جہاز کو جزوی نقصان پہنچا کر تھوڑا وقت حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ بھارت نظر بندوں کی رہائی کے بارے میں مزید سوچ سکےلیکن اس دوران جہاز کی خاکستری کا واقعہ پیش آ گیا۔ اس سلسلے میں دوسرے ہائی جیکر اشرف قریشی کی طرف سے مارچ ۱۹۹۲ء میں پاکستانی اخبار'فرنٹئر پوسٹ'(Frontier Post) کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں اشرف قریشی کہتے ہیں:

''...ٹریننگ کیمپ کی جائے وقوع کا راز فاش ہوگیا اور ہندوستانی فوجیوں نے ایک جھڑپ کے بعد مجاہدین کو گرفتار کرلیا، اس جھڑپ میں ایک ہندوستانی آفیسر اور ایک فریڈم فائٹر اورنگ زیب شہید ہوگیا(**اور یہی کشمیر کی موجودہ جدوجہد کا پہلا شہید تھا**)1968ء میں مقبول بٹ سرینگر میں جیل ٹوٹنے کے بعد فرار ہوگئے، جب وہ پاکستان آئے تو کافی تفصیل سے ان سے پوچھ تاچھ ہوئی۔ انہیں اس وقت تک مظفرآباد کے قلعے میں رکھا گیا، جب تک کہ انہیں سفید قرار نہیں دیا گیا۔ مطلب یہ کہ انہیں ہر طرح کے شک وشبہے سے بری کر دیا گیا...رہائی کے بعد انہوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور 'آپریشن تھنڈر' اور 'آپریشن رومانہ' کا اہتمام کیا، وہ یہاں گوریلاؤں کو ٹریننگ دیتے اور انہیں جموں بھیج دیتے، جہاں کئی بارود کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ ہندوستان الزام لگاتا کہ ان کاروائیوں میں پاکستانی ملوث ہیں لیکن ہماری حکومت یہ نہیں کہتی کہ یہ کام خود کشمیریوں نے انجام دیا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ نام نہاد'وزارت برائے امورِ کشمیر'لے جاتی تھی....اس پورے عرصے میں ہندوستان کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بتاتا رہا لیکن اسی دوران لیلیٰ خالد نے ایک طیارہ ہائی جیک کرکے فلسطین کے مسئلہ کی جانب دنیا کی توجہ موڑی، ہماری قیادت نے اس واقعہ سے فیضان حاصل کرکے انہی خطوط پر کام کرنے کا فیصلہ کیا(اس وقت مقبول بٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری اور عبدالخالق انصاری صدر تھے) جب مقبول بٹ کی ملاقات پشاور میں ہاشم سے ہوئی تو انہوں نے انہیں اس کام کے لئے مناسب آدمی سمجھا اور انہیں ہندوستانی قبضے والے کشمیر بھیج دیا۔ ہاشم نے وہاں نیشنل لبریشن فرنٹ کا طلباء محاذ قائم کیا، میں وہیں اس میں شامل ہوا، ہاشم واپس پاکستان آگئے، جہاں انہیں ہائی جیکنگ کی ٹریننگ دی گئی، کوریئر کے ذریعے دستی بم اور پستول سرحد پار بھیجے گئے، لیکن کوریئر ڈبل ایجنٹ نکلا اور بھارت نے ہمارے ہتھیار اپنے قبضے میں لے لئے، اس کے بعد ہم نے لکڑی کاٹ کر پستول اور دستی بم تیار کیا، ایک چھرا لیا اور جموں جانے والے طیارے پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ ہاشم کاک پٹ کے اندر گئے اور میں نے مسافروں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی، چونکہ طیارے میں معقول مقدار میں ایندھن موجود نہیں تھا اس لئے ہم اسے

راولپنڈی نہیں لے جا سکے، ہم نے لاہور ائیر پورٹ کے حکام کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور ان لوگوں نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا اور لاہور ائیر پورٹ کی طرف ہماری رہنمائی کی''

اشرف قریشی اپنے انٹرویو میں مزید کہتے ہیں:

''حکومتِ پاکستان کو ہماری ہائی جیکنگ کے منصوبے کا علم تھا لیکن اسے بروئے کار لانے اور نافذ العمل بنانے میں اس نے کوئی خاص تعاون نہیں کیا، لاہور میں جہاں ہم نے ڈاکٹر فاروق حیدر سے رابطہ قائم کیا، ائیر پورٹ کے حکام نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا، ہمیں ایسا کوئی تاثر نہیں ملا، جس سے تاثر ہوتا کہ ہم گرفتار ہونے والے ہیں لیکن ایک ستم ظریفی یہ کہ پاکستان میں حکومت اور عوام کے جذبات ہمیشہ مختلف رہے ہیں، لاہور ہوائی اڈے پر کمشنر آغا افضل اور فوجی حکام مسافروں کو اپنے ساتھ لے گئے، ہم ابھی نوعمر تھے اور یہ بات محسوس نہ کر سکے کہ مسافروں کی اہمیت حقیقی پلان سے زیادہ تھی، ذوالفقار علی بھٹو (جو اس وقت تک استعفیٰ دے چکے تھے) دوسرے دن ہمارے پاس آئے، وہ ہم سے ملنے والے پہلے سیاسی لیڈر تھے، انہوں نے ہمیں مبارکباد دی اور اپنی پارٹی کی حمایت کا بھی یقین دلایا، ہمارے خاص مطالبات میں ہندوستان سے اپنے سیاسی قیدیوں کو رہا کرانا، سیاسی پناہ کے لئے منظوری حاصل کرنا، اور اس بات کی یقین دہانی شامل تھی کہ بھارتی قبضے والے کشمیر میں ہمارے رشتہ داروں کو پریشان نہیں کیا جائے گا، ہمارے منصوبے میں طیارے کو آگ لگانا شامل نہیں تھا، کیونکہ طیارہ جتنے دن وہاں رہتا، اتنی ہی زیادہ لوگوں کی توجہ اس جانب جاتی۔ ہماری قیادت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم طیارے کو بھارت کے سپرد کر کے اپنی آزادی کا مطالبہ کریں گے لیکن ہمیں طیارے کو نذرِ آتش کرنے کے لئے مجبور کیا گیا ایس ایس پی لاہور (عبدالوکیل) اور ڈی ایس پی باقر علی نے ہمیں پیٹرول مہیا کیا، ہمیں بتلایا گیا کہ طیارے کی موجودگی نظم و نسق کے لئے مسئلہ پیدا کر دے گی اور یہ کہ حکومتِ ہند طیارے کی واپسی کے لئے دباؤ ڈال رہی ہے، جلتے ہوئے طیارے سے اٹھنے والے دھویں کو دیکھ کر ہمیں تکلیف پہنچی، ایس ایس پی نے خود اپنی گاڑی سے ہمیں ہسپتال پہنچایا...اس وقت ہمیں ہیرو تصور کیا جاتا تھا، لوگ ہمارے آٹوگراف لیتے اور اپنے نوزائد بچوں کے نام ہمارے ناموں پر رکھتے..ہمارے نام پر بڑے بڑے جلوس نکالے گئے...اس کے بعد ہمیں ہائی جیکروں کے بارے میں بین الاقوامی قانون کا علم ہوا کہ انہیں اسی ملک کے حوالے کیا جاتا ہے، جس کا جہاز وہ اغواء کرتے ہیں یا پھر جس ملک میں وہ جہاز کو لے کر جاتے ہیں، وہ ملک ان کے خلاف قانونی کاروائی کرتا ہے، ہمیں کوہاٹ کے قریب ٹانڈا ڈیم لے جایا گیا، ارباب مختار جلیل (جو کہ اس وقت چین میں فرسٹ سیکریٹری تھے) اور فوج کے خفیہ محکمہ

کے کسی آدمی نے ہم سے پوچھ تاچھ کی، پوچھ تاچھ زبانی طور پر ہوئی اور رپورٹ ہمارے حق میں تھی۔ پوچھ تاچھ کا مقصد یہ پتہ لگانا تھا کہ کہیں اس کے پیچھے ہندوستانی ہاتھ تو نہیں تھا، جو مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان کے ساتھ رابطہ کاٹنے کے لئے بہانہ تلاش کر رہا تھا"

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس وقعہ کے تقریباً ایک سال (گیارہ ماہ) بعد یعنی دسمبر 1971ء میں بھارت نے اپنی افواج کو مکتی باہنی کے روپ میں بنگلہ دیش کے اندر داخل کیا (ہائی جیکنگ کا وقعہ 30 جنوری 1971 کو پیش آیا تھا) ہاشم اور اشرف قریشی اپنی صفائی میں یہ بات بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر ہائی جیکنگ کا کوئی تعلق بھارتی سازش سے ہوتا تو پھر بھارت اس کے فوراً بعد پاکستان کے مشرقی حصے پر حملہ کر دیتا کیونکہ اس وقت اس کا جواز بھی بنتا تھا لیکن دونوں واقعات کے درمیان تقریباً 11 ماہ کا وقفہ ہے، جو اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ بھارت نے جو کچھ کیا وہ اس کے بعد کیا، اس حوالے سے گنگا ہائی جیکنگ کو بطور Thought provoking لیا جا سکتا ہے یا بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ بھارت اور پاکستان کے درمیان مخاصمت اور دشمنی کے حوالے سے باعثِ اشتعال بنا، حالانکہ ہاشم کا کہنا ہے کہ اس سے قبل دونوں ملکوں کے درمیان 1947ء اور 1965 کی دو جنگیں ہو چکی تھیں اور دونوں ملکوں کے درمیان دشمنی کے بیج کافی پہلے سے پنپ رہے تھے اور وہ انتقام گیری کے لئے بھی کافی تھے۔ اس واقعہ سے متعلق پاکستان کے سینئر صحافی خالد حسن کا وہ مضمون بھی کافی اہمیت رکھتا ہے، جو انہوں نے 11 اپریل 2003ء کو پاکستانی اخبار فرائڈے ٹایمز کے لئے لکھا تھا، خالد حسن اس مضمون کے تیسرے پیراگراف میں مرحوم کے ایچ خورشید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "(وہ) 2 فروری 1971ء کو شام کے سات بجے ائیر پورٹ پر پہنچے تھے، انہیں یہ بتایا گیا کہ صورت حال نازک بن چکی ہے اور پی آئی اے نے اغواء کاروں کا دانا پانی بند کر دیا ہے، جموں وکشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کے لیڈر، مرحوم مقبول بٹ، جو پشاور میں قیام پذیر تھے، بھی اس دوران وہاں پہنچ گئے، میں اور مصلح الدین سب سے پہلے ان سے ملنے والوں میں تھے، مصلح الدین اُن دنوں پی ٹی وی نیوز کے لئے کام کرتے تھے، ہم دونوں نے مقبول بٹ کو صورت حال سے آگاہ کیا اور ان کے لئے ہوٹل انٹرنیشنل میں پریس کانفرنس کا اہتمام کیا، ہاشم اور اشرف نے مقبول بٹ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی، ایس ایس پی لاہور مقبول بٹ اور کے ایچ خورشید کو

ایک دوسرے کمرے میں لے گئے، جہاں ہاشم کچھ افسروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اس نے مقبول بٹ سے کہا کہ یہ لوگ مجھے جہاز کو جلا دینے کی بات کہہ رہے ہیں، مقبول نے جواباً کہا ''ایسا کرنا غیر دانشمندی ہوگی'' اور جب مقبول اور خورشید کو کمرے سے باہر لے جایا جا رہا تھا، ایس ایس پی نے ان سے مخاطب ہو کر کہا ''خدا لے لئے جہاز کو جلا دو اور ہماری جان چھوڑو'' اور بعد میں ایسا ہی ہوا لیکن اغوا کاروں کے ہاتھ سے نہیں'' (یاد رہے کہ اشرف قریشی مندرجہ بالا سطور میں یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ انہوں نے ہی جہاز پر پیٹرول چھڑکا وراسے آگ لگائی، جب کہ کے ایچ خورشید کا بیان اس سے متضاد ہے) خالد حسین اپنے مضمون میں مزید لکھتے ہیں:

گنگا کو تباہ کرنے کے بعد اغوا کاروں کو لے جایا گیا، کچھ دنوں بعد مقبول بٹ سمیت کے این ایل ایف کی پوری قیادت کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا، یہ سبھی بہادر لیکن معصوم لوگ دو برسوں تک جیلوں میں بند رہے، بالآخر لاہور ہائی کورٹ نے انہیں 'مادرِ وطن کی آزادی کے لئے برسرِ پیکار' حریت پسند جتلا کر بری کر دیا۔ تاہم ہاشم کو 1980ء تک رہائی نہیں ملی، جب تک کہ پاکستان ہائی کورٹ میں دائر کی گئی اس کی اپیل کا فیصلہ اس کے حق میں نہیں ہوا'' (فرائیڈے ٹائمز لاہور، ۱۱ اپریل، ۲۰۰۳ء)

ادھر ہاشم قریشی نے اس حوالے سے تذبذب دور کرتے ہوئے اس نمائندے کے ساتھ دورانِ گفتگو اس بات کا اعتراف کیا کہ انہیں لاہور ائیر پورٹ پر اس وقت گنگا جہاز کو جلا دینے کے لئے مجبور کیا گیا، جب وہ بھارت پر دباؤ ڈالنے کے لئے اس کو محض جزوی نقصان پہنچانے کے درپے تھے، جس کے لئے مرحوم مقبول بٹ نے انہیں حکم دیا تھا، لیکن ایس ایس پی وکیل نے انہیں پیٹرول دیا اور کہا کہ یہ بٹ صاحب کا ہی حکم ہے کہ جہاز کو پوری طرح سے جلا دیا جائے، حالانکہ بعد میں پتہ چلا کہ عبد الوکیل نے جھوٹ کہا تھا، بٹ صاحب نہ تو پہلے اس حق میں تھے اور نہ ہی بعد میں انہوں نے اس کاروائی کی حمائت کی۔

''گنگا'' کی استھیاں ''گنگا'' میں بہادی گئیں اور کشمیر کے اولین مجاہدین اس ''اسلام کے قلعے'' پاکستان میں مقید ہو کر رہ گئے، جس نے ہر دور میں کشمیری عوام کی آزادی اور حقِ خود ارادیت کی حمایت کی تھی، اس دوران ان ''حریت پسند مجاہدین'' پر پاکستانی تعدیب خانوں اور جیلوں میں کیا کیا گزری، اس بارے میں بھی کتابوں میں کافی کچھ موجود ہے اور ابھی ان ملزمان میں سے کچھ ایک بقید

حیات بھی ہیں............اس کے بعد آغاز ہوتا ہے اس باب کا، جس کی وجہ سے برصغیر کے نقشے پر بنگلہ دیش کے نام سے ایک اور ملک کا قیام عمل میں آیا۔

☆☆☆

42

بنگلہ دیش جنگ اور شملہ سمجھوتہ!

برصغیر کی تقسیم(1947ء) سے لیکر پاک،، بھارت، بنگلہ دیش جنگ(1971ء) تک کے 24 درمیانی برسوں کے دوران کبھی بھی پاکستانی حکمرانوں، دانشوروں اور سیاست دانوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ انہیں اپنے ملک کے دوسرے حصے یا ریاست یعنی مشرقی پاکستان پر کنٹرول قائم رکھنے کے لئے اپنے سب سے قریبی اور روائتی دشمن ملک، بھارت کی فضائی حدود کے اندر سے ہزاروں کلومیٹر کی دوری طے کر کے وہاں جانا پڑتا ہے حتیٰ کہ بھارت کے ساتھ دو جنگیں لڑنے کے باوجود بھی اس مشکل کا حل تلاش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ اگر ایک دن بھارت نے اپنی فضائی حدود کو پاکستانی ہوائی جہازوں، خاص طور پر فوجی جہازوں کے لئے بند کر دیا تو اُس صورت میں مغربی پاکستان کون سا راستہ اختیار کرے گا؟، حالانکہ یہ بات تقسیم کے وقت ہی طے ہو جانی چاہیے تھی کہ ایک ملک ایسے دو حصوں میں منقسم رہ کر کیسے متحد رہ سکتا ہے کہ جس کے ایک حصہ سے دوسر حصہ تک جانے کے لئے کسی تیسرے ملک کی زمینی اور فضائی حدود کا استعمال کرنا ناگزیر ہو؟ اگر یہ بات مان لی جائے کہ بنگال کے مسلمانوں کو پاکستان کے ساتھ رکھنا ضروری تھا اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا تو پھر تقسیم کی شرائط میں اس بات کو شامل کیوں نہیں کیا گیا کہ بھارت کو ہر قیمت پر اور ہر حال میں اپنی فضائی حدود پاکستان کے دونوں حصوں کیلئے کھلی رکھنا ہوں گی یا پھر کوئی ایسا راستہ یا شاہرہ تعمیر کرنا ہوگی، جس پر صرف اور صرف پاکستان کا کنٹرول رہے گا....لیکن عین ایسے موقع پر جب کہ مسلمانانِ برصغیر کی پناہ گاہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصے آپس میں لڑ پڑے اور بھارت نے اپنی فضائی حدود بند کر دیں تو پاکستانی حکمران اور سیاست دانوں کی ساری خیالی عمارتیں دھڑام سے گر گئیں اور 24 سال پہلے قائم ہونے والے چھوٹے سے دولخت ملک کی کوکھ میں سے ایک اور ملک نے 'بنگلہ دیش' کے نام سے جنم لے لیا۔

مختلف تاریخی کتب کا باریکی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ بنگلہ دیش کے عوام اپنی سرزمین پر موجود پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان حکمرانوں اور فوجیوں کی موجودگی اور ان کی طرف سے بنگلہ دیشی عوام کے ساتھ روا رکھی گئی 'غیر انسانی اور غیر مہذب' پالیسیوں اور سرگرمیوں

کی وجہ سے اپنے ہی وطن میں گھٹن محسوس کر رہے تھے اور ان کی مغربی پاکستانیوں کے خلاف نفرت کا گراف کشمیر میں پائے جانے والے 'ہندمخالف' رجحان کے گراف سے کافی اونچا تھا۔ اس سلسلے میں اگرچہ بھارت میں کئی بڑی، چھوٹی کتابیں لکھی گئیں اور انھیں پڑھا بھی گیا لیکن ان کو 'منفی پر پگنڈا' کے زمرے میں ڈالتے ہوئے اگر افواجِ پاکستان کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ صدیق سالک کی کتابیں 'ہمہ یاراں دوزخ' 'میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا' اور ''سقوطِ بنگلہ دیش'' وغیرہ تصنیفات کا مطالعہ کیا جائے تو بیدردیٔ ایا اور مظالمِ زمانہ کی رونگٹھے کھڑے کرنے والی خونین داستانیں سامنے آتی ہیں، صدیق سالک کی تحریرات اس لئے بھی کافی وزن رکھتی ہیں کیونکہ وہ خود بھی ان 90 ہزار پاکستانی فوجیوں میں شامل تھے جنھوں نے اپنے کمانڈر جنرل نیازی کی قیادت میں دسمبر 1971 میں بھارتی افواج کے سامنے سرینڈر کر کے 'تاریخ' رقم کی لیکن اس سے قبل، جب بنگلہ دیش کے نام سے نیا ملک وجود میں آیا، اس وقت کی صورتِ حال کے بارے میں پرویز دیوان اپنی کتاب 'کشمیر' میں لکھتے ہیں:

''جب بعض 'شرارتی افراد' (ہائی جیکروں) نے بھارت کا ایک مسافر بردار طیارہ سرینگر سے ہائی جیک کرنے کے بعد لاہور ائر پورٹ پر تباہ کر دیا تو اس کے کئی ماہ بعد بھارت نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اُڑنے والے پاکستانی جہازوں کے لئے اپنی فضائی حدود بند کر دیں تو پاکستان کے لئے یکا یک بہت بڑی آفت کھڑی ہوگئی، جو پاکستانی ہوائی جہاز ہزاروں میل کی فضائی مسافت طے کر کے بنگال جاتے تھے، انہیں اب سری لنکا کے راستے سے ہو کر جانا پڑتا تھا اور وہاں پر اترنے اور ایندھن بھرنے کا خرچہ پاکستان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا، نتیجے کے طور پر پاکستان کے جو ہزاروں فوجی اور سول حاکم بنگال میں موجود تھے، وہ باقی دنیا سے کٹ کر رہ گئے.... یہی وجہ تھی کہ پاکستان اس بات سے انکار کرتا رہا کہ 'گنگا ہائی جیک'' میں اس کا کوئی ہاتھ تھا، اس کے علاوہ چونکہ گنگا ہائی جیک منصوبے میں شامل لبریشن فرنٹ کے دو قائدین، امان اللہ خان اور مقبول بٹ کا تعلق ریاستِ جموں وکشمیر سے تھا اور وہ ایک خود مختار کشمیر کا مطالبہ کر رہے تھے، جس کی رُو سے پاکستان کو کشمیر کے اپنے مقبوضہ علاقہ جات کو خالی کرنا تھا، اس لئے وہ گنگا ہائی جیک کو ان کے ماتھے مڑ دینا چاہتا تھا....'' (کشمیر/صفحہ نمبر 109)

ادھر اگر بنگلہ دیش میں موجود اس جنگ سے متعلق لکھی گئی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ

بھارت کی جانب سے 'مکتی باہنی' (بھارتی رضا کاروں) کی آمد کو اپنے لئے ''طیراً ابابیل'' سے کم نہیں سمجھتے، بلکہ مکتی باہنی کی آمد اور رخصتی کے وقت اس فورس کو جو عزت و اکرام ملا، وہ بھی ایک تاریخی نوعیت کا تھا۔ بنگلہ دیشی اخبار ''لبریشن ٹائمز'' کی اشاعت بتاریخ 16 دسمبر 1971ء کی ایک تفصیلی خبر میں درج ہے:

''بنگلہ دیشی فورسز کو ازسرِ نو تشکیل دینے اور ان کی تجدید کی غرض سے وزیر اعظم تاج الدین اور فوجی سربراہ جنرل عثمانی کی صدارت میں منعقدہ کانفرنس (11 جولائی تا 17 جولائی) میں یہ طے پایا کہ بنگلہ افواج کو جدید ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ازسرِ نو تشکیل دے کر جدوجہدِ آزادی کو متحرک اور منظّم کیا جائے، کرنل محمد عطاء الغنی، جس کی سبکدوشی کی تاریخ نزدیک تھی، کو ترقی دے کر جنرل بنا دیا گیا، پورے ملک (بنگلہ دیش، جسے ابھی تک پاکستان اپنا مشرقی بازو تصور کرتا تھا) کو گیارہ سیکٹروں میں تقسیم کر دیا گیا، ہر سیکٹر کے لئے ایک سیکٹر کمانڈر مقرر کیا گیا، جس کی مدد کے لئے ایک سب سیکٹر کمانڈر بھی رکھا گیا۔ دسواں سیکٹر براہِ راست کمانڈر انچیف کی کمانڈ میں رہے گا اور اس میں بحری بیڑے اور ائیر فورس سے وابستہ ڈھانچہ بھی شامل رہے گا، ان گیارہ سیکٹروں کی ذمہ داریاں سنبھالنے والوں میں کچھ ایسے مغربی پاکستانی کماندار بھی شامل ہیں، جو پاکستانی افواج سے الگ ہو گئے ہیں اور انہیں خاص طور پر گوریلا فورسز کو تربیت دینے کے کام پر مامور کیا جا رہا ہے، کیونکہ جنرل عثمانی کا سب سے زیادہ زور اسی پر ہے کہ پاکستانی فورسز کے خلاف دوبدو جنگ کی بجائے گوریلا طرز کی جنگ لڑی جائے''

بنگلہ دیش میں پاکستانی قبضہ ختم کروانے اور بنگلہ دیش کو آزاد کروانے کے لئے وہاں ایک باضابطہ فوج کی تشکیل، اعلانِ بغاوت کا فائدہ اٹھانے اور پاکستان سے اپنی دو سابقہ جنگوں کا بدلہ لینے کا بھارت کے لئے اس سے اچھا موقعہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، بھارت نے ہوا کا رخ اپنے لئے موافق پاتے ہی پہلے وہاں اپنی مداخلت رسدات اور ضروری اشیاء کی فراہمی کی صورت میں کی اور اسی کے ساتھ بنگلہ باغیوں کو فوجی امداد اور ہتھیاروں کی سپلائی بھی شروع کر دی، اس کی خبر ملتے ہی پاکستان نے بھارت کو بنگلہ دیش سے دور رکھنے کی غرض سے مغربی محاذ (لاہور تا سندھ) پر زمینی اور ہوائی حملے شروع کر دیئے لیکن بھارت نے اس کا کوئی خاص اثر نہیں لیا اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے پاکستان کے خلاف

اعلانِ جنگ کرنے کے ساتھ ہی اس کی پروازوں پر بھی اپنی فضائی حدود میں پابندی عائد کردی، جس سے پاکستانی افواج کے بنگلہ دیش سے باہر نکلنے کے تمام راستے بند ہو گئے''

بنگلہ دیش کے ایک جنگی رسالے ''بنگلہ دیش وار ٹائم لائن'' میں اس حوالہ سے کچھ یوں درج ہے:

> ''بھارت کی (بنگلہ دیش میں) بڑھتی ہوئی مداخلت سے پریشان ہوکر پاکستانی فضائیہ نے بھارت کے خلاف ''ایک پیشگی بچاؤ حملے (Preemptive strike) کا آغاز کردیا تاکہ بھارتی فورسز کو مشرق کی جانب سے موڑ کر مغرب کی جانب مصروف کیا جائے اور بنگلہ دیش میں اس کی مداخلت بند ہو سکے، یہ حملہ اسرائیلی طرز کے آپریشن ''فوکس'' کی طرز پر کیا گیا تھا تاکہ کم سے کم وقت کے دوران زیادہ سے زیادہ نتائج حاصل کئے جاسکیں، لیکن منصوبہ ناکام ہو گیا اور بھارت نے اسے اپنے ملک پر ایک کھلم کھلا حملہ تصور کر کے پاکستان کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا، اسی کے ردِعمل میں پاکستان کے لئے بھارتی فضائیں بھی مسدود ہو گئیں اور مکتی باہنی، جو کہ ابھی تک بنگلہ دیش میں 'بچاؤ کاروائیوں' میں مصروف تھی، کو فوجی کمک پہنچانے کے لئے حکم جاری کردیا گیا اور اسی کے ساتھ پاک بھارت جنگ کا آغاز بھی ہو گیا''

فوجی رسالے میں آگے درج ہے

> ''بھارتی رضاکاروں کی صورت میں داخل ہونے والی افواج 'مکتی باہنی' کو تقریباً تین بریگیڈ کے برابر بھارتی افواج کی امداد و اعانت حاصل تھی، جب کہ اس کے علاوہ بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی فوجی ٹکڑیاں اپنے طور غیر منظّم طریقے سے رضاکارانہ طور لڑ رہی تھیں، بھارتی فوجیں بہت کم وقت میں پورے بنگلہ دیش میں پھیلنے اور وہاں کا کنٹرول حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں، انہوں نے پاکستانی افواج کے مضبوط سے مضبوط مراکز اور ٹھکانوں کی بھی پرواہ نہیں کی اور پاکستانی فوجیں انہیں روکنے یا واپس دھکیلنے میں بری طرح سے ناکام ہو گئیں، جس کے نتیجہ میں پاکستانی افواج کو 16 دسمبر 1971 کے دن بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے.... بھارت کی خارجہ سراغرساں ایجنسی RAW (ریسرچ اینڈ انالسز ونگ) نے جنگ کی ابتداء میں مکتی باہنی کو فوجی امداد پہنچا کر اس آپریشن میں بہت اہم رول ادا کیا،

RAW کے اس آپریشن کو اس وقت کے مشرقی پاکستان میں، جنوبی ایشیا کا سب سے بزدلانہ اور ظالمانہ آپریشن قرار دیا جاسکتا ہے، بھارت کی امداد محض زمینی راستے سے نہیں آئی بلکہ بھارتی فضائیہ نے بھی اپنے شدید حملے شروع کر دیئے اور تاج گاؤں، کُرمی ٹولا، لال منیر اور شمشیر نگر علاقوں پر بھارتی فضائیہ کے sea hawks اور IANS Vikrant کے سکوارڈنوں نے زبردست حملے کر کے پاکستانی دفاعی نظام کو نہ صرف ناقابلِ بیان نقصان پہنچایا بلکہ وہاں پھنسے پاکستانی فوجیوں کے تمام فرار کے راستے بھی مسدود بند کر دیئے۔''

پانسہ پلٹ جانے کی وجہ سے پاکستانی فورسز کے لئے اب کوئی اور راستہ باقی نہیں بچا تھا کہ وہ بھارتی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیں، چنانچہ پاکستانی افواج کے بنگلہ دیش میں اعلیٰ کماندار اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل عبداللہ خان نیازی نے اپنا ''سرینڈر نامہ'' بھارتی افواج کے کماندار لیفٹننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو بھیج دیا اور اس واقعہ کے بارے میں صدیق سالکؔ اپنی کتاب ''ہمہ یاراں دوزخ'' میں رقمطراز ہیں:

''ڈھاکہ چھاونی میں یہ خبر یاس والم کا پیغام بن کر آئی، جذبۂ جہاد سے سرشار چہرے یک لخت بُجھ گئے، آنکھیں ڈبڈبا گئیں، جگر پارہ پارہ اور دل فگار ہوگئے، کُچھ احباب کوڑے کرکٹ کی پوٹلیوں کی طرح کونوں کھدروں میں جا دُبکے اور بعض نے اندرونی ابھال آنسوؤں کی صورت میں نچوڑ دیا۔ کچھ نے اپنے چہرے رومال یا ٹوپی میں چھپا کر آہ وفغاں کو پابند کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود ان کی سسکیاں سُنائی دیتی رہیں اور جسم ڈھنکنی کی طرح کانپتے رہے، یہ ماتم، آہ وفغاں اور گریہ زاری سپاہیانہ شان کے شایان نہ سہی لیکن جواں مرگی پر کس کا کلیجہ منہ کو نہیں آتا...آج 24 سالہ پاکستان کا عین عالمِ شباب میں آدھا دھڑ کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا''(ہمہ یاراں دوزخ/صدیق سالک/صفحہ نمبر 16)

43

موئے مقدسِ نبویؐ اور درگاہ حضرتبل!

......حالانکہ شاعر مشرق علامہ اقبال نے بہت زور دے کر کافی پہلے کہا تھا کہ '' نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ''، لیکن اس کے باوجود کشمیر میں درگاہوں، آستانوں اور بزرگوں کے مزاروں کے تئیں عوام کا ایک غیر متزلزل عقیدہ رہا ہے اور ان مقامات کو مذہبی اعتبار سے ہر دور میں مرکزیت حاصل رہی ہے۔ (وادیٔ کشمیر دوستانِ خدا کی سرزمین ہے، جنہوں نے باہمی میل جول، رواداری اور انس ومحبت کا سبق دیا ہے اور کشمیری لوگ اولیائے کرام کی ودیعت کی ہوئی محبت اور رواداری کی امانت کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اس موقف پر ناز بھی کرتے ہیں۔ کشمیر میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ انہی اولیائے کرام کی تبلیغ کی وجہ سے آیا ہے۔ حضرت بلبل شاہؒ نے یہاں کے بودھ بادشاہ اور بدھ مت کے پیروکاروں کو اپنی تدبیر سے اسلام کی طرف مائل کیا اور انہی دوستانِ خدا کی وجہ سے یہ خطۂ فروس توحید کے زمزموں سے معمور ہوا اور انسان دوستی اور خدمتِ خلق کے آفاقی پیغام کو عام کیا۔ زیارتِ قبور مسلمانانِ کشمیر کی کثرت کا مسلک ہے۔ یہ ایک صحیح بات ہے یا غلط، اس پر پچھلی کئی صدیوں سے بحث جاری ہے اور اب تک کوئی واضح فیصلہ نہیں ہوسکا ہے۔ ف م ح)

کشمیر کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کی درگاہوں، زیارتوں اور خانقاہوں کے ساتھ کشمیری عوام کی اسی بے پناہ عقیدت سے فکرمند ہوکر ہوکر شاعرِ مشرق نے یہ بھی کہا تھا کہ ؎

''کشیری کہ با بندگی خوگرفتہ بتے مے تراشد زِ سنگِ مزارے

(پیامِ مشرق)

اور اس کے علاوہ بھی انہوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، جو شرعی اعتبار سے کافی اہم اور چشم کشائی کے مترادف ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ کشمیری عوام نے اس کا بہت کم اثر لیا اور وہ اپنے عقیدے پر برابر اور سختی کے ساتھ جمے رہے، بہرحال تاریخ کا تذکرہ ہورہا ہے تو اس بات کی وضاحت

کرنا بے حد ضروری ہے کہ سرینگر کے شمال مشرقی علاقہ حضرت بل میں بھی ایک ایسی ہی اہم درگاہ ہے، جہاں تاریخی شواہد کے حساب سے پیغمبر آخرالزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مقدس تشریف فرما ہے اور اس لحاظ سے اس درگاہ شریف کو کشمیر میں کافی اہمیت اور مرکزیت حاصل ہے اور راسخ العقیدہ لوگ اسے ''غریبوں کا مدینہ'' بھی کہتے ہیں۔ درگاہ شریف کے ساتھ نہ صرف موئے مقدس نبویؐ کی تاریخ جڑی ہوئی ہے بلکہ ساٹھ کی دہائی میں اس درگاہ کی وجہ سے کشمیر میں ایک ایسا انقلاب بھی وابستہ ہے، جس نے کشمیری عوام کو نہ صرف متحد کر دیا بلکہ انتہائی سرد اور سخت ترین موسم میں لوگوں نے اس احتجاج میں حصہ لے کر پوری حکومت کو ہلا کر رکھ دیا، اس کا تذکرہ بعد میں آئے گا لیکن اس سے قبل موزون یہ ہوگا کہ اس درگاہ میں مقیم موئے شریف کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے۔

راقم نے دورانِ اسیری جموں کے سینٹرل جیل کوٹ بھلوال میں میر غلام احمد آف تھنہ منڈی راجوری کی کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' کے لئے جو چند ایک مضامین دستیاب کتب کے مطالعے کے بعد لکھے، ان میں سے ایک مضمون ''مسئلہ کشمیر اور مسلح جدوجہد'' میں میں نے موئے مقدس نبویؐ کی مختصر تاریخ کا حوالہ بھی دیا تھا، زیر نظر مضمون میں اسی حوالہ کو پیش کرنا کافی مناسب معلوم ہوتا ہے:

''درگاہ حضرت بل سرینگر اور موئے مقدس نبویؐ کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ گزشتہ چار سو سال سے اس درگاہ میں نبیٔ آخرالزمانؐ کا ایک موئے مبارک آرام فرماء ہے، جس کے بارے میں مورخین نے کافی تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ یہ موئے مقدس حضورؐ کے ان بہت سے موئے مبارکاں میں سے ایک ہے جو انہوں نے اپنے آخری حج یعنی حجتہ الوداع کے موقعہ پر مختلف لوگوں کو تبرکاً عطاء کئے تھے، اس حوالہ سے بخاری شریف کی وہ حدیث بھی بطورِ ثبوت پیش کی جاتی ہے کہ ''حضورؐ نے حجتہ الوداع کے موقعہ پر اپنے صحابہ اور خلفاء کو کچھ موئے مبارک تبرکاً دیئے تھے'' اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ انہی موہائے مقدس میں سے کچھ ایک حضورؐ کے نواسے حضرت امام حسینؓ کے ہاتھ بھی لگے اور پھر نسل درنسل یہ تبرکات سادات میں تقسیم ہوتے رہے اور بالآخر مکہ شریف میں یہ موئے مبارک امام حسینؓ کی اولاد میں سے سید عبداللہ نامی ایک بزرگ کے پاس پہنچے اور یہ سید صاحب 1634ء میں مکہ شریف سے ہجرت کر کے بیجاپور (بھارت) آ گئے۔

ان دنوں بھارت میں مغلوں کی حکومت تھی، انہوں نے پہلے سید عبداللہ کو، ان کی حضورؐ کے ساتھ وابستگی کی بناء پر ایک بڑی جاگیر دی لیکن بعد میں جب اورنگ زیب نے تخت سمبھالا تو اسے بے دخل کر کے اس کی جنگلہ بندی کرادی گئی، سید عبداللہ کا فرزند سید عبدالحمید بیجاپور سے بے دخل ہونے کے

بعد دلی چلا آیا، جہاں اس کی ملاقات ایک سرکردہ کشمیری تاجر خواجہ نورالدین ایشاوری ؔ سے ہوئی، خواجہ صاحب نے سید عبدالحمید سے یہ موئے شریف حاصل کر لیا، اس حوالہ سے اگرچہ سر والٹر لارنس کا ماننا ہے کہ خواجہ نے یہ موئے مقدس دکن میں اپنے سفر کے دوران سید عبداللہ سے حاصل کیا تھا لیکن یہ اس لئے صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ سید عبداللہ کے وصال کے وقت ابھی اورنگ تخت نشین نہیں ہوا تھا، ایک اور تاریخی حوالہ یہ بھی ہے کہ سید عبدالحمید نے موئے مبارک خواجہ نورالدین کو تحفے میں دے دیا تھا لیکن پرویز دیوان کا ماننا ہے کہ خواجہ صاحب، جو کہ وسطی ایشیا کے ایشاور علاقہ سے ہجرت کر کے کشمیر آئے اور یہاں سے بغرض تجارت دلی آتے جاتے رہتے تھے، نے موئے پاک کو مبلغ ایک لاکھ روپئے کے عوض حاصل کیا اور اسے کشمیر منتقل کرنے کی غرض سے اپنے رفیق سفر اور خادم میداتش کو مقرر کیا۔ لیکن ادھر لاہور میں اورنگ زیب کو اس منتقلی کا پتہ چل گیا اور اس نے مغل سپاہیوں کو اسے روکنے کی غرض سے بھیج دیا، سپاہیوں نے خواجہ اور اس کے خادم کو گھیر لیا اور موئے شریف کو اجمیر میں حضرت معین الدین چشتیؒ کی درگاہ میں رکھنے کا حکم دیا، خواجہ ایشاوری ؔ اس صدمے کی وجہ سے دم توڑ گئے اور اس کا خادم نو دن تک لاہور میں مارا مارا پھرتا رہا، راویان کا بیان ہے کہ دسویں دن اورنگ زیب نے نبی اکرمؐ کو خواب میں دیکھا اور ان سے کہا کہ ان کو خواجہ صاحب سے زبردستی یہ موئے پاک چھیننے کا کوئی حق نہ تھا، ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی گئی کہ وہ فوراً سے پیشتر اس موئے مبارک کو کشمیر روانہ کریں، بتایا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے نیند سے جاگتے ہی موئے پاک کو سرینگر بھیجنے کا انتظام کیا اور مغل سپاہیوں کی نگرانی میں خواجہ ایشاوری کے جنازے اور موئے پاک کو مغل روڈ کے راستے سرینگر روانہ کیا گیا، یہ قافلہ 10 مارچ 1700ء کو سرینگر پہنچا، پہلے موئے پاک کو ہفت چنار لے جایا گیا اور بعد میں نوہٹہ میں خواجہ نقشبند صاحبؒ کی درگاہ میں رکھا گیا، ادھر کشمیر میں لوگوں کو موئے مبارک کی تشریف آوری کا علم ہوا تو وہ جوق در جوق ٹوٹ پڑے، زیارتِ نقشبندؒ یہ کا احاطہ کافی چھوٹا تھا اور موئے شریف کی زیارت کو آنے والوں کو سمبھالنا مشکل ہو گیا تو اسے کسی کھلی جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ جھیل ڈل کے مغربی کنارے مغل سردار شیر خانؔ کا ایک بڑا باغ تھا، شیر خان نے یہ باغ موئے مقدس کے قیام کے لئے بطور صدقۂ جاریہ دے دیا، چنانچہ خواجہ نورالدین ایشاور اور مغل سردار شیر خان کو بھی اسی زیارت کے احاطے میں دفن کیا گیا، بتایا جاتا ہے کہ جب موئے شریف کی سرینگر تشریف آوری ہوئی تو یہاں مغل گورنر فاضل خان کی حکومت تھی، فاضل خان نے باغ شیر خان میں موئے شریف کے لئے ایک عمارت تعمیر کی اور تب سے اس جگہ کا نام ''حضرت بل'' پڑ گیا(اس موضوع پر غلام رسول بٹ آف سولنہ سرینگر نے تاریخِ موئے مقدسؐ' کے

نام سے ایک کتاب بھی رقم کی ہے) تاریخی حوالہ جات کے مطابق خواجہ نورالدین ایشاوری کا کوئی بیٹا نہ تھا، اس کی بیٹی کا نام عنایت بیگم تھا، جو حضرتبل کے قریب نگین کے ایک شخص بلاقی بانڈے کے عقد میں تھیں، لہذا بلاقی بانڈے موئے شریف کا پہلا متولی مقرر ہوا۔ بلاقی بانڈے کو موئے شریف کو مختلف مواقعہ پر عوام کے سامنے پیش کرنے اور اس کی زیارت کروانے کا کام سونپا گیا لیکن عوام کا رش اس قدر بڑھنے لگا کہ بلاقی بانڈے اسے سمبھال نہ پایا اور انہوں نے اپنی مرضی سے یہ کام ایک شریف النفس شخص ردھو محمد چستی کو سونپ دیا اور یہ جگہ مرجعٔ خلائق بنتی چلی گئی۔ پرویز دیوان کے مطابق ایک بار مغل گورنر آزاد خان کو موئے مقدس کے اصلی ہونے پر شبہہ ہوا اور اس نے شیشے کی ٹیوب کو توڑ کر موئے پاک کو باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکا، اس نے گھبرا کر اسے اپنی جگہ رکھ دیا جبکہ بعد میں اسے ایک عجیب وغریب بیماری نے گھیر لیا اور وہ انتہائی بری موت مر گیا۔ یہ موئے مبارک 1948ء تک اسی جگہ مقیم رہا اور اس کے قیام کے لئے ایک قدیم طرز کی عمارت، جس پر برزہ (کاغذ) کی چھت تھی بنائی گئی تھی، اس کے بعد مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر میں مختلف زیارت گاہوں اور درگاہوں کی تعمیر نو کا کام ہاتھ میں لیا، وہاں تحفظ کا انتظام کیا اور ان مقامات پر آنے والی نذر و نیاز کی آمدن کا حساب رکھنے کے لئے مسلم اوقاف ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ بنایا (جواب سرکاری محکمہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور بدنظمی کا اکھاڑہ کہلاتا ہے) اسی ادارے کو درگاہ حضرت بل کی نگرانی کا کام بھی سونپا گیا لیکن اس دوران سال 1963 کے اواخر میں موئے مقدس کی گمشدگی کا دلخراش واقع پیش آیا تو وادیٔ کشمیر میں زندگی تھم کر رہ گئی، احتجاجوں، جلسوں، جلوسوں، توڑ پھوڑ کی وارداتوں، کا ایک لامحدود سلسلہ شروع ہو گیا اور ان واقعات کی وجہ سے وادی باقی دنیا سے کٹ کر رہ گئی۔ لاکھوں لوگ گھروں سے نکل آئے اور موئے پاک کی بازیابی کے لئے حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، اس زمانے میں ریاست میں وزیراعلیٰ کی جگہ وزیراعظم کا عہدہ ہوتا تھا اور اس دوران اس عہدے پر شمس الدین (عرف شمہ کھ) فائز تھے (جنہوں نے صرف چالیس دن حکومت کی) موئے پاک کی بازیابی کے لئے مرحوم میرواعظ مولوی محمد فاروق کی قیادت میں علمائے کرام پر مشتمل "مجلس عمل برائے حصولِ موئے مقدس" تشکیل دی گئی، جس کا سیکریٹری مرحوم مولانا محمد سعید مسعودی کو بنایا گیا، جنوری 1964ء میں اس مجلسِ عمل کا ایک جلسہ سرینگر کے تاریخی لال چوک میں منعقد ہوا، جس دوران کشمیری عوام نے موئے شریف کے تئیں اپنی عقیدت کا بے پناہ ثبوت فراہم کیا اور برستی برف میں کئی گھنٹے تک ایک جگہ کھڑے رہ کر مولانا مسعودی کی تقریر سُنی، اس تقریر کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے، بتایا جاتا کہ اس دوران لال چوک

میں کافی برف جمع ہوگئی لیکن برفباری اور سخت سردی کے باوجود جلسہ کے اختتام تک سبھی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر جمے رہے۔

اسی دوران ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اچانک حکومت نے اعلان کیا کہ موئے شریف درگاہ شریف کے اندر ہی مل گیا ہے اور اسے اپنی اصلی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر چہ اس گمشدگی اور بازیابی کے بارے میں بہت سے حوالہ جات اور دلائل دیئے جاتے ہیں (اور خدشات بھی ظاہر کئے جاتے ہیں) لیکن ایک مضبوط دلیل یہ ہے کہ مرحوم بخشی غلام محمد کی والدہ جموں کے ایک ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلاء تھیں اور انہوں نے موئے شریف کے دیدار کی خواہش ظاہر کی اور چونکہ موئے شریف کو اعلانیہ طور اپنی جگہ سے ہٹانا ممکن نہیں تھا اس لئے بخشی نے یہ کلام انتہائی راز داری (چوری) سے انجام دیا اور جب عوام کا سیلاب سڑکوں پر نکل آیا تو یہ کام ایک بار پھر سے اسی ''راز داری'' کے ساتھ انجام دینا پڑا..دروغ بر گردنِ راوی....

(حوالہ جات از: ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' از میر غلام احمد صفحہ نمبر 195 تا 198، کشمیر از پرویز دیوان، صفحہ نمبر 462 تا 464)

یہ واقعہ چونکہ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے زمانے میں پیش آیا ہے اور وہ موئے مقدس کی بازیابی کی تحریک کے دوران پیش پیش رہے ہیں اس لئے اُن کی سوانح حیات ''آتش چنار'' سے اس حوالے سے چند اقتباسات کو نقل کرنا مناسب رہے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بس پھر کیا تھا، یہ خبر ایک صاطقے کی طرح نکلی اور جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ وادی میں برف باری ہو رہی تھی لیکن اس وحشت ناک اطلاع نے دلوں میں جذبات کے الاؤ روشن کر دیئے، ہر طرف کہرام مچ گیا، زن و مرد، پیر و جوان گریاں و نوحہ کناں سڑکوں پر اُمڈ آئے اور چلہ کلان کی زمہریری ہوائیں عقیدت کے شعلوں کو بجھانے کی بجائے اُنہیں بھڑکانے لگیں'' (صفحہ نمبر 531)

> ''یہ خبر ساری دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی اور دنیا بھر کے نشریاتی اور اطلاعاتی اداروں نے اسے خوب تشہیر دی۔ نہرو حالات کی کروٹ سے گھبرا گئے انہوں نے خود ریڈیو سے کشمیری عوام کے نام لچھے دار اپیل نشر کروائی لیکن جو دریا جھوم کر اُٹھتے ہیں، وہ تنکوں سے کہاں ٹالے جاسکتے ہیں، نہرو نے بخشی کو جو دلی کے ایوانوں میں کاسۂ گدائی لے کر مارا مارا پھرتا رہتا تھا ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' کے مصداق

سرینگر کے حالات پر قابو پانے کیلئے بھیجا......لیکن جونہی عوام کو اُن کی آمد کی خبر ملی، اُن کی رہائش گاہ پر ہلہ بول دیا گیا جس کو بچانے کیلئے پولیس اور فوج نے اُن کی کوٹھی کے سامنے کتنے ہی سرفروشوں کو گولیوں سے بھون ڈالا'' (صفحہ نمبر 532)

اسی طرح شیخ محمد عبداللہ آگے لکھتے ہیں:

''4 فروری 64ء کو اچانک ریڈیو سے اعلان کیا گیا کہ موئے مبارک کی بازیافت ہوگئی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلات اس وقت تو کیا، آج تک عام نہیں کی گئیں، یہ کس نے غائب کئے تھے اور پھر کیسے بازیافت ہوگئے۔ یہ معمہ آج تک حل نہ ہوسکا حالانکہ ایک وقت پارلیمنٹ میں اعلان کیا گیا کہ اس سازش کا سراغ لگا لیا گیا ہے چنانچہ چند لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا لیکن بعد میں انہیں بھی رہا کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ سارے معاملے کو خاموشی کی ایک سازش کا کفن پہنا کر دفن کر دیا گیا'' (آتش چنار صفحہ نمبر 533)

بہر حال 1964ء کے اس دلدوز اور انقلاب آفریں واقعہ کے بعد حکومت نے اس کے تحفظ کے لئے سیکیورٹی کے انتہائی سخت انتظامات کئے اور اس جگہ جموں و کشمیر آرمڈ پولیس کی ایک بٹالین کو مستقل طور بٹھا دیا، زائرین کی تلاشی کے لئے انتظامات کئے گئے، ڈل جھیل کے مغربی کنارے پر شام کے وقت غروبِ آفتاب کی آڑ میں درگاہ شریف کے سامنے واقع (بڈشاہ کے تعمیر کردہ) سونہ لانک (سنہری جزیرہ) میں جا کر درگاہ شریف کی خوبصورت مسجد کو دل کی نظر سے دیکھا جائے تو یقیناً ہر ذی شعور شخص کی روح کو تسکین نصیب ہوگی لیکن افسوس کہ اس پاک جگہ پر خواتین اور شریعت سے ناواقف زائرین کو کھلی چھوٹ حاصل ہے اور دن بھر شرک و بدعات کے کئی گناہ ہوتے رہتے ہیں، جس کا سارا کفارہ ان علماء کے سر پر ہے، جو اب تک کشمیری عوام کو توحید اور شرک کے درمیان فرق کے ساتھ ساتھ زیارتِ قبور کے آداب سمجھانے میں ناکام رہے ہیں۔

(نوٹ: کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' میں اس مضمون میں پروف کی کئی غلطیاں رہ گئی ہیں اور فاضل خان کو ناصیل خان لکھا گیا ہے جبکہ موئے شریف کی تاریخ آمد 15 اپریل 1643ء لکھی گئی ہے، جس کو درست کیا گیا...ساحل)

44

شملہ سمجھوتہ!...
پاکستان کا سرینڈر؟ (1)

آپریشن جبرالٹر (1965) کے دوران پاکستان نے جو کچھ بھارت کے ساتھ کیا، جن حالات میں تاشقند معاہدہ پر دستخط کئے گئے اور جس طرح سے لال بہادر شاستری کی موت واقع ہوئی، یہ بھارت کے لئے انتہائی حزیمت اور بے عزتی کا باعث تھا اور اس کا بدلہ لینا از بس ملکی سیاست کا ایک نا قابلِ تنسیخ حصہ تھا لیکن اس کے لئے موافق اور موزون حالات کا ساز گار ہونا اولین شرط تھی، جس کا بھارت کو بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار تھا...ایک مشہور کہاوت ہے کہ تاریخ خود کو دوہراتی ہے اور انسان اس کے لئے خود ذمہ دار ہوتا ہے، کچھ اسی طرح کے حالات ستر کی دہائی کے اوائل میں بھارت اور پاکستان کے درمیان بھی پیدا ہوگئے، بنگلہ دیش میں پاکستانی افواج کو جس نفرت، حزیمت اور حقارت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اسے دیکھ کر جنگی اور سیاسی مبصرین پہلے سے ہی طے کر چکے تھے کہ اس چپقلش اور ٹکراؤ کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو، وہ پاکستان کے حق میں اچھا نہیں ہوسکتا کیونکہ تقسیم ملک کے وقت جو غلطی کی گئی تھی، اس میں دوراندیشی کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا اور قانونِ قدرت بھی یہی ہے کہ جس چٹان کے نیچے سے ایک چھوٹا سا کنکر ایک بار کھسک جائے، اسے دیر سویر ایک نہ ایک دن لڑھک کر کسی گہری کھائی میں جانا ہی ہوتا ہے اور کسی عمارت کی بنیاد رکھتے وقت اگر اس میں کوئی خامی رہ جائے تو اس عمارت کا زیادہ دیر تک ٹکنا ممکن نہیں ہوتا، یہی حالت اس وقت پاکستان کے دو حصوں کی بھی تھی اور ان کا لخت لخت ہونا ایک قدرتی عمل تھا۔

شملہ سمجھوتہ کی تاریخ کے حوالے سے راقم کے سامنے اس وقت جو تین کتابیں موجود ہیں، ان کے مصنّفین ابھی تک بقیدِ حیات ہیں، ان سے راقم کی ملاقاتیں بھی ہوچکی ہیں اور ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی اعتباریت کو جاننے کا موقعہ بھی ملا ہے، ان میں سے ایک پرویز دیوان ہیں، جن کی پیدائش اس وقت سرینگر میں ہوئی جب ان کے والد ونگ کمانڈر ٹی۔آر دیوان کشمیر میں تعینات تھے،

وہ بھارتی فضائیہ میں ونگ کمانڈر تھے اور پرویز کو اس بات پر ہمیشہ فخر رہا ہے کہ ان کی پیدائش کشمیر کی سرزمین پر ہوئی ہے، دوسرے مصنف پی این دھر کا تعلق ایک جانب کشمیر سے ہے اور دوسری جانب وہ بھارت کی خاتونِ آہن اندرا گاندھی کے قریبی رازدار اور مددگار رہے ہیں اور ان کی خاص بات یہ ہے کہ وہ شملہ سمجھوتہ کے وقت از خود شملہ میں موجود تھے اور اندرا گاندھی ان کے مشورے اور صلاح کے بغیر کوئی بھی قدم نہیں اٹھاتی تھیں، تیسرے مصنف کا نام غلام محمد میر ہے، جن کا تعلق تھنہ منڈی راجوری سے ہے اور 1972ء میں جب شملہ سمجھوتہ طے پایا، وہ بھارتی فوج کی میڈیکل کور میں کام کرتے تھے، اس طرح سے وہ اس زمانے کے حالات کے چشم دید گواہ بھی ہیں، ان کی خاص بات یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' لکھی، وہ راقم کے ساتھ جموں کے سینٹرل جیل کوٹ بھلوال میں پی ایس اے کے تحت بند تھے اور انہی الزامات کا سامنا کر رہے تھے، جن کا راقم کو سامنا تھا اس وقت ہم دونوں ''دشمن کے ایجنٹ'' قرار دیئے جا چکے تھے اور سزا بھگت رہے تھے (اور اس جرمِ بے گناہی کا ہمیں اب تک کوئی افسوس نہیں) میر غلام محمد اپنی اسی کتاب میں ''1972ء کا شملہ سمجھوتہ'' عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> ''بنگلہ دیش پاکستان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا، پاکستان کے اندازاً 98ہزار فوجی، بھارتی فوج کے ہاتھوں جنگی قیدی بن چکے تھے، جنھیں آزاد کرانے کے لئے پاکستان نے سیاسی اور سفارتی سطح پر کوششیں شروع کردی تھیں، جس کے نتیجے میں بھارت اور پاکستان کے درمیان ''شملہ سمجھوتہ'' کے نام سے ایک معاہدہ طے پایا، شائد پاکستان کے اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو ان فوجیوں کو رہا کروا کر اپنی تباہ حال سیاسی ساخت کو بحال کرنا چاہتے تھے کیونکہ بنگلہ دیش کے وجود کی وجہ سے انہیں پاکستان میں سخت خفت اٹھانا پڑی تھی جبکہ دوسری جانب اتنی بڑی تعداد میں جنگی قیدی خود بھی بھارت کے لئے سر درد بنے ہوئے تھے کیونکہ یہ فوجی آئے روز جیلوں میں سرنگیں کھود کر بھاگنے کی کوششیں کرتے اور پہریداروں پر حملے کرتے رہتے تھے، شملہ معاہدہ میں طے پایا کہ دونوں ممالک باہمی مسائل بشمول مسئلہ کشمیر کو پُرامن اور غیر فوجی طریقے سے حل کریں گے، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی جائے گی اور تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، اگرچہ اس معاہدے کی دنیاء بھر میں تشہیر کی گئی لیکن یہ معاہدہ دراصل دونوں ملکوں نے

اپنا اپنا دامن بچانے کے لئے کیا تھا، کیونکہ اس معاہدے میں طے شدہ شرائط میں سے آج تک کسی پر عمل نہیں ہوا''(میں نے کشمیر جلتے دیکھا، صفحہ نمبر 135)

مذکورہ بالا مختصر احوال سے ایک بات واضح ہوتی دکھائی دیتی ہے کہ جنگی قیدی اگر چہ وقتی طور پر بھارت کے ہاتھ میں پاکستان کے خلاف ایک مضبوط ہتھیار کی طرح تھے لیکن ان کی دیکھ ریکھ اور پرورش پر اسے جو اخراجات اور ذہنی پریشانی اٹھانا پڑ رہی تھی، وہ اس سے فوراً نجات پانا چاہتا تھا لیکن دوسری جانب پاکستان اپنے ایک لاکھ فوجیوں کو فوراً سے پیشتر اپنے گھروں میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اسے بھارت کی پریشانیوں کی طرف توجہ نہیں تھی، پرویز دیوان لکھتے ہیں ''بھارتی جیلوں میں پاکستان کے تقریباً 98 ہزار فوجیوں، افسروں، کمانڈروں، میجر جنرلوں اور بریگیڈئروں کی موجودگی پاکستان کے لئے ایک قومی بے عزتی اور وقار کا مسئلہ بن چکا تھا، اس ملک میں اس حوالے سے حکومت پر عوام کا شدید دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ اپنے قیدی بچوں کو جلد سے جلد اپنے گھروں میں دیکھنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو (مرحومہ) جو اس وقت ایک طالبہ تھیں اور اپنے والد کے ساتھ شملہ سمجھوتے کے وقت موجود تھیں، نے بھی اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ''اگر بھارت چاہتا، اس وقت پاکستان سے اپنی کوئی بھی شرط تسلیم کروا سکتا تھا'' ادھر بھارت میں عوامی ردِ عمل یہ تھا کہ بھارت کے ہاتھ میں جنگی قیدیوں کی شکل میں جو طاقتور ہتھیار آیا ہے، اسے مسئلہ کشمیر کے حتمی اور آخری حل کے لئے بھرپور انداز میں استعمال کیا جانا چاہیے کیونکہ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے اور اس مسئلہ، جو بھارت کے سر پر ایک لٹکتی تلوار کی طرح موجود ہے، کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جانا ضروری تھا۔ اس لئے بھارت کو اس موقعہ پر اپنی تمام شرائط پاکستان سے منوا لینی چاہیں (اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہا) بھارت میں یہ عوامی مطالبہ زور پکڑ رہا تھا کہ بھارت کو چاہیے کہ وہ پاکستان کے قبضہ میں کشمیر کے سبھی علاقہ جات کو ان جنگی قیدیوں کے عوض واپس حاصل کر لے اور ساتھ ہی پاکستان پر یہ شرط بھی عائد کر دے کہ وہ آیندہ بھارت کے خلاف اپنے جنگی حربے نہیں آزمائے گا۔ جب کہ بھارت میں عوام کے ایک حلقے کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے دو حصوں کو چیرنے والی عارضی جنگ بندی لائن کو بین الاقوامی سرحد میں بدل دیا جانا چاہیے اور یہ مطالبہ بنگلہ دیش جنگ کے خاتمے (دسمبر 1971) کے وقت سے ہی پیدا ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود بھارت اور پاکستان جلد سے جلد کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ کر اس قضیے کو ختم کرنا چاہتے تھے''(کشمیر / صفحہ نمبر 110)

شملہ سمجھوتہ کی شرائط وغیرہ کی تفصیل میں جانے سے پہلے اس مصنف کی روئداد پر ایک نظر ڈالنے کی سخت ضرورت ہے، جو اس تاریخی معاہدے کے وقت نہ صرف وہاں موجود تھے بلکہ خود بھی اس کا ایک حصہ تھے پی این دھر کا تعلق کشمیر کی پنڈت برادری سے ہے، وہ رعناواری سرینگر کی مشہور حکیم فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور 1943ء سے ہی بھارتی سیاست کے کافی قریب رہے ہیں، ایمرجنسی کے نفاذ کے دوران انہوں نے مسز گاندھی کے دائیں ہاتھ کے طور کام کیا اور ان کے ہر کام میں ان کا مشورہ شامل رہا، وہ اپنی کتاب (سوانح حیات) ''اندرا گاندھی، ایمرجنسی اینڈ انڈین ڈیموکریسی'' کے صفحہ نمبر 195 سے آگے اپنے مضمون ''مسز گاندھی، بھٹو اینڈ شملہ ایگریمنٹ'' میں پاکستانی وزیر اعظم مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''اس سمجھوتے کے دوران بھٹو نہ صرف جنگ بندی لائن کو'' لائن آف کنٹرول'' میں تبدیل کرنے پر آمادہ تھے بلکہ اس کے لئے انہوں نے پہلے سے ہی ایک لفظ'' امن کی لکیر'' تجویز کر رکھا تھا، وہ اس بات پر بھی آمادہ تھے کہ اس لکیر کو دھیرے دھیرے ایک بین الاقوامی سرحد میں تبدیل کر دیا جائے اور یہ عمل درج ذیل طریقے سے طے پائے: ان دنوں چونکہ بھارت اور پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر کے منقسم حصوں کے درمیان لوگوں کا آنا جانا بہت بڑھ گیا تھا اس لئے اس کو اولاً کم کرنا ضروری تھا، جس کے لئے یہ طے پایا کہ سرحد پر کچھ خاص خاص مقامات پر چیک پوائنٹ بنوائے جائیں، جہاں سے ایک باضابطہ عمل کے ذریعے لوگوں کو آنے جانے کی اجازت دی جائے، ان مقامات پر ایمگریشن کنٹرول اور کسٹم کلیرنس کے دفاتر قائم کئے جائیں، علاوہ ازیں کشمیر کا جو حصہ پاکستان کے پاس ہے، اسے پوری طرح سے پاکستان میں ضم کر دیا جائے، جس کے آغاز کے لئے بھٹو کی پارٹی (پاکستان پیپلز پارٹی) سب سے پہلے وہاں اپنی جماعت کی شاخیں کھولے اور بعد میں سارا علاقہ پاکستانی انتظامیہ اپنی تحویل میں لے لے جبکہ اس کام کے دوران بھارت برائے نام احتجاج کرے، (اور یہ وہ ہی ہے، جو 1974ء میں ہوا، جب بھٹو نے کشمیر کو آئینی طور پر پاکستان کا پانچواں صوبہ قرار دے دیا اور بھارت نے برائے نام احتجاج کر کے خاموشی اختیار کر لی) اس واقت یہ تصور کرلیا گیا تھا کہ لائن آف کنٹرول کو (de-facto frontier) کا نام دے دینے اور اس نام کو بار بار دوہرانے کی وجہ

سے عوام کے دلوں میں بھی یہ term گھر کر لے گی اور اسے ایک بین الاقوامی سرحد میں تبدیل کرنا آسان ہوجائے گا۔اسی کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان تجارت اور کاروبار کی بحالی کی وجہ سے ان میں پایا جانے والا تناؤ بھی کم ہوجائے گا، جس کی وجہ سے لوگوں میں پائی جانے والی دوریاں بھی کم ہوں گی۔ان سبھی نکتوں کو سننے کے بعد مسز گاندھی نے بھٹو سے کہا'' کیا یہی وہ نکتے ہیں، جن پر ہمیں آگے بڑھنا ہے؟''(پی این دھر)

مسز اندرا گاندھی کے یہ الفاظ اپنے اندر ایک بہت بڑی کہانی چھپائے ہوئے ہیں اور اس کہانی کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ وہ خود کچھ نہیں بول رہی تھیں بلکہ وہ سب سُن رہی تھیں، جو مرحوم بھٹو انہیں سُنا رہے تھے، جس کی وہ پہلے سے تیاری کر کے آئے تھے اور اب انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کے ایک لاکھ جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے تا کہ اس حوالے سے اندرونِ ملک مچنے والی ہائے توبہ بند ہوسکے اور یہ مصیبت کی گھڑی کسی طرح ٹل جائے۔ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار جیمز پی سٹربا (James P. Streba) نے اس ملاقات کے چند گھنٹے بعد اپنی ایک تجزیاتی رپورٹ میں ذوالفقار علی بھٹو کے ایک قریبی راز دار کے حوالے سے لکھا تھا کہ شملہ سمجھوتہ دراصل دونوں ممالک کے درمیان ایک ایسا سودا ہے جسے دونوں ملکوں کے حکمران اپنے اپنے عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے کافی دیر تک بیچتے رہیں گے اور اپنی کرسی پر بیٹھے رہیں گے''..(جو کہ اب تک ہو رہا ہے)

پی این دھر اپنے مضمون میں اس حوالہ سے مزید لکھتے ہیں:''پاکستان پر 14 برس تک حکومت کرنے والے بھٹو کی حالت شملہ ایگریمنٹ کے وقت ایسی تھی کہ وہ ریاست جموں وکشمیر کے ان حصوں میں سے ایک تہائی حصہ بھارت کو دے دینے پر بھی آمادہ تھے، جو پاکستان کے قبضے میں تھے، وہ جنگ بندی لائن کو مستقل سرحد بنانے پر بھی آمادہ تھے اور بھارت کے ساتھ بہت ہی ملائم اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے متمنی بھی۔انہوں نے مسز گاندھی سے کہا تھا کہ انھیں اس کام میں چند سال کی مہلت درکار ہوگی تا کہ اس دوران وہ اپنے ملک کے عوام کو سمجھانے میں کامیاب ہوجائیں اور وہ یہ بات کسی دھنگے، فساد اور اس کی حکومت کو زک پہنچائے بغیر انجام دینے کے لئے تیار ہوسکیں، یہ تھی دونوں ملکوں کے رہنماؤں کے درمیان شملہ مفاہمت اور یہ تھا مسئلہ کشمیر کے لئے'' شملہ حل'' (پی این دھر، صفحہ نمبر 196)

دھر کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے ملک (بھارت) کے عوام کو اس مفاہمت نامہ کے پسِ پردہ پوشیدہ حقائق سے آگاہ کرنے کے لئے اپریل 1995 میں بھارتی اخبار 'ٹائمز آف انڈیا' میں دو قسطوں پر مشتمل ایک مضمون لکھا تھا، جس پر پاکستانی صحافیوں، دانشوروں اور سیاست دانوں نے ہاہا کار مچائی، لیکن اگر اس دوران کوئی خاموش تھا تو وہ تھیں پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو، جو شملہ سمجھوتے کے وقت اپنے والد کے ہمراہ وہاں موجود تھیں اور ساری صورتحال سے واقف تھیں۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ کشمیر میں اس سمجھوتے کے حوالے سے ایک افواہ برابر گشت کرتی آئی ہے کہ شملہ سمجھوتہ کے دوران مسز گاندھی اور مرحوم بھٹو کے درمیان ایک ''خفیہ ملاقات'' ہوئی تھی، جس کے ساتھ اگر چہ طرح طرح کی تو ہمتیں بھی وابستہ ہیں لیکن دیگر باتوں کو چھوڑ کر پی این دھر کی خود نوشت سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوتا ہی ہے کہ دونوں کے درمیان کم از کم ایک ''خفیہ ملاقات'' ضرور ہوئی تھی، اور اس میں مسز گاندھی کو کافی کچھ ملا تھا۔ جیسا کہ مضامین کے زیرِ نظر سلسلے میں کئی بار یہ بات آچکی ہے کہ تاشقند اور شملہ معاہدوں کے بعد بھارت نے کبھی بھی آزاد کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار نہیں دیا، یہ بات شملہ سمجھوتے کے حالات سے ایک بات پھر درست ثابت ہو رہی ہے کہ دونوں نے اپنی اپنی موجودہ پوزیشنوں کو تسلیم کر لیا تھا اور اگر چہ پاکستان آج بھی کشمیر پر اپنے دعوے سے دستبردار نہیں ہوا ہے لیکن بھارت اپنے وعدے کے ساتھ وفاء کر رہا ہے.............

(**نوٹ**:...دو ممالک کے سربراہوں میں خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئی ناجائز حرکت کر رہے ہیں...ف م ح)

45

شملہ سمجھوتہ

....اور پاکستان کا سرینڈر...(۲)

شملہ سمجھوتے کے دوران برصغیر میں دو بڑی امیدیں پیدا ہوئی تھیں۔ اول یہ کہ اس سمجھوتے کی وجہ سے مسئلہ کشمیر کا کوئی سنجیدہ، دیرپا ءاور مستقل حل نکل آئے گا اور اس کی وجہ سے اس خطے میں موجود تناؤ اور رسہ کشی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی اور دوم یہ کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان باہمی تعلقات کی بحالی کا ایک ماحول قائم ہو گا اور دونوں ملکوں کے پڑوسی بھی اس سے مستفید ہوں گے، لیکن ان دونوں میں سے ایک بھی بات نہ ہوئی اور تنازعات آج تک جوں کے توں موجود ہیں، اس ناکامی کی وجوہات کے بارے میں دونوں جانب نہ تو کبھی سنجیدگی کے ساتھ سوچا گیا اور نہ ہی اس حوالے سے آزادانہ بحث ومباحثہ کیا گیا۔ پی این دھر بھی اس حوالے سے اسی نکتۂ نظر کے حامی دکھائی دیتے ہیں کہ بھارتی فوج (مکتی باہنی) نے جو کمال میدانِ جنگ (بنگلہ دیش یا مشرقی پاکستان) میں دکھایا تھا اور جس کی وجہ سے پاکستان کو عاجز کر کے مذاکرات کے میز پر لانا ممکن ہو سکا تھا، اس کا فائدہ اس ملک کی سیاسی قیادت مذاکرات کے میز پر نہ اٹھا سکی، ان کا کہنا ہے کہ اس سمجھوتے کا مسودہ اگرچہ بہت خوب تھا لیکن اس کی ناکامی کی دو بڑی وجوہات یہ تھیں کہ بھارت اس کی مدد سے مسئلہ کشمیر کے علاوہ دیگر باہمی معاملات کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے درمیان قائم ہونے والے تناؤ اور کشیدگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا تھا اور اس کے دوررس نتائج کا حامی تھا لیکن پاکستان کی ترجیحات مختلف تھیں، پاکستان اس سمجھوتے سے وقتی طور دو بڑے فائدے اٹھانا چاہتا تھا، اول یہ کہ وہ بھارتی افواج کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے ایک لاکھ فوجیوں کو فوراً سے فوراً واپس گھر لیجائے اور دوم یہ کہ وہ بنگلہ دیش کو ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر تسلیم کرنے کے معاملے کو اپنی مرضی کے مطابق فی الحال ٹال دے اور پہلے اپنے اندرونی تناؤ کو کم کرے، دھر کے مطابق پاکستان اپنے کچھ مسلم ممالک اور پڑوسی ملک چین کی مدد سے ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہوا، لیکن بھارت چونکہ دوراندیشی کا مظاہرہ کرتا رہا اس لئے اس کی سیاسی

قیادت نے وہ بھی کھو دیا، جو اس کی افواج نے حاصل کیا تھا۔ جبکہ اس کے چند سال بعد پاکستان نے اس جنگ بندی لائن کی پھر سے خلاف ورزی کرنا شروع کر دی، جس کو مرحوم بھٹو نے شملہ میں ''امن کی لکیر'' (Line of peace) قرار دیا تھا۔ حالانکہ شملہ میں پاکستانی صدر ذوالفقار علی بھٹو اور اس کے ساتھی عزیز احمد نے ایک زبردست 'جنگل بندی' کا مظاہرہ کیا تھا، بھٹو، جو اس سے پہلے بھارت کے ساتھ کشمیر کے حصول کے لئے ایک ہزار سال تک لڑنے کی بات کرتا تھا، نے انتہائی عاجزی، انکساری اور حلیمی کا مظاہرہ کر کے بھارت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اب اپنی سابقہ 'حرکتوں' سے باز آ چکا ہے اور اپنے ملک کے بچے کھچے حصوں کو مجتمع کر کے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا متمنی ہے اور اسے ترقی اور خوشحالی کے راستے پر ڈالنا چاہتا ہے، اس نے شملہ میں اپنی حلیمی اور 'اعترافِ شکست' کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا ''برصغیر کے حکمران اپنے عوام کی امیدوں پر پورا اترنے میں اس لئے کامیاب نہیں ہوئے کہ انہوں نے ترقی، امن اور باہمی دوستی کی بجائے جنگ و جدل، تناؤ اور ٹکراؤ کو ترجیح دی اور ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہے اور اسی بات کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اس خطے میں غربت، بدحالی اور غیر یقینیت کے بادل منڈلا رہے ہیں اور یہی باتیں آج بھی ہمارے معاملات اور مسائل کے حل کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں'' (پی این دھر/ صفحہ نمبر/ ۲۰۰)

اس وقت 2 جولائی 1972ء کو بھارت اور پاکستان کے درمیان طے پانے والے شملہ سمجھوتے کا جو مسودہ ہمارے سامنے موجود ہے، اس کا آزادانہ اردو ترجمہ کچھ اس طرح سے ہوسکتا ہے:

شملہ سمجھوتہ

''بھارت اور پاکستان، دونوں ملک اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے درمیان پائے جانے والے تناؤ، کشیدگی اور جنگ و جدل کے ماحول کو ترک کر کے اور اپنے باہمی رشتوں کو دوستانہ اصولوں پر استوار کر کے اس خطے کے عوام کی فلاح و بہبود اور ترقی و خوشحالی کے لئے مل جل کر کام کریں گے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان مندرجہ ذیل سمجھوتے کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوئی ہیں:

حصہ اول (ا) دونوں ملکوں کے درمیان رشتوں کی بنیاد اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے اصولوں پر ہوگی۔

(۲) دونوں ممالک اپنے باہمی معاملات اور مسائل کا حل مذاکرات، پرامن طریقہ کار، افہام و تفہیم یا پھر کسی ایسے طریقے سے تلاش کریں گے، جس پر وہ آپس میں راضی ہوں، التوائی میں

پڑے ہوئے کسی بھی باہمی مسئلہ کے حوالہ سے کوئی بھی فریق یکطرفہ طور پر ایسے حالات پیدا نہیں کرے گا، جس سے صورت حال کے بگڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے بلکہ دونوں ہی نازک حالات میں ایک دوسرے کے ساتھ باہمی صلاح ومشورہ کر کے معاملات کو سلجھانے کی کوششیں کریں گے

(۳) یہ کہ دونوں ممالک ہمیشہ ہی اچھے پڑوسیوں کی طرح رہتے ہوئے خطے کے دیرپا امن، دوستانہ تعلقات اور بقائے باہم کے لئے کوششیں کرتے رہیں گے، دونوں ہی ایک دوسرے کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی آزادی اور خودمختاری کا احترام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے معاملات میں بے جا اور بلا وجہ مداخلت نہیں کریں گے (۴) یہ کہ وہ سبھی معاملات اور تنازعات، جن کی وجہ سے سابقہ 25 برسوں سے دونوں کے درمیان تلخی اور کشیدگی چلی آئی ہے، کا حل باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے تلاش کیا جائے گا (۵) یہ کہ دونوں ہی فریق ہمیشہ ایک دوسرے کی قومی یگانگت، علاقائی خودمختاری اور سیاسی آزادی کا احترام کریں گے (٦) یہ کہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مطابق دونوں ہی ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کریں گے اور سیاسی آزادی کا بھی۔

حصہ دوم: دونوں ہی ممالک اپنے اپنے ملک میں ایک دوسرے کے خلاف جاری منفی پرپگینڈا کو ختم کرنے کے لئے موئثر اور فوری اقدامات کریں گے اور دونوں ہی ملک ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی کریں گے، جن کی وجہ سے آپسی تعلقات بہتر ہوسکیں اور دوستانہ ماحول کو پنپنے کا موقعہ ملے۔

حصہ سوم: دونوں ممالک کے درمیان رفتہ رفتہ اور دھیرے دھیرے تعلقات کی بحالی کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات پر اتفاق رائے کیا جاتا ہے:

(۱) مواصلات، ڈاک و تار، سمندری اور سرحدی رابطوں کو بحال کیا جائے گا اور ہوائی رابطوں، بشمول ایک دوسرے کے اوپر سے جانے والی پروازوں کو بھی فوری طور بحال کیا جائے گا

(۲) دوسرے ملکوں کے باشندوں کو ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کے لئے بھی سہولیات فراہم کی جائیں گی

(۳) دونوں ملکوں کے درمیان پہلے سے تسلیم شدہ اصولوں اور ضابطوں کے تحت جلد سے جلد کاروبار اور تجارت کو بحال کیا جائے گا

(۴) سائنس اور کلچر کے شعبوں میں اشتراک کی غرض سے دونوں ملکوں کے وفود وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہیں گے تا کہ مشترکہ روایات اور تہذیبی وراثت کو فروغ مل سکے۔

حصہ چہارم: خطے میں ایک مستحکم امن کے قیام کی غرض سے دونوں حکومتیں اس بات کا اعادہ کرتی ہیں کہ:

(۱) بھارت اور پاکستان کی افواج کو اپنی موجودہ پوزیشنوں سے ہٹا کر بین الاقوامی سرحد پر پرانی پوزیشنوں پر تعینات کیا جائے گا

(۲) جموں و کشمیر میں 17 دسمبر 1971 کی پوزیشنوں کا احترام کیا جائے گا اور دونوں جانب کی افواج انہی پوزیشنوں پر واپس چلی جائیں گی (یعنی پاکستان نے بھی اس بات کو تسلیم کیا کہ وہ 1947ء سے پہلے کی پوزیشن کی بحالی کا مطالبہ نہیں کرے گا، جبکہ اس سے پہلے وہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق 1947ء سے پہلے کی پوزیشن کی بحالی کا مطالبہ کرتا آیا تھا) علاوہ ازیں کوئی بھی فریق اس حوالے سے کوئی بھی یکطرفہ حجت یا تبدیلی کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، اس کے علاوہ دونوں اس بات کا اعادہ بھی کرتے ہیں کہ وہ اس سرحد کی خلاف ورزی کرنے کے لئے طاقت (فوج) کا استعمال نہیں کریں گے۔

(۳) افواج کا انخلاء اور اس سمجھوتے میں درج باقی شرائط پر اس پر دستخط ہو جانے کے بعد تیس دن کے اندر اندر عمل درآمد شروع ہو جانا چاہیے۔

حصہ پنجم: اس سمجھوتے پر عمل درآمد دونوں ملکوں کی جانب سے تصدیق ہو جانے اور تصدیق شدہ مسودوں کے تبادلے کے فوراً بعد ہو جائے گا۔

حصہ ششم: دونوں فریق اس بات پر بھی متفق ہیں کہ دونوں ملکوں کے سربراہانِ مملکت عنقریب ایک موزون وقت پر ملاقات کریں گے، اور اسی دوران دونوں ملکوں کے نمائندے آپسی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھ کر ایک پائدار امن کے قیام کے لئے مزید اقدامات کی راہ ہموار کریں گے، ان میں تعلقات کی بحالی اور دونوں اطرف کے جنگی قیدیوں کا تبادلہ، جموں و کشمیر مسئلہ کا حتمی حل اور سیاسی روابط کی بحالی شامل ہو گی....

دستخط۔ اندرا گاندھی، وزیر اعظم جمہوریہ ہند..

دستخط۔ ذوالفقار علی بھٹو، صدر، اسلامی جمہوریہ پاکستان...''.

☆☆

یہ تھا شملہ سمجھوتے کا وہ مسودہ، جس کی رُو سے بھارت نے پاکستانی کشمیر پر پاکستانی قبضے کو اور پاکستان نے بھارتی کشمیر پر بھارتی قبضہ کو تسلیم کر کے اپنی اپنی افواج کو دسمبر 1971 کی پوزیشنوں پر

واپس بھیج دینے کا اعادہ اور عہد و پیمان کیا، اس کے بعد پاکستان نے 1974ء میں آزاد کشمیر کو پاکستان کا پانچواں آئینی صوبہ قرار دے دیا اور بھارت نے برائے نام احتجاج کیا جبکہ بھارت اپنے قبضے والے کشمیر میں اپنی فوجی اور سیاسی قوت کو بڑھاتا چلا گیا.... پرویز دیوانہ کا ماننا ہے کہ بھارت کے قوم پرست دانشوروں کا خیال ہے کہ شملہ سمجھوتے میں ایک ایسی شق موجود تھی، جس کا تعلق مسئلہ کشمیر کے مستقل حل کے ساتھ تھا، لیکن وہ اگلی سطر میں لکھتے ہیں کہ اس طرح کی کسی خفیہ شق کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جب کہ دونوں کہہ رہے تھے ''بغیر کسی حجت کے تسلیم شدہ پوزیشنوں کا احترام کیا جائے گا'' اور جب دونوں نے دسمبر 1971ء کی پوزیشنوں کو تسلیم کر لیا تھا، پھر کسی خفیہ سمجھوتے کی کیا ضرورت تھی، کشمیر اور پاکستان میں اس سمجھوتے کے ساتھ جو 'تہمت' وابستہ تھی اور جس کا تعلق مسز اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ تھا، کا عقدہ پی این دھر کی کتاب بہت اچھی طرح سے کھولتی ہے، اس وقت بھٹو مرحوم کی حالت ایک سائل کی سی تھی جبکہ مسز گاندھی اپنے ہاتھوں میں ایک طاقتور ہتھیار ہونے کے باوجود بھی اسے بھرپور انداز سے چلا نہ پائیں اور 90 ہزار جنگی قیدیوں کو کھلانا پلانا بھارت کو مہنگا لگ رہا تھا۔ اپنی اپنی پوزیشن اور طاقت سے بے خبر دوسربراہانِ مملکت نے وقتی طور ایک سمجھوتہ کر کے اپنی اپنی جان چھڑا لی اور اپنی زندگی بھر کی حکمرانی کو بھی محفوظ کر لیا، مستقبل میں حالات کے بدل جانے کے ساتھ عوام اور حکومتوں کے مزاج بدلتے گئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

46

جب شیر بوڑھا ہو جاتا ہے....
مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ایکارڈ پہ ایکارڈ....

تقسیم برصغیر کے بعد بھارت، پاکستان اور اب بنگلہ دیش کے نقشۂ عالم پر ابھرنے کی وجہ سے باقی حصوں کی طرح جموں وکشمیر کے اس خطے پر بھی بے شمار منفی اور نقصان دہ اثرات مرتب ہوئے اوران واقعات کا سایہ اتنا محیط اور گہرا تھا کہ کئی دہائیاں گزر جانے کے باوجود اس خطے میں روشنی کی ایک بھی ایسی کرن نظر نہیں آتی، جسے 'امید کی کرن' سے تعبیر کیا جاسکے اور جس کو بنیاد بنا کر امید کی عمارت کی تعمیر شروع کی جاسکے، جبکہ وقت کے طالع آزما اور ابن الوقت سیاست دانوں نے اپنی کرسی بچانے کے لئے صرف اور صرف سودا بازیاں کیں اور کبھی مرکز کے ساتھ کوئی ایکارڈ کیا، کبھی کوئی سمجھوتہ کیا اور کبھی ٹکراؤ کا راستہ اختیار کر کے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی، یہ سب بظاہر عوام کو دکھانے کے لئے ہوتا رہا یا پھر کیا جاتا رہا لیکن اصل بات کچھ اور تھی، جیسا کہ پچھلی ایک قسط میں آچکا ہے کہ مرکز ریاست جموں وکشمیر کو بھارت میں ایک ممتاز اور بااختیار پوزیشن فراہم کرنے والی آئینِ ہند کی دفعہ 370 کو ختم یا کم از کم اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرنا چاہتا تھا اور اس کا عندیہ بھارت کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے پچاس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں پارلیمنٹ کے ایک اجلاس سے خطاب کے دوران دے دیا تھا (اے۔جی نورانی) اس منصوبے پر عمل درآمد کے لئے کشمیر کی واحد اور بااثر آواز شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاریوں اور قید وبند کا سلسلہ بھی تقریباً بائیس سال کے ایک اچھے خاصے عرصے پر محیط ہے ، شیخ محمد عبداللہ کی مسلسل گرفتاری اور قید وبند کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ ان کو سیاسی منظر نامے سے ہٹا کر ریاست کی اس خصوصی حیثیت کو ختم کر دیا جائے تا آں کہ جموں وکشمیر بھی ملک کی باقی ریاستوں کی طرح بھارت کا ایک صوبہ بن جائے اور نہ تو اس کا 'مسلم اکثریت' کا دعویٰ باقی رہے اور نہ ہی اس کی آئینی خصوصیت، اس عرصہ (1953 تا 1975ء) کے دوران اس طرح کی کوششیں ہوتی رہیں اور مرحوم بخشی غلام محمد، خواجہ شمس الدین (عرف شمہ کٹھ)، غلام محمد صادق اور سید میر قاسم ان 23 برسوں

کے دوران ریاست کے وزرائے اعظم بن کر اس کی تمام جڑوں کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتے رہے، اس دوران شیخ اکثر قید و بند کے ساتھ ہی الجھے رہے اور اگر کبھی رہا ہوئے بھی تو اس دوران وہ کوئی خاص کام انجام نہیں دے پائے، مسلسل قید تنہائی کی سختیوں نے بھی ان کی سوچ پر کافی اثر مرتب کیا تھا اور وہ بھی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنی سوچ کو بدلنا چاہتے تھے ساتھ ہی 1971ء میں مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کی وجہ سے ہونے والی پاکستان کی درگت بھی دیکھ چکے تھے لہذا بہت محنت اور متعدد با اثر سیاست دانوں کی کوششوں کی وجہ سے شیخ محمد عبداللہ کے کے دستِ راز مرزا محمد افضل بیگ اور بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے نمائندے جی پارتھا سارتھی ریاست کے مستقبل کے حوالے سے کچھ بنیادی نقطوں پر متفق ہوئے اور ایک معاہدے کے تحت شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سونپ دیا گیا، اس معاہدے، جس پر اتفاق ہوا تھا، اور جن نقطوں پر اتفاق ہوا تھا، ان میں ایک خاص نقطہ یہ بھی تھا کہ شیخ محمد عبداللہ 1953ء کی پوزیشن کے مطابق بحیثیت 'وزیر اعظم' حلف لیں گے۔ لیکن رسمِ حلف برداری سے صرف چند منٹ پہلے دلی والے اپنے وعدے سے مکر گئے اور انہیں جو حلف نامہ پڑھ کر سنایا گیا اس میں وزیر اعظم کی جگہ وزیر اعلیٰ لکھا گیا تھا، ساتھ ہی نہ تو 1953ء کی پوزیشن بحال ہوئی اور نہ اس معاہدے کی کوئی اور شق یا شرط پوری ہوئی۔ لیکن اس معاہدے کو آج تک ''اندرا عبداللہ ایکارڈ'' کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے اور یہ بھی 'مسئلہ کشمیر' کو حل کرنے کی ایک کوشش تھی۔

تاریخ بڑے بڑے پہلوانوں کو بھی وقت آنے پر چاروں خانے چت کر دیتی ہے اور بڑے سے بڑا زیرک بھی عقل کی مار کھا کر سمبھل جاتا ہے لیکن خطۂ کشمیر کو اب تک ایسی بے لوث قیادت نصیب نہ ہو سکی جو وقت کے تھپیڑوں اور مہربانوں کی بے وفائی سے سبق سیکھ کر اس سادہ لوح قوم کی تقدیر کو سنوار سکے، اندرا عبداللہ معاہدے کی ناکامی کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شیرِ کشمیر کہلانے والا شیخ محمد عبداللہ کوئی ایسا لائحہ عمل اختیار کرتا جس سے اس ریاست کے عوام کے درد و غم کا مداوا ہو سکے لیکن حکومت نے سڑکیں بنانے، بجلی اور پانی فراہم کرنے کو اپنا بنیادی اصول بنا لیا، مرکزی حکومتیں پانی کی طرح پیسہ بہاتی رہیں اور حکمران طبقہ اس بہتی گنگا میں نہاتا رہا، کل کا غریب کشمیری آج بھی غریب ہی ہے اور نہ جانے کب تک رہے گا، ادھر مرکز میں بھی اب تک کشمیر کے حوالے سے یہی اصول کارفرما ہے کہ کشمیریوں کو کھانے، پانی اور بجلی دو اور خاموش کرا دو'' لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے۔ یہاں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ کشمیر کے حوالے سے بھارت کی ہی سیاسی تدبیریں جاری نہیں رہیں بلکہ اس حوالہ سے پاکستان بھی اپنے طور سرگرم رہا اور چوں کہ مرحوم بھٹو نے 1972ء میں لکھ دیا تھا کہ وہ پاکستانی قبضہ

والے کشمیر کو پاکستان کا پانچواں صوبہ بنا کر دم لیں گے، اس کا باضابطہ اعلان انہوں نے 1974ء میں مقبوضہ علاقے میں اپنی پارٹی PPP کی شاخیں قائم کرنے کے بعد اور اس اعلان کے ساتھ ہی کر دیا تھا کہ کشمیر پاکستان کا پانچواں صوبہ ہے، اسی کے ساتھ 24 ستمبر 1974ء کو پاکستان نے ریاست کے جسم پر ایک اور آری اس وقت چلائی، جب اس نے گلگت اوربلتستان کے ایک حصہ ہُنزہ کو کاٹ کر پاکستان کے 'شمال مغربی علاقہ' NWFP' میں ضم کر دیا اور اسے بھی پاکستان کا ہی حصہ قرار دے دیا گیا۔ ادھر پاکستان کشمیر کے سینے پر قینچی چلاتا رہا اور ادھر بھارت کشمیری قیادت سے ایسے کام کرواتا رہا جس سے اس بدقسمت ریاست کا مقدر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بگڑ کر رہ گیا۔ اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ ہر بار جب جب بھی کشمیری عوام نے یہ چاہا کہ وہ اپنے مقدر کا فیصلہ خود کریں، ان کے قائدین نے انھیں مایوس کیا اور ہر آنے والے پل کے ساتھ ان کے دلوں میں بھارت کے خلاف بداعتمادی اور بدظنی پیدا ہوتی رہی، لیکن ایک بات ماننی پڑے گی کہ شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش پر شیخ کی مرضی اور خواہش کو ترجیح دیتے ہیں اور وہی ان کے اصل نمائندے اور راہبر ہیں'' اس کے ساتھ ہی ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہوئی کہ فروری 1975ء میں محاذ رائے شماری کا آخری اجلاس بھی منعقد ہوا اور شیخ کے ساتھ ساتھ ان کے دستِ راست مرزا افضل بیگ نے اس محاذ کے نیشنل کانفرنس میں انضمام کا اعلان کیا اور کشمیر کی خصوصی پوزیشن کی بحالی کے لئے برسرِ پیکار اس آخری محاذ نے بھی دم توڑ دیا... پرویز کے مطابق ''اس سال (۱۹۷۵ء میں) کشمیر میں بھارت کا یومِ آزادی (۱۵، اگست) اس قدر دھوم دھام کے ساتھ منایا گیا، جیسا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں منایا گیا تھا، ہر طرف عوام کا سیلاب اُمڈ آیا اور ریلیوں، جلسوں اور جلوسوں میں ایک ہی نعرہ بلند کیا گیا'' آزاد ہندوستان زندہ آباد'' لیکن یہ خوشیاں بھی دیرپا ثابت نہیں ہوئیں اور کانگریس نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو اپنی حمائت واپس لے لی، مرکز نے ریاست میں گورنر راج نافذ کر دیا اور ریاست پر مرکز کی جانب سے مقرر کردہ پہلے حکمران گورنر تھے ایل کے جھا، انہوں نے اعلان کیا کہ ریاست میں ۳۰ جون ۱۹۷۷ء کو عام انتخابات کروائے جائیں گے۔ لیکن وقت انسان کو نہ جانے کیا کیا دکھلاتا ہے، اسی عرصے میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا مرکز میں اچھا خاصا دبدبہ قائم ہو چکا تھا اور بھارت کئی کئی شمالی ریاستوں میں اس پارٹی کی شاخیں اور جڑیں بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھیں، ادھر اس کا اثر کشمیر میں بھی محسوس کیا گیا اور میر واعظ مرحوم مولوی محمد فاروق کی جماعت عوامی ایکشن کمیٹی نے اس جماعت کی حمایت کا اعلان کر دیا، یہ حمایت جنتا پارٹی کے لئے جیت کا کھلا اعلان تھی اور انہوں نے پوری ریاست میں 'کچھ'

کر دکھانے کی ٹھان لی۔لیکن وقت نے اچانک کروٹ بدلی، بی جے پی کے کچھ لیڈروں نے کشمیر کا دورہ کیا اور اپنے حمایتیوں کے ساتھ جلسہ وجلوس کا اہتمام بھی کیا جب کہ شیخ محمد عبداللہ، جو ان دنوں صاحبِ فراش تھے، کے بارے میں کچھ قابلِ اعتراض باتیں بھی کیں لیکن اسی دوران یہ افواہ پھیل گئی کہ شیخ محمد عبداللہ وفات پا گئے اور ان کی لاش سٹیٹ ہسپتال میں برف کے سلوں پر رکھی گئی ہے، اس افواہ کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں کا سیلاب گھروں سے نکل آیا اور شیخ محمد عبداللہ کو بے محنت اور بے مول حمائت مل گئی اور وہ لوگ جو ان سے نفترکرتے تھے، نے بھی انہی کی حمایت کی. یہ واقعہ ایک ایسے موقعہ پر پیش آیا، جب انتخابات کو محض چند دن باقی تھے، شیخ عبداللہ نے انتخابات میں اکثریت حاصل کر لی اور ان انتخابات کو اس وقت تک ہونے والے انتخابات میں سے سب سے زیادہ صاف ستھرا اور منصفانہ قرار دیا گیا۔اس دوران ایک جانب کشمیر میں بھارت کی مقبولیت بڑھ رہی تھی اور سیاسی قیادت کے پیچھے پیچھے کشمیری عوام بھی نئی دلی کے کافی قریب جا رہے تھے، جبکہ دوسری جانب 1979ء تک آتے آتے پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹر ضیاءالحق نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں کے منتخبہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ایک قتل کیس میں پھنسا کر پھانسی پر چڑھا دیا گیا تو اس کے ردِعمل میں کشمیر میں ضیاءالحق مخالف لہر چلی، جسے بعض مورخین نے پاکستان مخالف لہر قرار دے کر کہا کہ یہ وہ وقت تھا جب کشمیر میں پاکستان کی 'نفرت' میں حد درجے کا اضافہ ہوا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لہر اگر چہ ایک طرف جنرل ضیاءُالحق کے خلاف تھی، لیکن دوسری جانب پاکستان کے منتخبہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے حق میں بھی تھی، اس لئے اسے پاکستان مخالف لہر قرار نہیں دیا جاسکتا، تاہم یہ بات اور ہے کہ کشمیریوں نے اس لہر کے دوران قران شریف اور احادیثِ مبارکہ کی مقدس کتابوں کو جلانے اور ان کی بے حرمتی کے سینکڑوں گناہانِ عظیم کا ارتکاب بھی کیا، جس پر اللہ تعالیٰ کو ایک بار ضرور اپنے ان نادان بندوں کی حماقتوں پر غصہ آیا ہوگا....بہر حال بات ہو رہی تھی 1952 کی....شیخ محمد عبداللہ نے جب یہ دیکھا کہ مرکز کی جانب سے سبسڈی پر فراہم کئے جانے والی غذائی اجناس کو کشمیر کے غیرت مند صارفین ''بھیک'' سمجھنے لگے ہیں تو انہوں نے ڈرامائی انداز میں راشن پر ملنے والی سبسڈی کو ختم کر دیا اور مسلم اوقاف ٹرسٹ کی رقومات کا استعمال کر کے یہ خسارہ پورا کیا، دوسری طرف انہوں نے غریب کاشتکاروں کی حالت زار دیکھ کر زمیندار اور مزارع کے رشتے کی ہمیشہ کے لئے سہ طلاق کروا ڈالی اور زرعی اصلاحات کو نافذ کر کے زمین کو ان کاشتکاروں کو سونپ دیا، جو برس ہا برس سے اس میں اپنا خون پسینہ ملا رہے تھے، یہ ایک اچھا قدم تھا، اس کی وجہ سے اگر چہ ایک امیر طبقہ ان کے خلاف ہو گیا اور انہوں نے ان کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا لیکن ان کو اپنی دعاؤں میں

شامل کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، شیخ عبداللہ کے کھاتے میں جو سب سے اہم بات جاتی ہے، وہ ہے سال 1978 کا ''زرعی اصلاحات ایکٹ'' اس ایک اقدام نے شیخ محمد عبداللہ کو تقسیم ریاست سے اُس وقت تک کے سبھی ریاستی حکمرانوں میں سے قد آور اور ممتاز بنا دیا اور وہ عوام کی پہلی پسند بن کر ابھرے۔..لیکن سال 1982 میں شیخ محمد عبداللہ اچانک بیمار ہو گئے اور اسی کے ساتھ 8 ستمبر کو ان کی وفات ہو گئی۔ان کی موت پر کشمیری عوام نے ان کے تئیں جس محبت اور عقیدت کا اظہار کیا، وہ بھی تاریخِ کشمیر کا ایک ایسا باب ہے، جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، تو ہم پرستی کے غلبے اور دینی علوم کے افلاس کی وجہ سے ان کے فدائین نے ان کے نام کا کلمہ تک پڑھ ڈالا اور ان کے جلوسِ جنازہ کو ایم اے روڈ سے نسیم باغ حضرتبل تک پہنچنے میں ایک پورا دن لگا، ان کے جنازے میں ایک اندازے کے مطابق پانچ لاکھ سے زائد لوگ شامل ہوئے، جو اس وقت تک کشمیر میں ایک اہم اور اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ تھا۔

شیخ محمد عبداللہ کا سالِ پیدائش 1905ء تھا، جس کا ابجدی حساب ''درختِ آتش'' بنتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ایک جیوتشی نے کہا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کی وفات کے ساتھ ہی کشمیر میں ایک نا بجھنے والی آگ پھیل جائے گی، جو کسی شاخ کو نہ بخشے گی، اور دیکھا جائے تو یہ پیشین گوئی کافی حد تک درست بھی ثابت ہوئی۔

فاروق عبداللہ اور غلام محمد شاہ کا پُر آشوب دور

☆☆☆

شیر کشمیر کہلانے والے شیخ محمد عبداللہ کی موت دراصل ایک زمانے کا خاتمہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا، جس دوران کشمیر کی اس وادی کے عوام ڈوگرہ شخصی راج سے نکل کر بیسویں صدی کے وسط میں ساری دنیا میں برپاء ہونے والی بیداری اور آزادی کی انقلابی تحریکوں میں شامل ہوئے اور اگرچہ اپنی پرانی روایات اور سیاسی صورت حال کو بدل دینے کے لئے کشمیری عوام نے بھی باقی دنیاء کی مظلوم اور محکوم اقوام کے ساتھ ساتھ بے شمار اور لاتعداد قربانیاں دیں لیکن وہ صورصورت حال کو بدلنے کی حد تک ہی کامیاب رہے جبکہ اپنی اس جدوجہد کو کسی مقام اور حتمی انجام تک پہنچانے میں انہیں کامیابی نہیں مل سکی اور اسے زمانے کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے سکول ماسٹری چھوڑ کر جب بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کشمیر کی سیاست میں قدم رکھا تھا، اس وقت کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر وہ ایک قدآور اور واحد لیڈر بن کر ابھریں گے اور 21 جون 1931ء کے دن سرینگر کی خانقاہِ معلیٰ میں میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اس عہد کے بعد کہ اب وہ ساری زندگی ایک دوسرے سے جداء نہیں ہوں گے اور نہ ہی ایک دوسرے کے خلاف لب کشائی کریں گے، کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ قسمیں اور یہ وعدے محض چند سال بعد نیشنل کانفرنس کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی غرقِ جہلم ہو جائیں گے، آگے چل کر یہی دو خاندان کشمیر میں سخت ترین روائتی اور سیاسی حریف بن کر ابھریں گے اور شیر اور بکرا کے نام سے کشمیر میں دو ایسے طبقے وجود میں آجائیں گے، جو دو انتہاؤں پر رہ کر کشمیر کی سیاست میں سرگرم رہیں گے، حالانکہ اس کے بعد ایک زمانے میں ''ڈبل فاروق'' کے نام سے ایک اتحاد بھی وجود میں آیا اور پرانی تلخیاں ختم کرنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن چونکہ اختلافات کی یہ خلیج کافی وسیع اور گہری ہو چکی تھی اور سیاسی و ذاتی مفادات کو قومی معاملات پر ترجیح حاصل تھی اس لئے یہ اتحاد بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

ستمبر 1982ء میں شیخ محمد عبداللہ کی وفات کے بعد کشمیری عوام چونکہ شیخ صاحب کی محبت میں کافی حد تک گرفتار ہو چکے تھے، اس لئے انہوں نے پینتالیس سالہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ (تاریخِ

پیدائش اکتوبر 1937) کو ''یتیم'' قرار دے کر اپنی بے لوث حمایت دی اور چونکہ نیشنل کانفرنس کی حکومت پہلے سے قائم تھی، اس لئے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو وزیراعلیٰ کے عہدے کے لئے مقرر کر لیا گیا اور کشمیر میں پرانی روایت کہ جذبات کو سیاست پر ترجیح حاصل رہنی چاہیے اور کسی بڑے عہدے پر براجمان شخص کی وفات کے بعد اسی خاندان کا چشمِ چراغ قائم رہنا چاہیے۔ حالانکہ خود شیخ محمد عبداللہ ڈوگروں کے شخصی راج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ریاست میں جمہوریت اور عوامی حقوق کی بحالی کے لئے ساری زندگی سرگرداں رہے لیکن وہ اس کام کے لئے صرف اپنی ذات کو ہی تیار کر پائے تھے جبکہ یہاں کے عوام کے دلوں سے ان کی وفات تک بھی غلامانہ عادتیں باہر نہ نکل پائی تھیں، یہ روایت ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ ایک بار پھر چلی اور ابھی تک جاری ہے، کشمیر کی سیاست میں ہی نہیں بلکہ دیگر امور میں بھی عوام کی تقریباً یہی نہج رہی ہے اور اس طرح کی کئی مثالیں بیان کی جا سکتی ہیں، جن کا ذکر اپنے اپنے موقعہ پر وقت کی مناسبت سے آتا رہے گا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو شیخ مرحوم کی وفات سے قبل ہی سال 1981ء میں نیشنل کانفرنس کا صدر چن لیا گیا تھا لیکن ان کی وفات کے بعد ان کا وزیراعلیٰ بننا طے تھا اور ایسا ہی ہوا بھی۔

اگلے سال یعنی جون 1983ء میں ریاست میں عام انتخابات ہوئے جس میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی قیادت والی نیشنل کانفرنس کو پہلے انتخابات سے زیادہ ووٹ بھی ملے اور سیٹیں بھی، جبکہ اس وقت کے سیاسی مبصرین نے ان انتخابات کو پہلے کے مقابلے میں
آزادانہ بھی قرار دیا تھا، دیوان اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ فاروق عبداللہ کو ان انتخابات میں اچھی خاصی اکثریت ملی اور لوگوں کی حمایت بھی ان کے ساتھ تھی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سال 1984ء کے اوائل سے اخبارات میں اس قسم کی رپورٹیں آنا شروع ہو گئی تھیں کہ دلی والے ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے خوش نہیں ہیں اور وہ اس کے کابینہ ممبران کو خریدنے اور کوئی متبادل سرکار قائم کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ 2 جولائی 1984ء، اتوار کے دن، ڈاکٹر فاروق عبداللہ اپنے اہلِ خانہ اور فلم ایکٹریس شبانہ اعظمی کے ہمراہ چند گھنٹوں کی تفریح کے لئے گلمرگ چلا گیا اور انہی چند گھنٹوں میں ان کے بہنوئی خواجہ غلام محمد شاہ کو ریاست کا نیا وزیراعلیٰ بنا لیا گیا، مسٹر شاہ این سی کے چند ساتھیوں کے ہمراہ انڈین نیشنل کانگریس کے ریاستی یونٹ کے ساتھ جا ملے اور اس طرح ایک ''گٹھ بندھن''

(مخلوط) سرکار بنا کر ڈاکٹر فاروق کو باہر کر دیا گیا''

اس موقعہ پر چلتے چلتے یاد آیا کہ سابق صدر ریاست اور موجودہ ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر کرن سنگھ اپنی سوانح حیات ''Heir Apprant'' (سفرِ حیات، اردو) میں سال 1953ء میں شیخ محمد عبداللہ کی برخواستگی اور گرفتاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کہ ان کو بھی گلمرگ کے ایک گیسٹ ہاؤس سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا، اس طرح سے اب تک شیخ خاندان کے لئے گلمرگ کی سیاحت کے ساتھ کافی مصیبتیں بھی جڑی ہوئی ہیں، ڈاکٹر کرن سنگھ لکھتے ہیں:

''...اور ہوا بھی ایسا ہی، ہماری دعائیں کام آئیں، شیخ کو بدلتے حالات کا کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ اپنے اقتدار میں اتنا مغرور تھا کہ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کوئی اسے للکارنے کی ہمت بھی جٹا سکتا ہے، جب اے ڈی سی اور پولیس پارٹی بالا آخر گلمرگ پہنچ گئی تو رات بہت بیت چکی تھی، شیخ اور بیگم عبداللہ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے، کچھ مشکلات اور بہت زیادہ دروازہ کھٹکھٹکانے کے بعد اس کے ہاتھ میں خط اور گرفتاری کا وارنٹ تھما دیا گیا، اس کو پڑھ کر وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور چلانے لگا 'یہ صدرِ ریاست مجھے برخواست کرنے والا کون ہوتا ہے، اس چھوکرے کو میں نے صدرِ ریاست بنا دیا ہے'...لیکن تب تک پولیس نے اس مکان کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا تھا، اسے دو گھنٹے کا وقت دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ نماز پڑھے اور بسترہ گول کرے، بعد میں میں نے سُنا کہ اس دوران اس نے کئی دستاویز جلا ڈالے، جو اس نے اپنے ساتھ رکھے تھے۔ اس کو روک بھی لیا گیا ہوتا لیکن ہم نے پولیس کو کڑی ہدایت دے رکھی تھی کہ اس کے اور بیگم کے ساتھ بڑی تعظیم کے ساتھ پیش آنا چاہیے اور کسی طرح بھی کوئی زور زبردستی نہیں کی جانی چاہیے، 9/اگست (1953) کو علی الصباح کار میں بٹھا کر ادھمپور کے تارانواس گیسٹ ہاؤس لیجایا گیا اور وہاں نظر بند کر دیا گیا، ایم اے بیگ اور ان کے کچھ ساتھیوں کو بھی اسی رات وادی کے مختلف علاقوں سے گرفتار کر لیا گیا'' (سفرِ زندگی۔ ڈاکٹر کرن سنگھ، صفحہ نمبر ۲۹۹)

تاریخ خود کو دہراتی ہے اور یہی کچھ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ بھی 1984ء میں اس وقت ہوا جب وہ شبانہ اعظمی کے ساتھ گلمرگ میں موجود تھے، انھیں تو خیر گرفتار یا نظر بند نہیں کیا گیا لیکن یوسف شاہ چک کی طرح اپنے ہی بہنوئی (بہیقی) کی طرح غلام محمد شاہ نے انھیں اقتدار سے الگ کر دیا

گیا،مرحوم شاہ اپنی اس Trick کو بعد میں کشمیری محاورہ ''وٹہ کھوُر'' (ٹانگوں میں ٹانگ پھنسا کر پہلوان کو گرانا) سے تعبیر کرتے تھے اور اپنی اس 'حکمتِ عملی' پر اترایا بھی کرتے تھے۔

بہر حال ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی گرفتاری کے وقت حکومت کو بخوبی علم تھا کہ اس کے ردِعمل میں عوام کا غم وغصہ پھوٹ کر باہر آئے گا اس لئے کسی قسم کے امکانی دھنگوں سے نمٹنے کے لئے پہلے سے ہی نیم فوجی دستوں کو شہر سرینگر اور کچھ بڑے قصبہ جات میں تعینات کر دیا گیا تھا،لیکن چونکہ نیم فوجی دستے وادی میں وافر مقدار میں موجود نہیں تھے اس لئے 2 جولائی کو نافذ ہونے والا کرفیو سیکریٹریٹ کے جموں منتقل ہونے (آخر اکتوبر) تک جاری رہا اور کشمیر میں پہلی بار لوگوں نے اتنے بڑے پیمانے پر کرفیو کی سختیاں اور فوجی دستوں کا گشت دیکھا،اس دوران عجیب عجیب سیاسی فتنے بھی دیکھنے کو ملے ڈاکٹر فاروق اور غلام محمد شاہ کے حامی اپنی اپنی محفلوں میں ایک دوسرے کے خلاف زہر افشانی کرتے وقت گندی اور غلیظ گالی گلوچ کا سہارا بھی لیتے دیکھے گئے، یہ فراموش کرتے ہوئے کہ دونوں کا آپس میں انتہائی نازک اور حساس رشتہ ہے،شاہ کے حامی فاروق عبداللہ کو ''فاوق ڈسکو'' کہتے جبکہ فاروق کے حامیوں نے شاہ کو ''غلہ کرفیو'' کا نام دے رکھا تھا ہم ان دنوں کافی چھوٹے تھے لیکن اس کے باوجود میں نے نیشنل کانفرنس کے کئی جلسوں میں مقررین کو ایک دوسرے کے خلاف گالیاں بکتے سنا اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار فاروق عبداللہ نے جلسے میں کہا'' شاید آپ لوگ یہ بات بھول جاتے ہو کہ غلام محمد شاہ کی بیگم (خالدہ شاہ) میری ہمشیرہ ہے،اس لئے کم از کم میرے سامنے اس کو برا بھلا نہ کہا کریں...'' لیکن کشمیری روایات کا تقاضہ تھا کہ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رکھا جائے اور یہ جاری رہا بھی،اس دوران غلام محمد شاہ نے نیشنل کانفرنس کے اپنے حصے کا نام ''نیشنل کانفرنس خالدہ'' رکھا تھا۔ جو 1986ء کے وسط تک جاری رہا اور اسی دوران ایک بار پھر کانگریس نے شاہ کی سرکار سے دامن چھڑا کر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو وزیر اعلیٰ بنا دیا اور مخلوط حکومتوں کا سلسلہ جاری رہا تا آنکہ مسلم متحدہ محاذ کے نام سے ایک نیا اور انقلابی سیاسی محاذ سامنے آیا۔

پریز دیوان کشمیر میں بھارت مخالف رجحان اور نفرت میں اضافے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ریاست میں منتخبہ حکومتوں کو اس طرح سے گرانے اور اپنی مرضی کی سرکاریں تعینات کرنے کی وجہ سے بھی کشمیریوں کے دلوں میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ حکومت ہند کو نہ تو ان کی رائے کا احترام ہے اور نہ ہی ان کے جذبات کا۔

ڈبل فاروق بنام مسلم متحدہ محاذ!

تاریخ کشمیر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا یا اس کے سربستہ اسرار سے پردہ ہٹانے کی جسارت کرنا کسی ہزار سالہ عفریتِ خفتہ وخوفناک کو جگانے کے مترادف ہے۔ اگرچہ میں نے تاریخ کشمیر کو کبھی بھی باضابطہ طور کسی سکول یا کالج میں نہیں پڑھا اور نہ ہی یہ کبھی میرا مضمون رہا لیکن اس دھرتی کا باشندۂ غمخوار اور عاشقِ گرفتار ہونے کی وجہ سے یہ مضمون ہمیشہ میری توجہ اور دلچسپی کا مرکز رہا ہے اور شائد مضامین کا رواں سلسلہ بھی اسی محبت اور رشتے کا نتیجہ ہے اور اسے کسی تکمیل تک پہنچانے کے لئے میں گویا بضد سا ہو کر رہ گیا۔ اس موضوع کی سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ کشمیر میں کبھی بھی تاریخ ان بنیادوں یا معیاروں پر نہیں لکھی گئی، جسے حوالہ جات کے حوالے سے مستند اور حرفِ آخر قرار دیا جا سکے، اس سلسلے میں مجھے کشمیر کے سربرآوردہ محقق اور مورخ، پروفیسر فدا محمد حسنینؔ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ تاریخ نویسی میں کوئی بھی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی اور مورخ واقعات کو اپنی اپنی نظر سے دیکھتے اور اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق لکھتے ہیں۔ اس سے پہلے میں مضامین کے اس سلسلے کے حوالے سے کافی پریشان بھی تھا کہ اگر کوئی واقعہ صحیح طریقے سے بیان نہ ہوا ہو یا کوئی اہم واقعہ رہ گیا ہو تو شائد وقت کے محققین اس کے لئے مجھے موردِ الزام ٹھہرائیں کیونکہ میں تاریخِ کشمیر میں پائے جانے والے بہت سارے کنفیوژن کو زلفِ یار سمجھ کر سلجھانا چاہتا تھا لیکن مجھے لگا کہ دراصل یہ زلفِ یار، ستم گار دوستوں کی وجہ سے افریقہ کا ایسا گھنا اور خوفناک جنگل بن چکا ہے، جس میں بھٹک جانے والے مسافروں کو کبھی بھی باہر آنے کا راستہ نہیں ملتا۔ ماضی بعید یا قریب کی بات کرنا بے وجہ ہوگا کیونکہ ان زمانوں میں نہ تو وسائل ہوتے تھے اور نہ ہی تعلیم کا وہ میعار ہوتا تھا جو اس دور میں ہے۔ کسی مورخ یا محقق کو ساری زندگی سرگرداں رہنا پڑتا تھا اور تب جا کر وہ کوئی شاہکار منظر پر لا سکتا تھا۔ آج کے زمانے میں انٹرنیٹ نے یہ کام اتنا آسان بنا دیا ہے کہ ایک رات میں کوئی بھی محقق ایک کتاب کے لئے مواد اکٹھا کر سکتا ہے اور ایک طالب علم ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے سکتا ہے، اس لئے اس زمانے میں تاریخ کا باب کم از کم کافی شفاف ہونا لازمی تھا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس زمانے میں بھی بعض مورخین اور قلمکاروں نے اسے روزی روٹی

کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور اس میں پائی جانے والی خامیاں برابر اپنی جگہ قائم ہیں۔

کشمیر میں جاری موجودہ جدوجہد جسے بعض مورخین تحریکِ آزادی قرار دے رہیں، بعض اسے اسلامی جہاد قرار دیتے ہیں اور بعض اسے کھلے بندوں دہشت گردی، افراتفری اور پاکستان کی سرپرستی میں جاری کشمیر کو غصب کرنے کی سازش قرار دیتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں جب کوئی محقق یا مورخ ہمارے حوالہ جات کو بنیاد بنا کر کشمیر کی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ کس نتیجے پر پہنچے گا اور اس کی اپنی قوم کے بارے میں کیا رائے ہوگی؟

سابقہ قسط میں یہ پتہ چلا تھا کہ سال 1987ء تک آتے آتے کشمیر کے سیاسی حالات اتنے حساس اور نازک ہوگئے تھے کہ خود دلی میں بیٹھے ہوئے پالیسی سازوں اور سراغرسانوں کو بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا مقابلہ کیسے کیا جائے، سال 1984ء میں نیشنل کانفرنس حکومت کے دورِ اقتدار میں جب کشمیر کے مزاحمتی قائد مقبول بٹ کو دلی کے تہاڑ جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تو کشمیر کے اکثر قائدین (جو کہ آج تحریک آزادی کی صفوں میں شامل ہیں) نے ۱۱ فروری کی ہڑتال کی مخالفت کرتے ہوئے شہید بٹ کو ''بھارتی ایجنٹ'' اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر یاد کیا تھا...لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اگلے چند برسوں میں وہ پاکستان، جس نے بٹ اور اس کے ساتھیوں کو بھارتی آلہ کار سمجھ کر جیل بھیج دیا تھا، وہی پاکستان اس بات پر آمادہ تھا کہ اگر کشمیر میں بھارت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کرنا ہے تو اس کے لئے صرف جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے لڑکوں کو ہی ہتھیار فراہم کئے جائیں اور اس کام میں کوئی بھی ایسی جماعت شامل نہ ہو، جو پاکستان نواز سٹینڈ رکھتی ہو، خاص طور پر جماعتِ اسلامی وغیرہ کو (ابتداء میں شائد) پاکستان اس لئے دور رکھنا چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے دنیا پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرائے گی۔ اور یہ بھی تاریخِ کشمیر کا ایک اور کنفیوژن تھا، جسے سمجھنے کے لئے اس وقت نہ تو قیادت کے پاس وقت تھا اور نہ ہی وہ تیزی کے ساتھ بدلتے حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھی۔

اسی دوران سال 1987ء میں کشمیر کی تاریخ میں ایک اور ایسا باب رقم ہوا، جس نے پوری تاریخ کو ہی بدل کر رکھ دیا، کانگریس اور نیشنل کانفرنس پہلے ہی راجیو فاروق ایکارڈ کی رو سے ایک دوسرے کے کافی قریب تھیں جبکہ اس اتحاد میں ایک اور باب اس وقت رقم ہوا، جب شیخ خاندان کے قدیم اور روائتی حریف میر واعظ مولوی محمد فاروق نے نیشنل کانفرنس کے صدر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ ہاتھ ملا کر ''ڈبل فاروق'' کے نام سے ایک اور سیاسی محاذ قائم کیا اور کئی ایسی تنظیموں کے محاذ اور اتحاد ''مسلم متحدہ محاذ'' کے خلاف لڑنے کا اعلان کر دیا، جو کشمیر کی سیاست میں ایک نیا باب رقم کرنے کے

لئے سامنے آرہا تھا۔ مسلم متحدہ محاذ کے لئے اگر چہ اس وقت 'اسلامک سٹوڈنٹس لیگ نے 'بنیاد' کا کام کیا لیکن اس محاذ میں ریاست کی سب سے بڑی علیحدگی پسند اور سخت گیر جماعت ، جماعتِ اسلامی کے علاوہ جنوبی کشمیر میں ڈاکٹر قاضی نثار احمد کی قیادت میں تبلیغی کام میں مصروف امت اسلامیہ کے علاوہ عبدالغنی لون کی پیپلز کانفرنس، مولانا عباس انصاری کی اتحاد المسلمین، اسلامک سٹوڈنٹس لیگ، پروفیسر عبدالغنی کی مسلم کانفرنس وغیرہ شامل تھیں تاہم ISL کے قائد شکیل احمد بخشی کا کہنا ہے کہ انھیں حکومت نے سال 85ء میں کشمیر یونیورسٹی میں مزاحمتی طلباء کی قیادت کرنے کی پاداش میں گرفتار کرلیا اور درمیان میں چند ماہ اگر چہ رہائی ملی لیکن جولائی 86ء میں دوبارہ گرفتار کرکے جیل بھیج دیا، اس وقت ان کے پیچھے محمد یاسین ملک اور شکیل بخشی وغیرہ نے یہ کام جاری رکھا اور انھوں نے ہی مف کی بنیاد رکھنے میں بھی اہم رول ادا کیا لیکن اس کے لئے سب سے پہلے جماعتِ اسلامی نے پہل کی ۔ جماعت والے سبھی این سی مخالف تنظیموں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے ایک مشترکہ محاذ کے لئے کوششیں کیں، ان کا اصرار تھا کہ اگر کوئی دوسرا ان کے ہمراہ نہ چلا تو وہ اکیلے ہی این سی کے ''غنڈہ ازم'' کے خلاف میدان میں اتریں گے۔ اس وقت چونکہ ماحول سازگار تھا، اس لئے سبھی یکساں سوچ رکھنے والے قائدین اور جماعتیں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آنے کے لئے تیار ہوگئیں، شکیل کے مطابق ان کی جماعت ISL کو 1987 کے انتخابات میں پانچ حلقوں میں الیکشن لڑنے کی پیشکش کی گئی لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ اس دوران ڈبل فاروق' 'اتحاد کے تین شرکاء ڈاکٹر فاروق عبداللہ، مولوی فاروق اور کانگریس (غلام رسول کار) نے وادی کی سبھی سیٹوں پر دوستانہ اور مشترکہ الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ عوامی ایکشن کمیٹی کے امیدوار سرینگر کی دونشستوں پر مف کے خلاف میدان میں اترے حالانکہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کو چار حلقوں میں مینڈیٹ ملے گا لیکن بعد میں انھیں صرف دو ہی نشستوں پر لڑنے کی اجازت ملی (شبنم قیوم) ان میں پیر محمد شفیع نے حلقہ زڈی بل سے اور محمد شفیع خان نے حلقہ عید گاہ سے انتخاب لڑا اور جیتا بھی۔ جبکہ یہی وہ الیکشن تھا جس میں محمد یوسف شاہ (عرف سید صلاح الدین) نے بھی امیرا کدل حلقۂ انتخاب سے الیکشن لڑا، ان کے حامیوں اور مددگاروں میں محمد یاسین ملک بھی شامل تھے۔ جبکہ یہ بات بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ اس الیکشن میں اس وقت کے سابق وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد شاہ نے بھی مف کے ساتھ اتحاد کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے مسلم متحدہ محاذ کے کئی جلسوں میں تقریریں بھی کیں لیکن وہ اس میں شامل ہونے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

۴ مارچ ۱۹۸۷ء کو مسلم متحدہ محاذ کا پہلا جلسہ، جو ہم نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سُنا،

اقبال پارک کے میدان میں منعقد ہوا، اس جلسے سے سید علی گیلانی، پروفیسر عبدالغنی بٹ اور ڈاکٹر قاضی نثار احمد نے خاص طور پر خطاب کیا اور یہ ساری تقریریں کافی تیز اور دھواں دار تھیں، اسی جلسے میں کفن بردار بھی رونما ہوئے تھے اور اس کے بعد وادی میں مف کے جلسہ وجلوس کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ساری فضاء بدل کر رہ گئی۔ ان جلسوں اور جلوسوں میں نوجوانوں کی شرکت بڑے پیمانے پر ہوئی کیونکہ اس دوران ایک لہر یہ چلی تھی کہ اب کی بار کشمیر کی سیاسی فضاء سے روائتی سیاستدانوں کی جڑیں اکھاڑ دی جائیں گی اور کشمیر میں عوام کی مرضی کی ایسی سرکار وجود میں آئے گی، جس کی بنیاد میں اسلام اور کلمۂ طیبہ ہوگا، چونکہ اس طرح کے جذبات پہلے سے فضاء میں موجود تھے اور مسئلہ کشمیر کی متنازعہ حیثیت کے حوالے سے پہلے سے ہی اخباروں میں بھی خبریں شائع ہورہی تھیں لہذا نوجوانوں کی نظریں اس بات پر تھیں کہ شائد کشمیر سے کم از کم روائتی اور خاندانی راج کا خاتمہ ہوجائے گا اور چونکہ مف کی ساری قیادت مسلم نظریات کی حامل تھی اور کشمیر کے مسئلہ کو متنازعہ مانتی تھی، اس لئے نوجوانوں نے اس اتحاد کے ساتھ خود کو منسلک کرلیا جبکہ اس سے قبل ہونے والے انتخابات میں دلی والوں کی مداخلت اور صرف دوسال کی مدت میں فاروق عبداللہ اور غلام محمد شاہ کی حکومتوں کو برخواست کرکے مرکز نے ایک واضح سگنل دیا تھا کہ وہ کشمیر میں جمہوریت کے اصولوں سے بالاتر ہوکر اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کا واحد مقصد اس ریاست کی خصوصی پوزیشن کو ختم کرکے اسے بھارت میں پوری طرح سے ضم کرنا ہے لہذا اس ساری صورتحال کے پیشِ نظر مف کشمیری نوجوانوں کی 'مسیحا تنظیم' بن کر سامنے آئی تھی۔

بقولِ پرویز دیوان: ''مسلم متحدہ محاذ کو وادی میں تقریباً تمام این سی اور کانگریس مخالف ووٹ ملے، اس لئے یہ انتخابات کافی حد تک منصفانہ اور شفاف طریقے سے ہوئے لیکن...اس کے باوجود مف کو صرف چار سیٹوں پر کامیابی ملی...اس نے ان انتخابات کے حوالے سے کافی شکوک وشبہات پیدا کئے۔ اس وقت بھارت نواز مبصرین نے اس حوالہ سے جو تبصرے کئے، ان کے مطابق اگر این سی اور کانگریس کشمیر میں تمام کی تمام سیٹیں بھی ہار جاتیں، تو بھی ان کو اچھی خاصی اکثریت ملتی کیونکہ اس کے ردِ عمل میں جموں اور لداخ صوبوں میں ان دونوں کو ساری کی ساری نشستیں حاصل ہوگئی ہوتیں، دوسری طرف مف کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ انھیں کشمیر میں زیادہ سے زیادہ آٹھ سیٹوں پر کامیابی ملی ہوتی، جبکہ خود مف کے ہمدردوں کا بھی یہی خیال تھا کہ انھیں پندرہ نشستوں پر کامیابی مل سکتی تھی...اور اگر اسے بھی مان لیا جائے تو 76 نشستوں کی اسمبلی میں مف کی درجن بھر سیٹیں کیا گل کھلا سکتی تھیں، وہ نہ تو کشمیر کی سیاسی حیثیت کو بدل سکتی تھیں اور نہ ہی مسئلہ کشمیر کو حل کرسکتی تھیں، لیکن انھیں چونکہ

زبردستی ہرایا گیا اور یہاں تک بھی خبریں آئیں کہ محمد یوسف شاہ (صلاح الدین) اور کئی دیگر ممبران سے بندوق کی نوک پر دستخط کروائے گئے اور زبردستی ہار تسلیم کروائی گئی۔ جن چار لوگوں نے مف کے ٹکٹ پر اس الیکشن میں کامیابی حاصل کی، ان میں سید علی شاہ گیلانی، غلام نبی سمجھی، محمد سید شاہ اور عبدالرزاق میر شامل تھے۔ ان ارکان نے اگر چہ اسمبلی میں پہنچتے ہی کافی شور و ہنگامہ برپاء کیا لیکن وہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کے برابر تھا، مجھے یاد ہے، ایک بار وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اسمبلی اجلاس میں سید علی گیلانی سے مخاطب ہو کر کہا تھا '' میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ لوگ اس ایوان میں یہاں تک پہنچ پائیں....لیکن اب کسی نہ کسی طرح آپ چار لوگ یہاں تک آگئے ہو، اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ آپ خاموشی سے بیٹھیں اور اسمبلی کا کام کاج چلنے دیں''

سال 1987 میں ہونے والے اسمبلی انتخابات کے دوران کچھ ایسے لوگوں کو سخت دھچکہ لگا، جو سچ مچ کشمیر کی اس وقت کی صورت حال کو بدلنا چاہتے تھے، اگر چہ شکیل بخشی کہ یہ کہنا کہ اس الیکشن میں لوگوں نے الیکشن جیتنے اور حکومت بنانے کے لئے نہیں بلکہ این سی کا 'غنڈہ ازم' ختم کرنے اور خاندانی راج کے خاتمے کے لئے مف کو اپنی حمایت دی تھی، بھی اپنی جگہ درست ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوام نے اس الیکشن کو ایک ریفرنڈم کے طور لیا تھا اور اگر کشمیر کی ساری سیٹوں پر بھی مف کو کامیابی مل گئی ہوتی، تو بھی کوئی بڑا انقلاب برپاء ہونے کی امید نہیں تھی لیکن مرکزی حکومت اور ان کی مقامی حامی جماعتوں (این سی اور عوامی ایکشن کمیٹی) نے مل کر محض چند نشستوں پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے پوری فضاء کو بدل کر رکھ دیا اس کا سب سے برا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر کی اس نوجوان قیادت کو انتخابات اور جمہوری عمل سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہوگئی، جو بڑے جوش و خروش اور انقلابی جذبات کے ساتھ میدان میں اتری تھی۔

49

تحریکِ مزاحمت کاسنگِ بنیاد......!

تقسیم برصغیر کے بعد کشمیر میں کوئی بھی زمانہ یا عشرہ ایسا نہیں گزرا ہوگا، جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس دوران یہاں بھارت مخالف مزاحمت نہ رہی ہو، کسی نہ کسی شکل میں کشمیر میں علیحدگی اور مزاحمت کا عنصر موجود رہا، پھر چاہے وہ شیخ محمد عبداللہ کے محاذ رائے شماری کی شکل میں رہا ہو الفتح تحریک کی صورت میں رہا ہو یا اندرا عبداللہ ایکارڈ کے بعد مقبول بٹ کی طرف سے چلائی جانے والے جے کے این ایل ایف (بعد کی لبریشن فرنٹ) ہو یا پھر سال 1987 کے بعد شروع ہونے والی مسلح مزاحمت ہو۔ اگر چہ کشمیر کا ایک طبقہ بھارت کا ہمدرد، وفادار اور کاسہ لیس بھی رہا، اقتدار کے مزے لوٹتا رہا اور لوگوں نے بھی وقتاً فوقتاً اس طبقے کا ساتھ دیا لیکن اس کے باوجود عوام کے ایک اچھے اور بڑے طبقے نے متوازی طور پر بھارت مخالف سرگرمیاں جاری رکھیں اور قائدین کا ایک ٹولہ مزاحمت پر آمادہ رہا جو وقتاً فوقتاً جیل خانوں کی زینت بنتا رہا۔ اس مزاحمت کی بھی اپنی جگہ کئی وجوہات رہیں، جس میں سب سے بڑی اور سرِ فہرست وجہ یہ تھی کہ کشمیری عوام کے دل میں یہ کھٹکا ہمیشہ موجود رہا کہ بھارت ریاست جموں وکشمیر کی مسلم شناخت اور اکثریتی تشخص کو ختم کر کے اسے بھی باقی ریاستوں کی طرح ایک ریاست بنانے کے درپہ ہے اور اس کی متنازعہ حیثیت کو ختم کر کے اسے بھارت میں پوری طرح سے ضم کر دینا چاہتا ہے۔ مرکزی حکمران جس طریقے سے کشمیر میں انتخابات میں دھاندلیاں کرتے رہے اور اپنی مرضی کی حکومتیں تھوپتے رہے، حکمرانوں کو اپنا آلۂ کار بنا کر حسبِ ضرورت استعمال کرتے رہے اور ضرورت ختم ہو جانے پر انھیں قید و بند کی سختیوں سے دوچار کرتے رہے، اس رجحان نے کشمیر کی نوجوان نسل کو کبھی بھی سکون سے نہیں رہنے دیا اور اندر ہی اندر ایک لاوا کبھی دھیمی آنچ پر اور کبھی بڑے ابھال کے ساتھ پکتا رہا حتیٰ کہ 87ء کے انتخابات تک پہنچتے پہنچتے اس نے حتمی اور دھماکہ خیز صورت اختیار کر لی لیکن مسلم متحدہ محاذ نام کا یہ اتحاد کسی اچانک پیدا ہو جانے والے انقلاب کا نام نہیں تھا بلکہ 1947ء سے 1987ء تک کے چالیس سال تک کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی سیاسی نا انصافیوں اور سماجی نا برابریوں کے ایک لگاتار سلسلے کے نتیجے میں سامنے آنے والا ایک ایسا ردِ عمل تھا، جو اپنے عروج کو پہنچ چکا

تھااور ساری فضاء کو بدل دینے پر آمادہ تھا۔ پچھلی قسط میں MUF کی تاریخ پر جو سرسری نگاہ ڈالی تھی، اس کے کئی پہلو سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں اور یہ چونکہ ماضی قریب کی تاریخ ہے اس لئے اس کے چشم دید گواہ اور وہ لوگ، جن سے یہ منسوب ہے، اکثر و بیشتر ابھی تک بقیدِ حیات ہیں، حالانکہ ہر واقعہ کے بارے میں لوگوں کی اپنی اپنی رائے اور نظریہ ہے لیکن کوشش یہ ہونی چاہیے کہ واقعات کی ترتیب اور ہیئت برقرار رہے اور آنے والے طلباء اور محققین کسی تذبذب کا شکار نہ ہوں (حالانکہ اس بات کا بہت احتمال ہر صورت میں باقی رہے گا، خاص طور پر کشمیر کے حوالے سے، کشمیر میں ایک عجیب سا رجحان یہ بھی رہا ہے کہ سیاستدانوں نے ہر دور میں اس چیز کو اپنے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے، جس کا تعلق عوام کے جذبات اور حمائت کے ساتھ ہو، اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ اس وقت وہ نیشنل کانفرنس بھی خود کو 'تحریک نواز' اور ''حریت پسند'' قرار دے رہی ہے اور ریاست کی خود مختاری کا مطالبہ کر رہی ہے، جس کے بانی (شیخ محمد عبداللہ) نے اپنے دورِ اقتدار میں کئی مرتبہ بھارت کی مرکزی حکومتوں کے ساتھ کشمیر کے حوالے سے ایکارڈ اور معاہدے کئے اور یہ سلسلہ راجیو فاروق ایکارڈ تک جاری رہا لیکن اس وقت چونکہ عوام نے ان سبھی معاہدوں اور ایکارڈوں کو مسترد کر دیا ہے، اس لئے این سی ریاست کی اندرونی خود مختاری کی صورت میں اپنی 'تحریک نوازی' کا دعویٰ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہی حال عوامی نیشنل کانفرنس نامی ایک تنظیم کا بھی ہے، جس کی بنیاد سابق وزیر اعلیٰ غلام محمد شاہ نے ڈالی اور اس وقت ان کے صاحبزادے اور بیگم صاحبہ اسے چلا رہی ہیں۔ حالانکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ غلام محمد شاہ نے MUF کے وجود میں آنے کے بعد ایک آدھ کوشش ضرور کی تھی کہ انھیں مف کے سٹیج پر آنے اور تقریر کرنے کا موقعہ دیا جائے لیکن ایسا کوئی موقعہ نہیں آیا اور نہ ہی انھیں اس کی اجازت ملی لیکن ان کی وفات کے بعد شاہ کے ورثاء اور ارکانِ جماعت نے بڑے فخر سے شہر میں بڑے بڑے اشتہار (Hordings) لگائے جن پر یہ لکھا گیا کہ (بقولِ ان کے) مرحوم مسلم متحدہ محاذ کے بانی تھے۔ اس سلسلے میں عوامی نیشنل کانفرنس کی جانب سے شہر کی ایک دیوار پر چسپاں اس اشتہار، جس کا عنوان تھا ''حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا'' کے متن میں درج تھا ''....سہ فریقی مذاکرات کا پہلا نعرہ بلند کرنے والے قائد اور مسئلہ کشمیر کے پرامن اور باوقار حل کی خاطر انٹرا کشمیر کانفرنس کی تجویز دینے والے دور اندیش رہنماء، جنھوں نے ریاست میں عدل و انصاف پر مبنی حکومت کی بنیاد ڈالی، کو ہمارا خراجِ عقیدت، پوری قوم کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کرنے اور مسلم متحدہ محاذ کے بانی ممبر کو ہمارا سلامِ عقیدت..'' اس ہورڈنگ میں درج عبارت کا جائزہ لیا جائے تو سوائے اس کے کہ مرحوم شاہ نے ' '

نٹرا کشمیر کانفرنس' کی تجویز پیش کی تھی، باقی سب بے بنیاد ہے (یا پھر اس کے لئے اور بھی کسی موزون لفظ کا استعمال کیا جاسکتا ہے) لیکن اس وقت کشمیر میں صورت حال یہ ہے کہ کسی بھی تحریر کا فوری اور سنجیدہ نوٹس لیا جاتا ہے اور اس کا جواب بھی دیا جاتا ہے۔ سرینگر سے شائع ہونے والے ماہانہ انگریزی میگزین 'Honour'' نے اپنے مارچ ۲۰۱۰ء کے شمارے میں اس ریکارڈ کو درست کرتے ہوئے اپنے ایک کالم "Putting the record straight" میں اس کا اچھا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

''مسلم متحدہ محاذ کا قیام جنوبی کشمیر کے ضلع اسلام آباد میں جماعتِ اسلامی اور ڈاکٹر قاضی نثار احمد کی جماعت 'امتِ اسلامی' کی طرف سے اس وقت ایک علاقائی فورم کے طور پر عمل میں لایا گیا، جب اس وقت کے گورنر جگموہن نے ہندو تہواروں کے موقعہ پر کشمیر میں گوشت کی خرید وفروخت پر پابندی عائد کرکے مسلمانانِ ریاست کا قافیہ حیات تنگ کردیا تھا۔ 1986ء میں غلام محمد شاہ کی حکومت کو برخواست کرنے کے بعد گورنر جگموہن کی کشمیر دشمن اور مسلم دشمن پالیسیاں اور زیادتیاں عروج پر پہنچ چکی تھیں، انھوں نے کشمیر میں بے تحاشہ شراب فروشی کی اجازت دے دی اور ہندو تہواروں پر گوشت کے جانور مارنے پر پابندی عائد کردی (حالانکہ کشمیری پنڈت بھی گوشت خور تھے) گورنر کے ان اقدامات نے مختلف مذہبی اور سماجی فرقوں اور گروہوں کو متحد کردیا اور انھوں نے مسلم اکثریت والی اس ریاست میں گورنر کے ظالمانہ اقدامات کے خلاف مزاحمت کا تہیہ کرلیا۔ قاضی نثار مرحوم نے ان پابندیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جنم اشٹمی کے موقعہ پر قصبے میں اپنے ہاتھوں سے دو بھیڑ ذبح کئے... اس کے چند دن بعد مسلم متحدہ محاذ کا سنگِ بنیاد رکھا جاچکا تھا۔ مرحوم قاضی نثار احمد اور اس وقت کے قیمِ ضلع جماعت اسلامی، اسلام آباد شیخ محمد حسن (موجودہ امیرِ جماعت اسلامی جموں وکشمیر) اس محاذ کے بانی ممبران تھے....'' یہ وہی زمانہ تھا، جب ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے پہلے راجیو گاندھی کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا اور بعد میں میر واعظِ کشمیر مولوی محمد فاروق کے ساتھ ...اور مسلم متحدہ محاذ کے خلاف الیکشن لڑا۔ نئی دلی والوں نے جگموہن کو واپس بلا لیا، جبکہ راجیو فاروق ایکارڈ کو بھی مسلمانان ریاست نے اپنے لئے ایک اور 'توہین' کے طور پر لیا کیونکہ اس سے صرف تین سال

قبل اسی کانگریس نے فاروق عبداللہ کو اتار کر غلام محمد شاہ کی حکومت قائم کی تھی۔ جماعت اسلامی نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے کانگریس اور این سی کے خلاف عوام میں پیدا ہونے والی نفرت کا فائدہ اٹھایا اور مف کا دائرہ ریاست گیر سطح پر وسیع کیا۔ مف کے جھنڈے کے نیچے اسمبلی انتخابات لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔'' آنزمیگزین کے مطابق ''...لیکن این سی اور کانگریس کے اتحاد نے ان انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلیاں کیں اور اس کو اپنے حق میں موڑ لیا، ایم یو ایف کے امیدوار، جو شاندار طریقے سے الیکشن جیت رہے تھے، کو یکا یک ہرا دیا گیا، ان کے ایجنٹوں اور کارکنوں کی مار پیٹ کی گئی، ان کو اذیتیں دی گئیں اور جیلوں میں بھر دیا گیا، ان میں محمد یوسف شاہ (جماعتِ اسلامی) بھی شامل تھا، جو امیرا کدل حلقہ سے الیکشن جیت رہا تھا لیکن اسے ہرا کر جیل میں ڈال یا گیا اور یہی یوسف شاہ بعد میں حزب المجاہدین کا چیف کمانڈر بن کر ابھرا اور کشمیر میں بھارت کے خلاف مسلح جنگ کا اعلان کیا، اس انتخابی دھاندلی نے کشمیر میں سیاسی نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا اور انتخابات کے بعد اس میں یہ اضافہ ہوا کہ عبدالغنی لون باضابطہ طور پر مف میں شامل ہو گئے اور مرحوم شاہ نے بھی اس کی کوشش کی (اور ایک آدھ جلسے سے خطاب بھی کیا) اگر چہ مف کی عمر زیادہ لمبی نہیں تھی لیکن اس کے اثرات آج بھی کشمیر کی سیاست پر بہت ہی گہرے دکھائی دے رہے ہیں، مف کے اکثر و بیشتر قائدین نے اسی کے ساتھ مین سٹریم سیاست کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ کر علیحدگی پسند محاذ میں داخلہ لے لیا اور کل جماعتی حریت کانفرنس کا حصہ بن گئے'' (آنزمیگزین/مارچ 2010/صفحہ نمبر ۹)

کشمیر کے سر کردہ صحافی رشید احمد کی ادارت میں شائع ہونے والے 'آنزمیگزین' کی مذکورہ بالا تحریر سے جہاں یہ بات سامنے آئی کہ کشمیر کی سیاسی قیادت حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ ایک طرف عوامی جذبات کا استحصال کرنے کے لئے کوئی بھی حربہ اختیار کر سکتی ہے اور خود کو ہر اس سچے یا جھوٹے واقعہ کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتی ہے، جس کا تعلق عوام کے جذبات کے ساتھ ہوتا ہے، وہیں یہ بھی کہ تاریخ کو اپنے حق میں موڑنے اور اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کا کوئی بھی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ مف کے قیام اور تاسیس کے حوالے سے جماعت اسلامی کے (سابق قیمِ ضلع اور موجودہ امیر) شیخ محمد حسن کا نام بھی سامنے آیا اس لئے مناسب تھا کہ ان کے ساتھ اس سلسلے

میں بات کی جائے اوران سے ان حالات کے بارے میں دریافت کیا جائے ،جن کی وجہ سے مف کی تشکیل ضروری بن گئی تھی اورمختلف نظریات رکھنےوالی قیادت میں اتحاد پیدا ہوگیا،اس سلسلے میں شیخ غلام حسن کے ساتھ رابطہ قائم کیا تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے کچھ بتانے سے معذرت کی کہ ان کا حافظہ کافی کمزور ہوگیا ہے اور انھیں واقعات کی ترتیب اورصورت حال کا صحیح نقشہ بیان کرنے میں کافی دشواری آرہی ہے البتہ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ سابق امیر جماعت غلام محمد بٹ بھی اس ساری صورت حال کے چشم دید گواہ ہیں اور وہ اس بارے میں زیادہ بہتر طریقے سے بتا سکتے ہیں۔(باقی اگلی قسط میں...)

☆☆☆☆☆

50

تحریک مزاحمت کا سنگِ بنیاد.......2

مسلم متحدہ محاذ کے قیام اوران وجوہات کے بارے میں، جن کی وجہ سے ایک سیاسی محاذ بعد میں مزاحمتی اتحاد میں تبدیل ہوگیا اور اِس وقت تک حریت کانفرنس کے کئی دھڑوں اور دیگر علیحدگی پسند تنظیموں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، جب میں نے سابق امیر جماعت اور محاذ کے بانی قائد جی ایم بٹ سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے واقعات پر سے ایک ایک کر کے کچھ اس طرح سے پردہ ہٹایا:

> ''سرکاری ملازمین کی تنظیم مسلم ایمپلائیز فرنٹ اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھی، حکومت نے پروفیسر عبدالغنی بٹ اور کچھ دیگر سرکاری ملازمین کو نوکریوں سے بے دخل کر دیا تھا اور اس فرنٹ کی سرگرمیاں چونکہ جاری تھیں اور انہی دنوں دوسری جانب جنوبی کشمیر کے اسلام آباد ضلع میں ڈاکٹر قاضی نثار احمد اور جماعتِ اسلامی کی حکومت مخالف سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں، لہٰذا ان سرگرمیوں کو ایک سمت اور جہت دینے کی غرض سے 'مسلم یونائٹڈ فرنٹ (MUF) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس میں جو لوگ سب سے پہلے شامل ہوئے، ان میں ویرے علاوہ قاضی نثار احمد کے علاوہ پروفیسر عبدالغنی بٹ، پروفیسر غلام قادر بچہ اور پروفیسر صراف بھی شامل تھے، میں چونکہ ان دنوں امیر جماعت اسلامی تھا اس لئے اس محاذ کی سرگرمیوں میں میرا اور میری جماعت کا اہم رول رہا۔ محاذ کا دستور میری ہی سربراہی میں تیار ہوا اور اس دستور کی منظوری کے لئے پروفیسر عبدالغنی بٹ کے آبائی گاؤں بوٹینگو میں ۱۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو محاذ کی ایک نشست بلائی گئی۔ دستور کی منظوری کے وقت ایک تجویز رکھی گئی کہ محاذ اسمبلی انتخابات میں حصہ لے گا، تجویز منظور ہوئی اور ہم نے انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا۔ خیال اور تصور یہ تھا کہ مسلم متحدہ محاذ نام کا یہ اتحاد ریاست میں روائتی سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں ہونے والے عوامی استحصال کے خلاف

ایک موثر اور متبادل سیاسی پلیٹ فارم کے طور ابھرے گا اور اسے ایک جمہوری شکل دے کر اس قابل بنایا جائے گا کہ یہ عوام کے مسائل اور مشکلات، خاص طور پر سیاسی اور سماجی نابرابری اور استحصال کا جائزہ لے کر اس کا حل نکالا جا سکے۔ لیکن انتخابات میں اس قدر دھاندلیاں کی گئیں کہ MUF کے سارے منصوبے چکنا چور ہو گئے، عوام نے ووٹ کسی کو دیئے لیکن کوئی اور ہی کامیاب ہو کر سامنے آ گیا اور حکومت پر قابض ہو گیا۔ پولنگ بوتھوں پر قبضہ کر لیا گیا، امیدواروں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا اور ان کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی گئیں۔ امیر ضلع سرینگر جماعت اسلامی، محمد یوسف شاہ، جو بعد میں سید صلاح الدین بن کر مسلح تحریک کا سالارِ اعلیٰ بنا، امیرا کدل حلقے سے اسی انتخاب میں بطور امیدوار شامل ہوا تھا۔ عین پولنگ کے روز میری گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی اور پروفیسر عبدالغنی بٹ کو بھی گرفتار کر لیا گیا، جماعت اسلامی کے صدر دفتر بٹہ مالو پر چھاپہ مارا گیا اور ہم سبھی کو گرفتار کر کے پہلے سینٹرل جیل سرینگر لے جایا گیا، وہاں سے مجھے ریاسی جیل میں بھیج دیا گیا اور باقیوں کو ہیرانگر جیل منتقل کر دیا گیا، اسی دوران جگموہن نے اسلام آباد ضلع میں ہندو تہواروں پر گوشت خوری پر پابندی عائد کر دی اور ڈاکٹر قاضی نثار احمد نے بھیڑ ذبح کر کے اس حکم نامے کی مخالفت کی اور یہ ایک ایشو بن گیا''

یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ سابقہ قسط میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ ڈاکٹر قاضی نثار احمد اور جماعتِ اسلامی جگموہن کے اس ڈکٹیٹرانہ حکم کے خلاف پہلے سے ہی سرگرم تھے اور اسی نے بعد میں مف کی شکل لے لی تھی، لیکن جی ایم بٹ، جو کہ اس وقت امیر جماعت اسلامی جموں وکشمیر ہونے کے ساتھ ساتھ ان سرگرمیوں میں خود بھی پیش پیش تھے، کے مطابق جگموہن کا یہ حکم نامہ اس وقت سامنے آیا، جب مف کے بعض ارکان انتخابات کے بعد گرفتار ہو کر مختلف جیلوں میں نظر بند تھے اور مسلم متحدہ محاذ کا وہ تجربہ کہ اسے ایک متبادل اور موثر سیاسی محاذ کے طور پر عوام کے مسائل کے حل کے لئے تیار کیا جائے گا، ناکام ہو چکا تھا اور کشمیر کے ان نوجوانوں، جنہوں نے انتخابات میں حصہ لے کر یہ توقع کی تھی کہ وہ اپنے مسائل اور استحصال کا کوئی حل جمہوری طریقے سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن این، سی، کانگریس اور عوامی ایکشن کمیٹی کے اتحاد نے یہ سارے منصوبے چکنا چور کر دیئے اور کشمیر میں سیاست، جمہوریت اور قانون کی اعتباریت پر سے عوام کا بھروسہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا اور جو

نوجوان کل تک ووٹوں کے لئے عوام کے پاس جارہے تھے، آج اسلحہ حاصل کرنے کے لئے سرحد عبور کرنے کی تیاری میں تھے۔ جی ایم بٹ نے اس حوالے سے مزید کہا:

''جمہوریت اور قانون پر سے بھروسہ ختم ہوجانے کی وجہ سے کشمیر میں مایوسی اور غصے کی لہر بری طرح سے دوڑ گئی اور اس نے نوجوانوں کو خاص طور پر سیخ پا کردیا، جس کی وجہ سے سیاسی راستہ اختیار کرنے والے تشدد کی راہ تلاش کرنے لگے، الیکشن سے قبل ہم سب کا زور اسی بات پر تھا کہ ہم الیکشن لڑ کر کامیاب ہوجائیں گے، چند ایک سیاسی تنظیموں کی اجارہ داری اور بالا دستی کو کم کیا جائے گا اور عوام کو ان کے جائز حقوق دلانے کے لئے پرامن طریقے سے قانونی طور پر کوششیں جاری رکھی جائیں گی اور چونکہ ایک عرصے سے کشمیری عوام اس بات کو شدت سے محسوس کررہے تھے کہ ان کے قانونی، جمہوری اور سیاسی حقوق کو صلب کیا جارہا ہے اور اس کی بڑی وجہ ریاست میں چند ایک روائتی اور سیاسی جماعتوں کی اجارہ داری اور من مانی تھی، اس لئے عوام کو ایک متبادل جمہوری اور سیاسی ڈھانچہ فراہم کرنے کی اشد ضرورت تھی اور اسی کے لئے ہم نے یہ کوششیں شروع کی تھیں، میں نے خاص طور پر اس دوران بار بار یہ بات کہی تھی کہ ہمیں کوئی بھی ایسی حرکت یا بات نہیں کرنی چاہیے، جس سے یہ پُرامن راستہ ایک پرتشدد خارزار میں بدل جائے، لیکن اس کے لئے خود اس وقت بھارت نے ایسے حالات پیدا کردیے۔ اس الیکشن میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ، مولانا محمد فاروق اور کانگریس کے غلام رسول کار ایک طرف تھے، جبکہ عبدالغنی لون نے بھی الیکشن لڑا لیکن وہ اس اتحاد سے باہر تھے۔ انہوں نے الیکشن سے قبل مف میں شمولیت کے لئے جو شرائط رکھی تھیں، ان میں یہ بھی شامل تھا کہ ان کو کافی سیٹیں دی جائیں لیکن میں نے کہا کہ ایسا ممکن نہیں ہے، حالانکہ ہم نے ان کو کافی رعایتیں دینے کا بھی فیصلہ کیا تھا لیکن وہ نہ مانے، ایک دن انھوں نے ہی فون پر کہہ دیا کہ ٹھیک ہے، مفاہمت نہیں کریں گے، میں نے اخبارات کے لئے ایک بیان جاری کردیا کہ لون صاحب کے ساتھ مفاہمت نہیں ہوپائی مگر کچھ دن بعد جب انتخابی عمل شروع ہوگیا اور سبھی امیدوار اپنے اپنے حلقے میں سرگرم ہوگئے تو لون صاحب نے الیکشن مفاہمت کی پیشکش کی لیکن میں نے کہہ دیا کہ اب ممکن نہیں ہے کیونکہ بگل بج چکا ہے اور اب

امیدواروں کو میدان سے واپس بلانا مشکل ہے۔ مجھے یاد ہے ان کی طرف سے میرے پاس صورہ میں شبنم قیوم بھی آیا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ لون صاحب آپ کے فامولہ پر مفاہمت کے لئے تیار ہیں لیکن میں نے کہہ دیا کہ اب کافی دیر ہوچکی ہے''

سابق امیر جماعت جی ایم بٹ کے ساتھ اس ٹیلی ملاقات میں تاریخ کشمیر کے کئی پہلو سامنے آرہے تھے اس لئے اس کو میں نے بھی جان بوجھ کر طوالت دی اور ان سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، سابقہ قسط میں یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ مرحوم لون اور غلام محمد شاہ نے مف میں شامل ہونے کی کوشش کی تھی مگر انھیں اس کی اجازت نہیں دی گئی لیکن اصل بات بٹ کے انٹرویو سے سامنے آرہی ہے کہ لون کو اجازت نہ دینے کی وجہ دراصل انتخابی نشستوں میں ان کو مطلوبہ حصہ نہ ملنا تھی اور اس حوالہ سے مف کے قائدین نے مرحوم لون کو کافی رعائت دینے کی بھی پیشکش کی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ لون اس محاذ سے الگ نہ رہیں لیکن لون کے مطالبات کی وجہ سے ایسا نہ ہو پایا اور جب لون کو اس بات کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنے نکتۂ نظر پر نظر ثانی کرنے کی حامی بھری اور اپنے ثالث مف کے پاس روانہ کئے، تب تک مف نے اپنے امیدواروں کو میدان میں اتار دیا تھا اور وہ سرگرم بھی ہو چکے تھے اور ایسے موقعہ پر کسی امیدوار کو واپس بلانا واقعی سیاسی دانشمندی نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے لون اس میں شریک نہیں ہوسکے۔ سرینگر کے اقبال پارک میں منعقد ہونے والے مف کے تاریخی جلسے کے بارے میں جی ایم بٹ نے کہا:

''الیکشن میں ہمیں ہرا دیا گیا اور جیلوں میں بند کردیا گیا...جب ہم لوگ بشمول قاضی نثار وغیرہ جیلوں سے رہا ہوئے تو ہم نے اسلام آباد میں داکٹر قاضی نثار احمد کو اس اتحاد میں شامل کرنے کے لئے کئی پیغامات ارسال کئے، وہ پہلے بعض وجوہات کی بنا پر اس کے لئے تیار نہیں تھے لیکن ایک دن اسلام آباد کے عیدگاہ میں ان کا ایک جلسہ تھا، ہم کئی لوگ، جن میں میرے علاوہ پروفیسر صراف اور پروفیسر بچہ وغیرہ شامل تھے، ان کے اس جلسے میں شامل ہوئے اور ان کو اس بات کے لئے تیار کیا کہ کل سرینگر کے اقبال پارک میں ہمارا ایک جلسہ منعقد ہورہا ہے اور انھیں اس میں شریک ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا ''میں ساٹھ گاڑیوں میں لوگوں کو لاؤں گا'' میں نے کہا'' آپ سو بسیں لائیے'' وہ راضی ہوگئے اور اگلے روز اقبال پارک میں ایک

بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا، جس میں لوگوں کی ایک ریکارڈ تعداد نے حصہ لیا۔ اس جلسے سے میں نے تقریر نہیں کی البتہ پروفیسر عبدالغنی بٹ، ڈاکٹر قاضی نثار احمد اور سید علی گیلانی نے خاص طور پر عوام سے خطاب کیا، اگرچہ اور بھی بہت سے مقررین تھے لیکن اہم تقاریر انہی لوگوں کی تھیں۔ اسی جلسے میں کفن بردار نوجوان ظاہر ہوئے اور یہیں سے سارا ''تماشہ'' شروع ہوا''۔

سابق وزیر اعلیٰ اور عوامی نیشنل کانفرنس کے سرپرست غلام محمد شاہ کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں بٹ نے کہا:

''وہ بانی ممبر نہیں تھے، البتہ انھوں نے الیکشن سے قبل ایک کوشش ضرور کی تھی، میں ان دنوں سعودی عرب میں تھا اور میری غیر حاضری میں یہاں ایک نشست ہوئی تھی لیکن یہ کامیاب نہیں ہوسکی، جب میں واپس آیا، انہی دنوں مولوی عباس انصاری کی والدہ کی وفات ہوگئی تھی، ہم وہاں تعزیت کے لئے گئے، قرآن خوانی ہورہی تھی کہ اسی دوران اچانک سب لوگ یہاں جمع ہوگئے، انھوں نے کہا کہ قوم کو اس وقت بہت سارے سیاسی مسائل درپیش ہیں اس لئے ہمیں بات کرنی چاہیے ...اور ہم نے بالائی منزل میں ایک ہنگامی نشست منعقد کرلی۔ نشست میں اتحاد کی تجویز رکھی گئی اور فیصلہ ہوا کہ سارے معاملات کا جائزہ لینے کی غرض سے مجلسِ شوریٰ کا اجلاس بلایا جائے، میں ان دنوں صورہ میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا، فیصلہ ہوا کہ وہیں ایک اجلاس بلایا جائے اور اس میں بحث ومباحثہ کے بعد کوئی حتمی فیصلہ لیا جائے۔ سردی کے ایام تھے، شام کے وقت اجلاس شروع ہوا اور دیر تک جاری رہا، مولوی عباس انصاری کے اصرار پر اس کی صدارت میں نے کی اور یہ فیصلہ لیا گیا کہ چونکہ الیکشن قریب ہے اس لئے اس وقت کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آرہا ہے لہذا الون اور شاہ کے ساتھ 'انتخابی مفاہمت' کرلینی چاہیے جبکہ انتخابات کے بعد ہی باضابطہ کوئی مشترکہ باڈی تشکیل دی جائے گی اور انتخابات کے انعقاد تک یہی فیصلہ برقرار رہا۔ لون انتخابات کے بعد مف میں آگئے لیکن شاہ نے اس کے بعد کوئی مزید کوشش نہیں کی''

مسلم متحدہ محاذ کے قیام، جو دراصل موجودہ تحریکِ مزاحمت کی بنیاد کا باعث بنا، کے حوالہ سے

غلام محمد بٹ کا مذکورہ انٹرویو اس لحاظ سے بھی کافی اہم ہے کہ وہ نہ صرف مف کے بانیوں میں شامل تھے بلکہ اس کے قائد اور روحِ رواں بھی تھے، ابتداء کی تقریباً سبھی نشستیں ان کی ہی صدارت میں منعقد ہوئیں اور انہی مجالس میں اہم فیصلہ جات بھی لئے گئے، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جماعتِ اسلامی اس سے قبل بھی باضابطہ طور جمہوری عمل میں شریک ہو چکی تھی اور انھوں نے کئی انتخابات میں اپنے امیدوار اتارے اور انھیں کامیابی بھی نصیب ہوئی تھی۔ اس جماعت کو مین سٹریم اور متحرک سیاست میں باقیوں سے زیادہ تجربہ حاصل تھا اور وہ اس بات کو اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ ریاست میں این سی اور کانگریس کی کئی دہائیوں پر مشتمل اجارہ داری کو ختم کئے بغیر یہاں کے نوجوانوں کے دل و دماغ میں پائی جانے والی بے چینی دور نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان کے جائز مطالبات کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ بٹ کے مذکورہ انٹرویو میں کہیں بھی یہ بات سامنے نہیں آئی کہ مسلم متحدہ محاذ کے قیام کا مقصد بھارت سے ریاست کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا تھا یا اس کو آگے چل کر عسکری تحریک میں بدلنا تھا بلکہ اس بات پر انہوں نے ضرور زور دیا کہ وہ چاہتے تھے کہ مف کے بینر تلے ایک ایسا سیاسی پلیٹ فارم بنے، جسے جمہوری شکل دے کر عوامی مسائل کا ازالہ کیا جا سکے، انہوں نے یہ بات بھی کہی کہ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ سلسلہ پر تشدد تحریک کی شکل اختیار کر لے اور نوجوانوں کا جمہوری عمل پر بھروسہ ختم ہو جائے۔ مجھے یاد ہے بٹ نے اس نمائندے کے ساتھ ماضی میں بھی کئی انٹرویوز کے دوران یہ بات دوہرائی ہے کہ جماعتِ اسلامی الیکشن کمیشن آف انڈیا کے پاس ایک رجسٹرڈ سیاسی جماعت ہے اور جمہوری عمل میں یقین رکھتی ہے۔ اس کا پاکستان کی جماعتِ اسلامی یا کسی دیگر علیحدگی پسند جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں البتہ جماعت مسئلہ کشمیر کو ایک حل طلب مسئلہ مانتی ہے اور اس کو حل کرنے کے لئے کشمیری عوام نے جو تحریک شروع کر رکھی ہے، جماعت خود کو اس سے الگ یا دور نہیں رکھ سکتی۔ یہ بات اس وقت بھی کھل کر سامنے آئی تھی جب سال 1995ء میں کولگام تحصیل میں جماعتِ اسلامی اور راشٹریہ رائفلز کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد ہوا (جس کی راقم نے عکس بندی اور رپورٹنگ کی) اس اجلاس میں جماعت کے سرکردہ ارکان نے حصہ لیا اور اس بات کو رد کیا کہ جماعت عسکری تنظیم ''حزب المجاہدین'' کا سیاسی بازو ہے بلکہ یہ الزام انہوں نے حزب کے اولین کمانڈر انچیف ماسٹر احسن ڈار پر عائد کیا اور کہا تھا کہ انہوں نے جماعت کے ارکان کے دلوں میں حزب کے لئے نرم گوشہ پیدا کرنے اور جماعت کو اس میں متحرک کرنے کے لئے یہ اصطلاح از خود تیار کی تھی، جس کی وجہ سے جماعت کے متعدد اہم، سینئر اور سرگرم ارکان حزب کے نام پر قتل کر دیئے گئے۔ ادھر اس سے قطع نظر ہلال احمد وار نے اپنی کتاب میں مف

کے بارے میں کچھ اس طرح سے مختصر سی تحریر درج کی ہے،

''اسلامک سٹوڈنٹس لیگ نے سید صلاح الدین کو اپنے امیدوار کی حیثیت سے حلقۂ امیرا کدل سے میدان میں اتارا،لیکن حکومت نے بڑے پیمانے پر انتخابی دھاندلیاں کیں اور اپنے ممبران کی شکست کو جیت میں بدل دیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیری نوجوانوں کا جمہوریت سے بھروسہ اٹھ گیا اور انہوں نے بندوق کا راستہ اختیار کر لیا،سید یوسف شاہ آگے چل کر سید صلاح الدین کے نام سے حزب المجاہدین کے پہلے کمانڈر انچیف بن گئے ،حزب المجاہدین ریاست میں سب سے بڑی اور طاقتور ملی ٹنٹ جماعت بن کر سامنے آئی ،جبکہ لیگ کے باقی ممبران یاسین ملک اور اشفاق مجید وانی نے بھی مسلح تحریک میں شمولیت اختیار کی اور آگے چل کر لبریشن فرنٹ نام کی دوسری بڑی عسکری جماعت کے بانی ممبران بنے''

51

مسلح تحریک کا آغاز

جب ایک مطلوقہ بہن کے زیورات بیچ کر دو پستول خریدے گئے!

کشمیر کے نوجوانوں کی طرف سے اپنے حقوق کی بحالی کے حق میں اور سماجی وسیاسی نابرابری کے خلاف شروع کی گئی وہ تحریک، جسے مسلم متحدہ محاذ کا نام دیا گیا تھا، کب اور کیسے ایک مسلح اور خونریز جنگ میں تبدیل ہوگئی، خود کشمیریوں کو بھی پتہ نہیں چلا۔ کشمیر کا مسئلہ 1947ء سے ہی متنازعہ چلا آرہا تھا، پاکستان کو اگرچہ اقوامِ متحدہ نے اپنی قراردادوں کی رُو سے 'حملہ آور' قرار دے کر یہ ہدایت بھی دے دی تھی کہ وہ اپنے زیرِ قبضہ علاقہ جات کو خالی کر کے ریاست میں 'رائے شماری' کے لئے ماحول سازگار کرنے میں اپنا رول ادا کرے لیکن اس کے باوجود وہ اوڑی سے لے کر کوہالہ تک اور میرپور سے لے کر گلگت بلتستان تک کے ایک وسیع وعریض اور زرخیز علاقے پر قابض رہا اور اس ملک کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی کہ وہ پوری ریاست جموں وکشمیر کو پاکستان کے ساتھ ملا کر اسے اپنا پانچواں صوبہ بنائے، اس کام کے لئے پاکستان کشمیر پر کئی بار براہِ راست حملے بھی کر چکا تھا اور پھر سے کسی ایسی کوشش کے انتظار میں تھا، جس سے اس کے مفادات کی تکمیل ہو سکے۔ کشمیر میں مسلم متحدہ محاذ کے بینر کے نیچے انتخابات لڑنے والے درجن بھر امیدواروں، جو کہ اپنی تقدیر کو بھارت سے الگ کئے بغیر کشمیر میں جمہوریت کی مکمل بحالی کے لئے سرگرداں تھے، کو ہرا کر بھارت نے پاکستان کو ایک نادر اور قیمتی موقعہ فراہم کیا، کشمیر کے نوجوان بھارتی طرزِ جمہوریت اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی وجہ سے اپنی حکومت اور اس حکومت کے نظام سے بالکل خائف تھے، وہ اپنے اندر کے غم وغصے اور ابھال کا مداوا چاہتے تھے، انھیں اس وقت ایک ہمدرد اور غمخوار دوست اور رفیق کی ضرورت تھی، جو ان کی بات سن کر ان کے غم وغصے میں شریک بن سکتا، جو ان کے اندر کی تکلیف کو محسوس کر کے اس کا کوئی علاج تجویز کرتا اور ان کی ہاں میں ہاں ملا کر ان کو اس تکلیف سے باہر نکالنے کی کوئی چارہ جوئی کرتا اور اس نازک وقت میں ان کے لئے پہلے سے تاک میں بیٹھے پاکستان سے زیادہ اچھا ہمدرد، رفیق اور غمخوار کون ہو سکتا تھا؟ اپنے سینے میں

ہزاروں زخم لئے، سیاست اور جمہوریت سے پریشاں کشمیری نوجوان جب عسکریت کی جانب مڑے تو پاکستان نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔انھیں سینے سے لگایا، ان کی مزاج پُرسی کی، ان کے زخموں پر مرہم رکھی اور ان کے منصوبوں اور ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے عہد و پیماں کئے۔قلم کاغذ اور MUF کا جھنڈا اٹھانے والے ہاتھوں میں اپنے دور کا سب سے خطرناک اور آتشیں اسلحہ (کلاشنکوف، اے کے ۴۷ اور اے کے ۵۶) آیا تو انھیں اپنا وجود ساتویں آسمان پر محسوس ہوا۔مغلوں کی آمد کے بعد کشمیری عوام نے ایک طویل اور اذیت ناک غلامی اور محکومی دیکھی تھی، یعقوب شاہ چک نے ہتھیار کیا چھوڑے کہ کشمیریوں سے کلہاڑی، درانتی اور چھری چاقو بھی چھین لئے گئے۔شہسوار اور جنگباز قوم کو خچر اور گھوڑے کی طرح بیگار اور سواری کے لئے ایک طویل عرصے تک استعمال کیا جاتا رہا تھا اور ان کے ضمیر اور عزتِ نفس کو مارنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی لیکن یہ وہ خاک تھی کہ جس کے ضمیر میں آتشِ چنار پوشیدہ تھی اور اس کا سرد ہونا ناممکن تھا البتہ اسے انتظار تھا ایک موزون ماحول اور مناسب موقعے کا، جو اسے 87ء اگر چہ کچھ لوگوں سے عطیات وغیرہ جمع کر لئے گئے تھے لیکن وہ ناکافی تھے، اسی دوران ہم ایک اجنبی سے ملے، جس نے ہمیں سرحد پار رابطہ قائم کروانے کی حامی بھر لی، اس اجنبی کے ہمراہ ہم لوگ کپواڑہ میں سرحد کے قریب گئے اور پاکستان پیغام بھجوایا۔اس دوران سرحد پار جانے والا پہلا شخص بھی ہمایوں آزاد ہی تھا...اس کے بعد دھیرے دھیرے آنا جانا شرع ہوا۔ادھر 1987ء میں مسلم متحدہ محاذ کے نام سے ایک پلیٹ فارم قائم ہوا تو ہم لوگ بھی کچھ دیر کے لئے اپنے کام کو ملتوی کر کے مف کی الیکشن مہم میں شامل ہو گئے لیکن مف کے ساتھ جڑنے کی پاداش کے انتخابات میں ہونے والی دھاندلیوں کے فوراً بعد مل گیا اور ایک عام کہاوت ہے کہ جب گھر کے افراد میں فساد برپا ہوتا ہے اور اہلِ خانہ میں نااتفاقی پیدا ہو جاتی ہے تو باہر والوں کو گھر کے اندرونی معاملات میں ٹانگ اڑانے اور مداخلت کرنے کا بھرپور موقعہ ملتا ہے، کشمیر میں بھارت مخالف لہر چل چکی تھی، نفرت کا لوہا گرم تھا اور ضرورت تھی ایک کاری ضرب کی، جو پاکستان نے بروقت لگائی۔

کشمیر میں پہلا جدید ترین ہتھیار کلاشنکوف یا دستی بم کب داخل ہوا اور اس کو حدِ متارکہ کے اُس پار سے کون لایا، اس بارے میں اگر چہ اختلافات کی گنجائش ہے اور ابتدائی عسکریوں میں سے کوئی بھی اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کر سکتا ہے تاہم ابتدائی دور کے ان چند عسکریت پسندوں میں سے طویل نظر بندی اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے والے بلال احمد صدیقی سے راقم کی ملاقات دوران اسیری 2006-07 کے دوران جموں کے کوٹ بھلوال جیل میں ہوئی، ان دنوں میں میر غلام

احمد کی کتاب ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا'' کی ادارت اور ترتیب وغیرہ میں مصروف تھا اور کشمیر کی عسکری جدوجہد کے حوالے سے میں نے بلال صدیقی سے ایک طویل ملاقات کی اور ان سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کشمیری نوجوانوں نے بندوق کا راستہ کب اور کن حالات میں اختیار کیا تھا۔ بلال نے اس ملاقات کے دوران ان دنوں کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا:۔

''سال 1986ء کے دوران ہی ہم نے اپنے چند اور ساتھیوں، جن میں ہمایوں آزاد (جو گزشتہ 17 سال سے دورانِ حراست لاپتہ ہے) ارشد کول، جاوید جہانگیر (حال پاکستان) اور جمشید احمد بٹ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، کے ساتھ مل کر ایک گروپ بنایا، اس گروپ کا کوئی نام بھی نہیں رکھا گیا تھا، ہم لوگ چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے اور کوئی منصوبہ تیار کرتے رہتے تھے لیکن ہمارے پاس نہ تو کوئی اسلحہ تھا، نہ فنڈس تھے اور نہ ہی کوئی پروگرام۔ اسی دوران ہمایوں آزاد نے اپنی مطلوقہ ہمشیرہ کے زیورات اڑا لئے اور ان کو فروخت کر کے دو دیسی ساخت کے ریوالور خرید لئے، وہ ہتھیار خرید کر ہم کافی خوش تھے، انھیں چلا کر آزمانا چاہتے تھے لیکن موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ ابتداء میں ہم لوگوں کا خیال تھا کہ بھارت کے اندر سے ہتھیاروں کا انتظام کر لیا جائے گا لیکن اس کے لئے کسی رابطے اور فنڈس کی ضرورت تھی، جس کا اہتمام کرنا کافی مشکل تھا'' بلال صدیقی نے مزید کہا:

الیکشن کے فوراً بعد مجھے 1987ء میں گرفتار کر کے تھانہ صدر میں بند کر دیا گیا، اسی تھانہ میں میری ملاقات شیخ عبدالحمید، مقبول الٰہی، عبدالاحد بنگرو اور کچھ دیگر دوستوں کے ساتھ ہوئی، جو بھارت کے سسٹم سے سخت ناراض تھے۔ ان دوستوں کے ساتھ رہائی کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور دیکھتے دیکھتے ان میں محمد یاسین ملک اور دیگر کئی لوگ بھی شامل ہو گئے''

جیل کی کال کوٹھری میں اس ملاقات کے دوران صدیقی نے راقم کو بتایا کہ 1987ء کے اواخر میں نظام الدین نامی ایک شخص بلال سے ملاقی ہوا، جس نے ان کے لئے سرحد پار سے ''دعوت نامہ'' لایا تھا۔ آپسی صلاح ومشورے کے بعد بلال صدیقی جنوری 1988ء میں پاکستان کے لئے روانہ ہو گئے، بلال نے اپنی یاداشت تازہ کرتے ہوئے کہا'' 26 جنوری 88ء کا دن تھا، میں اپنے ایک صحت مند ساتھی جمشید کے ہمراہ گھر سے روانہ ہوا، جمشید آگے نہ چل سکا، بہر حال سرحد کے قریب جا کر ہمیں چند دن رکنا پڑا اور آخر کار پار سے ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ آپ سبھی کو JKLF کے ساتھ کام کرنا ہوگا اور ابتداء میں دس افراد پر مشتمل ایک گروپ روانہ کرنا ہوگا، جو 10 فروری 88ء کو سرحد پر پہنچ جانا چاہیے، سرحد پار سے خط مل چکا تھا اور اس کے ذریعے ہدایت بھی مل چکی تھی اس لئے ہم واپس لوٹ

آئے اور گروپ کو اکٹھا کرنے میں مصروف ہوگئے لیکن ہم دس کی جگہ صرف چھ افراد کو ہی بھیج سکے۔ میرے ساتھ اس گروپ میں جو مزید پانچ لوگ سرحد پار گئے، ان میں علی محمد پیر، وحید احمد ڈار، محمد ایوب بنگرو، غلام محمد گجری اور عبدالحمید شیخ شامل تھے۔ اس دوران مرحوم مقبول بٹ (شہید) کے برادر مرحوم غلام نبی بٹ بھی ایک علیٰحدہ چینل پر کام کر رہے تھے، انہوں نے ہمارے ساتھ بلال احمد بیگ (اسلامک فرنٹ..حال پاکستان) کو بھیجا..یہ سبھی لوگ کپواڑہ میں سرحد کے قریب پہنچے، رات کو قیام کیا اور صبح چار بجے آگے کے لئے روانہ ہوگئے جبکہ میں جمشید کے ساتھ یہاں سے واپس آ گیا۔ واپسی پر پلہالن پٹن میں ماسٹر محمد احسن ڈار کے ساتھ ملاقات ہوئی، وہ ان دنوں انصار الاسلام نامی تنظیم کے لئے کوششیں کر رہے تھے۔ ہمارا گروپ 25 دن بعد واپس آ گیا...اب ہمارے پاس جدید ترین کلاشنکوف رائفلیں، آٹو میٹک پستول اور دستی بم تھے لیکن وہ دو دیسی پستول، جن کو ہمایوں آزاد نے اپنی مطلوقہ ہمشیرہ کے زیورات کو بیچ کر خریدا تھا اور جن کے بل پر ہم نے عسکری تحریک شروع کی تھی، کو ہم نے بطورِ یادگار کافی عرصے تک اپنے پاس سنبھال کر رکھا"

بلال صدیقی اس ملاقات کے دوران کئی مرتبہ جذباتی بھی ہوئے اور پُرنم بھی، انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"جب پہلا گروپ واپس آیا تو اس کے ہمراہ دو پاکستانی گائیڈ بھی تھے، جن کے پاس میرے لئے بھی بلاوا تھا، دوسرے گروپ میں میرے ہمراہ مقبول الٰہی مرحوم پاکستان گئے، سرحد پار کرکے ہم اٹھمقام پہنچے، وہاں سے ہمیں مظفرآباد میں راجہ مظفر کے گھر لے جایا گیا (راجہ مظفر ان دنوں لندن میں جے کے ایل ایف کے ساتھ وابستہ ہیں) مظفرآباد سے ہم لوگ اسلام آباد میں ڈاکٹر فاروق حیدر کے گھر پر رکے، ان دنوں امان اللہ خان JKLF کے چیئرمین تھے اور اسی کے ساتھ لڑکوں کا باضابطہ آر پار آنا جانا شروع ہوگیا...ہم پر سرحد پار سے دباؤ بڑھنے لگا کہ کشمیر میں فوج کے خلاف کاروائی کی جائے لیکن میں نے انکار کیا، کیونکہ ابھی ہمارے پاس افرادی قوت اور اسلحہ ناکافی تھا، ہم چاہتے تھے کہ ہمارے پاس کم از کم 500 مسلح اور تربیت یافتہ افراد تیار ہو جائیں لیکن ہماری بات نہیں مانی گئی۔ اس من مانی سے ناخوش ہو کر ہم نے پاکستان سے آنے والا بھارت مخالف لٹریچر بھی جلا دیا لیکن ہمارے پاس جولائی 88ء میں دو پاکستانی گائیڈ پہنچے، جن میں محمد صدیق نامی شخص کے علاوہ کپواڑہ کے ماسٹر غلام محمد وانی (عرف گلہ وانی، المصطفیٰ لبریشن فائٹرس..حال یونان) باضابطہ حکمنامہ لے کر آئے اور ہم نے 13 جولائی کے دن یومِ شہدائے کشمیر کے موقعہ پر سرینگر کے مرکزی تارگھر، امر سنگھ کلب اور اکھاڑہ بلڈنگ پر کاروائیاں

کرتے ہوئے ہتھ گولے پھینکے، جن سے کشمیر میں عسکری کاروائیوں کا باضابطہ آغاز ہوا'' بلال نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

''اس دوران شیخ عبدالحمید کی ملاقاتیں اشفاق مجید وانی اور محمد یاسین ملک وغیرہ کے ساتھ ہوئیں، وہ لوگ بھی ہمارے ساتھ آنا چاہتے تھے لیکن چونکہ MUF کے حوالے سے وہ لوگ کافی expose ہوئے تھے، اس لئے ہم نے انھیں فی الحال بالائے زمین کام کرنے کا مشورہ دیا لیکن ہمارے پہلے حملے کے ساتھ ہی انھوں نے مولانا آزاد روڈ پر سکھوں کا حلیہ بنا کر جھگڑا کیا، جس سے عوام اور حکومت میں یہ پیغام گیا کہ یہ حملے سکھوں نے کیے ہیں...سلسلہ چل پڑا تھا، حملے ہو رہے تھے اور کشمیری لوگ گہری نیند سے جاگ رہے تھے...ایک دن ۲۹ ستمبر ۱۹۸۸ء کو میں ماسٹر احسن ڈار سے ملنے کے لئے پلہالن جا رہا تھا کہ راستے میں گرفتار ہو گیا لیکن تب تک ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
..لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

(''میں نے کشمیر جلتے دیکھا''....صفحہ نمبر 185 تا 188)

ایک مطلوقہ ہمشیرہ کے زیورات بیچ کر دو یسی پستول خریدنے والے چند نوجوانوں نے صرف چند ماہ کے دوران کشمیری نوجوانوں کو دنیا کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کر دیا تھا اور دنیا کی ایک بہت بڑی فوجی قوت بھارت کے خلاف اعلانِ جنگ ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک کشمیری عوام اور حکومتِ ہند، دونوں کو یہ وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ مسلح تحریک بیس بائیس سال تک (تادمِ تحریر نومبر ۲۰۱۰) جاری رہے گی۔اس جدوجہد نے ایک طرف بھارت کی سات لاکھ فوج کو دو دہائیوں سے الجھائے رکھا ہے، وہیں اس وجہ سے ریاستِ جموں وکشمیر میں ''گن کلچر'' کی وجہ سے مضرت رساں اثرات بھی مرتب ہوئے جبکہ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے ابھی تک کشمیری عوام نے سوا لاکھ سے زیادہ انسانی جانوں کے ساتھ ساتھ بے پناہ مالی قربانی اور عزت وناموس کا نذرانہ بھی پیش کر دیا ہے لیکن سیاست دانوں کے داؤ پیچ اور چالبازیوں کی وجہ سے کشمیر کا یہ مسئلہ الجھتا ہی جا رہا ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ اس مسئلہ کو مزید الجھانے اور کمزور کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔عوام نہ تو پہلے مایوس اور پست ہمت تھے اور نہ ہی اس قدر مظالم سہنے کے بعد ان کے پایۂ استقلال میں کوئی لغزش نظر آ رہی ہے، حالانکہ ریاست کے اس حصے، جس کو کشمیر کہا جاتا ہے، میں عوام کا کاروبار اور زندگی کے تمام وسائل فناہ کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ہمایوں آزاد کی طرح آج بھی یہاں اپنی بے سہارا اور مطلوقہ بہنوں کے زیورات بیچ کر تحریک کو

عطیات دینے والے لوگ موجود ہیں لیکن اس نام کی تجارت کرنے والا سیاست دانوں کا ٹولہ ان عطیات سے اپنے محلات کی منزلیں بلند کرنے میں مصروف ہے اور اپنے ذاتی اور حقیر مفادات کی لڑائی میں الجھ کر عوام کا استحصال کر رہا ہے، ان حالات میں اللہ تعالیٰ سے ہی کسی غیبی امداد کی توقع کی جاسکتی ہے........

52

مسلح تحریک کا آغاز...2

ہمایوں آزاد، جاوید جہانگیر، بلال احمد صدیقی اور ان کے متعدد ساتھی میدان میں اتر چکے تھے، اعجاز احمد ڈار وہ جوان تھا جس نے اس وقت کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس (کشمیر رینج) ایس ایس علی کی رہائش گاہ واقع راجباغ کے اندر گھس کر فائرنگ کی لیکن پہرے پر تعنیات ایک سپاہی کی گولی لگنے سے جاں بحق ہو گیا، اعجاز ڈار راجباغ کا ہی رہنے والا تھا اور اگرچہ اس کا بلال صدیقی کے گروپ مجاہدینِ اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا تاہم یہ وہ موقعہ تھا جب صرف چند ہی نوجوان میدان میں موجود تھے اس لئے ان کے ایک دوسرے کے ساتھ کافی قریبی روابط تھے، راوی کے مطابق جب اعجاز ڈار نے ایس ایس علی پر (ستمبر 1989) حملے کا منصوبہ بنایا تو جاوید اور بلال نے اس کی اس لئے مخالفت کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے کشمیر پولیس ان کے خلاف متحرک ہو سکتی تھی اور اس کے منفی نتائج برامد ہو سکتے تھے لیکن اعجاز کا دعویٰ تھا کہ ڈی آئی جی اور کچھ دیگر افسران کشمیری نوجوانوں کی عسکری تحریک کو دبانے کے لئے ایک منصوبے پر عمل کر رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی نقصان پہنچائیں، ان پر حملہ کر دینا چاہیے، اس طرح سے اعجاز نے حملہ کر دیا لیکن چونکہ حملے سے قبل اس حوالے سے کوئی زیادہ تیاری نہیں کی گئی تھی اس لئے اس کا نتیجہ ان کی توقعات کے خلاف برامد ہوا تاہم اعجاز ڈار کو کشمیر کی مسلح تحریک کا پہلا 'مجاہد' ہونے کا خطاب مل گیا۔ ادھر جاوید جہانگیر کو بلال نے مشورہ دیا کہ وہ سرحد کے قریب ہی اپنا مسکن بنائے اور آنے جانے والے لڑکوں کی رہنمائی کرے، جاوید نے یہ کام کافی مہارت کے ساتھ کیا اور اس کام کے لئے اسے king of the borders (سرحدوں کا راجہ) کے لقب سے بھی پکارا گیا، اسی دوران ایک دن پولیس نے ہمایوں آزاد کو راجباغ میں (1990 میں) گرفتار کر لیا اور اسے کہیں لے جایا جا رہا تھا کہ بٹہ مالو کے مقام پر وہ پولیس کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا (بلال صدیقی اس سے قبل ہی پٹن جاتے ہوئے گرفتار ہو چکا تھا) ہمایوں آزاد اور جاوید جہانگیر نے کافی تال میل کے ساتھ کام کیا اور اس دوران بہت سے نوجوان سرحد پار جا کر ہتھیار اور ان کی تربیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کا حاجی گروپ بھی

میدان میں اُتر چکا تھا۔ اس گروپ میں عبدالحمید شیخ، اشفاق مجید وانی، جاوید احمد میر اور محمد یٰسین ملک شامل تھے اور کشمیر میں گن کلچر کا باضابطہ آغاز ہو چکا تھا۔ اِن دنوں سرحد پار جانے والے نوجوانوں کا عالم یہ تھا بٹہ مالو بس اڈے پر باضابطہ طور پر بسیں لگتیں اور کنڈیکٹر آواز لگاتا ''راولپنڈی چلو، راولپنڈی چلو'' اور نوجوان ان بسوں میں بیٹھ کر سرحدوں کے قریب پہنچ جاتے اور چونکہ ابھی فوج کا اس طرف زیادہ دھیان نہیں تھا، سو بے شمار لڑکے اوڑی، بارہمولہ اور کپوارہ کے راستوں سے پاکستانی قبضہ والے کشمیر میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے، اس ہجرت کے لئے کشمیری نوجوانوں نے از خود فیصلہ لیا تھا، جیسا کہ اس سے پہلے کے واقعات سے بھی ثابت ہو رہا ہے کہ اس کے لئے انھیں نہ تو کسی نے اکسایا اور نہ ہی ترغیب دی یا زبردستی پکڑ کر سرحد پار کرائی۔ یہ محض ریاستی اور مرکزی سرکار کی غلط اور غیر جمہوری پالیسیوں کا نتیجہ تھا کہ کشمیری نوجوانوں کا سیاسی اور جمہوری سسٹم سے اعتبار اٹھ گیا اور جب نوجوان طبقے کے جذبات اور عزتِ نفس مجروح ہوئی تو انھوں نے چارو ناچار بندوق کا راستہ اختیار کر لیا اور چونکہ دوسری جانب بھارت کا روائتی دشمن پاکستان انھیں گلے لگانے کے لئے تیار تھا، اس لئے بقول غلام احمد میر'' پیاسا کنویں پر گیا اور کنویں نے اس کی جی بھر کر پیاس بجھائی'' (میں نے کشمیر جلتے دیکھا) دوسری جانب پاکستان کے صدر مرحوم جنرل محمد ضیاءالحق کے زمانے میں ہی پاکستانی سراغ رساں ایجنسیوں نے کشمیر میں اس طرح کی صورت حال پیدا کرنے کے لئے ایک منصوبہ ''آپریشن ٹوپاز'' (Operation Topaz) کے نام سے پہلے سے ہی مرتب کر رکھا تھا لیکن اس کو عملانے کے لئے پاکستان کو مناسب وقت اور حالات کی تلاش تھی، جو اسے اب کی بار اچھی طرح سے مل رہے تھے۔ راستہ کھلا تھا اور ماحول بھی سازگار تھا اس لئے جس کو جدھر کی راہ ملی، وہ ''راولپنڈی چلو'' کی آواز پر سرحد پار چلا گیا، ہزاروں کی تعداد میں طلباء، بے روزگار نوجوان (جن کی اس وقت کوئی کمی نہیں تھی) کاریگر، کنڈیکٹر، اور نہ جانے کون کون...اور کیسے کیسے لوگ...سرحد پار چلے گئے، وہاں پہنچتے ہی نہ صرف ان کی آؤ بھگت کی گئی بلکہ ان کے کھانے، پینے اور رہنے کا بھی معقول انتظام کیا گیا (جو آج تک جاری و ساری ہے) پاکستان کے پاس افغان جنگ کے دوران بیرونی ملکوں، خاص طور پر امریکہ کی جانب سے آنے والے جدید ہتھیاروں اور گولہ بارود کا بے شمار ذخیرہ موجود تھا، جسے کشمیر بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ کشمیر میں ایک مدت بعد بندوق داخل ہوئی تھی، اس کا اثر یہاں کے سماج کے ہر پہلو پر ہونا ضروری تھا، سماجی، سیاسی اور اقتصادی قدریں بدلنا نیز نئے رسم و رواج کا رائج ہونا اور طرزِ حیات میں تبدیلی کا رونماء ہونا ضروری تھا، سب سے پہلے اس کا جو اثر ہوا، اس کی وجہ سے جموں و کشمیر کے عوام اور ان کے قائدین دو

حصوں میں بٹ گئے۔ایک حصہ بہت سی مین سٹریم جماعتوں پرمشتمل تھا، جو بھارت نواز طبقہ کہلایا، جبکہ دوسرا طبقہ بھی کئی سیاسی اور عسکری تنظیموں پرمشتمل تھا اوران کی وابستگی 'تحریک آزادی' کے ساتھ تھی اوران کا جھکاؤ پاکستان جانب تھا۔ریاست کا صاحبِ ثروت،صاحبِ جائیداد،صاحبِ مراعات اور تعلیم یافتہ طبقہ چونکہ کسی نہ کسی طرح سے بھارت یا بھارتی سیاست کے ساتھ جڑا ہوا تھا، اس لئے وہ اس اچانک رونماء ہونے والے انقلاب کے حوالے سے نہ تو اپنا کوئی ردِعمل ظاہر کرسکا اور نہ ہی اس تناظر میں اپنے مستقبل کے حوالے سے کوئی فیصلہ لے سکا،اسلئے ابتداء میں تحریک کے ساتھ زیادہ تر وہی لوگ وابستہ ہوئے جو یا تو حالات کے ستائے ہوئے تھے،سیاست اور جمہوریت سے بدظن ہوچکے تھے یا پھر بے روزگار اور بیکار تھے، اس وجہ سے سماجی اقدار کا بے دردی کے ساتھ جنازہ اٹھنا شروع ہوگیا ، چھوٹے، بڑے اوراچھے بُرے کی تمیز جاتی رہی اور بندوق کی بالا دستی قائم ہوکر رہ گئی،نئی ہوا چلی اور نئی رسمیں رائج ہوئیں تو اس وجہ سے عوام کے دل ودماغ بھی بدلنے لگےاور عام لوگوں کے ساتھ ساتھ سیاسی وابستگیاں رکھنے والے لوگ خود کو غیرمحفوظ تصور رنے لگے۔بندوق برداروں کی سماج میں قدرومنزلت بلند ہوئی تو دیکھا دیکھی کے عالم میں ہر قبیلے اور ہر طبقے سے وابستہ نوجوان اس دوڑ میں شامل ہوگئے، کچھ ایک اپنی حفاظت کے لئے ، کچھ ایک فیشن کے طور پر اور باقی سوچ سمجھ کر ایک مقصد کے حصول کے لئے ...بچے بچے کی زبان پر کلاشنکوف، اے کے فورٹی سیون(AK47)، مجاہد،شہید، غازی، ایریا کمانڈر،تحصیل کمانڈر،ضلع کمانڈر اور چیف کمانڈر کے ساتھ ساتھ سپریم کمانڈ کونسل وغیرہ کے نئے الفاظ چڑھ گئے ،قدریں بدل گئیں اورسماجی طورطریقے بدلے تو عوام کی زبان پر ایک نئی لغت آ گئی، بندوق اور عسکریت کو عوام میں پذیرائی اورعزت ملی تو نوجوانوں نے بھی اس رنگ میں رنگنے کو اپنا شیوہ بنا لیا،حد یہ تھی کہ دوڈہ، بھدرواہ اور پونچھ وراجوری کے کئی غیر مسلم لڑکے بھی اسی دوران سرحد پار کر کے 'مجاہد' بن گئے اور فورسز کے خلاف صف آراء ہوگئے۔

ابتداء میں کشمیر میں صرف جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ نام کی ایک تنظیم تھی حالانکہ بلال صدیقی اینڈ کمپنی نے اس بینر کے نیچے کام نہیں کیا،انھوں نے اپنے 'بے نام' ٹولے کا نام 'مجاہدینِ اسلام' رکھ لیا تھا ، جو آگے چل کر 'مسلم مجاہدین' نامی تنظیم میں مدغم ہوگیا...بہر حال اس کے بعد حزب المجاہدین (احسن ڈار) العمر مجاہدین ،مشتاق احمد زرگر) حزب اللہ (مشتاق الاسلام) اللہ ٹائیگرس، سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ،اخوان المسلمون (یٰسین بٹ، بلال احمد بیگ)،المصطفیٰ لبریشن فائٹرس (محمد سلیم وانی،غلام محمد وانی)، العمر کمانڈوز (شبیر احمد زرگر)الجہاد (شیخ عبدالعزیز،ایس حمید) حزب اسلامی،اسلامی جنگ،

یلغارعلی، پاسداران اسلام، البرق (بلال احمد لودھی، سید یوسف نسیم)، اور دیگر درجنوں تنظیمیں میدان میں اتر آئیں۔ راقم ان دنوں ممبئی کی فلم نگری چھوڑ کر واپس آ چکا تھا اور روز نامہ ''آفتاب'' کے ساتھ بطورِ معاون مدیر بابائے صحافت مرحوم خواجہ ثناء اللہ بٹ کی تربیت میں لکیریں سیدھی کرنے کی کوشش میں مصروف تھا، کیونکہ ممبئی میں کشمیر کی صورت حال کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ کسی کشمیری مسلمان کے لئے وہاں مقیم رہنا کافی دشوار ہو گیا تھا۔ کشمیری پنڈتوں کی جس پہلی کھیپ نے بندوق کی آمد کے بعد (بدنامِ زمانہ) گورنر جگموہن اور اس وقت کے مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کے دور میں کشمیر سے ہجرت کی، وہ چونکہ امیر اور سرمایہ دار ٹولہ تھا اس لئے سیدھے بمبئی (ممبئی) اور دوسرے بڑے شہروں میں چلا آیا اور آتے ہی انھوں نے واویلا شروع کر دیا کہ کشمیر میں ہر طرف سبز رنگ نظر آ رہا ہے، وہاں نظام مصطفیٰؐ قائم ہو گیا ہے اور مسلمان پنڈتوں اور غیر مسلموں کو قتل کر رہے ہیں....اس منفی، زہریلے اور بے بنیاد پروپگنڈا کی وجہ سے ممبئی میں شدت پسند ہندو تنظیموں خاص طور پر بال ٹھاکرے کی فاشسٹ ہندو تنظیم 'شیوسینا' نے وہاں سے کشمیریوں کو نکالنا شروع کر دیا اور ایک شام راقم کو بھی اندھیری ایسٹ کے ایک ہوسٹل سے دوران شب فلائٹ پکڑ کر دلی پہنچنا پڑا، جہاں سے آگے کا سفر بس میں طے کیا اور کشاں کشاں سرینگر پہنچا، کشمیر کی صورتحال کی بیرون ریاست میڈیا نے ایسی منفی تشہیر کی تھی جس سے لگتا تھا کہ اس سے پہلے کہ کشمیر ایک آزاد ملک بن کر ہمارے لئے اپنے دروازے بند کر دے، ہمیں بانہال ٹنل پار کر کے وادی میں داخل ہو جانا چاہیے لیکن قاضی گنڈ پہنچ کر پتہ چلا کہ ''ابھی دلی بہت دور ہے''

کانگریس اور بھارت کی مرکزی ہوم منسٹری چھوڑنے اور اپنی جماعت (پی ڈی پی) بنانے سے پہلے ایک روز مفتی محمد سعید نے راقم کے ساتھ ایک انٹرویو میں اپنی رہائش گاہ (نوگام بائی پاس) پر کہا کہ وہ تب تک بحیثیت مرکزی ہوم منسٹر کشمیر کی عسکری تحریک کو غیر سنجیدگی کے ساتھ لے رہے تھے، جب تک کہ کشمیری عوام نے 1990 کے ابتداء میں اپنی گھڑیوں کو پاکستان کے معیاری وقت کے ساتھ ملا لیا، عوام کا سیلاب سڑکوں پر نکل آیا اور انھوں نے اقوامِ متحدہ کے دفتر کی طرف ''چلو'' کا سلسلہ شروع کر دیا، اس صورتحال کا مقابلہ کرنا ضروری تھا اور اسی لئے سی، آر، پی ایف کو ہٹا کر فوج تعینات کرنا پڑی۔ ادھر انہی دنوں اولین بندوق بردار ہمایوں آزاد کو ایک بار پھر اپریل 1993ء میں بارڈر سیکیورٹی فورس کے سپاہیوں نے مجھو پُل پر پکڑ لیا، ان دنوں آپریشن ٹائگر (پکڑو اور مارو) جاری تھا اور اس کے بعد اس نوجوان کا کوئی اتہ پتہ نہیں چلا اور نہ ہی وہ لوٹ کر واپس آیا، اس حوالے سے پولیس پر کیس کیا گیا تو ایک فوجی آفیسر نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ ہمایوں کو پنجاب سرحد پر ہتھیاروں کی نشاندہی

کے لئے لے جایا گیا، جہاں اچانک فائرنگ ہوئی، جس میں ہمایوں مارا گیا، یہ بیان ان دنوں کافی بدنام بیان تھا اور'' پکڑو اور مارو''(Catch and kill) کی پالیسی کے تحت فورسز اکثر اس طرح کا بیان دے کر گرفتار شدگان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ بہر حال اپنی ہمشیرہ کے زیورات بیچ کر پستول خریدنے والا کشمیر کا یہ اولین سپاہی دوران حراست غائب ہونے والا پہلا جوان بھی بنا اور اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔

اسی دوران (مئی، جون 1990) میں کشمیر سے پنڈت برادری کو وادی سے باہر نکالنے کا ایک منصوبہ بھی بنایا گیا اور یہ کام اس وقت کے گورنر جگموہن نے بخوبی انجام دیا، وہ جانتے تھے کہ پنڈت ایک تعلیم یافتہ اور سرمایہ دار طبقہ ہیں اور جب فوج میدان میں آ کر ملی ٹنٹوں کے خلاف کاروائی کرے گی تو اس کی زد میں پنڈت بھی آئیں گے، ان کا پوشاک، زبان اور طرزِ حیات بالکل کشمیری مسلمانوں جیسا تھا اس لئے فوجی کاروائیوں کے دوران ان کو پہچاننا مشکل تھا لہٰذا ان کو یہاں سے نکالنے اور کچھ وقت کے لئے کسی محفوظ مقام پر لیجانا ازبس ضروری ہوگیا تھا، اس سلسلے میں کشپ بندو نامی پنڈت لیڈروں نے کافی اہم رول ادا کیا اور اپنی برادری کو کشمیر سے باہر نکالنے میں اہم رول ادا کیا۔ اگر چہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ملی ٹینسی کی ابتداء میں ہی محمد مقبول بٹ کو پھانسی کی سزا سنانے والے جسٹس گنجو اور ٹیکہ لال ٹپلو (حبہ کدل) کے علاوہ اور بھی چند ایک کشمیری پنڈت عسکریت پسندوں کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے لیکن یہ آبادی کے تناسب کے اعتبار سے بہت کم تھا کیونکہ دوسری جانب انہی بندوق برداروں کے ہاتھوں نیشنل کانفرنس، کانگریس اور دیگر کئی مین سٹریم جماعتوں سے وابستگیاں رکھنے والے اس سے کئی گنا زیادہ مسلمان کارکن اور لیڈر بھی مارے جا چکے تھے، اس لئے یہ کہنا کہ پنڈتوں کو جان بوجھ کر مذہبی بنیادوں پر نشانہ بنایا گیا البتہ اس میں کوئی دورائیں نہیں اور اس بات کو خود بھی پنڈت برادری کے بے شمار لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ ان کو وادی سے باہر نکال کر حکومت نے ان کے ساتھ ''وشواس گھات'' (دھوکہ) کیا ہے کیونکہ بقول ان کے، ان سے کہا گیا تھا کہ یہ محض چند دنوں کی بات ہے اور حالات درست ہوتے ہی انھیں واپس بلا لیا جائے گا لیکن حالات کو نہ تو ٹھیک ہونا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی ہوئے، نتیجۃً یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار اور سرمایہ دار طبقہ اپنے مادرِ وطن کو مصیبت و آلام میں چھوڑ کر یہاں سے چلا گیا، دوران اسیری راقم کی ملاقات جیلوں اور اذیت خانوں میں کئی پنڈت پولیس افسروں، سراغ رسانوں اور سپاہیوں سے ہوئی، ان میں سے کئی ایک نے میرے ساتھ اس حوالے سے کافی طویل اور گرما گرم بحث و مباحثے بھی کئے اور اس بات کو بھی مانا کہ انھوں نے بندوق کی آمد کے

ساتھ ہی کشمیر سے ہجرت کر کے بہت بڑی غلطی کی اور حالانکہ ان کو بھارت کے باقی حصوں میں روزگار اور حصول تعلیم کے اچھے مواقع ملے لیکن اس دوران وہ اپنی زمین، اپنے ماحول اور اپنے لوگوں سے کٹ کر رہ گئے، ان کی سماجی قدریں ختم ہو گئیں اور وہ بحیثیت ایک قوم کے ختم ہو گئے۔ ان کو پورے بھارت کے ہندوؤں میں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا اور وہ اپنی برادری سے باہر لڑکیوں کی شادیاں نہیں کرتے تھے لیکن باہر جا کر انھیں ایسے ایسے لوگوں کے ساتھ رشتے جوڑنے پڑے، جنھیں وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے جبکہ جموں کے انٹیروگیشن سینٹر (میراں صاحب) میں ایک پنڈت سپاہی نے کہا "بندوق کی آمد کے ساتھ ہی کشمیر میں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ پنڈتوں اور مسلمانوں کو اپنی اپنی بقاء کے حوالے سے کوئی فیصلہ جلدی میں لینا ضروری تھا اور مال و جائیداد یا جان میں سے کسی ایک شے کی قربانی دینا ناگزیر تھی، مسلمانوں نے جان کی قربانی دی لیکن پنڈتوں نے اپنے مال و جائیداد کو چھوڑنا مناسب سمجھا اور ہجرت کر لی۔

53

بندوق کی آمد.... کشمیری سماج کا بدلتا مزاج....

بندوق......کشمیری لوگوں کے لئے ایک بالکل ہی نئی اور دلچسپ چیز تھی، ایک طویل مدت کے بعد کشمیر کے ناراض نوجوانوں کے ہاتھوں میں بندوق، بم، اور ایسے ہی دیگر جدید اور مہلک ترین ہتھیار آئے تھے، بندوق برداروں کے دل و دماغ اپنے ساتھ ہونے والی سیاسی اور سماجی زیادتیوں اور نابرابریوں کی نفرت سے بھرے پڑے تھے، وہ راتوں رات سماج کو بدلنے کے لئے بیتاب تھے، عوام نے ایک لمبی مدت تک مظالم سہے تھے، ان کی عزت، انا اور غیرت بُری طرح سے مجروح ہوئی تھی، کئی صدیوں کا غبار ان کے دل کے آسمان پر جما ہوا تھا اور وہ اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان مسلح نوجوانوں کی تربیت فوجی اصولوں کے بجائے گوریلا اصولوں کے تحت ہوئی تھی، انھیں کسی باضابطہ استاد نے معینہ اور مقررہ وقت تک تربیت نہیں دی تھی بلکہ انھیں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ وردی پوش سپاہی ان کا دشمن ہے اور جو بھی کوئی بھارت کا نام لے، وہ قابلِ تعزیر ہے، اس حوالے سے بڑے چھوٹے اور کھرے کھوٹے کی تمیز کوئی معنی نہیں رکھتی لہٰذا ان نوجوانوں کی راہ میں جو بھی آیا، وہ اسے روندتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ سیاسی وابستگیاں اور وفاداریاں بے شمار لوگوں کے لئے باعثِ عذاب بن گئیں اور ہجرت و ترکِ سکونت کے ساتھ ساتھ سماجی قدریں بھی بدلنے لگیں۔ لوگوں کی سوچ اور برتاؤ میں تبدیلی آنے لگی اور دیکھتے دیکھتے کشمیر کی ساری فضاء بدل کر رہ گئی۔ صورت حال کے اس بدلاؤ پر تبصرہ کرتے ہوئے یک ایرانی دانشور نے کہا تھا ''جو کچھ ہم نے 1978ء کے آس پاس ایران میں شروع کیا تھا، وہ افغانستان اور پاکستان سے گزرتے ہوئے اب کشمیر تک جا پہنچا ہے''

عسکریت پسندوں نے سب سے پہلے جو کام کیا، وہ تھا سماجی برائیوں کو ''ختم'' کرنے کا، اس سلسلے کی پہلی کارروائی یہ تھی کہ کشمیر وادی کے سارے سینما ہال بند کروا دیئے گئے۔ کئی ایک سینما ہالوں کو خاکستر کر دیا گیا تو باقیوں نے خود ہی یہ ''دھندہ'' ترک کر دیا، اسی کے ساتھ ساتھ کیبل ٹی وی پر بھی پابندی عائد کر دی گئی اور خواتین سے کہا گیا کہ وہ اسلامی شعار کے مطابق برقعہ اور پردے کا اہتمام کریں، اس سلسلے میں سب سے پہلے آسیہ اندرابی کی جماعت ''دخترانِ ملت'' نے 1990 کے اوائل میں پہل کی

اور راقم نے انھیں لڑکیوں کے ایک بر گیڈ کے ہمراہ لال چوک کے پلیڈیم سنیما کے فلمی پوسٹروں پر کالک پوتتے ہوئے خود دیکھا تھا(ان دنوں میں روزنامہ''اذان'' کے ساتھ بطور کاتب وابستہ تھا،اذان 'جماعت اسلامی کا آفیشل آرگن تھا، جسے حکومت نے اس وقت بند کردیا، جب جماعت اسلامی کو ممنوعہ جماعت قرار دیا گیا)مسلم خواتین سے پردہ کرنے کے لئے کہا گیا تو غیر مسلموں کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق اپنی انفرادی شناخت قائم کریں مثلاً ماتھے پر بندی لگائیں اور ساڑھی وغیرہ پہنیں،خلاف ورزی کرنے والی خواتین پرکئی جگہوں پر تیزاب چھڑکا گیااور ایک لڑکی کو جینز پہننے پر ٹانگوں میں گولی بھی ماری گئی۔کشمیر، جسے سیاحتی اعتبار سے اپنی ایک منفرد حیثیت حاصل تھی، میں سارے کلب بند کردیے گئے یا جلا دیے گئے،کوکرناگ، پہلگام،سونہ مرگ اور کئی دیگر مقامات پر حکومت نے جدید تفریحی سہولیات سے لیس کلب انہی دنوں تعمیر کروائے تھے، جو راتوں رات خاکستر کردیے گئے۔

کشمیری نوجوانوں کی طرف سے اچانک ہتھیار اٹھانے اور اس وجہ سے سماج پر پڑنے والے اثرات کے حوالے سے پرویز دیوان لکھتے ہیں:

''مغلوں کو کشمیر پر حملہ کرنے کے بعد(1586) یہاں اپنی اتھارٹی قائم کرنے میں تقریباً تین سال لگے تھے،کشمیریوں کی جنگی مہارت کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ہر قسم کے ہتھیار رکھنے پر پابندی عائد کردی، یہاں تک کہ گھروں میں چاقو، چھری وغیرہ رکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔انھوں نے گھر گھر تلاشی لی، یہاں تک کہ تہہ خانوں کو بھی چھان مارا، جہاں ان کو خدشہ تھا کہ کشمیریوں نے ہتھیار چھپا کر رکھے ہوں گے اور 1589ء تک کشمیر کے میدانی علاقوں میں ایک بھی ہتھیار کسی عام شہری کے پاس نہیں رہنے دیا گیا جبکہ اگلے چند ایک برسوں میں پہاڑی علاقوں کو بھی ہتھیاروں سے''پاک'' کرلیا گیا تھا(دیوان کے مطابق)1589ء سے 1989ء تک کے چار سو برسوں کے دوران کشمیر ایک منفرد اور امن پسند سماج تھا....لیکن اس کے بعد ایک''پڑوسی دوست''(پاکستان) نے کشمیر میں جدید ہتھیاروں کے سیلاب کا رُخ موڑ دیا اور یہاں کلاشنکوف،گرینیڈ، بارودی سرنگیں اور نہ جانے کیا کیا جدید اور مہلک ہتھیاروں کے ڈھیر لگ گئے، حالانکہ ان میں سے بہت کم ہتھیار فوج کے خلاف استعمال کئے گئے کیونکہ جیسا کہ اس زمانے کے اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ عسکریت پسندوں کے ہاتھوں مرنے والے زیادہ تر لوگ نہ تو فوجی اہلکار تھے، نہ

پولیس والے اور نہ ہی وردی پوش بلکہ زیادہ تر تو عام شہری ہی تھے'' (پرویز دیوان / صفحہ نمبر 123)

جہاں تک کشمیر میں پاکستانی ہتھیاروں کی آمد کا سوال ہے، یہ بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ پاکستان کے صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں مقامی معاملات اور مسائل کو حل کرنے کی غرض سے کئی صدیوں سے ہتھیاروں کا استعمال کیا جاتا رہا ہے، حالانکہ بھارتی قبضے والے پنجاب، آسام، بہار اور اتر پردیش میں بھی حالیہ برسوں میں ہتھیاروں کا استعمال ہوتے دیکھا گیا ہے لیکن 1990ء میں یہ کلچر کشمیر میں بھی آ گیا اور چونکہ ہتھیار سونپتے وقت نہ تو معیار کا خیال رکھا گیا تھا اور نہ ہی تعلیمی قابلیت وغیرہ کا۔ نوجوانوں نے بے حساب ہتھیار اُٹھا لیے تھے اس لئے جب مقابلے سے قبل ہی ہتھیار چھوڑنے اور سرینڈر کرنے کا وقت آیا تو یہ سلسلہ بھی بڑے زوروشور سے چلا، سینکڑوں کے حساب سے نوجوانوں نے ہتھیار چھوڑے اور فوج و کشمیر پولیس کی ''تحریک مخالف'' صفوں میں شامل ہو گئے، جس سے ایک اور نئی سوشل پرابلم کھڑی ہوگئی اور کشمیری عوام دیکھتے دیکھتے کئی اطراف سے چلنے والی بندوقوں کے نرغے میں آ گئے۔ تحریک نوازوں کی بندوقیں بھی خانوں میں بٹنے لگیں اور سب سے پہلے اس کے دو پھاڑ ہوئے۔ ایک پھاڑ پاکستان نواز تھا اور دوسرا خودمختار کشمیر کا، پاکستان نواز گروہ کی قیادت حزب المجاہدین نے سمبھالی جبکہ خودمختار کشمیر کی حامی تنظیموں کے گروہ کی قیادت جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کر رہا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان دو نظریات کے ٹکراؤ میں جتنے لوگ مارے گئے، شائد ہی ابتداء کے دنوں میں اتنے لوگ فوجیوں کے ہاتھوں مارے گئے ہوں گے، بڑے بڑے کمانڈر، مجاہدین، ڈاکٹر، وکلاء اور دانشور اس ٹکراء کی آندھی کی نذر ہو گئے، اسی پر بس نہیں ہوئی بلکہ اب تو تیسرا طبقہ اخوان یا ''نابدی بندوق برداروں'' پر بھی مشتمل تھا، جو فوج اور پولیس کے ٹاسک فورس کا اعانت کار بن گیا تھا، شروع میں اکا دُکا لوگ ''مخبری'' کے الزام میں مارے بھی گئے لیکن اگلے چند برسوں میں ''مخبروں'' کی باضابطہ تنظیمیں بن گئیں۔ سمبل سوناواری میں محمد یوسف عرف کُکہ پرے نے اخوان نام کی تنظیم بنائی اور دیکھتے دیکھتے مسلم مجاہدین، حزب المجاہدین اور اخوان کے درمیان جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کپوارہ (لولاب اور کنڈی وغیرہ) میں رشید خان اور ہاتھی بھائی نامی ایسے ہی منحرف بندوق بردار رونما ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے کئی اور ہم خیال تنظیمیں چل پڑیں۔ خودمختار و پاکستان نواز تنظیمیں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئیں اور کشمیریوں نے ہی کشمیریوں کا جم کر لہو بہایا۔ ان دنوں کے حالات و واقعات اور ان واقعات سے جڑی باتوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے تو دفتروں کے دفتر درکار ہوں گے اور اس امید

پر کہ اس موضوع پر مستقبل میں کبھی تفصیل سے لکھا جائے گا (انشاءاللہ) یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ بندوق اٹھانے والے ان نوجوانوں کا بعض سیاستدانوں نے اپنے ذاتی مفادات اور نظریات کی تکمیل کے لئے خوب استحصال کیا اور ان کی معصومیت کا جم کر فائدہ اٹھایا گیا، جس کی وجہ سے نہ صرف کشمیری عوام کو تاریخ کے بدترین اور سیاہ ترین دن دیکھنے نصیب ہوئے بلکہ وہ عوام، جنھوں نے صرف چند سال قبل اس امید سے بندوق اور بندوق والوں کا والہانہ استقبال کیا تھا کہ شاید یہ ان کی نجات کا باعث بنیں، وہ اب اس کلچر سے بری طرح متنفر ہونے لگے۔ سیاسی وابستگیوں اور نظریات کی بناء پر اپنے ہی لوگوں کا لہو بہتے کوئی کب تک دیکھ سکتا ہے، جن لوگوں نے ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھمائے تھے، انھوں نے ہی ان کی خانہ بندی بھی کردی تھی اور مختلف نظریات بھی دے دیے تھے، 1988 تک جو پاکستان کشمیری نوجوانوں کو صرف لبریشن فرنٹ کے نام پر ہتھیار دینے کے لئے آمادہ تھا، اب اس نے کشمیری نوجوانوں سے یہ عہد و پیمان بھی لے لیا کہ وہ بھارت کو کشمیر سے بھگانے کے بعد اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرائیں گے، جیت سے قبل ہی قتدار اور عہدوں کی تقسیم کی بات چلی تو لوگوں نے اپنے لئے پہلے سے ہی جگہ بک کرنے کا سلسلہ شروع کردیا اور اس رسہ کشی میں ہزاروں بے گناہ لوگ بے وقت کی موت مارے گئے۔ جنوبی کشمیر کے اسلام آباد ضلع میں بھی اخوان اور مسلم مجاہدین نامی ایسی ہی سرکار نواز تنظیموں کا کافی زور رہا اور مجھے یاد ہے کہ جب 8 جولائی 1996ء میں جب راقم کے ساتھ ساتھ مزید 19 کشمیری صحافیوں کا ایک گروپ، جو مسلم مجاہدین کے نبہ آزاد کی دعوت پر شہلی پورہ اچھ بل پریس کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے جا رہا تھا، کو اپنے کمانڈر ہلال حیدر کے حکم پر سنگھپورہ اچھ بل اور جنگلات منڈی میں اخوان والوں نے اغواء کر کے ایک پنڈت کے خالی مکان میں بند کر دیا اور راقم سمیت چند مقامی صحافیوں کو قتل کر دینے کی دھمکی دی گئی تو اسی دوران اس تنظیم سے وابستہ ایک کمانڈر سیٹھ نے کہا تھا ''میں نے تقریباً تین سو جماعتیوں (جماعت اسلامی سے وابستہ افراد) کو قتل کیا ہے، اس کے بعد میں نے گنتی کرنا چھوڑ دیا اور مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں کہ میں نے اب تک کتنے لوگوں کو مارا ہے''

الغرض گریز کی سرحدوں سے لے کر ارہمولہ کے پیر پنچال دروں سے ہوتے ہوئے کر کوکرناگ کی ہمالیائی چوٹیوں تک فوج کے ساتھ لڑنے کی غرض سے چلنے والے کشمیری بندوق برداروں نے ابتداء کے کئی سال آپسی کشت و خون میں جی بھر کے حصہ لیا اور سرزمینِ کاشمر کو جی بھر کے خون میں نہلایا گیا۔ اس دوران سیاسی اور نظریاتی ہلاکتوں کا اگر تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو نہ جانے کتنی ہی

کتابیں رقم کرنا پڑیں گی لیکن اس کام کے لئے ابھی موزون وقت نہیں ہے اور (میرے خیال سے) اس کی دو بڑی وجوہات بھی ہیں۔اول یہ کہ اس سلسلے سے جڑے ہوئے اکثر افراد ابھی اپنے اپنے حساب سے کام میں مصروف ہیں اور اپنے جیتے جی کوئی بھی شخص اپنی تنقید سُننا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی ابھی ہمارے معاشرے میں ضمیر کی بیداری اس سطح تک پہنچ پائی ہے کہ ہم تعمیری تنقید کو آئینہ بنا کر اس میں اپنی صورت دیکھ سکیں اور اپنی لغزشوں کا ازالہ کر سکیں۔دوسری وجہ یہ کہ جس تحریک کے ساتھ یہ واقعات تعلق رکھتے ہیں، وہ ابھی اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچ پائی ہے لہذا اس حوالے سے کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا تاہم بعض سیاسی ہلاکتیں ایسی بھی ہیں، جنھیں نظر انداز کرنا نہ صرف اپنے قلم کے ساتھ ناانصافی ہوگی بلکہ یہ ایک قومی فریضہ بھی ہے لہذا اس کا احوال اگلی قسط میں ہوگا۔

54

بندوق کی آمد...(2)

سیاسی ہلاکتوں کا لامحدود سلسلہ

1989ء میں جب کشمیر میں 'بندوق کی تہذیب' پوری طرح متعارف ہوئی تو بندوق والوں کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ تحریک دشمنوں اور تحریک دوستوں کی پہچان کر لی جائے اور چونکہ بھارت نواز سیاست دان اور قائدین اس 'نئی تہذیب' کے راست دشمن تھے، اس لئے تحریک کو آگے لے جانے کے لئے ان کو راستے سے ہٹانا ضروری تھا، بندوق میدان میں اتری تو اخبارات میں جو نیا سلسلہ شروع ہوا، وہ یہ تھا کہ بھارت نواز جماعتوں کے ورکروں نے ''اظہارِ لاتعلق'' کے اشتہارات شائع کرنا شروع کر دیئے۔ اس اس طرح کے درجنوں اشتہارات روزانہ دیکھنے کو ملتے رہے لیکن اس کے باوجود کچھ مین سٹریم سیاسی کارکن ایسے بھی تھے، جو اس صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنی اپنی جگہ پر اس کا مقابلہ بھی کیا اور اس کے خلاف مزاحمت بھی کی اور ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے جب نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے کئی ورکروں نے اپنے بچوں کو صرف اور صرف اس لئے ہتھیاروں کی تربیت کے لئے سرحد پار بھیجا تا کہ وہ واپس آ کر اپنے خاندان کی حفاظت کر سکیں، جبکہ کئی بڑے اور متمول گھروں میں ملازمت کرنے والے کئی نوجوانوں نے 'جہاد' میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھیں حاجیوں کی طرح عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا گیا لیکن جب وہ ''سفرِ محمود'' سے واپس آئے تو انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جن گھروں میں وہ ملازمت کرتے تھے، ان سے رشتہ جوڑنے کے لئے اپنی بندوق کا استعمال کیا اور اگر چہ یہ تعداد کافی کم تھی لیکن اس صورت حال کی وجہ سے بھی کئی عزت دار گھرانوں نے کشمیر سے ہجرت کر لی تا حالیکہ وادی میں حالات ٹھیک نہیں ہو گئے، وہ اپنے گھروں سے دور ہی رہے۔ جب کہ اس وقت بندوق برداروں نے جہاں ایک طرف ہندوستانی افواج کو بارکوں سے باہر نکل کر خانہ تلاشی کی غرض سے گھروں کی خواب گاہوں تک پہنچا دیا اور ساری دنیا میں کشمیر کی خبریں سرِ فہرست آ گئیں، وہیں یہ بھی ہوا کہ بندوق کا استعمال اپنوں کے خلاف ہی ہونے لگا،

نیشنل کانفرنس، چونکہ اس سے قبل اقتدار میں تھی اس لئے اس کے بانی شیخ محمد عبداللہ کو الحاق ہند اور کشمیر کو غلامی کے پنجوں میں پھنسانے کا ذمہ دار قرار دیا جانے لگا، اس لئے سب سے پہلے سب سے زیادہ اسی تنظیم سے وابستہ ورکر اور قائدین بندوق کا نشانہ بنے، اس دوران این سی کی تقریباً پوری کی پوری قیادت نے کشمیر سے ترکِ سکونت کر کے جموں یا بھارت کے دیگر شہروں میں اپنے آشیانے بنا لئے اور ادھر کشمیر میں سیاسی ہلاکتوں کا سلسلہ مزید تیزی کے ساتھ شروع ہو گیا۔ ان واقعات کا شروع سے جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلی سیاسی ہلاکت نیشنل کانفرنس کے سرگرم کارکن محمد یوسف حلوائی ساکینہ خانقاہِ معلیٰ فتح کدل کی تھی، جس کو عسکریت پسندوں نے ۲۱ اگست ۱۹۸۹ء کی شام کو سرِ بازار گولی مار دی۔ اس ہلاکت کی وجہ سے نیشنل کانفرنس اور دیگر بھارت نواز جماعتوں کو ایک صاف پیغام ملا کہ ان کے لئے کشمیر میں جگہ تنگ ہو چکی ہے اور انھیں اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہوگا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا اور دوسری اہم سیاسی ہلاکت بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک اہم لیڈر اور کشمیری پنڈت ٹیکہ لال ٹپلو کی تھی، جسے ۱۴ ستمبر کے روز حبہ کدل میں گولی مار کر موقعہ پر ہی ہلاک کر دیا گیا، اسی سال 4 نومبر کے روز ہری سنگھ ہائی سٹریٹ میں جے کے ایل ایف کے بندوق برداروں نے ریٹائرڈ سیشن جج نیل کنٹھ گنجو کو بہت قریب سے گولی ماردی، نیل کنٹھ گنجو پہلی دو ہلاکتوں سے سے بھی زیادہ اہم اور حساس ہلاکت تھی کیونکہ گنجو نے ہی جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے بانی مقبول بٹ کو موت کی سزا سنائی تھی، جسے 11 فروری 1984ء کے دن دلی کے تہاڑ جیل میں پھانسی پر کر شہید کرنے کے بعد جیل کے اندر ہی سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح سیاسی ہلاکتوں کا ایک لامحدود سلسلہ جاری رہا، لیکن جس ہلاکت نے پورے کشمیر میں غم اور ماتم کی صف بچھا دی، وہ تھی میر واعظِ کشمیر مولوی محمد فاروق کی۔ مولوی محمد فاروق کو ان کے گھر واقع نگین حضرتبل میں 21 مئی 1990ء کے روز نامعلوم بندوق برداروں پُراسرار حالات میں گولی مار دی۔ اگرچہ میر واعظ مرحوم کی پراسرار موت ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے اور پولیس کسی بھی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ پائی ہے تاہم اس حوالے سے مختلف لوگوں کی مختلف آراء رہی ہیں، جن پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

میر واعظ مولوی محمد فاروق کا کشمیر کی سیاست میں ابتداء سے ہی ایک اہم رول رہا، وہ میر واعظ کے طور پر وہ ایک بڑے دینی عہدے پر فائز تھے ہی لیکن ساتھ ہی انھوں نے کئی ایک انتخابات میں بھی حصہ لیا تھا اور اس میں سب سے قابلِ ذکر 1987ء کا اسمبلی الیکشن تھا، جو میر واعظ نے کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے ساتھ مل کر مسلم متحدہ محاذ کے خلاف لڑا تھا (اس حوالے سے پہلے تفصیل آ چکی ہے)

اور مف کی ہار ہی دراصل کشمیر میں بندوق کی آمد کی وجہ بنی تھی۔علاوہ ازیں ان ابتدائی ایام میں کبھی بھی میر واعظ نے بندوق کے حق میں کوئی بیان دیا اور نہ ہی اس حوالہ سے کسی سرگرمی میں حصہ لیا۔مشہور انگریز مصنفہ وکٹوریہ شیفرڈ اپنی کتاب Kashmir, in conflict and the unending war کے صفحہ نمبر 153 پر اس حوالہ سے لکھتی ہیں:

''اپنے چچا مولوی محمد یوسف کی ہجرت اور شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ان کی مخاصمت کے بعد سے میر واعظ ایک 'پاکستان نواز لیڈر' کے طور پر جانے جاتے تھے۔لیکن 1983ء میں ڈبل فاروق اتحاد کی وجہ سے ان کے سٹینڈ میں تبدیلی آئی، جبکہ اس کے بعد کے حالات میں، جب مسلم جماعتوں (مف) کا عروج ہوا تو دونوں فاروقوں کی اہمیت کچھ کم ہوگئی اور ملی ٹینسی کے آغاز میں چونکہ میر واعظ کو جامع مسجد میں کافیموئٹر سٹیج حاصل تھا اس لئے عسکری جوانوں کے حساب سے میر واعظ تحریک کے حوالے سے ایک اہم رول ادا کر سکتے تھے لیکن اچانک 21 مئی کے روز چند نامعلوم بندوق برداران کے گھر میں داخل ہوگئے اور انھیں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ان کی موت پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں کی گئیں۔بھارت نواز حلقوں نے اس کا الزام ملی ٹنٹوں پر عائد کرتے ہوئے یہ جواز دیا کہ چونکہ میر واعظ الیکشنوں میں حصہ لے چکے تھے اور انھوں نے ملی ٹنٹوں کی کھُل کر حمایت نہیں کی اس لئے انھیں راستے سے ہٹا دیا گیا، جبکہ عسکریت پسندوں اور تحریک نوازوں کا الزام تھا کہ بھارتی ایجنٹوں نے انھیں اس لئے صفحہ ہستی سے ہٹا دیا کیونکہ میر واعظ تحریک کے لئے ایک انمول سرمایہ ثابت ہو سکتے تھے اور چونکہ ان کو جامع مسجد کے سٹیج پر دسترس حاصل تھی اس لئے وہ لوگوں کو تحریک کے حق میں آمادہ کرنے کیلئے اس کا استعمال کر سکتے تھے'' وکٹوریہ شفرڈ آگے لکھتی ہیں''راتوں رات ایک عجیب بات ہوئی، جو لوگ کل تک میر واعظ کو 'تحریک دشمن اور غدار' قرار دیتے تھے، انھوں نے انھیں شہیدِ ملت کا خطاب دے دیا'' جبکہ بھارت کی سرکردہ خاتون صحافی تولین سنگھ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا'' ابھی میر واعظ کو دفن بھی نہیں کیا گیا تھا کہ انھیں ایک شہید اور اعتدال پسند قائد قرار دے دیا گیا''

ان سبھی باتوں کے علاوہ جو اہم بات ہے، وہ یہ ہے کہ جتنا ماتم میر واعظ کی موت پر کشمیر میں ہوا، وہ اس وقت کی صورت حال کے حساب سے کسی ایٹم بم سے کم نہیں تھا۔ان کی شہادت صرف ان کی

ہی شہادت نہیں تھی بلکہ اس پرظلم بالائے ظلم یہ ہوا کہ ان کے جلوسِ جنازہ پرحول کے قریب سی آر پی ایف کی 69 ویں بٹالین نے اسلامیہ کالج کے قریب اندھا دھند فائرنگ کر کے تقریباً ایک سو کے قریب سوگواروں کو بھی شہید کردیا اور یہ تاریخ کشمیر، خاص طور پر بندوق کی آمد کے بعد شروع ہونے والی تحریک میں ایک دلدوز واقعہ تھا۔ میں ان دنوں روزنامہ 'اذان' میں کام کرتا تھا اور اس موت سے متاثر ہوکر میں نے بھی ایک نظم کہی تھی، جو''اذان'' میں'' آہ! میر واعظ!'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور بعد میں میرے پہلے شعری مجموعہ'' خاموش تلاطم'' میں سال 1991 بھی چھپی، یہ میری پہلی نظم تھی، جو میں نے کسی شخصیت سے متاثر ہوکر لکھی تھی، جب کہ اس طرح کی کہ دوسری اور آخری نظم 11 فروری 1997ء کو میں نے یومِ مقبول بٹ کے موقعہ پر لکھی تھی، جس کا عنوان تھا''مقبول تیری سرزمیں'' بہرحال میر واعظ سے منسوب اس نظم کے پہلے چند اشعار کچھ اس طرح سے تھے:

بجھ گئی اک اور شمع محفلِ کشمیر سے
ہر طرف پھیلا ہوا ہے اک زہریلا دھواں
دشت و صحراء اشکباری پرہوئے مجبور آج
لرز اٹھا درد کا پیغام سن کر آسماں
میر واعظ ! کون پوچھے تیرے غمزدگاں کا حال
ساتھ تیرے چل دیئے سارے ترے ماتم کناں!

میر واعظ کے جلوس پر کی گئی فائرنگ میں مرنے والوں کی تعداد سرکاری طور پر 27 بتائی گئی تھی تاہم مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس واردات میں 90 لوگ شہید ہوئے، میر واعظ کی برسی ہر سال 21 مئی کو سرینگر کے مزارِ شہداء میں منائی جاتی ہے۔ قتل کی اس واردات کے بارے میں بی بی سی اردو سروس کے اس وقت کے نیودہلی چیف ستیش جیکپ نے پنجاب کی ایک حقوق انسانی سے متعلق تنظیم کے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اس کے پاس اس بات کی مصدقہ خبر تھی کہ میر واعظ کو حزب المجاہدین کے بندوق برداروں نے اس لئے قتل کر دیا کیونکہ وہ جے کے ایل ایف کا حامی تھا اور ان دونوں تنظیموں میں آپسی رسہ کشی شروع ہوچکی تھی۔ تاہم جیکپ نے ان کے جلوسِ جنازہ میں شامل افراد پر فورسز کی فائرنگ کی سخت الفاظ میں مذمت کی تھی (وکٹوریہ شیفر، صفحہ نمبر 153 تا 155) یہ کارنامہ بدنامِ زمانہ گورنر جگموہن کے دورِ اقتدار میں پیش آیا اور اس کی وجہ سے کشمیر صوبہ باقی دنیا سے پوری طرح کٹ کر رہ گیا کیونکہ ماتم اور احتجاج کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔

میر واعظ مولوی محمد فاروق کے صاحبزادے عمر فاروق ان دنوں ابھی بمشکل سولہ سترہ سال کے تھے اور تعلیم حاصل کر رہے تھے، والد کی وفات کے بعد ان کو میر واعظ کے عہدے پر بٹھایا گیا اور ان کی حمایت میں کشمیری عوام نے زبردست ہمدردی کا مظاہرہ کیا اور آگے چل کر وہی میر واعظ علیحدگی پسند جماعتوں کے اتحاد 'کل جماعتی حریت کانفرنس' کے پہلے چیئرمین بنے۔

اس حادثے کے بعد بھی وادی میں مختلف نظریات اور اور سیاسی وابستگیاں رکھنے کی پاداش میں سینکڑوں افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا رہا اور مختلف تنظیمیں کھل کر ایک دوسرے پر بندوق اور قلم سے وار کرتی رہیں اور اخبارات میں ''مختلف تنظیموں کی آپسی سرپھٹول'' کے عنوان سے شہ سرخیاں اور مضامین شائع ہوتے رہے تاہم اس دوران مارچ 1993ء میں کشمیر کے ایک سرکردہ معالج (ماہرِ امراض قلب) ڈاکٹر عبدالاحد گورو کو بھی اسی طرح پراسرار حالات میں قتل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر گورو کو 31 مارچ 1993ء کو سرینگر کے صورہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے اغواء کر لیا گیا اور انڈسٹریل لین بژھ پورہ میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ اس حوالہ سے انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایشیا واچ نے اپنی رپورٹ میں سنسنی خیز انکشافات کرتے ہوئے کہا تھا کہ ڈاکٹر گورو کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کروایا گیا۔

55

بندوُق کی آمد اور سیاسی ہلاکتوں کا لامحدود سلسلہ...3

☆☆☆

بندوق کی آمد چونکہ اچانک ہوئی تھی اور اس کے لئے کشمیری قیادت نے نہ تو پہلے کبھی سوچا تھا، نہ ہی کوئی منصوبہ یا خاکہ بنایا تھا اور نہ ہی وہ اس کے لئے ذہنی اور جسمانی طور تیار تھی۔ قیادت کے سامنے یہ مسئلہ تب آیا جب بندوق برداروں نے میدان میں اتر کر کاروائیاں شروع کر دیں اور عوام نے انھیں گلے لگایا، گھروں میں پناہ دی، ان کی بندوق کو آنکھوں سے لگایا اور ہونٹوں سے چوما...اس کے بعد قیادت سامنے آئی اور اس نے چاروناچار اس شئے کو اپنالیا، اسی کے ساتھ چونکہ کشمیر میں پہلے سے کوئی تیاری نہیں تھی، بندوق والے اپنی کاروائیاں جاری رکھتے ہوئے مستقبل کے بارے میں بھی سوچنے لگے، چنانچہ اس دوران جو کوئی بھی ان کے راستے میں آیا یا، جس نے انھیں اس حوالے سے مزید غور و خوض کرنے یا کوئی منصوبہ بنانے کی ترغیب دی، وہ ان کا دشمن کہلایا اور اس پاداش میں اسے بغیر کوئی مقدمہ چلائے ہلاک کر دیا گیا۔ ریاست کی بھارت نواز اور مین سٹریم سے وابستہ جماعتیں ان کا سب سے پہلا نشانہ تھیں، اس کے بعد الحاق پاکستان اور خودمختار کشمیر کی حامی جماعتوں نے آپس میں زور آزمائی شروع کر دی اور فوج کو بھلا کر پہلے آپسی معاملات کو نمٹانے کو ترجیح دی گئی۔ اس رو میں کتنے ہی سیاست دان، دانشور، وکلاء، جج، عالم اور فاضل مار دیئے گئے، ان کا شمار کرنے کیلئے کئی دفاتر درکار رہوں گے تاہم کچھ ایک کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق سے شروع ہونے والی سیاسی ہلاکتوں کا تعلق ہے، اس حوالے سے ان کی جماعت عوامی ایکشن کمیٹی یا پھر ان کے فرزند مولوی عمر فاروق نے کبھی بھی کھل کر یہ نہیں کہا کہ انھیں بھارتی فوج، کسی سراغرساں ایجنسی یا پولیس نے قتل کروایا، اگرچہ دبے ہونٹوں اور اشارتاً اس بات کا کئی بار اشارہ دیا گیا کہ انھیں تحریک مخالف قوتوں نے قتل کروایا لیکن اس کے باوجود یہ بات عیاں ہے کہ یہ تحریک مخالف عناصر کون تھے، میر واعظ مرحوم کی سترہویں(17th) برسی پر عوامی ایکشن کمیٹی کی جانب سے جو اشتہار شائع کیا گیا، اس پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے سے صورت حال اور بھی واضح ہو جاتی ہے، اس میں یوں درج ہے:

''۲۱ مئی ۱۹۹۰ء کو کسی بھی صورت بھلایا نہیں جا سکتا، جب جموں وکشمیر کے سب سے بڑے آزادی پسند، قد آور اور ممتاز دینی رہنماء میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق صاحب کو ایک گہری اور گھناؤنی سازش کے تحت اسلام دشمن، تحریک دشمن اور آزادی دشمن قوتوں نے انتہائی بے دردی کے ساتھ مظلومیت کے عالم میں شہید کرا ڈالا اور پھر اس کے جسدِ خاکی کو صورہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے اپنے آبائی مکان، تاریخی میر واعظ منزل لایا جا رہا تھا تو ۶۱ ھ کے کرب و بلاء کی دردناک اور المناک تاریخ کو ایک بار پھر دوہراتے ہوئے بے لگام بھارتی فورسز نے اپنی بندوقیں، سنگینوں اور مشین گنوں کے دہانے کھول کر اندھا دھند اور بے تحاشا فائرنگ کر کے اسلامیہ کالج حول چوک میں موقعہ پر ہی ۷۵ سے زیادہ نہتے، معصوم بے بس اور ماتم زدہ لوگوں کو آناً فاناً خاک وخون کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا.....'' اس پمفلٹ نما اشتہار میں میر واعظ کے قاتلوں کو تحریک دشمن، آزادی اور دین دشمن تو قرار دیا گیا ہے لیکن انھیں بھارتی ایجنٹ یا فورسز وغیرہ نہیں کہا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قاتل دراصل اپنی ہی آستینوں میں چھپے ہوئے تھے اور یہ بھی کہ اس بارے میں عوامی ایکشن کمیٹی کو کوئی شک وشبہہ بھی نہیں تھا، جبکہ اس کے ساتھ ہی دوسری سطر میں میر واعظ کے ماتم کناں کے قاتلوں کے ساتھ ''بے لگام بھارتی فورسز'' کا لفظ واضح کرتا ہے کہ اس حوالے سے انھوں نے کسی رعایت یا لحاظ سے کام نہیں لیا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ لگانا کوئی زیادہ دشوار کام نہیں ہے کہ کشمیر میں ہونے والی اس طرح کی سیاسی ہلاکتوں کا مقصد کیا تھا اور اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ اسی طرح کی ایک بڑی ہلاکت، جس پر نہ صرف اندرونِ کشمیر بلکہ دنیا بھر میں اہل دل لوگوں نے آنسو بہائے اور اسے تاریخِ کشمیر کی بدقسمتی قرار دیا گیا، ڈاکٹر عبدالاحد گورو کی ہلاکت تھی۔

ڈاکٹر عبدالاحد گورو، کشمیر کے پہلے عالمی شہرت یافتہ ماہرِ امراضِ قلب تھے اور ان کی ہلاکت کے بارے میں اس وقت جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ نے کھل کر کہا تھا کہ ڈاکٹر گورو کو حزب المجاہدین کے کمانڈر ذوالقرنین نے کشمیر پولیس کی ایما پر قتل کروایا جبکہ خود بھی ایک فوجی آفیسر نے اس حوالے سے اپنے بیان میں یہی کہا تھا کہ حزب کے اس وقت کے سرکردہ کمانڈر ذوالقرنین کو اسی شرط پر کشمیر پولیس نے رہا کیا تھا کہ وہ اس کے عوض ڈاکٹر گورو کا قتل کرے گا۔ اس حوالے سے اُس وقت انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایشیا واچ کی ایک ٹیم بھی کشمیر آئی اور انھوں نے ڈاکٹر گورو کی ہلاکت کے حوالے سے ایک مفصل رپورٹ تیاری کی، جو آج بھی انٹرنیٹ پر Google books کے عنوان کے تحت search کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب نما رپورٹ کے صفحہ نمبر 136 پر ایشیاء واچ اپنے

مضمون The Human Rights Crises in Kashmir کے تحت رقم طراز ہے:

''کشمیر کے جانے مانے ماہرِ امراضِ قلب ڈاکٹر عبدالاحد گورو کو 31 مارچ 1993ء کو سرینگر میں نا معلوم بندوق برداروں نے قتل کر دیا ڈاکٹر گورو جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی Governing Council کے ممبر تھے، اس کی یہی سیاسی وابستگی اس کی موت کی وجہ بنی، وہ بھارتی افواج کے ہاتھوں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف بھی کھل کر بولتا تھا اور وقتاً فوقتاً وادی کا دورہ کرنے والی انسانی حقوق کی تنظیموں اور گروپوں سے ملتا رہتا تھا، ان کی موت کے بارے میں ابھی تک جو ثبوت وشواہد ملے ہیں، وہ اسی بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ ان کا قتل ملی ٹنٹ گروپوں کی سازش کا نتیجہ تھا، لیکن ساتھ ہی جو اہم اور سنجیدہ بات ہے، وہ یہ ہے کہ حکومت نے قتل سے پہلے اور بعد میں جو رول ادا کیا، اس نے اسے اور بھی مشکوک بنا دیا ہے''

اس کے کئی سال بعد کشمیر میں اُس وقت کے ڈویژنل کمشنر اور بھارت کے موجودہ چیف انفارمیشن کمشنر وجاہت حبیب اللہ نے بھی اپنی کتاب "My Kashmir Conflict and prospets of Enduring Peace" میں ایک زبردست اور سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے لکھا

> ''اپریل 1993 میں کشمیر کے سرکردہ معالج اور لبریشن فرنٹ کے سب سے بڑے پالیسی ساز ڈاکٹر عبدالاحد گورو کو حزب المجاہدین کے کمانڈر ذوالقرنین نے اغوا کر کے ہلاک کر دیا'' وہ آگے لکھتے ہیں ''پولیس نے ذوالقرنین کو حراست میں لینے کے بعد اس کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ تیار کیا اور اس نے باہر نکل کر ڈاکٹر گورو کو ہلاک کرنے کی حامی بھر لی لیکن اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں یہ سازش بے نقاب نہ ہو جائے، پولیس نے اس واقعہ کے بعد ہی ذوالقرنین کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور ڈائریکٹر جنرل آف پولیس بی ایس بیدی نے اسے پولیس کے لئے ایک بڑی کامیابی قرار دیا'' وہ اگلی سطور میں لکھتے ہیں ''اپنا مشن انجام دینے کے بعد ذوالقرنین ایک گھر میں بیٹھ کر اپنی ایک دوست (لڑکی) کے ساتھ بے فکر ہو کر وقت گزار رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس نے پولیس کا کام کر دیا ہے اس لئے وہ محفوظ ہو گیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اسے موت نے کب گھیر لیا، اس کا اسے بھی پتہ نہیں چل پایا''

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر گورو کو اس روز چند نقاب پوش بندوق برداروں نے صورہ میڈیکل

انسٹی ٹیوٹ سے 31 مارچ کی دوپہر کو ان کی ہی گاڑی میں دھوکے سے اغواء کرلیا گیا اور دو بندوق بردار اسے یہ کہہ کر صورہ میں انڈسٹریل لین کی جانب لے گئے کہ وہاں ان کا کوئی ساتھی انتہائی بیمار حالت میں ہے اور اس کا علاج کرانا مطلوب ہے لیکن وہاں پہنچ کر اسے ایک سائلینسر لگے پستول سے گولی مار کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ اس واقعہ کو لے کر حزب المجاہدین اور جے کے ایل ایف کے درمیان کافی عرصہ تک قلمی مخاصمت بھی چلتی رہی اور عسکری تصادم آرائی بھی ہوتی رہی، جو تقریباً سال 1995ء تک جاری رہی اور جس دونوں اطراف کے مزید درجنوں بندوق بردار مارے گئے۔(Asia watch report "The killing of Dr. Guru, Page no. 136)

اس کے تین ماہ بعد یعنی ۱۹ جون ۱۹۹۳ء کو جنوبی کشمیر کے قصبہ اسلام آباد (اننت ناگ) میں بھی اسی طرح کا ایک دلدوز واقعہ پیش آیا، جس میں جنوبی کشمیر کے میر واعظ ڈاکٹر قاضی نثار احمد کو (مومن آباد) بونہ دیالگام علاقے میں اغواء کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس حوالے سے جو تفصلات اس وقت سامنے آئیں، ان کے مطابق اس قتل کے لئے حزب المجاہدین کے مقامی کمانڈر رابورافع کو ذمہ دار قرار دیا گیا تھا، یہ واقعہ ۲۰ جون ۱۹۹۳ء کی صبح کو پیش آیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ڈاکٹر قاضی نثار احمد کو گزشتہ شب ان کے گھر (ریشی محلّہ) سے اغواء کرلیا گیا تھا اور رات بھر اسے کسی خفیہ مقام پر رکھا گیا لیکن علی الصباح ان کی لاش مومن آباد کے قریب ایک ویران سڑک پر پھینک دی گئی (جہاں آج بھی ایک بوڑد نصب ہے، جس پر لکھا گیا ہے کہ اس جگہ ڈاکٹر قاضی نثار احمد کو شہید کیا گیا)۔ قتل کی یہ واردات کوئی چھوٹی وارات نہیں تھی اور اس دن بھی کشمیر میں لاکھوں لوگوں نے آہ وزاری اور ماتم کیا۔ جبکہ جنوبی کشمیر میں احتجاج اور ماتم کا یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ اس موقعہ پر سرینگر سے شائع ہونے والے اخبارات میں حزب المجاہدین کی مخالف تنظیموں نے حزب پر کھلے بندوں یہ الزام عائد کیا کہ انھوں نے ہی ڈاکٹر قاضی نثار احمد کا اغوا کے بعد قتل کر دیا، جب کہ اس کے ردِعمل میں ضلع بھر میں جماعتِ اسلامی کے ارکان اور وابستہ گان (اس وقت جماعت اسلامی کو حزب المجاہدین کا سیاسی بازو کہا جاتا تھا) کو لوگوں نے نشانہ بنایا، جو سال 1979ء کے بعد جماعت کے ارکان کے خلاف ہونے والی دوسری بڑی کارروائی تھی۔ اس سے قبل 4 اپریل 1979ء کو جب پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا تو اس کے خلاف کشمیر میں سخت ردِعمل ہوا تھا اور عوام نے اس کے لئے بھی جماعت اسلامی کو ذمہ دار قرار دے کر سخت ترین احتجاج کیا، جس میں جماعت کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا، لیکن اس کے بعد دوسری بار قاضی نثار احمد کی موت پر جنوبی کشمیر میں اس طرح کا سخت ردِعمل ہوا۔ جبکہ آگے چل کر یہی ردِعمل قصبہ

اسلام آباد میں ہلال حیدر اور سیٹھ کی قیادت میں کھڑی ہونے والی سرکاری بندوق برداروں کی جماعت اخوان المسلمون کی شکل میں سامنے آیا اور ابتداء میں لوگوں نے ان کا ساتھ اسی لئے دیا تھا کیونکہ وہ ڈاکٹر قاضی نثار احمد کی موت کا 'بدلہ' لینے کی بات کرتے تھے، اس کا فائدہ سرکار نے بھی اٹھایا اور یہ جماعت پوری طرح ایک Renigade جماعت بن کر رہ گئی اور علاقے میں متعدد ہلاکتوں کی باعث بنی۔ ڈاکٹر قاضی نثار کا رول کشمیر میں جاری تحریک کے حوالے سے کافی اہم تھا، وہ اس وقت بھی حکومت کے خلاف سرگرم تھے، جب باقی لوگ ابھی خوابِ غفلت میں محو تھے، جب کشمیر میں گورنر جگموہن نے سال 1986ء میں ہندو تہواروں پر گوشت خوری پر کشمیر میں پابندی عائد کر دی تو ڈاکٹر قاضی نثار واحد شخص تھے، جنہوں نے اسے ایک غیر شرعی فعل قرار دے کر اسلام آباد میں اپنے ہاتھوں سے بھیڑ ذبح کئے اور ان احکامات کو ٹھکرایا۔ اس کے بعد انھوں نے ہی مسلم متحدہ محاذ کی بنیاد رکھی لیکن خود 1987ء کے انتخابات میں حصہ نہیں لیا، بعد کے برسوں میں وہ حریت پسند قیادت کے ساتھ ساتھ کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے رہے لیکن حق پرستی اور خودداری کا دامن کبھی ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ راقم کا ان کے ساتھ بہت قریبی رابطہ تھا اور میں اکثر اسلام آباد کے ریشی محلّہ میں ان کے گھر جایا کرتا تھا، وہاں میں صرف یہ کام کرتا تھا کہ جب وہ عوام کے دینی اور سماجی مسائل کو سنتے اور ان کا شرعی حل تجویز کرتے تو میں یہ باتیں خاموشی کے ساتھ سنتا رہتا تھا، ان کی ذہانت اور فصاحت کا یہ عالم تھا کہ اکثر اوقات وہ متحارب اور متصادم فریقین میں صلح صفائی کروا دیتے اور وہ اختلافات چھوڑ کر دوست بن کر ہی ان کے گھر سے باہر نکلتے.....اس قتل کے بعد بھی اگرچہ سیاسی ہلاکتوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد کی دوسری بڑی ہلاکت پیپلز کانفرنس کے اس وقت کے چیئرمین عبدالغنی لون کی تھی۔ جس پر اگلی قسط میں تبصرہ ہوگا۔

بندوق کی آمد اور سیاسی ہلاکتوں کا لامحدود سلسلہ....4

نیشنل کانفرنس کے کارکن محمد یوسف حلوائی کو پائین شہر کے فتح کدل خانقاہ معلیٰ علاقہ میں 21 اگست 1990ء کو جب قتل کیا گیا تو بہت کم لوگوں کے دماغ میں یہ بات آئی ہوگی کہ سیاسی ہلاکتوں کا یہ سلسلہ آگے چل کر اس قدر بھیانک صورت اختیار کرلے گا کہ اس کی زد میں تحریک کی اگلی صفوں میں شامل اعلیٰ عہدہ دار اور سیاسی قائدین بھی آسکتے ہیں اور سیاسی مخالفین کو قتل کرنا اور راستے سے ہٹانا مختلف تنظیموں کا بنیادی نکتہ بن جائے گا۔ صرف دو برس بعد، سال 1992ء میں مختلف عسکری تنظیموں کے درمیان آپسی تصادم آرائی کا سلسلہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ہر روز اخبارات میں متصادم تنظیموں کی الزام تراشی پر مبنی بیانات کی تعداد دیگر خبروں سے زیادہ ہوتی تھی۔ ہندوارہ تحصیل کے بالائی علاقہ جات خاص طور پر راجواڑ، ترہگام، رفیع آباد اور ملحقہ جات میں روزانہ کسی نہ کسی عسکریت پسند کے دوسری تنظیم کے ہاتھوں ہلاکت کی اطلاعات ملتی رہتی تھی اور ہر دو تنظیمیں ایک دوسرے کو تحریک دشمن، دین دشمن اور بھارتی آلہ کار قرار دیتی تھیں۔ اس علاقے میں سب سے زیادہ تصادم آرائی البرق (جس کی سیاسی ونگ عبدالغنی لون کی پیپلز کانفرنس تھی) اور حزب المجاہدین (جس کی سیاسی ونگ سید علی شاہ گیلانی کی جماعتِ اسلامی تھی) کے درمیان ہوتی رہی، جبکہ اس علاقے میں لبریشن فرنٹ کا بھی کافی اثر تھا اور فرنٹ کی البرق کے ساتھ نظریاتی قرابت بھی تھی، لہذا ابتداء میں ان دو تنظیموں نے حزب المجاہدین کے خلاف اتحاد کیا، اس کے بعد اس میں کئی دیگر چھوٹی چھوٹی تنظیمیں شامل ہوگئیں اور اگر چہ ان سبھی تنظیموں کے نام یاد کرنا قدرے دشوار ہے تاہم ان میں اعمر مجاہدین، مسلم مجاہدین، جمیعت المجاہدین اور لبریشن فرنٹ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، یہ سبھی مشترکہ طور حزب المجاہدین کے خلاف نبرد آزماء تھیں حالانکہ ان سبھی تنظیموں نے بندوق بھارت کے خلاف اٹھائی تھی لیکن اس طویل لڑائی میں بڑے بڑے کمانڈر، جو سچ مُچ ان دنوں فورسز کے لئے ایک مصیبت بن چکے تھے، آپسی سر پھٹول میں مارے گئے۔ لڑائی میں دونوں جانب کا نقصان ہوا اور دونوں ایک دوسرے پر تحریک دشمنی اور دین دشمنی کا الزام عائد کرتے رہے اور تقریباً سال 1996ء تک اس حوالے سے سرینگر میں موجود ان تنظیموں کے قائدین (سیاسی و عسکری) ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن کرتے رہے۔ اگر چہ سال

96-1995 کے آس پاس لبریشن فرنٹ نے ہتھیار چھوڑ کر سیاسی راستہ اختیار کرلیا تھا اور اس کے اولین چار کمانڈروں میں سے دو کمانڈر شیخ عبدالحمید اور اشفاق مجید وانی پہلے ہی شہید ہو چکے تھے جبکہ جاوید احمد میر اور محمد یاسین ملک گرفتار ہونے کے بعد جب رہا ہوئے تو انھوں نے مسلح جدوجہد کو خیر باد کہہ کر سیاسی راستہ اختیار کرلیا۔ اسی کے ساتھ اس محاذ میں شامل دیگر کئی تنظیمیں بھی بکھرتی چلی گئیں اور اگرچہ اس کے بعد آپسی سر پھٹول کم ہوگئی لیکن ایک دوسرے کے خلاف نظریاتی بنیادوں پر الزام تراشی کا سلسلہ جاری رہا اور اتحاد بنتے اور ٹوٹتے رہے۔ اس دوران سیاسی اختلافات اور باہمی جامہ چاکی کے باوجود جو مزاحمتی قیادت ابھر کر سامنے آئی اس میں سید علی گیلانی، عبدالغنی لون، شبیر احمد شاہ، محمد یاسین ملک، نعیم احمد خان، مولوی عمر فاروق، شیخ عبدالعزیز، مولوی عباس انصاری، پروفیسر عبدالغنی بھٹ شکیل احمد بخشی اور فضل الحق قریشی وغیرہ شامل تھے اور جب سال 1993 میں کل جماعتی حریت کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو یہی وہ قائدین تھے، جو اس کے بانی ممبران بنے اور انہی میں سے سات قائدین اس کی ایکزیکیٹو کونسل میں شامل ہوئے۔ حریت کے آئین کے مطابق تمام تنظیموں نے اپنے آپسی اختلافات بھلا کر اس بات پر توجہ دینے کا اعادہ کیا کہ مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت حل کیا جانا چاہیے، حالانکہ اس قیادت میں سید علی گیلانی اور شیخ عبدالعزیز جیسے لیڈران الحاق پاکستان کے حامی تھے اور محمد یاسین ملک، شبیر احمد شاہ، عبدالغنی لون اور فضل الحق قریشی وغیرہ خودمختار کشمیر کے حامی تھے، جبکہ پروفیسر عبدالغنی بھٹ، مولوی عباس انصاری اور کئی دیگران اگرچہ پاکستان کی جانب جھکاؤ رکھتے تھے لیکن انھوں نے اس کا کبھی بھی کھل کر اظہار نہیں کیا اور اس ضمن میں اکثر خاموش ہی رہے۔ تاہم حریت کانفرنس میں بھی جلد ہی دراڑیں پڑ گئیں اور اس کے ایک قائد سید علی گیلانی نے الگ سے حریت (گ) کی بنیاد ڈالی، پہلی حریت میں شامل اکثر تنظیمیں بھی ٹوٹ گئیں، کچھ کی وفاداری حریت (گ) کے ساتھ وابستہ ہوگئی جبکہ کچھ دوسری حریت کے ساتھ جا ملے، جس کے چیئر مین کبھی مولوی عمر فاروق تھے، کبھی پروفیسر عبدالغنی اور کبھی مولنا عباس انصاری، لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کے وجود کو ٹھکرانے اور ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔

ادھر دوسری جانب سیاسی ہلاکتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اب چونکہ عسکریت کسی حد تک کمزور ہو چکی تھی اور اگر تھی بھی تو اس میں وہ عناصر کم ہی بچے تھے، جو سیاسی اور نظریاتی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کا خون بہاتے تاہم سیاسی سطح پر ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ نہیں تھما تھا۔ حتیٰ کہ میر واعظ مولنا محمد فاروق کی بارہویں برسی پر 21 مئی 2002ء کو عیدگاہ سرینگر میں، جب لوگوں

کی بھاری تعداد میر واعظ کے مزار پر جمع ہوئی، بعض نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے پیپلز کانفرنس کے لیڈر اور تحریکِ مزاحمت کے ابتدائی قائد عبدالغنی لون کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مولوی محمد فاروق، ڈاکٹر عبدالاحد گورو اور ڈاکٹر قاضی نثار احمد کے بعد عبدالغنی لون کی ہلاکت کشمیر کی تحریکِ مزاحمت کے لئے واقعتاً ایک بہت بڑا دھچکہ تھی، اس روز کے حالات کے ہم خود بھی چشم دید گواہ رہے ہیں اور چونکہ ہر سال میر واعظ کی برسی پر ہم پریس رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کا یہ دن کافی مصروف رہتا تھا اور میر واعظ منزل سے نکلنے والے جلوس کے ساتھ ساتھ ہم بھی چل دیتے تھے، اس لئے ان واقعات پر ہماری مکمل نظر رہتی تھی، ان نوں حریت کانفرنس کے اس دھڑے کے چیئر مین پروفیسر عبدالغنی بھٹ تھے، جلسہ گاہ میں جب میر واعظ عمر فاروق، پروفیسر بھٹ، عباس انصاری اور عبدالغنی لون نے تقریریں ختم کیں اور اب جبکہ جلسہ اختتام پذیر ہونے جارہا تھا اور قائدین سٹیج سے اتر رہے تھے، اسی دوران نعروں اور شوروغل کے درمیان دھکم پیل میں قائدین بھی ایک دوسرے سے جدا ہوگئے اور عین اسی موقعہ پر سٹیج کی دوسری جانب کئی گولیوں کی آوازیں سُنی گئیں، جن میں عبدالغنی لون اور ان کا ایک باڈی گارڈ بری طرح سے زخمی ہوگئے، جن کو اگرچہ ہسپتال لے جانے کی کوشش کی گئی لیکن بیکار ثابت ہوئی اور دونوں موقعہ پر ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے، جلسہ گاہ میں موجود کئی دیگر افراد بھی اس دوران گولیاں لگنے سے زخمی ہوگئے تاہم قاتل اپنا کام کرنے کے بعد جائے واردات سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

قتل کی اس وارات کے ساتھ جس واقعہ کا کافی گہرا تعلق ہے اور جس کو اکثر مبصرین نے اس وقت لون کی موت کے لئے ذمہ دار بھی ٹھہرایا، وہ اس سے تقریباً دیڑھ ماہ قبل دوبئی میں ہونے والی 'غیر مقیم کشمیریوں' (Non resident Kashmiri) کی ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس تھی، جس میں دنیا کے بیشتر مما لک میں مقیم کشمیری دانشوروں اور سیاست دانوں نے حصہ لیا اور مسئلہ کشمیر کے حوالے سے ایک اعلامیہ بھی جاری کیا گیا۔ یہ اعلامیہ کشمیر میں پاکستان نواز سوچ رکھنے والے قائدین کی تنقید کا نشانہ بنا اور اس حوالے سے کافی الزام تراشی بھی ہوئی، خاص طور پر حریت (گ) میں چونکہ زیادہ تر ممبران اسی سوچ سے وابستہ تھے، انھوں نے اپنے اپنے جلسوں اور جلوسوں میں اس حوالے سے لون اور ان تمام لوگوں پر، جو دوبئی کانفرنس میں شامل ہوئے تھے، پر کافی تنقید کی، حالانکہ لون کی موت کے بعد ان کے چھوٹے صاحبزادے سجاد غنی لون نے 8 جولائی 2003ء کو ایک پریس کانفرنس میں کھل کر کہا کہ لون صاحب کو مروانے میں حریت (گ) کے چیئر مین سید علی گیلانی نے اہم رول ادا کیا...لیکن لون کے بڑے صاحبزادے بلال غنی لون نے اگرچہ کھل کر کسی کا نام نہیں لیا لیکن وہ اس بات سے انکار نہیں

کرتے کہ ان کے والد کو ایک گہری سیاسی سازش کے تحت مروایا گیا اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے عالمی سطح پر جو سوچ پیدا ہونے لگی تھی، اسے دبا دیا جائے، لیکن ان کا کہنا ہے کہ لون صاحب کے قاتلوں نے صرف لون صاحب کی ذات کا قتل کیا، نہ کہ ان کی سوچ یا ان کے نظریے کا۔

اس سے قبل سال 1996 میں عبدالغنی بھٹ کے گھر واقع راول پورہ سرینگر پر ایک زبردست بارودی حملہ کیا گیا تھا جس میں ان کے مکان کا مغربی حصہ تباہ ہو گیا اور در و دیوار کو شدید نقصان پہنچا، میں ان دنوں دہلی کے ایک ٹی وی چینل کے لئے ویڈیو گرافی کے علاوہ ہفت روزہ چٹان کے لئے بھی رپورٹنگ کرتا تھا اور میں نے اس تباہ شدہ مکان کی عکس بندی بھی کی تھی۔ اس کے بعد 3 جنوری 2002ء کو (ان کی موت سے تقریباً چار ماہ قبل) بھی ان کے اسی مکان پر شام کے وقت نا معلوم افراد نے گولیاں چلائیں، اس وقت بھی لون اپنے کنبے کے ساتھ گھر میں موجود تھے، تاہم کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا۔ اس حوالہ سے بلال غنی لون کا کہنا ہے ''سیاسی ہلاکتوں کے پیچھے کشمیر میں ہر دور میں سیاسی لوگوں کا ہی ہاتھ رہا ہے اور یہ سلسلہ کافی طویل ہے لیکن ہمارے گھر کے خلاف اس طرح کی سازشوں کی شدت کچھ زیادہ ہی رہی، ہمارے اوپر پے در پے کئی حملے کئے گئے، جس میں ہمارا کافی نقصان ہوا لیکن اس کے باوجود نہ تو ہمارے ارادوں میں کوئی کمزوری آئی اور نہ ہی لون صاحب کا وہ نظریہ ختم ہو سکا، جس کو ختم کرنے کے لئے یہ سارے حملے کئے گئے تھے۔

جہاں تک عبدالغنی لون کی سیاسی زندگی کا تعلق ہے، وہ اگرچہ سرحدی ضلع کپوارہ کے ایک دور افتادہ علاقہ لون ہرے کے رہنے والے تھے لیکن وہ شروع سے ہی کافی سرگرم تھے، انھوں نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور ایک وکیل کی حیثیت سے عدالت میں پریکٹس کرنے لگے، اس کے بعد ان کو سیاست سے کافی لگاؤ ہو گیا اور انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ 1966ء کے آس پاس وابستہ ہو گئے، وہ سید میر قاسم اور بخشی غلام محمد کے دور اقتدار میں وزارت کی کرسی پر بھی فائز ہوئے لیکن میر قاسم کے دورِ اقتدار میں ان کی کانگریس قیادت کے ساتھ اَن بن ہو گئی اور انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ پہلے شیخ محمد عبداللہ کے کافی قریب رہے اور نیشنل کانفرنس کیساتھ کچھ عرصہ وابستہ بھی ہوئے لیکن دونوں کے مزاج اور سوا چ میں چونکہ کافی فرق تھا اس لئے 1977ء میں جنتا پارٹی کے ساتھ وابستہ ہو گئے، انتخابات میں حصہ لیا اور تاریخ میں پہلی بار جنتا پارٹی کو جن دو ممبران کی بیک وقت کامیابی وادی کشمیر میں حاصل ہوئی، ان میں عبدالغنی لون کے علاوہ عبدالرشید کابلی شامل تھے، عبدالغنی لون نے کپواڑہ ضلع کے سرحدی اور پہاڑی حلقہ انتخاب کرناہ سے بھی الیکشن لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ ان کی بیباکی اور جرأت مندانہ سوچ

ہمیشہ ان کی سیاست پر حاوی رہی اور وہ مصلحت پسندی سے ہمیشہ دور رہے۔ میں اپریل 1993ء میں چٹان کے ساتھ وابستہ ہوا اور ستمبر 2004ء (اپنی گرفتاری) تک اس ادارے کے ساتھ جڑا رہا، اس دوران مجھے ان سے ملنے کا کافی موقعہ ملا اور ان کے تقریباً دس انٹرویوز بھی میں نے اسی اخبار کے لئے کئے تھے۔ اگر چہ مجھے مزاحمتی تحریک میں شامل تقریباً سبھی اولین قائدین کے انٹرویو کرنے کا موقعہ ملا لیکن لون کا طریقہ کچھ مختلف تھا، انھوں نے کئی بار انٹرویو کے بعد مجھ سے ایک دلچسپ بات کہی ''میں بھارت کے خلاف جتنا بول سکتا تھا، بول چکا، اگر انٹرویو تیار کرتے وقت آپ کو کوئی ''کمی'' محسوس ہو، آپ کو اختیار ہے کہ اُس کمی کو ضرور دور کریں'' خاص طور پر سال 96ء میں جب حکومت نے اس بات کا کافی پروپیگنڈا کیا کہ حریت قائدین کو پاکستان اور دیگر کئی ممالک سے بھاری رقومات ملتی ہیں، جس کو وہ کشمیر میں ملی ٹینسی اور افراتفری کے لئے استعمال کرتے ہیں، ان دنوں بھی میں نے ان کا انٹرویو کیا تھا اور انھوں نے اپنے خیالات کا کچھ اس طرح سے اظہار کیا تھا ''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ حکومت کس طرح کی باتیں کر رہی ہے، کیا بھارت کو ابھی بھی یہ بات سمجھنا پڑے گی کہ کشمیر میں اس کے خلاف ایک جنگ جاری ہے اور جب جنگ جاری ہوتی ہے تو اس کیلئے ہتھیاروں کی ضرورت بھی پڑتی ہے، بھارت جیسے طاقتور اور بڑے ملک کے خلاف لڑنے کیلئے ہمیں پیسے کی بھی ضرورت ہے اور ہتھیاروں اور حمایت کی بھی، میرے لئے بحیثیت ایک لیڈر اس طرح کا پیسہ شیر مادر کے برابر ہے اور میں اس سے ہرگز انکار نہیں کر سکتا'' مجھے یاد ہے کہ اس انٹرویو نے جہاں عوام کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا، وہیں ان کے سیاسی حریفوں کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے سوائے اس کے کہ حکومت کے 'الزامات' کی تردید کرتے رہے، اور کچھ بھی نہیں کیا۔ اس سے قبل جب 2000ء میں سجاد غنی لون کی شادی لبریشن فرنٹ کے بانی امان اللہ خان کی صاحبزادی کے ساتھ راولپنڈی پاکستان میں ہوئی تو لون نے دورۂ پاکستان کے دوران وہاں بھی اپنے حریفوں کو کھری کھری سنائی تھی، جس کی بازگشت راقم نے دوسرے سال یعنی جون 2001 میں دورۂ پاکستان کے دوران بھی سُنی اور میرے ساتھ ایک طویل مباحثہ کرنے والے ایک اجنبی مہمان نے کہا تھا ''لون کے بارے میں ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں، وہ اگر چہ پاکستانی نہیں لیکن وہ ہندوستانی بھی نہیں ہے، وہ ایک سچا کشمیری قائد ہے اور ایسے قائدین کی کشمیر کو کافی ضرورت ہے'' ادھر لون کے بڑے صاحبزادے اور حریت لیڈر بلال غنی لون کا اپنے والد کے بارے میں کہنا ہے ''لون ایک کشمیری لیڈر تھا، اسے نہ تو بھارت پسند کرتا تھا اور نہ ہی پاکستان، وہ جب بھی بات کرتا تھا، کشمیری عوام کی بات کرتا تھا اور اس کی یہی بیباکی اس کی موت کا سبب بھی بن گئی''

57

مزاحمتی جماعتوں کی جوڑتوڑ کا مخمصہ!

اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مزاحمتی تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی کشمیر کا وہ مسئلہ، جوکئی دہائیوں سے سردخانے میں پڑا ہوا تھا، باہر نکلا اور دنیا کی توجہ کا مرکز بنا، بندوق کی آمد کے لئے اگر چہ کشمیری ذہنی طور تیار نہیں تھے لیکن انھوں نے اس نئی شئے کو اس طرح اپنایا گویا یہ کبھی ان سے جدا ہوئی ہی نہیں تھی۔اُونچے اور دشوار گزار دروں اور خار دار وادیوں سے گزرتے ہوئے بندوق بردار نوجوان وادی میں داخل ہوئے تو ان کی چند ایک ابتدائی کاروائیوں سے ہی بھارت میں افراتفری مچ گئی اور فوج کی بھاری تعداد کو وادی میں دھکیل دیا گیا، گھر گھر تلاشیوں کا سلسلہ شروع ہوا، مخبر بھی میدان میں آئے اور شناختی پریڈوں کا خوفناک سلسلہ شروع ہوا، انٹیروگیشن سینٹروں، تعدیب خانوں اور مار کٹائی کرنے کے مراکز قائم ہوئے، گوگولینڈ، پاپا ٹو اور ہری نواس جیسے انٹیروگیشن سینٹروں میں نہ صرف گرفتار شدگان کی ہڈی پسلی توڑی جاتی تھی بلکہ درجنوں کے حساب سے حراستی ہلاکتوں کی جائے وقوع بھی یہی مراکز تھے، آپریشن ٹائگر (پکڑو اور مارو) کے زمانے میں سینکڑوں افراد کو فرضی جھڑپوں میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، ایک طرف ساری دنیا کشمیر میں بندوق کی آمد کی وجہ سے اپنی توجہ اس جانب مبذول کئے ہوئے تھی تو دوسری جانب مزاحمتی گروہوں میں نظریاتی اور سیاسی اختلافات کی بناء پر جنگ وجدل کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ابتدائی ایام میں ایسے نشانہ باز میدان میں اترے، جن کا ایک بھی فائر ضائع نہیں ہوتا تھا، بم دھماکوں سے شروع ہونے والی عسکری کاروائیوں نے بھیانک صورت اختیار کی اور کچھ ہی دنوں میں ریاستی پولیس کے انسپکٹر جنرل ایم ایم سکسینہ کے دفتر میں ایسا دھماکہ ہوا کہ سارا انتظامیہ ہل کر رہ گیا، دن دہاڑے قصبہ جات اور شہر ودیہات میں اس فوج پر حملے ہونے لگے، جس کا نام سُن کر کبھی کشمیری عوام کی روح کانپ اٹھتی تھی، کچھ ہی ایام میں لوگوں نے اپنی گھڑیاں پاکستان کے معیاری وقت کے ساتھ ملالیں اور سارے گھر، دکان اور بازار سبز رنگ سے رنگ ڈالے تو لوگوں میں ایک نئی زندگی انگڑائیاں لینے لگی اور ایسا لگ رہا تھا گویا کشمیر کا مسئلہ اب حل ہوا کہ اب.....!....لیکن ایسی اس خطۂ زمین کی قسمت کہاں تھی!

ابتداء میں حال یہ تھا کہ بقولِ بلال احمد صدیقی، پاکستان میں صرف اورصرف جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے جوانوں کوہتھیار دیئے جاتے تھےلیکن ۹۰ءمیں ہی جب انھوں نے دیکھا کہ کشمیریوں نے ہتھیاروں کا دل وجان سے استقبال کیا ہےاور وہ بھارت مخالف مزاحمت کا جی جان سے ساتھ دے رہے ہیں تو پاکستان نے ایک اور تنظیم حزب المجاہدین کو میدان میں اتار دیا۔اس کے بعد دیگر کئی تنظیمیں مثلاً العمر مجاہدین، تحریک المجاہدین، الجہاد، سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ....اور دیکھتے دیکھتے تقریباً ستر تنظیمیں میدان میں اتر آئیں اور ہر تنظیم کے پاس پانچ سے دس تک کی افرادی قوت ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۹۰ءمیں جب میں روزنامہ آفتاب میں سب ایڈیٹر تھا تو میرے ذمے صرف تین خبریں ہوتی تھیں ان میں سے پہلی خبر پاکستان کے حالات سے تعلق رکھتی تھی، دوسری کا تعلق خلیجی جنگ (کویت پر عراقی حملہ) سے تھا اور تیسری اور اہم خبر میرے ذمے یہ تھی کہ کشمیر میں سرگرم عسکری تنظیموں کے بیانات کو آفتاب کے آخری صفحے کے نچلے حصے پر ایڈجسٹ کیا جائے اور مجھے یاد ہے کہ میں نے اس دوران تقریباً ستر عسکری تنظیموں کے دوسطری بیانات کو اس آدھے صفحے میں سمویا ہے، کئی مرتبہ ہمیں دھمکایا بھی گیا اور ایک بار تو آفتاب کے دفتر کے اوپر سے گرینڈ پھینکا گیا جو دوسری جانب سناتن دھرم پرتاب سبھا کی عمارت میں پھٹا، اس سے آفتاب کی ایک کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا اور میرے ہاتھوں میں چوٹیں آئیں۔ان دنوں میرے ساتھ دوسرے سب ایڈیٹر ظہور ہاشمی بھی بیٹھتے تھے، اس روز ہم بال بال بچے.....بہرحال ذکر یہ چلا تھا کہ بندوق نے وادی میں داخل ہوکر ابتدائی ایام میں جو کہرام مچایا اور جس کی وجہ سے کشمیری عوام کی سوچ بدلی، قدریں بدلیں اور پامال بھی ہوئیں، وہ دھماکے دار سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکا اور نہ ان واقعات کا تفصیلاً ذکر کرنا یہاں ممکن ہے۔البتہ اس دوران جو اہم بات ہوئی اور جس کی جانب توجہ مبذول کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ ہے متعدد سیاسی اور عسکری تنظیموں کی جوڑ توڑ اور نئی نئی تنظیموں کا وجود میں آنا اور حالات کی دھند میں گم ہوجانا۔اس حوالے سے اگر سب واقعات کا تفصیلاً جائزہ لیا جائے تو کئی دفاتر درکار رہوں گے اور شائد کوئی یونیورسٹی خوش ہوکر راقم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی دے دے لیکن اس کے باوجود کچھ ایک تنظیموں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

کشمیر میں بھارتی فورسز کیلئے وبالِ جاں بننے والی سب سے بڑی تنظیم حزب المجاہدین کے اولین کمانڈر انچیف ماسٹر محمد احسن ڈار تھے، جبکہ اسی تنظیم کے ایک اور کمانڈر ناصرالاسلام نے حزب کی قیادت سے بغاوت کرکے جمعیت المجاہدین نام کی اپنی الگ سے تنظیم بناڈالی اور یہ تنظیم حزب سے بھی زیادہ سخت گیر واقع ہوئی، کچھ دن بعد ماسٹر محمد احسن ڈار کی اپنی قیادت (سید صلاح الدین، عبدالمجید ڈار

اور شمس الاسلام) کے ساتھ تضاد پیدا ہو گیا اور انھوں نے شباب المسمون نامی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ جو آگے چل کر مسلم مجاہدین نامی تنظیم میں مدغم ہوئی۔ احسن ڈار کی گرفتاری کے بعد چونکہ مسلم مجاہدین میں شامل اکثر سینئر کمانڈران ماسٹر محمد سلیم وانی، گل محمد وانی اور جاوید جہانگیر وغیرہ پاکستان چلے گئے، اس لئے یہ تنظیم پوری طرح سے دوسرے راستے پر چلی گئی۔ العمر مجاہدین نامی تنظیم جب ٹوٹی تو مشتاق احمد زرگر تو اپنی جگہ برقرار رہے لیکن شبیر احمد زرگر نے اپنی علیحدہ تنظیم العمر کمانڈوز کے نام سے بنالی اور آگے چل کر یہ بھی مسلم مجاہدین میں شامل ہوگئی۔ مسلم مجاہدین ٹوٹی تو ایک گروپ کے کمانڈر انچیف شبیر احمد زرگر بنے اور دوسری تنظیم کے کمانڈر شہلی پورہ اچھ بل کے غلام نبی عرف آزاد نبی بنے۔ آزاد نبی والی مسلم مجاہدین بھی آگے چل کر سرکاری بندوق برداروں میں شامل ہوگئی اور شبیر احمد زرگر ابھی تک قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہی حال الجہاد نامی تیسری بڑی تنظیم کا بھی ہوا۔ ان کے کمانڈر انچیف شیخ عبدالعزیز 1994ء میں گرفتار ہوئے تو اسی تنظیم کے ایک ڈپٹی کمانڈر جمال افغانی نے جہاد فورس کے نام سے اپنی الگ تنظیم بناڈالی، اسی دوران جب میں برزلہ علاقے میں ان کا انٹرویو کرنے پہنچا تو دو سوالوں کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا ''مجھے لگتا ہے کہ آپ میرا انٹرویو نہیں بلکہ انٹیروگیشن کر رہے ہیں''، تنظیم کے دوسرے دھڑے کی کمانڈ پلوامہ کے ایک انتہائی نیک نوجوان خلیل الرحمان نے سنبھالی، اور جب اس کا انٹرویو کرنے میں اور قمر الاسلام کاکا پورہ علاقے میں گئے تو وہاں حالت یہ تھی کہ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑتے نظر آئے..بہرحال سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ نامی تنظیم نے سب سے پہلے اپنا نام بدل کر اخوان المسلمین رکھا اور محمد یاسین بٹ اس کے کمانڈر انچیف بنے، ایک دو اغوا کاری کی وارداتوں کے بعد اس میں بھی دراڑ پیدا ہوگئی، اس تنظیم میں بلال احمد بیگ کے علاوہ نیاز احمد صوفی المعروف مٹھہ صوفی بھی شامل تھے، مٹھہ صوفی کو فورسز نے سرینگر کے راجباغ علاقہ میں اچانک گولی مار کر شہید کر ڈالا، جبکہ دوسری جانب شمالی کشمیر کے حاجن سوناواری علاقے میں یوسف پرے المعروف 'کوکہ پرے' نے اپنا الگ یونٹ کھڑا کر لیا، جو آگے چل کر سرکاری کھاتے میں چلا گیا اور عوامی لیگ کی شکل میں وقت کی دھند میں کھو گیا اس میں جاوید شاہ اور عثمان مجید بھی شامل تھے، جاوید شاہ کو عسکریت پسندوں نے تار گھر سرینگر کے نزدیک ایک فدائی حملہ میں ہلاک کر ڈالا جبکہ عثمان مجید ابھی تک حکومت میں شامل ہیں۔ مولانا عباس انصاری کی جانب سے بنائی گئی 'کشمیر لبریشن کونسل آگے چل کر جماعت جموں کشمیر ماس مومنٹ میں بدل گئی جس کی سالار اعلیٰ ان دنوں فریدہ بہن جی ہیں، جن کو کئی سال تک دلی کے تہاڑ جیل میں اذیتناک دن دیکھنے پڑے۔ ان پانچ عسکری تنظیموں کے ٹوٹنے کے بعد ایک واحد عسکری تنظیم بھی تھی،

جس میں دو تنظیمیں مدغم ہوئیں لیکن پھر الگ نہیں ہوئیں۔ ان میں نصر اللہ لنگڑیال کی جماعت حرکت الجہادِ اسلامی اور جاوید ڈبرن عرف سکندر کی جماعت حرکت المجاہدین شامل تھی، انہوں نے مل کر حرکت الانصار بنائی، جو آگے چل کر جیش محمد میں بدل گئی، اسی کے کمانڈروں میں مولانا سجاد افغانی اور اظہر مسعود بھی شامل تھے، نصر اللہ لنگڑیال کو جب راقم نے دورانِ اسیری سینٹرل جیل سرینگر میں (۲۰۰۸ء میں) دیکھا تو میں حیران ہوا کہ اس کے پاس جیل میں ایک موبائل فون تھا اور اس پر اسے نہ جانے کہاں کہاں سے فون آرہے تھے....ادھر سرینگر میں ابتدائی عسکری تنظیموں میں مشتاق الاسلام کی قیادت والی جماعت حزب اللہ بھی مشتاق کی گرفتاری کے بعد ختم ہوگئی، مشتاق تقریباً پندرہ سال جیلوں میں رہے اور اس دوران اس جماعت کا نام بدل کر مسلم لیگ رکھ دیا گیا، جس کو چلانے والے (بقول مشتاق الاسلام) اس کے والدین تھے، تاہم اس دوران ان کے شریک خاص مسرت عالم نے بھی مسلم لیگ کو اپنے طور چلایا لیکن مشتاق کی گرفتاری کے وقت، دسمبر 2004ء میں یہ تنظیم بھی دو حصوں میں بٹ گئی اور دوسرے حصے کے سالار اعلیٰ مسرت عالم بنے۔ یہی حال کچھ سیاسی جماعتوں کا بھی ہوا، پیپلز لیگ کے دو گروپ ہوگئے، ایک کی قیادت ایس حمید نے سمبھالی اور دوسری کی قیادت پاکستان میں مقیم محمد فاروق رحمانی نے، جب کہ اس سے پہلے ایس حمید الجہاد سے وابستہ تھے، رحمانی گروپ کے ماتحت جہاد فورس تھی اور حمید گروپ کے ماتحت الجہاد لیکن بعد میں دونوں میں سے کوئی بھی نہیں رہی۔ سید علی شاہ گیلانی جماعتِ اسلامی کے قائد تھے، اگر چہ وہ امیر جماعت کبھی نہیں بنے لیکن انھیں جماعت میں اہم حیثیت حاصل تھی۔ گیلانی چونکہ ابتداء سے ہی انفرادیت پسند رہے ہیں اور انھوں نے اپنے فیصلہ جات دوسروں سے منوائے، انھیں حریت کانفرنس میں جماعت کی نمائندگی حاصل تھی لیکن چونکہ حریت کانفرنس میں مشاورت کا سسٹم رائج تھا اس لئے گیلانی صاحب کو یہ ہوا راس نہ آئی اور ان کو جماعت سے بے دخل کر دیا گیا۔ انھوں نے اپنی جماعت تحریک حریت کے نام سے بنائی اور حریت کانفرنس نام کے سب سے بڑے حریت پسند محاذ کے دو ٹکڑے بھی اسی کے ساتھ ہوگئے۔ حریت کی کئی اکائیاں بھی ٹوٹیں اور وفاداریاں بھی بدل گئیں۔ عبدالغنی لون کی قیادت والی جماعت پیپلز کانفرنس بھی کئی بار ٹوٹی۔ لون کی موت کے بعد پہلے اس جماعت کے دو حصے ہوئے، ایک حصہ گلزار کشمیری نے سمبھالا اور دوسرا حصہ ڈاکٹر غلام محمد حبی نے، جبکہ بعد میں اس کے مزید دو حصے ہوئے اور یہ جماعت مرحوم لون کے دو بیٹوں بلال اور سجاد غنی لون میں بٹ گئی جبکہ لون کی صاحبزادی ایڈوکیٹ شبنم لون ان سے الگ ہوگئیں اور 2002ء کے اسمبلی انتخابات میں حصہ لیا لیکن ان کے والد کے حامیوں نے انھیں مسترد کر دیا، آگے چل

کر 2008 کے انتخابات میں سجاد غنی لون بھی اُترے لیکن نتیجہ ان کی توقع کے خلاف آیا، تاہم بلال غنی لون ابتداء سے ہی الیکشن کے خلاف رہے ہیں۔

یہ تو چند بڑی اور اہم سیاسی اور عسکری تنظیموں کا حال تھا لیکن اس کے علاوہ بھی درجنوں ایسی تنظیمیں تھیں جو روزانہ ٹوٹتی اور جڑتی رہیں۔ ان کا ریکارڈ ملنا کافی مشکل ہے اور اس کا احوال بیان کرنا ایک اخباری مضمون میں ممکن نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مضمون آگے چل کر کشمیر کی مسلح جدوجہد کے حوالے سے تحقیق کرنے والے طلباء کے لئے باعثِ کشش بنے اور وہ اس پر مزید ریسرچ کر کے کوئی ڈگری حاصل کرسکیں، ہم نے اپنی بساط کے مطابق اندھیرے راستے میں ایک چراغ روشن کردیا ہے، جس کی قسمت میں ہوگا، اپنا راستہ تلاش کرلے گا... کشمیر کی موجودہ تحریکِ مزاحمت میں شامل کئی افراد، جن کا کسی زمانے میں سکہ چلتا تھا، کچھ ہی برس گزرنے کے بعد عام لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوچکے ہیں لیکن جو لوگ کل تک لیڈروں کے پیچھے پیچھے چلتے تھے، آج بڑے بڑے ایوانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ حال ہی میں کشمیر کے ایک مشہور قلمکار اور دانشور ڈاکٹر جاوید اقبال نے کشمیر مسئلہ کے حوالے سے ایک مضمون میں بہت اچھی بات لکھی تھی، جس کا مفہوم تھا کہ مسئلہ کشمیر دراصل اس قدر پیچیدہ اور قد آور ہے کہ اس نے قائدِ اعظم محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، گاندھی اور شیخ محمد عبداللہ جیسے لیڈروں کا قد بھی چھوٹا کردیا، ان حالات میں کشمیر کے وہ لیڈر کس کھاتے میں رکھے جاسکتے ہیں، جو اپنے ساتھ درجن بھر حامیوں کو بھی ایک مالا میں پروکر نہیں رکھ سکتے، علاوہ ازیں کشمیری قیادت کی ایک بڑی بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وجود اور قابلیت کو تسلیم کرنے کیلئے کبھی بھی رضامند نہیں ہوتے اور ہر کوئی اپنے ساتھ والے کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور جیسے ہی موقعہ ملتا، اس 'پٹخنی' دینے سے باز نہیں رہتا۔

نوے کی دہائی...آتش وآہن کا خونین احوال(۱)

کشمیری نوجوانوں کے ہاتھوں میں بندوق کی آمد اس خطے کی تاریخ کا ایک اہم مگر خطرناک واقعہ تھا، ان چند گنے چنے نوجوانوں کا مقابلہ دنیا کی ایک بہت بڑی فوجی قوت کے ساتھ تھا جبکہ اس پر ستم یہ کہ انھیں محض چند ایک ہتھیار اور تھوڑا سا گولہ بارود دے کر اس بات کے لئے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ کشمیر میں فورسز کے خلاف اپنی کاروائیاں تیز کر دیں۔ اس بات کا اظہار اسی سلسلے کی ایک سابقہ کڑی میں بلال صدیقی کے حوالے سے تفصیلاً کیا گیا ہے کہ کس طرح سے ابتدائی کشمیری عسکریت پسندوں کو پاکستان میں موجود سرکاری ایجنسیوں نے حکم دیا تھا کہ وہ کشمیر میں اپنی عسکری کاروائیوں کا آغاز کر دیں حالانکہ وہ اس بات کے لئے نہ تو ذہنی طور تیار تھے اور نہ ان کے پاس اس کے لئے معقول افرادی قوت موجود تھی، ان حالات میں ایک بہت بڑی فوج کو بارکوں سے باہر نکالنا اور انھیں آبادیوں میں لا کر 'آپریشن' کے لئے تیار کرنا کسی خودکشی سے کم نہ تھا لیکن چونکہ کشمیری نوجوانوں کے اندر ۸۷ء کے انتخابات میں شکست فاش کا انتقام موجزن تھا اور پاکستان سمجھتا تھا کہ اگر گرم لوہے پر آج ہتھوڑا نہ مارا گیا تو اسے دوبارہ گرم کرنا کافی مشکل ہوگا، اس لئے ان پر باؤ ڈالا گیا اور اس دباؤ کو قبول کرتے ہوئے عسکریت پسندوں نے اپنی کارروائیوں کا باضابطہ آغاز ۱۳ جولائی ۱۹۸۹ء کو سرینگر کے امر سنگھ کلب، مرکزی تار گھر اور کئی دیگر مقامات پر اپنی کاروائیوں کے ساتھ کر دیا۔ یہ کاروائیاں بھارتی وزارت داخلہ کے لئے ایک ''وارننگ شارٹ'' کے برابر تھیں اور اس سے ان ایوانوں میں ہلچل مچنا ازبس ضروری تھا جبکہ اس کے ساتھ ہی شہر اور قصبہ جات میں سی آر پی ایف اور بی ایس ایف کی ایک بڑی تعداد کو تعینات کر یا گیا، جس کو سنگبازوں اور مظاہرین نے کافی وقت تک مصروف رکھا، احتجاجی مظاہروں اور دھرنوں کا لامحدود سلسلہ شروع ہو گیا اور وادیٔ کشمیر دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کی نظروں میں آ گئی لیکن اس کے بعد تقریباً اگلے چھ ماہ تک وادی میں کوئی خاص ہلاکت کا واقع پیش نہیں آیا۔ اسی دوران این سی حکومت کو برطرف کر کے ریاست میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا اور پورے بھارت میں مسلم دشمنی کے لیے 'بدنام زمانہ' جگموہن نامی ڈکٹیٹر کو ریاست کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا، اگلے برس یعنی جنوری ۱۹۹۰ء تک آتے آتے کشمیر میں صورت حال اس

قدر خراب ہوگئی کہ سرینگر میں تمام گھروں، دکانوں اور دیواروں کو سبز رنگ میں رنگ دیا گیا تھا اور لوگوں نے اپنی گھڑیاں پاکستان کے معیاری وقت کے ساتھ ملا لی تھیں۔ ان دنوں مفتی محمد سعید بھارت کے وزیر داخلہ تھے۔ جنوری میں جب کشمیر میں جلوسوں اور مظاہروں کا سلسلہ حد سے زیادہ تجاوز کر گیا تو فورسز کو مظاہرین سے نمٹنے کی ہدایات دلی سے جاری ہوئیں، جن پر عمل کرنے میں گورنر جگموہن نے ذرا بھر بھی دیر نہ لگائی اور ہلاکتوں کا جو سب سے پہلا اور بڑا واقعہ سرینگر میں پیش آیا، وہ ۸ جنوری کے دن پیش آیا، مجھے ہلکا اور دھندلا سا یاد ہے کہ اس روز سرینگر میں گاڑیوں اور آٹو رکھشاؤں کے بڑے بڑے جلوس دن بھر سڑکوں پر رواں دواں رہے۔ اسی دوران فورسز نے کئی مقامات پر عوامی جلوسوں پر فائرنگ کر دی، جس میں کل ملا کر ۱۷ افراد مارے گئے اور درجنوں دیگر زخمی ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد کشمیر میں تعینات نیم فوجی دستوں کی بندوقوں کے دہانے گویا کھل گئے اور قتلِ عام کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۵ جنوری کے روز ہندوارہ قصبے میں اسی طرح کے ایک احتجاجی جلوس پر فورسز نے فائر کھول دیا اور مزید ۱۷ افراد کو شہید کر دیا، لیکن اسی پر بس نہیں ہوئی، ۲۱ جنوری کے روز سرینگر کے بسنت باغ اور گاؤ کدل علاقوں میں فورسز نے اس سے بھی بڑا 'کارنامہ' انجام دیتے ہوئے ایک ساتھ ۵۵ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس دن کی فائرنگ کا واقعہ اس قدر شدید تھا کہ اس کی وجہ سے پوری دنیا میں کشمیر کے حوالے سے ہلچل مچ گئی اور آج کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا قتلِ عام کا واقعہ تھا۔ ان دنوں حالت یہ تھی گویا فورسز کو مکمل اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے عوام کے دلوں میں ڈر اور خوف کا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیں تا کہ وہ احتجاجی مظاہروں اور دھرنوں سے باز آ جائیں لیکن حکومت کی فراتفری اور بوکھلاہٹ کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عوام قتلِ عام کے ان واقعات سے خوفزدہ ہونے کی بجائے مزید مشتعل ہو رہے تھے اور احتجاج میں مزید شدت آ رہی تھی۔ اگلے روز یعنی ۲۲ جنوری کو جب گاؤ کدل کے قتلِ عام کے خلاف احتجاج کرنے کی غرض سے لوگ سڑکوں پر نکلے تو فورسز نے ان پر بھی فائرنگ کر دی اور مزید کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ احتجاجوں اور مظاہروں کا سلسلہ اب محض سرینگر تک ہی محدود نہیں رہا تھا بلکہ یہ جنوبی اور شمالی کشمیر میں بھی دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا اور اس کے بعد قتلِ عام کے ساتھ ساتھ 'گن پاؤڈر' چھڑک کر آگ لگانے کے واقعات بھی پیش آنے لگے۔ ۲۵ جنوری کے روز اسی طرح کے ایک مظاہرے پر قابو پانے کے لئے فورسز نے ہندوارہ قصبے میں بندوق کے ساتھ ساتھ گن پاؤڈر کا بھی آزادانہ استعمال کیا اور ۲۶ افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے علاوہ

قصبے میں آگ بھی لگا دی، جس میں تقریباً تقریباً پورا قصبہ خاکستر ہو کر رہ گیا۔ یہ غالباً فورسز کے ہاتھوں آتشزنی کا پہلا سب سے بڑا واقع تھا، اس واقعہ کی چند تصاویر کشمیر کے ایک جواں سال صحافی مرحوم قیصر مرزا نے مجھے آفتاب کے دفتر میں دکھائیں تو وہاں موجود سبھی لوگ انگشت بہ دنداں کافی دیر تک محوِ حیرت، کفِ افسوس ملتے رہے۔

یکم مارچ ۱۹۹۰ء کے دن مختلف عسکری تنظیموں کی کال پر عمل کرتے ہوئے جب شہر اور دیہات کے متعدد قافلے سرینگر کے سونہ وار علاقہ میں واقعہ اقوامِ متحدہ کے فوجی مبصرین کے دفتر کی جانب رواں دواں تھے، گورنر جگموہن کے حکم پر فورسز نے ٹینگہ پورہ بائی پاس اور زکورہ سرینگر کے دو مقامات پر بندوقوں کے دہانے کھول دیے اور ۴۷۔افراد کو موت کی نیند سلا دیا، ان میں سے ۲۱۔ افراد ٹینگہ پورہ بائی پاس (بٹہ مالو) میں مارے گئے جبکہ زکورہ کراسنگ پر ۲۶ افراد کو قتل کر دیا گیا۔

۲۱ مئی ۱۹۹۰ء کو سرینگر کے نگین حضرتبل میں جب بعض نامعلوم بندوق برداروں نے میر واعظِ کشمیر مولوی محمد فاروق کو قتل کر دیا تو ان کا جلوسِ جنازہ لے کر جانے والے مظاہرین پر اسلامیہ کالج کے قریب سی آر پی کے اہلکاروں نے اندھادھند فائرنگ کر دی اور ایک اندازے کے مطابق تقریباً ستر (۷۰) افراد مارے گئے جبکہ میر واعظ مرحوم کے تابوت میں بھی کئی گولیاں لگیں اور درجنوں لوگ بری طرح سے زخمی ہو گئے (اس حوالے سے تفصیلات سابقہ اقساط میں آ چکی ہیں) ۶۔اگست ۹۰ء کے روز فورسز نے خانیار سرینگر کے نزدیک مشالی محلّہ پر ہلہ بول دیا اور محاصرہ کر کے ملی ٹنٹوں کو تلاش کرنے کے بہانے درجنوں افراد کو تشدد کا نشانہ بنایا اور درجنوں گھروں میں لوٹ کھسوٹ کی۔اس واقع میں ۹ افراد تشدد کی وجہ سے جاں بحق ہو گئے جب کہ اس کے بعد وادی میں خانہ تلاشیوں اور محاصروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔۱۰۔اگست کے روز فورسز نے پازال پورہ ہندوارہ کا محاصرہ کیا اور مَردوں کو گھروں سے باہر نکال کر ایک میدان میں جمع کیا جبکہ خواتین کو گھروں کے اندر رہنے کی ہدایت دی گئی۔مردوں کی غیر موجودگی میں فورسز نے خوتین کے ساتھ دست درازیاں شروع کیں تو خواتین کی چیخ و پکار بلند ہوئی، محاصرے میں موجود افراد نے گھروں کی طرف جا کر خواتین کی عصمت بچانے کی کوشش کی لیکن فورسز نے ان پر بندوقوں کے دہانے کھول دیے، اس دوران دو درجن سے زائد افراد مارے گئے جبکہ متعدد دیگر زخمی ہو گئے۔۱۱ستمبر کے روز بی ایس ایف اہلکاروں نے سرینگر بارہمولہ روڈ پر ایک مسافر بردار بس کو روک کر اس پر فائرنگ کر دی، جس میں ۲۲ افراد گولیاں لگنے سے مارے گئے جبکہ بعد میں بس کو آگ لا دی گئی، جس میں مزید آٹھ مسافر زندہ جل کر جاں بحق ہو گئے۔یکم اکتوبر کے روز بی ایس ایف

اہلکاروں نے ہندوارہ میں ہی ایک اور احتجاجی مظاہرے کے دوران فائرنگ کر کے تقریباً ۲۰۔افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔اور یہ سال ۱۹۹۰ء کی ہلاکت کی آخری واردات تھی۔اس طرح سے اس سال جو درجن بھر بڑے واقعات پیش آئے ان میں کل ملا کر ۳۰۶۔افراد مارے گئے اور سینکڑوں دیگر زخمی ہو گئے جبکہ اسی سال آتشزنی، خانہ تلاشیوں اور خواتین کے ساتھ دست درازیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، جو آنے والے کئی برسوں تک جاری رہا۔اگلے برس یعنی ۱۹۹۱ء کا آغاز بھی مغل محلّہ خانیار میں ایک بڑی خونین وارات سے ہوا جب سی آر پی ایف کی بیالیسویں بٹالین نے ایک احتجاجی مظاہرے پر بلا اشتعال فائرنگ کر دی اور ۱۱/افراد کو موقعہ پر ہی مار ڈالا، ۳۰ جنوری کو اچھ بل اسلام آباد میں فورسز نے ۷۔افراد کو قتل کر دیا، ۱۱ مارچ کے دن فورسز نے رکھ ہائیگام سوپور میں سات افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ۱۶ مارچ کو پشواری ترہگام میں اس وقت ۷۔افراد اور ایک امام مسجد کو شہید کر دیا جب محصور علاقے کی ایک مسجد میں نمازیوں کو باہر آنے کے لئے کہا گیا مگر انہوں نے نماز توڑنے سے انکار کر دیا، مشتعل فورسز اہلکار مسجد میں داخل ہو گئے اور امام کو موقعہ پر ہی گولی مار دی گئی جبکہ باقی نمازیوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا گیا اور ان میں سے مزید چھ کو مسجد کے صحن میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔۵ مئی کے دن خیام چوک ناؤ پورہ میں ایک لڑکی سمیت پانچ افراد کو گولی ماردی گئی جبکہ ۸ مئی کو خانیار کے دستگیر صاحب علاقے میں فورسز نے اس وقت اندھادھند فائرنگ کر دی جب وہاں کچھ شہداء کی تجہیز و تکفین کے لئے لوگوں کی ایک بھاری تعداد جمع ہوئی تھی۔اس موقعہ پر سی آر پی ایف کی دوسری اور بی ایس ایف کی چھٹی بٹالین نے گولیوں کی برسات کر دی جس میں ایک دو سالہ بچے سمیت تقریباً اٹھارہ افراد مارے گئے۔۱۱ جون کے روز سی آر پی ایف اہلکاروں نے چوٹہ بازار حبہ کدل علاقے میں اس وقت ۳۲۔افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جب وہاں ایک ٹائر پھٹنے سے دھماکے کی آواز پیدا ہوئی۔۳ ستمبر کے روز صفا نگری نیلورہ پلوامہ میں فورسز نے مظاہرین پر فائرنگ کر کے ۲۳۔افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ان دنوں ان سبھی واقعات کے بارے میں تحقیقات کرنے کے احکامات دیئے جاتے رہے اور یقین دہانیاں کرائی جاتی رہیں کہ مستقبل میں اس طرح کے واقعات پیش نہیں آئیں گے لیکن ہر بار اس کے برعکس ہوتا رہا اور واردات پہ واردات رونماء ہوتی رہی۔

سال ۱۹۹۲ء بھی قتل و غارت گری کے اعتبار سے کچھ کم بھیانک نہیں رہا۔یہ سال بانڈی پورہ علاقہ میں جھیل ولر کے کنارے پر آباد آلوسہ دیہات میں سات ہانجیوں (Boatmen) کی ہلاکت سے شروع ہوا، ۱۳۔اپریل کے روز سوپور کے مختلف دیہات میں فورسز نے فائرنگ کر کے تقریباً ایک د

رجن افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ۲ جولائی ۹۲ء کو سرینگر کے لال چوک علاقے میں ٹائر پھٹنے کی آواز کو بم دھما کہ سمجھ کر فورسز نے فائرنگ کر دی اور ٦۔افراد کو موقعہ پر ہی ہلاک کر ڈالا۔٦ جولائی کے روز فورسز نے اشبر نشاط اور ملحقہ علاقہ جات کو محاصرے میں لے کر خانہ تلاشیوں کے دوران فائرنگ کر دی، جس میں ۱۰۔افراد مارے گئے، فورسز نے دعویٰ کیا تھا کہ اس سے قبل وہاں محصور عسکریت پسندوں نے فورسز پر فائرنگ کی تھی۔۵ اگست کے روز تاج محلّہ ترال میں ٦۔افراد کو مار دیا گیا، ۱۲ اکتوبر کو ہندوارہ تحصیل میں ۱۰۔افراد مارے گئے جبکہ ۱۲ دسمبر کو کشتواڑ میں سات افراد کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔

سال ۹۳ء کا آغاز سوپور قصبے میں آتشزنی کے واقع سے ہوا، ٦ جنوری کے روز بی ایس ایف کی ۹۴ ویں بٹالین نے سوپور کا وسیع محاصرہ کر لیا اور اکبر بھائی نامی ایک افغان عسکریت پسند کو پکڑنے کے لئے تلاشیوں کا سلسلہ شروع کیا، اسی دوران قصبے میں آگ نمودار ہوئی، جس میں ۳۷ رہائشی مکانات اور ۳۵ دکانیں خاکستر ہو گئیں۔اس واقع میں تقریباً ۵۷۔افراد ہلاک ہو گئے۔۱۰۔اپریل کو لال چوک سرینگر میں فورسز نے محاصرے کے دوران دھرم ارتھ ٹرسٹ بلڈنگ میں آگ لگا دی، جس سے ۵۹ رہائشی مکانات، ۱۹۰ دکانیں، ۵۳ گودام اور دو آفس کمپلیکس جل کر خاکستر ہو گئے جبکہ اس واقعہ میں تقریباً ۴۰۔افراد بھی جاں بحق ہو گئے۔۱۰ جولائی کو فورسز نے حضرت بابا پیام الدین ریشیؒ کی درگاہ (بابا ریشی) ٹنگمرگ میں فائرنگ کر کے دس زائرین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔۳۰ جولائی کے روز ہانگل بچھ پلوامہ میں ایک واقعہ میں فورسز نے ۱۲ عام لوگوں کو قتل کر دیا۔یکم اگست کے روز دری بل خانیار میں ایک جوڑے کی ہلاکت کے خلاف احتجاج کرنے والے ہزاروں لوگوں پر فورسز نے فائرنگ کر دی اور مزید دس افراد کو ہلاک کر دیا۔۱۴ اگست کے روز بعض نامعلوم بندوق برداروں نے سرتھل ڈوہ میں ایک مسافر بس کو روک کر اس میں سے ہندوؤں کو باہر نکالا اور ۱۴ کو موقعہ پر ہی ہلاک کر ڈالا۔۲۲ اکتوبر (جب درگاہ حضرتبل کا محاصرہ کر لیا گیا تھا) فورسز نے بجبہاڑہ اسلام آباد میں ایک احتجاجی جلوس پر فائرنگ کر دی اور پچاس افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔۲۰ نومبر کے روز فورسز نے آدھی پورہ سوپور میں فائرنگ کر کے ایک خاتون سمیت پانچ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ۲۴ نومبر کے دن فورسز نے سنگرامہ بارہمولہ میں خانہ تلاشیوں کے بعد فائرنگ کر دی اور سات شہریوں کو ہلاک کر ڈالا جبکہ ۲۲ دسمبر کو بلبل نوگام شانگس اسلام آباد میں فائرنگ کے ایک واقعہ میں چھ عام شہری مارے گئے۔یہ وہ زمانہ تھا، جب تشدد کی مختلف وارداتوں میں روزانہ ایک سے ڈیڑھ درجن کی اوسط سے عام شہریوں کا مرنا ایک عام بات بن گئی تھی۔اس مضمون میں صرف ان چند ایک واقعات کا ذکر کرنا ہی ممکن تھا، جن میں ایک ساتھ

آدھ درجن یا اس سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے جبکہ اس کے علاوہ انفرادی طور پر بھی روزانہ کئی کئی افراد کے مرنے کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر ان دنوں ہفت روزہ 'چٹان' میں ''ہفتہ رفتہ'' کے نام سے ایک ایسا مستقل کالم شروع کیا گیا، جس میں مرنے والوں کا مختصر احوال درج کیا جاتا تھا۔ اس مضمون کے حوالے سے بھی اس کالم سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ابھی کچھ اور بھی بڑے اور اہم واقعات کا ذکر کرنا باقی ہے۔

نوے کی دہائی...آتش وآہن کا خونین احوال (۲)

سال ۱۹۸۹ء سے بندوق کی آمد کے ساتھ ہی کشمیر میں اگلے دس برسوں میں خاص طور پر قتل وغارت گری کی جو بڑی وارداتیں پیش آئیں، ان کا حساب رکھنا اور مرنے والوں کا شمار کرنا اگرچہ کافی دشوار عمل ہے اور اس کے لئے عرق ریزی کے کئی کئی سمندر پار کرنے ضروری ہیں لیکن اس کے باوجود مضامین کی زیرِ نظر سیریز میں (جو کہ اب باضابطہ کتابی کی صورت میں شائع ہونے جارہی ہے) کچھ ایسے بڑے واقعات بھی ہیں، جن کا ذکر کرنا بے حد ضروری ہے، یہ ایسے واقعات ہیں، جن میں فورسز اور عسکریت پسندوں کی باہمی تصادم آرائی کی آڑ میں کئی کئی عام شہری موت کے گھاٹ اتار دیے گئے اور سبھی کو کراس فائرنگ کے کھاتے میں ڈال دیا گیا، ان وارداتوں میں عوامی جائیداد اور مال وجان کے ساتھ ساتھ کشمیری خواتین کی عزت وناموس کو بھی تار تار کیا گیا۔ گزشتہ شمارے میں اس گنتی کو سال ۹۳ء کے اواخر پر چھوڑ دیا گیا تھا، اس کے بعد کے چند بڑے واقعات کا حوال کچھ اس طرح سے ہے:

۲۴ جنوری ۹۴ء کو کپواڑہ میں ایک محاصرے کے دوران فریقین میں جم کر فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوررسز کے ہاتھوں ۱۱۸ افراد مارے گئے، جن میں کچھ عام شہری اور کچھ مقامی وغیر مقامی عسکریت پسند بھی شامل تھے۔ ۱۰ مئی کے روز فورسز نے علی الصباح بانڈی پورہ کا محاصرہ کرلیا اور دن بھر خانہ تلاشیوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے بعد شام کے وقت ۱۹ افراد کو حراست میں لے لیا، اگلے دن ان سبھی کی لاشیں لواحقین کے سپرد کردی گئیں تو علاقے میں حراستی ہلاکت کے اس بڑے واقعہ کے خلاف قیامتِ کبریٰ برپا ہوگئی۔ یہ سال اگرچہ باہمی تصادم آرائی اور جھڑپوں کا سال تھا اور اس میں طرفین کا کافی نقصان ہوا لیکن ان وارداتوں میں ایک یا دو سے زیادہ افراد کو ایک ساتھ قتل نہیں کیا گیا جبکہ اگلے سال یعنی ۱۹۹۵ء میں ۱۰ فروری کے روز فورسز نے سرینگر کے گاڈہ کوچہ علاقے میں اندھادھند فائرنگ کرکے ۶ دکانداروں کو ہلاک کرڈالا، سال ۱۹۹۶ء کا آغاز برشالہ ڈوڈہ میں ۵ جنوری کے روز پندرہ افراد کی ہلاکت سے ہوا، جن میں سے ۱۰ کا تعلق ایک ہی کنبے سے تھا۔ ۳۰ مارچ کو درگاہ حضرت بل میں ایک طویل محاصرے کے بعد فورسز نے ۱۳۲ افراد کو ہلاک کردیا، جن میں بیشتر عسکریت پسندوں کا تعلق

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے شبیر صدیقی گروپ سے تھا (یہ درگاہ شریف کا دوسرا محاصرہ تھا، اس سے قبل ۱۵ اکتوبر سے ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ء تک بھی اس درگاہ پر عسکریت پسندوں نے قبضہ کئے رکھا، جو آخر کار ان کے سرینڈر کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ ان دونوں وارداتوں کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی عکس بندی بھی کی) ۸ جون کو نامعلوم مسلح افراد نے کلماری ڈوڈہ میں ۸ ہندوؤں کو قتل کر ڈالا۔ ان وارداتوں کے حوالے سے عسکریت پسند اور فورسز ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے رہے، لیکن کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آسکا۔ ۲۰ مارچ ۹۷ء کی شب کو سنگرام پورہ بڈگام میں بعض بندوق بردار داخل ہو گئے اور اندھا دھند فائرنگ کر کے ۷ عام شہریوں کو ہلاک کر ڈالا۔ ۱۸ اپریل کو نامعلوم، نقاب پوش بندوق برداروں نے پران کوٹ ادھمپور میں ایک ہندو بستی میں داخل ہو کر پہلے لوگوں کو گھروں سے باہر نکالا اور بعد میں ان پر اندھا دھند فائرنگ کر دی، جس میں ۲۷ عام لوگ مارے گئے۔ اس واقعہ کی وجہ سے جموں صوبے میں کافی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی اور کافی دیر تک ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا رہا۔ ۱۹ ستمبر کو ارن بانڈی پورہ میں بی ایس ایف کی مارٹر شیلنگ میں ۱۱ دیہاتی مارے گئے۔ ۲۶ جنوری ۹۸ء کی صبح، جب ہم پریس رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کی ایک بڑی تعداد سرینگر کے بخشی سٹیڈیم میں بھارت کے یوم جمہوریہ کی تقریب کی کوریج کے لئے جمع ہو رہی تھی، عین اسی وقت یہ خبر آئی کہ وندہامہ گاندربل میں نقاب پوش بندوق برداروں نے ۲۷ کشمیری ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یوم جمہوریہ کی تقریب کو ادھورا چھوڑ کر تمام صحافی اور سٹیڈیم میں موجود انتظامیہ کے اعلیٰ آفیسر وندہامہ کی جانب دوڑ پڑے، لار کے قریب واقع اس دیہات میں قیامت کا سماں تھا اور پنڈتوں کی لاشیں ایک لمبی قطار میں رکھی ہوئی تھیں۔ (مارچ ۱۹۹۶ء میں درگاہ حضرت بل کے بعد یہ دوسرا بڑا واقعہ تھا، جس میں میں نے ایک ساتھ اتنی بڑی تعداد میں لاشوں کی تصاویر اتاریں) ۱۹ جون کے دن اسی طرح کی ایک اور واردات میں نامعلوم بندوق برداروں نے چمپناری ڈوڈہ میں ۲۵ غیر مسلموں کو قتل کر دیا۔ ۲۸ جون کو مڑوہ ڈوڈہ میں ۲۶ راشٹریہ رائفلز کے اہلکاروں نے ۱۹ افراد کو قتل کر دیا، جو وہاں عید کے موقعہ پر اکٹھے ہوئے تھے۔ ۲۸ جولائی کے روز نامعلوم بندوق برداروں نے ڈوڈہ کے دو دیہات میں ۱۶ افراد کو قتل کر دیا، ۳ اگست کو اس سے بھی بڑی واردات سیالاں پونچھ میں پیش آئی، جس میں سات بچوں سمیت ۲۰ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۱۸ اگست کے روز کالا بن کٹھوعہ میں جموں ہماچل روڈ پر بندوق برداروں نے مزدوروں کے ایک ٹھکانے پر حملہ کر کے ۳۵ غیر کشمیری مزدوروں کو قتل کر دیا۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۹ء کو ادھمپور اور راجوری ضلع میں تین بڑی وارداتوں میں فورسز نے کل بیس افراد کو قتل کر دیا۔ ان میں سے

موڑاہ پوتا بدھل میں ایک ہی کنبے کے۴ افراد، بلالا راجوری میں ۷، جبکہ برلیارادھمپور میں ۹ افراد کو ہلاک کیا گیا۔ ۲۹ جون کو نامعلوم عسکریت پسندوں نے موڑا اچھائی ادھمپور اور سہوتری پونچھ میں مجموعی طور پر ۱۷ افراد کو قتل کردیا، یہ وہ دور تھا جب پراسرار حالات میں صوبہ جموں میں غیر مسلموں کی ہلاکتوں کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی وجہ سے دونوں فرقوں میں اگرچہ اندر ہی اندر زبردست تناؤ اور کشیدگی کا ماحول قائم رہا لیکن دونوں نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کرکے ان عناصر کی کوششوں کو ناکام بنادیا، جو خطے میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے کے درپہ تھے۔ ۳۰ جون کے دن ایسی ہی ایک اور مشتبہ واردات میں اسلام آباد کے قریب ۱۵ بہاری اور نیپالی مزدوروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۲۸ فروری ۹۹ء کو بعض نامعلوم افراد نے قاضی گنڈ اسلام آباد میں ۵ عام افراد کو قتل کردیا۔ ۱۷ مارچ کو اسی علاقے میں ایک بی ایس ایف کیمپ کے قریب بعض نامعلوم بندوق برداروں نے ۷ ٹرک ڈرائیوروں کو قتل کردیا۔ ۲۰ مارچ کو سرینگر سے تقریباً ۷۵ کلومیٹر دور جنوبی کشمیر کے چھٹی سنگھ پورہ علاقہ میں سکھوں کے ایک گاؤں پر ہلہ بول کر ۳۵ سکھوں کو قتل کردیا گیا۔ میں اس دن اپنے گھر گیا ہوا تھا، صبح کی خبروں سے اس واقعہ کی اطلاع ملی تو میں وہیں سے چھٹی سنگھپورہ کے لئے چلا گیا، وہاں قیامت کا سماں تھا، اس وقت وہاں ماتم کرنے والے سکھوں نے کہا کہ شام کے وقت فوجی اہلکاروں نے سکھوں کو مقامی گوردوارے کے باہر اس وقت گھیر لیا، جب وہ اپنی روزانہ کی عبادت کے اختتام کے بعد باہر آرہے تھے، سکھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ وہی فوجی تھے، جو گزشتہ شب اسی موقعہ پر گوردوارے کے پاس آئے اور پوچھ تاچھ کی، لیکن بعد میں اسلام آباد کے ایس ایس پی فاروق خان نے انہیں ہدائت دی کہ وہ اس کا الزام فورسز پر نہ لگائیں کیونکہ بقولِ ان کے یہ کام ملی ٹنٹوں نے انجام دیا تھا۔ بعد میں پانڈیان کمیشن کے چیئرمین جسٹس پانڈیان نے بھی یہی کہا تھا کہ برا کہ پورہ اسلام آباد میں ۲۴ مارچ کو مارے گئے وہ چار افراد عام شہری تھے، جن کو فورسز نے چھٹی سنگھپورہ کے قتل عام میں ملوث غیر ملکی دہشت گرد قرار دیا تھا۔ اس واقعہ کی عکس بندی کرنے والا میں پہلا صحافی تھا۔ ۳۰ مارچ کو اسلام آباد کے پتھری بل علاقہ میں اسی واقعہ کے خلاف احتجاج کرنے والے مزید ۷ افراد کو فورسز نے قتل کرڈالا۔ ۱۴ مئی کو فورسز نے ان پانچ کمسن طلباء کو ٹنگڈار کپواڑہ میں ایک فرضی مقابلہ میں قتل کرڈالا جن کو سوپور سے سے گرفتار کیا گیا تھا۔ یکم اگست کو پہلگام علاقہ میں ایک پر اسرار واردات میں ۳۵ امرناتھ یاتری مارے گئے۔ جس کا الزام وہاں تعینات سی آر پی ایف کی بٹالین پر عائد کیا گیا۔ اسی روز قاضی گنڈ اور اچھہ بل علاقوں میں دو الگ الگ وارداتوں میں مزید ۲۷ غیر ملکی مزدوروں کو قتل کردیا گیا۔ ۲ اگست کے روز کپواڑہ کے ایک سرحدی علاقہ میں نامعلوم افراد نے ایک ہی

کنبے کے سات افراد کو قتل کر دیا۔۲ اگست کو ہی ڈوڈہ ضلع میں نامعلوم افراد نے ۱۱ عام شہریوں کو قتل کر دیا ۔۳ فروری ۲۰۰۱ء کو سرینگر کے مہجور نگر علاقہ میں بعض نامعلوم بندوق برداروں سکھوں کی ایک بستی میں داخل ہو گئے اور ۷ سکھوں کو گولی مار کر ہلاک کر ڈالا۔۱۰ فروری کے دن کوٹ چھتوال راجوری میں نامعلوم افراد نے ۱۲ افراد کو ہلاک کر ڈالا، جن میں چھ بچے اور چار خواتین شامل تھیں۔۱۷ مارچ کو نامعلوم بندوق برداروں نے اٹھولی ڈوڈہ میں ۸ افراد کو قتل کر ڈالا۔۲۱ مارچ کو پونچھ کے منڈی علاقہ میں فورسز اور عسکریت پسندوں کے درمیان ہونے والی ایک بڑی جھڑپ میں ۱۰ عسکریت پسند مارے گئے۔۲۱ جولائی کو شیشن ناگ اسلام آباد میں ایک واردات میں ۱۳ افراد مارے گئے۔۲۲ جولائی کو ڈوڈہ کے چیرجی اور ٹاگوڈ علاقوں میں ۱۲ افراد کو قتل کر دیا گیا، ۴ اگست کو لڈر شروتی دھار، ڈوڈہ میں ۱۵ افراد کو پراسرار حالات میں قتل کر دیا گیا۔۶ اگست کو اٹھولی کشتواڑ میں ۷ افراد کو قتل کر دیا گیا۔۸ دسمبر کو ۱۰ غیر مسلح افراد کو بارہ مولہ کشمیر میں قتل کر دیا گیا۔۶ جنوری ۲۰۰۲ء کو لڈواور راسو دوڈہ میں ۶ افراد کو قتل کر دیا گیا۔۲۰ جنوری کو بیرا پونچھ میں ۱۱ افراد کو قتل کر دیا گیا۔۲۱ جنوری کو سالوہ مینڈھر (پونچھ) میں ۱۴ افراد کو قتل کر دیا گیا، جن میں ۸ کمسن بچے بھی شامل تھے۔۱۶ فروری کو نرالہ راجوری میں ۱۸ افراد کو قتل کر دیا گیا۔۱۴ مئی کو کالو چک جموں میں مسلح نقاب پوشوں نے ۳۶ افراد کو قتل کر ڈالا، سرکاری طور الزام لگایا گیا کہ ملی ٹنٹوں کا ایک گروپ سرحد پار سے آیا اور یہ واردات انجام دے کر چلا گیا۔اسی سال ۱۳ جولائی کے دن قاسم پورہ جموں میں مزید ۲۸ افراد کو قتل کر دیا گیا۔۵ اگست کو نون ون پہلگام میں مسلح نقاب پوشوں نے ۹ امرناتھ یاتریوں کو قتل کر دیا۔۲۴ مارچ ۲۰۰۳ء کو ولگام کے ناڈی مرگ علاقے میں بعض نامعلوم مسلح افراد نے کشمیری پنڈتوں کی ایک بستی میں داخل ہو کر اندھا دھند فائرنگ کر دی، جس میں ۱۱ خواتین سمیت ۲۴ افراد مارے گئے۔ اس واقعہ کی عکس بندی (رپورٹنگ) بھی ہم نے کی اور اس کی تصاویر بھی اتاریں۔اس واقعہ کی کشمیر میں بڑے پیمانے پر مذمت کی گئی۔حکومت نے ملی ٹنٹوں پر اور ملی ٹنٹوں نے فورسز پر الزامات عائد کئے تاہم کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی۔۲۲ اکتوبر کو دمیل ڈوڈہ میں شادی کی ایک تقریب پر حملہ کر کے ۷ افراد کو قتل کر دیا گیا۔۵ اپریل ۲۰۰۴ء کو اسلام آباد کے پہلگام علاقے میں ۵ افراد کو قتل کر دیا گیا۔یکم مئی کو کالہنگ ڈوڈہ اور بسنت گڑھ ادھمپور میں دو بڑی مگر پراسرار وارداتوں میں نامعلوم افراد نے مجموعی طور ۳۵ افراد کو قتل کر ڈالا۔

اس طرح سے قتلِ عام کے خونین احوال کی اس دوسری قسط میں اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں زیادہ تر وارداتوں کا تعلق ''نامعلوم، نقاب پوش اور پراسرار بندوق برداروں'' کے ساتھ ہے۔

ان واقعات میں ایک ہی فرقہ کے لوگوں کو ایک خاص مقصد سے قتل کیا گیا اور وہ خاص مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح سے ریاست جموں وکشمیر میں فرقہ وارانہ افراتفری پیدا کی جائے اور اس کا فائدہ اٹھایا جائے لیکن اس دھرتی کے باشعور باشندوں نے ان سبھی وارداتوں کا صبر واطمینان کے ساتھ مقابلہ کیا اور ان عناصر کے عزائم کو ناکام بنادیا۔ جبکہ بعض واقعات میں براہ راست فورسز اور عسکریت پسندوں کا ہاتھ تھا۔ اسی کے ساتھ خونین واقعات کا یہ احوال اگرچہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے لیکن ابھی اور بھی بہت سی داستانیں ایسی ہیں، جن کا تعلق بندوق اور تحریکِ مزاحمت کے ساتھ ہے۔ اور جو اپنے قارئین تک پہنچانا مقصود ہیں، بشرطیکہ زندگانی۔

60

مرحلہ یہ اس قدر آساں نہ تھا!

تاریخِ کشمیر پر مضامین کا رواں سلسلہ تقریباً تقریباً اپنے اختتام کی طرف گامزن ہے اور بحیثیت ایک قلمکار، ابھی تک مجھے اس بات کا بالکل بھی اطمینان نہیں ہو رہا ہے کہ تنازعہ کشمیر کے وہ سبھی گوشے، جن سے پردہ اٹھنا چاہیے تھا اور جو اس ریاست کے سادہ لوح مگر باشعور باشندہ گان تک پہنچنا چاہیے تھے، میرے قلم کے ذریعے پہنچ پائے، وجہ ایک تو میری ناتوانی اور کم مائگی رہی اور دوسرے اخباری کالموں میں اس قدر جگہ بھی نہیں ہوتی کہ اتنے بڑے مسئلہ کے تعلق سے قارئین کی امیدوں کو پورا کیا جا سکے، تیسری اور سب سے بڑی بات یہ کہ مضامین کے رواں سلسلے کی ابتداء میں یہ خیال بھی دامن گیر نہ رہا کہ چند ایک مضامین کا یہ سلسلہ ایک ضخیم کتابی شکل اختیار کر لے گا، اگر ایسا ابتداء میں ارادہ ہوتا تو شائد صورت حال کچھ مختلف ہوتی اور مضامین کا اصلوب اور طرزِ بیان بھی مختلف ہوتا، بہر حال جو کچھ بھی میرے لئے ممکنات میں سے تھا، اسے بروئے کار لانے کی پوری کوشش کی گئی۔ اس دوران اگر چہ رواں تحریکِ مزاحمت کی قیادت کا ایک مختصر سا تعارف کرانا بھی مطلوب تھا لیکن موجودہ حالات میں ایسا کافی دشوار دکھائی دیا، وجوہات کچھ بھی ہوں لیکن موضوع کے ساتھ اگر انصاف نہ ہو پائے تو ایک قلم کار کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے اور اس خلش کو اپنے سینے میں کانٹے کی طرح موجود رکھ کر اس حالت میں زندہ رہنا کافی دشوار ہوتا ہے۔

مضامین کے رواں سلسلے کا سب سے بڑا مقصد یہ باور کرانا تھا کہ دراصل مسئلہ کشمیر (یا تنازعۂ کشمیر) صرف ساٹھ ستر سال پرانا نہیں بلکہ اگر چہ ریاست کی تکمیل ۱۸۶۴ء میں ڈوگروں کی آمد کے ساتھ ہوئی لیکن تنازعہ کشمیر اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب رنچن شاہ نے کوٹہ رانی کے ساتھ شادی کی، اسلام قبول کیا اور کشمیر پر ایک لداخی راجہ حکومت کرنے لگا، اس کے چند سال بعد رانی نے اپنے لئے افغانستان سے نیا راجہ ادھیان دیو برامد کرایا اور کشمیر غیر کشمیریوں کے ہاتھوں میں جاتا رہا، تب سے اب تک اس ملک پر کسی نہ کسی صورت میں غیر ملکیوں کا قبضہ اور تسلط جاری رہا اور یہ تنازعہ بھی اپنی جگہ قائم و دائم رہا۔ میرا کامل یقین ہے کہ اگر ایک بار کشمیری عوام یہ بات ذہن نشین کر لینے میں کامیاب ہو جائیں

کہ مسئلہ (یا تنازعہ) کشمیر ساڑھے چھ سو سال قدیم ہے اور اس کی اصلی جڑیں ایک طویل تاریخی سرزمین میں پھیلی ہوئی ہیں تو شائد اس تنازعہ کو سمجھنا اور اس کا حل ڈھونڈنا کافی آسان ہو جائے گا۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا بھر کے مسائل اور تنازعات میں سے مسئلہ کشمیر سب سے زیادہ الجھا ہوا اور طویل ترین زیرِ التویٰ تنازعہ ہے، جو تاریخ کی اونچی، نیچی ڈگر اور پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے نہ صرف نت دن زیادہ حساس اور پیچیدہ ہوتا چلا گیا بلکہ اس میں ہر بدلنے والے دن کے ساتھ ساتھ مزید الجھاؤ اور پیچیدگی پیدا ہوتی رہی۔ اگر اُس تاریخ اور ان تاریخی واقعات کا جائزہ لیا جائے، جن کی وجہ سے یہ مسئلہ الجھتا چلا گیا اور ان قائدین کا احتساب کیا جائے، جن کی وجہ سے یہ سب ہوتا رہا تو ایک نئی کتاب درکار ہوگی اور ایک نئے موضوع کے ایسے دروازے کھل جائیں گے، جن کو بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ تاریخِ کشمیر کی خمدار زلفیں اس قدر پریشان اور الجھی ہوئی ہیں کہ کوئی بھی عاشقِ نامراد انہیں درست کرنے کی کوشش کرے گا تو ان ویرانوں میں خود بھی الجھ کر رہ جائے گا۔ وقتاً فوقتاً نام نہاد مورخین، جو دراصل کسی ایک مکتبۂ فکر کے ترجمان یا کسی ایک نظریے کے زرخرید ایجنٹ ہوتے تھے، نے کشمیر کی تاریخ کے اوراق پر سیاہی پوتنے کا ہی کام کیا ہے۔ کسی سلطان نے چند درباریوں کو سونے کی چند اشرفیاں دے کر اپنے نام کے قصیدے لکھوائے اور کسی غاصب وظالم بادشاہ نے اپنے سے پہلے بادشاہوں کے کارناموں کو مسخ کرنے کے لئے قلم کو خرید لیا اور اس طرح سے اس جنتِ ارضی کی تاریخ ''تاریخ کی بدترین تاریخ'' بن کر رہ گئی اور ایسے میں اگر آج کی تاریخ میں کوئی مخلص اور بے لوث قلم کار ان الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو وہ چند ہی قدم آگے چل کر اپنا راستہ کھو جاتا ہے اور اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ آدھے راستے میں ہی مایوس اور پریشان ہو کر لوٹ آتے ہیں۔ اگرچہ راقم نے اس حوالے سے زیادہ گہرائی میں غوطے لگانے اور گوہرِ نایاب تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تاہم اپنی بے چارگی، ناتوانی اور لاچاری کا احساس قدم قدم پر دامن گیر رہا، کئی ایک موڑ ایسے بھی گزرے، جب مایوسی کا اندھیرا، امید کے اجالوں پر حاوی ہوتا نظر آنے لگا لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم شاملِ حال رہا اور قدم آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ کشمیر کے دورِ حاضر کے اعلیٰ پایہ کے مورخ اور محقق پروفیسر فدا محمد حسنین کے ایک چھوٹے سے مشورے نے کافی کام دیا کہ Re-seasrch کا مطلب ہوتا ہے، کھوج کرنا اور پھر کھوج کرنا لہٰذا اس سلسلے میں کوئی بھی بات نہ تو حرفِ آخر ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی محقق یا مورخ کی بات کو حتمی تصور کیا جا سکتا ہے۔ تحقیق کے دروازے کسی بھی موڑ پر بند نہیں کئے جا سکتے اور نہ ہی کوئی محقق اپنے تئیں کامل وجامع ہونے کا دعویٰ پیش کر سکتا ہے، پروفیسر صاحب کے قولِ فیصل نے کافی ہمت اور امید بڑھائی اور تاریخ کے یہ

ساٹھ اوراق راقم جیسے ناتوان کے ہاتھ لگے۔ جہاں تک موجودہ دور کی تاریخ کشمیر کا تعلق ہے، اس راستے میں بہت ہی زیادہ کنکر، پتھر، کانٹے اوراڑچنیں حائل تھیں۔نوے کی دہائی میں شروع ہونے والی مسلح بغاوت (تحریکِ مزاحمت) روزِ اول سے ہی انتشار اور بدنظمی کی شکار رہی، آغاز کے برسوں میں اس تحریک سے وابستہ افراد سے ایسی ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں کہ جن کی وجہ سے صرف اور صرف کشمیری عوام کے مصائب ومشکلات میں ہی اضافہ ہوا۔ گروہی فسادات، آپسی تصادم آرائی، خانہ جنگی اور کشت و خون کے ماحول اور مخاصمت کی شدید لہر کے باوجود اگر یہ تحریک اب تک جاری ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ اس تحریک میں کشمیری عوام کا لہو شامل ہے اور عوام نے جو قربانیاں پیش کی ہیں، ان میں خلوص اور نیک نیتی کا عنصر بدرجہ اتم شامل رہا اور اسی گوہرِ نایاب وبیش قیمت کے صدقے یہ تحریک اب تک جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ ورنہ ایمانداری سے دیکھا جائے تو قیادت کی سطح پر تب بھی خامیاں موجود تھیں اور آج بھی ان کو صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ جیل کی کال کوٹھریوں میں ایک بزرگ ساتھی اسیر نے ایک بار بہت ہی جذباتی ہوکر کہا تھا ''اگر تحریکی افراد کی غلطیوں کی پردہ پوشی کی جائے تو یہ بھی تحریک کے تئیں ایک خدمت ہی تصور ہوسکتی ہے'' اس کے جواب میں میں نے کہا تھا'' تحریک کسی ایک فرد یا جماعت کی میراث نہیں، نہ ہی کسی ایک طبقے نے اس کے لئے اپنے یا اپنے عزیز و اقارب کا لہو بہایا ہے، اس کا تعلق پوری کشمیری قوم کے ساتھ ہے اور سبھی نے اپنے اپنے انداز اور مقدر کے مطابق اپنا اثاثہ لٹایا ہے، اور اس تحریک کا تعلق ایک پوری قوم کے مستقبل کے ساتھ ہے، اس لئے میرے ایمان اور میری غیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سے وابستہ سبھی بڑے چھوٹے افراد اور قائدین کا محاسبہ ہونا چاہیے، ان کی غلطیوں اور لغزشوں کو Check کیا جانا چاہیے اور ان کی تعمیری تنقید کی جانی چاہیے تاکہ تحریک کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور اس تنازعے کا کوئی قابلِ قبول اور دیرپا حل نکل سکے۔ تاکہ آنے والے دنوں میں اگر پھر سے کسی تحریک کی ضرورت پڑے تو اگلی نسلیں اس تحریک کی تاریخ اور انجام سے کوئی سبق حاصل کر کے مستقبل کا پروگرام تشکیل دے سکیں، اس لئے تحریک کی تاریخ کے حوالے سے کسی طرح کی مصلحت پسندی سے کام لینے کا مطلب اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ زیادتی کرنے کے مترادف ہے، ایک گناہِ عظیم ہے اور میں اس گناہِ عظیم میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے لکھی جانے والی کتابوں میں انگریز مورخ اور ماہرِ زرعی اصلاحات، سر والٹر لارنس کی کتاب ''دی ویلی آف کشمیر'' ابھی تک ایک ایسی مستند کتاب ہے، جس میں ابہام یا غلط فہمیوں یا غلط بیانیوں کی بہت کم گنجائش نظر آتی ہے۔ اس کتاب کو محض تاریخ کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک کتاب قرار نہیں

دیا جاسکتا بلکہ اس میں کشمیر کی سیاسی، سفارتی اور ثقافتی تصویر پیش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور ایک صابر وذی ہوش قاری کو اس میں سے بہت کچھ ملتا ہے لیکن کتاب کا منفی پہلو یہ ہے کہ ایک مقام پر ایک تصویر میں دکھائے گئے مختلف طبقوں کا تعارف کراتے ہوئے گوجروں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ فرقے قرار دیا گیا ہے (دیکھیں صفحہ نمبر ۳۱۶ پر تصویر) لارنس چونکہ تھوڑے عرصے کے لئے کشمیر آئے تھے اور ان کی یہاں آمد کا مدعا و مقصد تاریخ کے مضمون میں طبع آزمائی کرنا نہیں تھا بلکہ وہ کشمیر میں مہاراجہ کی حکومت کی جاسوسی کرنے کی آڑ میں زرعی اصلاحات کا کام مکمل کرنے کی غرض سے آئے ہوئے تھے لیکن اس سرزمین، یہاں کے موسم اور موسموں کی خوبصورتی کو دیکھ کر ان کا قلم خود بخود چل پڑا اور انہوں نے ایک بہت ہی نایاب کتاب رقم کر ڈالی۔ اس کے برعکس اگر دیگر مقامی اور غیر مقامی مورخین کو دیکھا جائے تو ایک قاری قدم قدم پر تذبذب، غلط فہمیوں اور بدظنیوں کا شکار ہوتا رہتا ہے، مثال کے طور پر اگر اکبر نامہ سے لیکر تزکِ جہانگیری تک اور 'کشمکش سے لیکر ''آتشِ چنار'' تک کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مورخین یا مصنفین نے محض کسی خاص نظریے یا سیاسی پہلو کی ترجمانی کی ہے اور اپنے سیاسی نکتۂ نظر کو ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں میں ایک قاری کو قدم قدم پر ایسے واقعات اور حادثات سے پالا پڑتا ہے کہ جن کی تصدیق اور سند حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان سبھی کتابوں میں سیاسی وابستگیوں اور مجبوریوں کی چھاپ واضح طور دکھائی دیتی ہے، جبکہ مختلف مورخین اپنے اپنے حساب سے واقعات اور حوادث کو پیش کرتے نظر آتے ہیں، ایسے میں اگر کوئی کتاب صحیح سمت میں تھوڑی بہت رہنمائی کرتی نظر آتی ہے، وہ محمد اعظم دیدمری کی فارسی منظوم تاریخ ''واقعاتِ کشمیر'' ہے، جس کے اکثر وبیشتر واقعات سے اتفاق کرنے پر دل از خود ہی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پنڈت زوُنہ راجہ کی کتاب ''شہنشاہانِ کشمیر'' جسے ''زونہ راجہ کی راج ترنگنی'' بھی کہا جاتا ہے اور جو بڈشاہ کے دور میں سنسکرت میں لکھی گئی، کافی اچھی کتاب مانی جاسکتی ہے۔ اگر چہ اس کتاب کا کلہن پنڈت کی راج ترنگنی سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا لیکن الفاظ کی شستگی اور واقعات کی صحیح عکاسی اس کتاب کا خاصہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ کتاب بڈشاہ کے ذاتی میر منشی اور درباری پنڈت زونہ راجہ نے لکھی ہے اس لئے وہ دورِ بڈشاہی کا جس انداز میں بیان کرتے ہیں، اس کی جھلک دوسرے دور کے بادشاہوں کے بیان میں نہیں ملتی۔ اسی طرح سے بہارستانِ شاہی بھی اگر چہ اچھی کتاب ہے لیکن اس میں کشمیر کی اس ملکہ اور شاعرہ کا کہیں ذکر تک نہیں، جسے کشمیر کے لوگ حبہ خاتون کے نام سے جانتے ہیں اور اب کچھ ایک محققین نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ حبہ خاتون کا اصل نام زوُن نہیں بلکہ 'حبیبہ' تھا، لیکن پوچھا

جاسکتا ہے کہ حبہ خاتون کی شاعری میں جس ''زون'' کا ذکر ملتا ہے، وہ کون تھی؟حبہ خاتون کو ان کے زمانے میں لکھی جانے والی تاریخ کی سبھی کتابوں نے فراموش کر دیا ہے اور اس طرح سے یہ عظیم شاعرہ بھی ایک 'سراب' بن کر رہ گئی ہے۔

زیرِنظر مضمون کا مرکزی مدعا و مقصد یہ باور کرانا تھا کہ کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے طلبائے تاریخ کے سامنے جو سب سے بڑی ترجیح ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اس میں پائے جانے والے تذبذب اور الجھاؤ کو ختم کر کے اگلی نسلوں کے سامنے ایک صاف و شفاف تاریخ رکھی جائے، جس میں نہ تو مسلکی عصبیت کا عنصر شامل ہو، نہ سیاسی وابستگی چھلکتی نظر آئے اور نہ ہی کسی خاص مکتبہ فکر کی ترجمانی کا احساس ہو، ایک ایسی تاریخ جو صرف اور صرف کشمیری عوام یا بحیثیت ایک قوم کے، کشمیری باشندوں کی تاریخ ہو اور جس میں سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو۔ جس کے واقعات اور مندرجات پر دل خود بخود یقین کرنے پر آمادہ ہو جائے، اس کے علاوہ کشمیر ایک ایسی سرزمین ہے، جسے ''بزرگوں کی کھیتی'' بھی کہا گیا ہے، اس سرزمین میں کروڑوں اسرارِ پوشیدہ و پیوستہ ہیں، اس لئے قلم کو آغاز میں ہی ادب اور احترام کا سبق پڑھا دیا جانا چاہئے تا کہ وہ آگے چل کر خدانخواستہ کسی گمراہی کے دلدل میں نہ پھنس جائے اور قلمکار کے دین اور دنیا کی تباہی کا باعث نہ بنے۔ تاریخ کشمیر کے موضوع پر میری یہ غیر دانستہ کوشش اگر چہ اپنے اختتام کے قریب ہے لیکن اگر زندگی نے موقعہ دیا تو اس موضوع پر ایک اور کوشش ضرور کروں گا، جس میں نہ صرف اس جنتِ ارضی کی الجھی ہوئی زلفوں اور تار تار دامن کو درست کرنے کی کوشش کی جائے گی بلکہ اس کا چہرہ مسخ کرنے والوں کو بے نقاب کر کے اس کی شانِ رفتہ کو بحال کیا جائے گا۔ فی الحال تنازعۂ کشمیر کی نوعیت یہ ہے کہ ساری دنیا، بشمولِ اقوامِ عالم کی تنظیم یو این او اور دنیا پر اپنی چودھراہٹ جمانے والا امریکہ بھی اسے ایک دیرینہ اور حل طلب مسئلہ تسلیم کرتا ہے اور اس کے حل کو پوری دنیا کے امن و سکون کے ساتھ مشروط قرار دیا جا تا جا رہا ہے لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس تنازعہ کا حل تلاش کرنے والے اصل فریق یعنی ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی ان قربانیوں کو کسی کھاتے میں درج نہیں کیا جا رہا ہے، جو وہ پچھلے ساڑھے چھ سو سال سے دیتے چلے آئے ہیں اور ابھی تک دے رہے ہیں۔ آج دسمبر ۲۰۱۰ء میں بھی کشمیر میں اکا دکا عسکری حملے ہو رہے ہیں اور بھارت کے سات لاکھ سے زیادہ مسلح فوجی ایک حصے پر اور پاکستان کے لاکھوں مسلح فوجی دوسرے حصے پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ کشمیری قیادت آدھی بھارت کی جانب جھکی ہوئی ہے اور آدھی پاکستان کی جانب، جبکہ باقی ماندہ ریاست کی خودمختاری کی حامی ہے، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ساری قیادت کب اور کیسے کسی

ایک مرکزی نکتے پر متفق ہوکر اس الجھے اور پیچیدہ مسئلے کے کسی مستقل، پائیدار اور دیرپا حل کے لئے تیار ہوسکتی ہے لیکن ایک بات جو میں نے سال ۲۰۰۱ء میں اپنے دورۂ پاکستان کے دوران سیکھی، میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک کشمیری قیادت اسی طرح نظریاتی اور سیاسی خانوں میں بٹی رہے گی، تب تک انہیں بھارت اور پاکستان کا آلۂ کار، ایجنٹ اور ٹھیکیدار قرار دیا جاتا رہے گا اور ساری دنیا انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتی رہے گی، جب تک ریاست جموں وکشمیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آباد عوام ایک طویل اور مست نیند سے جاگ کر قیادت کی کوتاہیوں اور غلطیوں کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے اور خاص طور پر جب تک قائدین کی تقریروں کے دوران ان کی ہر اچھی بری بات پر تالیاں بجانا، نعرے بلند کرنا اور ''ضرور'' کا غلامانہ فقرہ دوہرانا بند نہیں کیا جاتا، یہ قوم اسی طرح سے بیرونی تسلط اور غلامی کے دلدل میں پھنسی رہے گی۔ اور... اگر کوئی قوم ساڑھے چھ سو سال کی غلامی کے باوجود بھی نیند سے جاگ کر اپنے مقدر کو سنوارنے اور طوق و زنجیر کو اتار پھینکنے کے لئے تیار نہیں ہوتی تو ایسی قوم کا خدا ہی حافظ۔

☆☆☆☆

61

کشمیری سیاست کا مختصر تارف...(1)

تاریخ کشمیر کے حوالے سے میری ادنیٰ سی کوشش اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے، موجودہ صورت حال یہ ہے کہ کشمیر کی سیاست مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے اور تین بڑے سیاسی پلیٹ فارم اپنی اپنی سمت میں کشمیر کی سیاست کو کھینچ رہے ہیں، ان میں سے پہلا بڑا سیاسی گروہ مین سٹریم سیاست دانوں کا ہے، جس میں تین بڑی سیاسی جماعتیں شامل ہیں، نیشنل کانفرنس (جو کسی زمانے میں مسلم کانفرنس ہوا کرتی تھی) اپنے حساب سے مین سٹریم سیاست میں سرگرم ہے اور بھارتی آئین کے دائرے میں رہتے ہوئے ریاست کی اندرونی خودمختاری کی حمائت و وکالت کرتی ہے۔ اس جماعت کا سیاسی نظریہ ہے کہ ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کچھ مخصوص حالات میں مخصوص شرائط کے تحت ہوا تھا اور ان شرائط میں سے سب سے بڑی شرط یہ تھی کہ ریاست کو بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت اندرونی خود مختاری حاصل رہے گی اور اس حوالے سے یہاں دو بڑے سیاسی عہدے یعنی موجودہ گورنر کی جگہ صدرِ ریاست اور موجودہ وزیراعلیٰ کی جگہ وزیراعظم کا عہدہ قائم رہے گا، ان دونوں عہدوں کو ۱۹۷۴ء میں اس وقت ختم کر دیا گیا تھا جب شیخ محمد عبداللہ کو ایک طویل اسیری کے بعد جیل سے رہا کیا گیا اور اندرا عبداللہ ایکارڈ کے بعد جب شیخ صاحب کو بحثیت وزیراعظم عہدے اور راز داری کا حلف لینا تھا، اچانک ان کو ایک ایسے حلف نامے کا مسودہ دیا گیا جس پر ویز یراعظم کی جگہ ''وزیراعلیٰ'' لکھا ہوا تھا۔ حالانکہ شیخ صاحب نے اس بارے میں اس وقت کوئی احتجاج یا اعتراض نہیں اٹھایا لیکن بعد میں کئی بار کہا کہ ان کے ساتھ ''دھوکہ'' (وشواس گھات) ہوا تھا اور اس بارے میں انھیں پہلے نہیں بتایا گیا تھا اور نہ ہی اعتماد میں لیا گیا تھا۔ اس کے کئی سال بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے دورِ اقتدار میں اس جماعت نے ریاست کی خودمختاری کے اپنے دعوے کو ایک بار پھر سے 'اٹانومی رپورٹ' کی صورت میں بی جے پی کی مرکزی حکومت کے سامنے پیش کیا لیکن بی جے پی نے اپنی روائتی فسطائیت اور فرقہ پرستانہ ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے اس رپورٹ کو پڑھے بغیر ہی واپس کر دیا۔ اب جبکہ ایک بار پھر مرکز نے ریاست کی سیاسی اور اقتصادی ترقی کے لئے ازسرِ نو منصوبہ سازی کرنے کے لئے رابطہ کوروں کی ایک ٹیم مقرر کر رکھی ہے،

نیشنل کانفرنس کا یہ دعویٰ آج بھی کبھی کبھار گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ ’ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ عارضی بنیادوں پر کیا گیا ہے اور اس کی اندرونی خودمختاری بحال کی جانی چاہیے لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ نیشنل کانفرنس کا ’ریاست‘ کا دعویٰ صرف بھارتی قبضے والے علاقوں تک ہی محدود ہے اور اس میں پاکستانی اور چینی قبضہ والے علاقوں کا کوئی ذکر نہیں ہے اور اس بارے میں این سی ریاستی اسمبلی میں وضاحت کر چکی ہے حالانکہ حق یہ ہے کہ ریاتی اسمبلی میں پاکستانی مقبوضہ علاقوں کے لئے ۲۵ اسمبلی نشستیں خالی رکھی جاتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حصے بھی اسی ریاست سے وابستہ ہیں اور جب ریات کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا، ان خالی نشستوں کو پر کیا جائے گا۔ ریاست کی دوسری بڑی اور مقامی سیاسی جماعت بھارت کے سابق وزیر داخلہ مفتی محمد سیعد کی قیادت والی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی ہے، جس کی صدر آج کی تاریخ میں ان کی بیٹی محبوبہ مفتی ہیں، پی ڈی پی بھی اپنے طور ریاست کو بھارت کا عارضی حصہ مانتی ہے اور اس کا سیاسی نظریہ ہے کہ ریاست کو سیلف رول فارمولے کے تحت زیادہ سے خودمختاری ملنی چاہیے اور ریاست کے سیاسی فیصلوں میں مرکز کی مداخلت نہ رہے، علاوہ ازیں ریاست کی خودمختاری جس طریقے سے ختم کی گئی ہے، اسے دھیرے دھیرے بحال کیا جائے، تیسری بڑی مین سٹریم پارٹی کانگریس ہے، جو ریاستی حکومت پر ۱۹۴۷ء سے ہی مختلف طریقوں سے حاوی رہی ہے۔ اس کے بانی پنڈت جواہر لال نہرو نے تقسیم ملک کے وقت سے ہی کشمیر کے معاملات کو اپنی نگرانی میں رکھا اور پہلی پاک بھارت جنگ کے دوران بھی ریاست کی تقسیم کے دوران اہم رول ادا کیا (جس کا احوال سابقہ اقساط میں تفصیل سے آچکا ہے) نہرو نے پہلے شیخ محمد عبداللہ کو اپنا یارِ خاص بنا کر ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کرایا اور صرف دو سال بعد پہلے کئی برس تک بخشی غلام محمد کو این سی سے الگ کر کے شیخ محمد عبداللہ کے خلاف مہرے کے طور استعمال کیا اور بعد میں غلام محمد صادق سے کام لے کر ریاست کے مشروط الحاق کو حتمی الحاق میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کے بعد بھی کانگریس وقتاً فوقتاً ریاست کے اقتدار پر کبھی کلی طور اور کبھی جزوی طور شامل رہی اور ریاست میں ’مخلوط حکومت‘ کے فارمولے کو جنم دیا۔ ۲۰۰۲ء میں پی ڈی پی کی پہلی حکومت وجود میں آئی تو دوسرے اڑھائی سال تک اس پر کانگریس کا راج رہا، اس کے بعد ۲۰۰۸ء میں کانگریس نے نیشنل کانفرنس کے ساتھ الحاق کر کے ایک بار پھر حکومت بنائی، جو تا دمِ تحریر قائم ہے۔ کانگریس کا ریاست کے مستقبل کے حوالے سے صاف اور واضح سٹینڈ ہے کہ ریاست کا بھارت کے ساتھ حتمی الحاق ہو چکا ہے اور جموں و کشمیر بھارت کا ایک ناقابلِ تنسیخ حصہ ہے، اس کے مستقبل کا فیصلہ تریسٹھ سال قبل ہو چکا ہے اور اس حوالہ سے اقوامِ متحدہ کی قراردادیں وقت

گزرنے کے ساتھ اب غیر موثر ہو چکی ہیں، اس وقت مرکز میں بھی اسی جماعت کی حکومت ہے اور راجیو گاندھی کی بیوہ سونیا گاندھی بھارت کا نظم و نسق سردار منموہن سنگھ کے ذریعے چلا رہی ہیں۔ سیاسی مبصرین اس بات پر حیران ہیں کہ دو بڑی مقامی سیاسی جماعتیں پی ڈی پی اور نیشنل کانفرنس اچھی خاصی پوزیشن میں ہونے کے باوجود اور تقریباً ایک جیسا سیاسی نظریہ رکھنے کے باوجود بھی مرکز کی اس جماعت کو اپنے اقتدار میں شریک کیوں رکھ رہی ہیں، جو ریاست کے اتنے بڑے تنازعے کو کوئی تنازعہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں، جسے ساری دنیا تسلیم کرتی ہے اور جس کی وجہ سے پورے خطے میں کئی دہائیوں سے تناؤ اور کشیدگی بنی ہوئی ہے۔ اور اس کا ایک ہی جواب ہے کہ مرکز میں کانگریس کی حکومت ہے اور مقامی جماعتیں کانگریس کو ناراض کر کے مرکز سے ملنے والی امداد کے دریا کا رخ موڑنا نہیں چاہتیں۔ اس طرح سے کل ملا کر ریاست کی مین سٹریم سیاسی جماعتوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنا الگ الگ نظریہ اور پروگرام رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے کوسوں دور بھی ہیں لیکن وقت وقت پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مخلوط حکومتیں بھی بنا ڈالتی ہیں اور اپنا اپنا وقت 'شاندار طریقے سے گزار رہی ہیں لیکن دوسری جانب عوام ابھی تک سیاسی طور اس قدر بیدار نہیں ہو رہے ہیں کہ وہ کوئی ایسا سیاسی پلیٹ فارم کھڑا کر سکیں، جو اس روایتی سیاست کا متبادل بن سکے اور عوام کو اس چنگل سے باہر نکال سکے۔ ۱۹۷۸ء میں مسلم متحدہ محاذ کے نام سے جو متبادل سیاسی پلیٹ فارم تشکیل دیا گیا تھا، وہ صرف تین سال بعد عسکری تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور متبادل سیاسی پلیٹ فارم کا خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ اس سیاسی نظریے کے ساتھ جڑنے والے سیاسی قائدین اس وقت کل جماعتی حریت کانفرنس کے دو دھڑوں کے علاوہ کئی انفرادی اور اجتماعی سیاسی پلیٹ فارموں سے وابستہ ہیں اور تقریباً پچاس سیاسی جماعتیں اپنے اپنے طور مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے کوشاں ہیں۔ حریت کانفرنس کے دو دھڑے (حریت میر واعظ اور حریت گیلانی) میں سے کون سا دھڑا بڑا اور زیادہ موثر ہے، کشمیری عوام نے اس بات کا اب تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا ہے کیونکہ وقتاً فوقتاً عوام دونوں دھڑوں کی کالوں اور پروگراموں پر عمل کرتے آئے ہیں اور دونوں دھڑوں نے اپنے اپنے وقتوں میں اپنے اپنے حساب سے عوام کا بھرپور استعمال (استحصال) کیا ہے، سال ۲۰۰۸ء میں حریت کے دونوں دھروں نے امرناتھ زمینی تنازعہ کے وقت جو بھی پروگرام دیا، اس پر عوام نے سختی سے عمل کیا اور اس کے بعد کبھی حریت (ع) کوئی کال دیتی تو عوام اس کا ساتھ دیتے اور کبھی حریت (گ) پروگرام دیتی تو عوام اس پر لبیک کہتے، ساتھ ہی ۲۰۱۰ء میں حریت (گ) نے احتجاجی کالوں اور طویل ہڑتالوں کا سلسلہ شروع کیا تو حریت (ع) نے خود کو اس پروگرام سے علیحدہ رکھا اور

ابھی تک ہڑتالوں کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ جب ۲۰۰۲ء میں سید علی شاہ گیلانی حریت کانفرنس سے الگ ہوئے اور انہوں نے اپنی الگ سے سیاسی جماعت بنا کر ایک اور 'حریت' کی بنیاد رکھی تو مشترکہ حریت میں شامل تقریباً سبھی جماعتیں دو پھاڑ ہوگئیں اور الگ ہونے والے ایک پھاڑ نے خود کو گیلانی حریت کے ساتھ وابستہ کرلیا۔ ان دنوں میں پاکستان کے چند اخبارات اور ایک خبر رساں ایجنسی کے ایم ایس (کشمیر میڈیا سروس) کے لئے کام کرتا تھا، دوران رپورٹنگ جب میں نے کئی بار گیلانی کو حریت (گ) کا چیئر مین لکھا تو کے ایم ایس کے ذمہ داروں نے اس پر اعتراض اٹھایا اور کہا کہ اس وقت حریت کے چیئر مین مولانا عباس انصاری ہیں اور گیلانی کو ''بزرگ سیاسی قائد'' لکھنا چاہیے، لیکن دو سال بعد ۲۳ مارچ ۲۰۰۴ء کو جب بھارت میں پاکستانی سفارتخانہ (نئی دلی) کی جانب سے کشمیر کے کئی علیحدگی پسند سیاست دانوں اور کچھ صحافیوں کو 'پاکستان ڈے' کی تقریب میں شریک ہونے کی دعوت ملی تو ایمبسی میں پاکستانی سفیر عزیز احمد خان نے میرے سامنے گیلانی صاحب سے کہا ''جب آپ نے حریت سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تو ہم نے اسے تسلیم کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی'' اس کے بعد سید علی گیلانی کو حریت کا چئیر مین کہا گیا اور میر واعظ عمر فاروق کو کشمیر کا حریت پسند لیڈر لکھا جانے لگا۔ اس سارے تناظر میں حریت کے دو دھڑے اپنے اپنے وقت پر پاکستان سے اپنی تصدیق کرواتے ہیں اور کشمیر کی ''آزادی'' کے لئے کوششوں میں مصروف ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے دو الگ دھڑے ہیں ایک دھڑے میں محمد یاسین ملک شامل ہیں اور دوسرے میں جاوید احمد میر، فیاض احمد عرف بٹہ کراٹے اور فرنٹ کے کچھ اور دیرینہ اراکین شامل ہیں، دونوں کا نظریہ ایک ہی ہے لیکن دونوں لبریشن فرنٹ کے بانی قائد امان اللہ خان (مقیم پاکستان) سے کافی دور ہیں۔ فرنٹ کا نظریہ پوری ریاست کی اس پوزیشن کی بحالی ہے، جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ سے پہلے تھی۔ اس جماعت کا ماننا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے ان سبھی پانچ خطوں کو ایک ساتھ ملا کر ریاست کی تاریخی پوزیشن کو بحال کیا جائے اور اس کے بعد عوام سے پوچھا جائے کہ وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے کیا چاہتے ہیں۔

تاریخ کشمیر کو مرتب کرتے وقت ایک مورخ کو انتہائی نازک اور حساس راستوں سے گزرنا پڑتا ہے اور قدم قدم پر ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں، جب ایک غیر جانبدار قلمکار کے لئے توازن برقرار رکھنا کافی مشکل ہوجاتا ہے کیونکہ میری بدقسمت قوم اور اس کے قائدین ابھی تک اپنے ذاتی محاسبے کے لئے ذہنی طور تیار نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی (میرے سمیت) ابھی تک قلمکاروں میں اس قدر قومی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی مصلحتوں کو ترک کر کے صرف اور صرف قومی مفادات

کی تکمیل کے لئے اپنے قلم کو وقف رکھیں۔ وجہ صاف ہے کہ اس کام کو انجام دینے کے لئے آتش و آہن کے کئی سمندر پار کرنے پڑتے ہیں، عیش و آرام کو ترک کر کے درویشی اختیار کرنا پڑتی ہے اور شہر و قصبہ جات کو چھوڑ کر دور کہیں گپھاؤں میں سکونت اختیار کرنا پڑتی ہے جبکہ موجودہ زمانے میں اس طرح کے تقاضوں کو پورا کرنا کافی دشوار ہے لیکن اس کے باوجود مایوسی نے ابھی تک دامن نہیں تھاما ہے اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضامندی اور خوشنودی پر کسی اور کی خوشی کو ترجیح حاصل ہے۔ اگلی قسط میں تحریکِ مزاحمت میں شامل باقی کچھ تنظیموں اور قائدین کا مختصر تعارف کرایا جائے گا، انشااللہ۔

62

کشمیری سیاست کا مختصر تعارف.....(2)

...تنازعہ کشمیر کے موجودہ مرحلے میں جو قیادت اس وقت کشمیری عوام کے سامنے ہے، اس میں رنگارنگی کے ساتھ ساتھ اختلافات کے کئی 'گلستان' بھی موجود ہیں۔مختلف سیاسی نظریات، آئین اور دستور رکھنے کے کے باوجود یہ قیادت جس ایک بنیادی نکتے پر متفق ہے، وہ یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر پر بھارت اور پاکستان کا ناجائز قبضہ ہے، کشمیری عوام کے ساتھ اقوام متحدہ کے روبرو یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کو ان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا بھرپور موقعہ دیا جائے گا اور عوام کے اسی مطالبے کی ترجمانی کرتی ہوئی اس قیادت کو کشمیر کے اندر اور باہر بے انتہاء نکتہ چینی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر اوقات ان سے ایسے سوالات بھی پوچھے جاتے ہیں، جن کا قیادت کے پاس بھی جواب نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود ان کی کالوں پر ابھی تک ہڑتالیں ہوتی ہیں، کاروبار زندگی مفلوج ہو جاتا ہے اور سڑکیں ویران ہو جاتی ہیں۔ مین سٹریم میں شامل تنظیمیں اگر چہ فطری طور اس بات کی پابند ہیں کہ وہ علیٰحدگی پسندوں کی مخالفت اور نکتہ چینی کریں لیکن اس کے باوجود انہیں بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ عوام نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور وہ پوری طرح سے 'حریت پسند قیادت' کے پروگرام کا ساتھ دیتے ہیں۔ پچھلے بائیس برسوں کے دوران ایک بھی موقعہ ایسا نہیں آیا ہوگا جب مین سٹریم سیاسی جماعتوں میں سے کسی ایک نے احتجاج یا'' کاونٹر پروٹیسٹ' کی کال دی ہو اور عوام نے 'حریت پسند قیادت' کے خلاف کوئی ہڑتال کی ہو، جلوس نکالا ہو یا پھر پروٹیسٹ مارچ کیا ہو۔لیکن اس کے برعکس ان برسوں میں عوام نے حریت قیادت کی کالوں پر ہزاروں مرتبہ 'فقیدالمثال'' ہڑتالیں کیں، احتجاجی مظاہرے کئے ، گولیاں کھائیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔امن اور قانون کو بنائے رکھنے کی ذمہ داری اگر چہ حکومت اور اس میں شامل پارٹیوں کی ہے لیکن کشمیر میں یہ پارٹیاں ان برسوں میں عوام کو کبھی بھی اپنے حق میں نہیں کر پائی ہیں اور نہ ہی حالات کی رو پر ان کا قابو رہا ہے، گزشتہ شمارے میں کشمیری سیاست کا جو مختصر تعارف کرانے کی کوشش کی گئی تھی، اس کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے اس شمارے میں جن دو قائدین کا تعارف کرانا مطلوب ہے، ان کا تعلق موجودہ تحریک کے ساتھ کافی دیرینہ ہے اور ان کا جیل

ریکارڈ بھی کئی دیگر قائدین سے بہت زیادہ ہے۔ان قائدین میں شبیر احمد شاہ اوران کے کافی دیرینہ ساتھی نعیم احمد خان شامل ہیں۔نعیم احمد خان نے ایک حال ہی میں ملاقات کے دوران اپنے اور موجودہ تحریک کے بارے میں کہا کہ تقسیم ریاست اور تقسیم ہند کے بعد جب بھارتی افواج کشمیر میں داخل ہوئیں اور ''جنگ پٹن'' پیش آئی تو سب سے پہلے فورسز کے ہاتھوں جو خانوادہ عتاب کا نشانہ بنا وہ ان کا ہی تھا،انہوں نے بتایا کہ جب سکھ رجمنٹ پٹن میں داخل ہوئی اور پٹھان پورہ کھور پہنچی تو انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ حملہ کرنے والے پٹھان کہاں ہیں؟ لوگوں نے پٹھان پورہ میں آباد ہماری بستی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہمارے محلے میں فوج کو بھیج دیا،فوجیوں نے ہمارے محلے میں آباد پٹھانوں کی خوب خبر لی،ان کے گھر جلا دیئے،۸۔لوگ قتل کر دیے گئے اور بہتوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا،نعیم خان نے کہا''ہمارے آبا واجداد تقسیم ریاست سے کافی قبل ہی سندھ کے ہزارہ علاقے سے ہجرت کر کے کشمیر آ گئے تھے اور پٹھان پورہ کھور پٹن میں بس گئے تھے،۱۹۶۸ء میں جب الفتح تحریک شروع ہوئی تو مرحوم شہید مقبول بٹ ہمارے گھر آئے اور ہمارے والد غلام محمد خان سے ملے،انہوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کبھی بھی بھارتی قانون یا تسلط کو تسلیم نہیں کیا،ان سے اگر مجھے کوئی شے ورثے میں ملی ہے تو وہ یہ ہے کہ کشمیر بھارت کے تسلط سے آزاد ہونا چاہیے...اور اسی حسرت کو دل میں لے کر ہم بھی مظالم سہہ رہے ہیں'' نعیم نے اپنی زندگی کی کہانی کو جاری رکھتے ہوئے کہا'' ۱۹۹۳ء میں والد صاحب کو شمیم جلالی کے ہمراہ گرفتار کیا گیا اور بدنام زمانہ انٹیروگیشن سینٹر Red-16 میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا،میں ان سے وہاں ملنے گیا اوران کی حالت دیکھ کر دل کو کافی ٹھیس پہنچی،اسی روز اپنے ساتھ یہ عہد کر لیا کہ میں بھی ان کے ہی نقشِ قدم پر چلوں گا۔اس کے کئی سال بعد سینٹرل جیل میں میری ملاقات پیپلز لیگ کے بانی ممبر نذیر احمد وانی کے ساتھ ہوئی اور یہیں شبیر احمد شاہ سے بھی ملاقات ہوئی،ان دنوں میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔بچپن سے ہی والدین سے تقسیم ریاست اور فوجی لوٹ مار کے بارے میں سنتے آئے تھے اس لئے ابتداء سے ہی باغیانہ ذہنیت کی پرورش ہوتی رہی،جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ابتدائی تعلیم اپنے ہی ہائی سکول میں حاصل کی اور ۱۹۸۵ء میں سول انجینئرنگ میں ڈپلوما بھی کیا لیکن گرفتاری اور جیل یاترا کا سلسلہ اس سے بھی کافی پہلے شروع ہو چکا تھا، مجھے یاد ہے کہ سال ۱۹۸۲ء میں ہم نے ماگام ہائی سکول میں احتجاج کیا اور پولیس ہمیں پکڑ کر لے گئی۔ آگے چل کر توہین قرآن کا واقعہ پیش آیا اور ہم نے اس کے خلاف احتجاج میں بھی حصہ لیا،اسی دوران اسلامی جمعیتِ طلباء بھی معرضِ وجود میں آئی اور ۱۹۸۵ء میں ہمیں کافی عرصہ تک ہاؤس اریسٹ بھی رکھا

گیا۔اسی سال کچھ ایسے نوجوان کشمیریوں سے ملاقاتیں ہوئیں، جو بھارتی نظام سے سخت دل برداشتہ تھے،ان میں اشفاق مجید،عبدالحمید شیخ،محمد یاسین ملک،محمود احمد ساگر اور فردوس احمد شاہ وغیرہ شامل تھے، نوجوان حکومت سے سخت نالاں تھے اور ہمارے اندر پہلے سے ہی لاوا ابل رہا تھا....اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کاروان کھڑا ہو گیا، جو انتہائی دشوار راستے پر آگے چلنے کے لئے ذہن و دل سے تیار بہ تیار تھا''

نعیم احمد خان کے ہمراہ چلنے والا یہ کاروان پہلے سے ہی اتنا دل برداشتہ تھا کہ وہ اگلے چند ہی برسوں کے دوران بندوق اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا اور اپنی جانوں پر کھیل جانے کا قصد کر لیا۔یہی وہ عرصہ تھا جب پیپلز لیگ جیسی تنظیموں کا ظہور ہوا اور ''کشمیر کی آزادی'' کے لئے جدوجہد شروع ہو گئی اور اگر یہ کہا جائے کہ پیپلز لیگ نے ہی کشمیر میں نوجوانوں کو بندوق اٹھانے اور مسلح بغاوت کرنے پر آمادہ کیا تو بے جا نہ ہوگا۔نعیم احمد خان کو ۱۹۸۶ء میں کاڈی پورہ اسلام آباد میں شبیر احمد شاہ اور مزید ۳۱ افراد کے ہمراہ گرفتار کیا گیا اور اسی ریڈ سکسٹین (Red -16) میں پہنچا دیا گیا، جہاں کبھی وہ اپنے والد سے ملنے جایا کرتے تھے،انہیں بھی اذیتیں دی گئیں اور تازیانے سنائے گئے،جن سے مزاج میں مزید پختگی آئی۔ ان کا کہنا تھا ''اس دور کے بعد ناراض کشمیری نوجوانوں کو شدت سے محسوس ہونے لگا کہ انہیں کسی باضابطہ پلیٹ فارم پر مشترکہ طور جدوجہد کرنا چاہیے اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے دنیا میں ایک واضح پیغام پہنچنا چاہیے اور یہی سوچ آگے چل کر مف (مسلم متحدہ محاذ) کی بنیادی وجہ بنی'' اپنی گرفتاری کے بارے میں بتاتے ہوئے نعیم نے کہا ''مئی ۱۹۸۶ء میں پولیس میرے پیچھے لگ گئی لیکن ۸۸ تک میں اس کے ہاتھ نہیں لگا، ۸۸ء میں پٹن میں گرفتار ہوا اور ریڈ ۱۶ سے گزرتے ہوئے پبلک سیفٹی ایکٹ وغیرہ کے مراحل طے کرتے ہوئے ۲ ماہ تک مصائب برداشت کئے۔لیکن اسی سال پھر سے گرفتار کر لیا گیا، ۴۰ روز تک کنگن تھانے میں رکھا گیا، ادھر چھوڑا گیا تو ادھر پھر پکڑ لیا گیا اور ریاسی جیل منتقل کر دیا گیا، اس بار قیدِ تنہائی میں رکھا گیا، اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں شبیر احمد شاہ کے ہمراہ رام بن میں گرفتار کر لیا گیا اور اس دوران ہری نواس نامی نیا تعدیب خانہ تیار ہو چکا تھا، یہاں سے شبیر احمد شاہ کو ادھمپور منتقل کر دیا گیا اور مجھے سرینگر کے سینٹرل جیل بھیج دیا گیا، اسی دوران وہاں جیل بریک کا واقعہ بھی پیش آیا اور ہمیں ریاست سے باہر جبل پور مدھیہ پردیش کے انتہائی خطرناک جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ۹۱ء میں رہا کیا گیا اور صرف تین ماہ کے بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، اس بار ہماری والدہ کو بھی گرفتار کیا گیا اور تقریباً ۴۵ دن تک نظر بند رکھا گیا، اسی دوران میرے ماموں طارق احمد لون کو بھی وانی گام پٹن سے گرفتار کیا گیا اور انہیں دوران حراست غائب کر دیا گیا، آج تک ان کے رشتہ داران کی لاش کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے اس بار

کوٹ بھلوال کے سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا اور ۹۳ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ ۹۳ء میں کل جماعتی حریت کانفرنس معرض وجود میں آئی، میں نے بھی اس مین شمولیت اختیار کی، جبکہ شبیر احمد شاہ کو ۱۹۹۴ء میں رہا کیا گیا اور ہم نے ایک ساتھ جموں راجوری اور کئی مقامات پر مہاجرانہ زندگی گزارنے والے کشمیری پنڈتوں کے کیمپوں کا دورہ کیا اور لداخ بھی ایک ساتھ گئے...''

شبیر احمد شاہ اور نعیم احمد خان کی یہ جوڑی تحریک کے ابتدائی برسوں میں کافی مقبول ہوئی اور ان دونوں نے ایک ساتھ کئی ایک معرکے بھی سر کئے لیکن بعد میں آگے چل کر ان کے راستے جدا ہو گئے،

(**نوٹ**: کشمیری قیادت کے مختصر تعارف کے دوران شبیر احمد شاہ کا تعارف بھی شامل کرنے کا ارادہ تھا لیکن وہ کتاب کی ترتیب کے دوران پی ایس اے کے تحت نظر بند تھے اور جب رہا ہوئے تو تب تک فارغ نہ ہوئے جب تک کتاب مکمل ہو گئی لہٰذا اس بات کی کمی محسوس کی گئی......ساحلؔ)

63

کشمیری قیادت کامختصر تعارف....3

....بات جب کشمیر کی ہوتی ہے تو اس سے مراد ریاستِ جموں و کشمیر ہوتی ہے، نہ کہ صرف وادیٔ کشمیر تاہم لفظ کشمیر اس لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے کہ اول تو دنیا اس لفظ سے بخوبی واقف ہے اور اس کا ذکر آتے ہی اس سرزمین کو نقشۂ عالم پر تلاش کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا اور دوم اس لئے بھی کہ پوری ریاست کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز بھی کشمیر ہی رہا ہے اور یہاں ہی تاریخ کے اہم فیصلہ جات بھی لئے گئے ہیں جن کا پوری ریاست پر اثر مرتب ہوا ہے۔ سیاسی سرگرمیاں ہوں، مذہبی یا عسکری، ان سبھی کا آغاز وادی سے ہی ہوا ہے اور ان کو اپنے انجام تک بھی وادی کے عوام نے ہی پہنچایا ہے اور اس بات کی گواہ کئی ہزار برس کی تاریخ ہے کہ کشمیر اس پورے خطے کی ہمہ گیر سرگرمیوں کا مرکز و گہوارہ رہا ہے اور دنیا پوری ریاست کو اسی نام سے جانتی ہے۔ تاریخی مضامین کے رواں سلسلے کے اختتام پر کشمیر کی موجودہ سیاسی قیادت کا مختصر تعارف جاری ہے اور اس ہفتے جن دو شخصیات کا ذکر مطلوب ہے، ان کا کشمیر کی سیاست کے ساتھ ساتھ یہاں کی دینی اور سماجی سرگرمیوں کے ساتھ بھی کافی گہرا تعلق رہا ہے۔ سید علی شاہ گیلانی جو اس وقت اپنی عمر کی ۸۱ ویں دہلیز پر ہیں اور عالمِ پیری کے ساتھ ساتھ انہیں بے شمار جسمانی تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے، حریت کانفرنس کے ایک دھڑے کے چیئرمین ہیں اور اس دھڑے نے پچھلے ایک برس سے کشمیر کی سیاست پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ سید علی گیلانی کے علاوہ اس شمارے میں جس کشمیری قاء کا تذکرہ مقصود ہے، وہ ہے مولوی محمد عمر فاروق ہیں جنہوں نے انتہائی کمسنی کے عالم میں کشمیری سیاست میں قدم رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ کشمیر کے میر واعظ کے اعلیٰ عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ میر واعظ نے ان بیس بائیس برسوں کے دوران کئی بار غیر ملکی دورے کئے اور مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے بیرونی دنیا کو باخبر کرایا۔

جہاں تک سید علی گیلانی کا تعلق ہے، ان کا جنم ۲۹ ستمبر ۱۹۲۹ء کو شمالی کشمیر کے تجر شریف سوپور میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم سوپور سے حاصل کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور سے گریجویشن مکمل کی ،ان کی اولاد میں دو بیٹے نسیم اور نعیم کے علاوہ پانچ صاحبزادیاں بھی شامل ہیں۔ وہ اس وقت حریت

کانفرنس کے ایک دھڑے کے چیئر مین ہیں، جسے حریت (گ) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، جبکہ ان کی اپنی تنظیم کا نام 'تحریکِ حریت کشمیر' ہے۔ اگرچہ گیلانی نے ۱۹۵۰ء سے ہی خود کو جماعتِ اسلامی کے وابستہ کر لیا تھا تاہم ان کی سب سے بڑی سیاسی سرگرمی ۱۹۶۸ء کے اس واقعہ کو قرار دیا جا رہا ہے جس میں انہوں نے تنِ تنہاء ریاستِ جموں وکشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی حمائت کی تھی، رواں سلسلۂ مضامین کی قسط نمبر ۳۹ میں اس حوالہ سے اگرچہ ذکر آ چکا ہے تاہم مضمون کی مناسبت سے ان سطور کو دوہرانا ضروری سمجھتا ہوں ''1968ء میں شیخ محمد عبداللہ کو 'گھریلو قید' یعنی ''ہاؤس اریسٹ'' سے آزاد کر دیا گیا اور سیاسی ریل گاڑی ایک مرتبہ پھر سے پٹری پر چل پڑی، اسی سال دلی کے کچھ سرکردہ قانون دانوں نے مجاہد منزل سرینگر میں نیشنل کانفرنس کے صدر دفتر پر کشمیر کی تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل ایک ''کل جماعتی کانفرنس'' کا اہتمام کرایا اور اس کانفرنس میں دوسروں کی مرضی کے خلاف بخشی غلام محمد نے یہ سٹینڈ لیا کہ ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کر دیا جائے، ایک سرکردہ کشمیری وکیل عبدالرشید شاہ کی قیادت میں ممبران کی ایک بڑی تعداد نے استصوابِ رائے کا مطالبہ کیا مگر جن لوگوں نے بھارت کی حمائت کی ان میں مولانا محمد سیعد مسعودی اور غلام محی الدین قرہ شامل تھے۔ اسی کانفرنس میں ایک واحد ممبر ڈیلی گیٹ یعنی سید علی شاہ گیلانی نے پاکستان کی حمایت کی اور ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرانے کا مطالبہ کیا، گیلانی اس وقت دائیں بازو کی اسلامی تنظیموں کی نمائندہ جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ تھے اور انہوں نے اپنی جماعت کا نکتہ نظر سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیئے''

تاریخی حوالہ جات کے مطابق گیلانی کو سب سے پہلے ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء کو گرفتار کیا گیا، اس دوران ان کو ۱۳ ماہ تک جیل میں رکھا گیا، اسی دوران ان کے والد کی وفات ہو گئی لیکن وہ ان سے ملاقات نہیں کر پائے۔ ۷ مارچ ۱۹۶۵ کو انہیں پاکستان کے ساتھ روابط رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور مزید ایک سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا جبکہ اس کے بعد ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۷ء ان کو کئی بار گرفتار کیا گیا اور رہا بھی کیا گیا۔ پرویز دیوان اپنی کتاب میں گیلانی کے بارے میں لکھتے ہیں ''..وہ پاکستان کے سخت حامی تھے.....لیکن یہ ایک عارضی انتظام تھا اور انہوں (گیلانی) نے جلد ہی (کچھ دیر کے لئے) پاکستان کا خیال ترک کر دیا اور تب تک اگرچہ جماعت اسلامی نے (بھارت اور پاکستان میں کہیں بھی) انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا تاہم اس کے بعد جماعت نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا اور 1972ء کے انتخابات میں اس کے تین سرکردہ لیڈران، بشمول سید علی گیلانی انتخابات جیت گئے اور انہوں نے بھارتی

آئین کے تحت حلفِ وفاداری لیا، اسمبلی میں داخل ہوگئے اور پورے پانچ سال تک اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخابات کی نمائندگی کرتے رہے۔ گیلانی نے اس کے بعد بھی مزید دو انتخابات میں حصہ لیا اور سوپور حلقہ انتخاب سے سال 1977 اور 1987ء میں کامیابی حاصل کی (پرویز دیوان/ کشمیر/ صفحہ نمبر108)

اگرچہ بعض مورخین گیلانی کے اس سیاسی یوٹرن کی مخالفت بھی کرتے ہیں لیکن خود گیلانی کا کہنا ہے کہ انہوں نے اسمبلی کے اندر اور باہر ہمیشہ مسئلہ کشمیر کے حل کی بات کہی ہے اور وہ اپنے اس مطالبہ سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارت کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لئے کہ مسئلہ کشمیر کو پر امن طریقے سے عوامی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے، انہوں نے (مین سٹریم) سیاست میں حصہ لیا لیکن ایک طویل کوشش کے باوجود بھی جب یہ طریقہ کامیاب نہ ہوا تو کشمیری نوجوانوں نے بندوق کا راستہ اختیار کیا اور انہوں نے بھی مین سٹریم سیاست کو خیر باد کہہ دیا۔ سید علی گیلانی اکتوبر ۱۹۸۳ء میں اس وقت پھر سے خبروں میں آئے جب انہوں نے سرینگر میں بھارت اور پاکستان کے درمیان ہونے والے ایک کرکٹ میچ کی مخالفت کی اور کہا کہ چونکہ ریاست ایک متنازعہ خطہ ہے اور اس کے مستقبل کا فیصلہ ہونا باقی ہے، اس لئے بھارت یہاں کرکٹ میچ منعقد نہیں کرا سکتا۔ سال ۱۹۸۷ میں جب تقریباً ۱۱۔ کشمیری تنظیموں پر مشتمل مسلم متحدہ محاذ کا قیام عمل میں آیا تو سید علی گیلانی نے اس میں بھی سرگرم حصہ لیا، اس ٹکٹ پر الیکشن لڑ کر کامیاب ہوئے اور اسمبلی میں بھی گئے، لیکن اس کے فوراً بعد کشمیر میں عسکری تحریک کا آغاز ہوگیا تو گیلانی اس وقت مزاحمتی سیاست کی اولین صفوں میں نظر آئے۔ سید علی گیلانی چند سال قبل تک اپنے اس موقف پر سختی سے قائم تھے کہ ریاست جموں وکشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے اور کشمیری عوام کو اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں کے تحت اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جانا چاہیے لیکن پاکستان کی کشمیر کے حوالہ سے بدلتی ہوئی پالیسی اور بھارت کے ساتھ اپنے تجارتی تعلقات کو استوار کرنے کی کوششوں کے بعد گیلانی نے اپنے اس رویہ میں نرمی لائی ہے اور وہ اب اس الحاق کو ''مشروط'' قرار دیتے ہیں۔ گیلانی کی زندگی جدوجہد اور قید و بند کی اذیتوں سے بھری پڑی ہے اور راقم کو کئی مرتبہ ان کے انٹرویوز کرنے اور ان کو قریب سے جاننے کا موقعہ ملا ہے۔ ان کو سال ۲۰۰۲ء میں حریت کانفرنس کے ساتھ اختلافات پیدا ہو جانے کی وجہ سے جماعت اسلامی کی بنیادی رکنیت سے خارج کر دیا گیا تو انہوں نے ایک اور حریت کانفرنس کی بنیاد ڈالی، جس میں متحدہ حریت سے خائف ہونے والی تنظیمیں شامل ہوگئیں اور حریت (گ) کے نام سے ایک اور

مزاحمتی سیاسی اتحاد معرض وجود میں آیا، جس کے چیئرمین خود سید علی گیلانی ہیں۔

جہاں تک حریت کانفرنس کے دوسرے دھڑے کا تعلق ہے، اس کے پہلے چیئرمین میر واعظ مولوی عمر فاروق تھے اور کئی بار اگرچہ اس کے چیئرمین بدل چکے ہیں لیکن ان دنوں بھی میر واعظ ہی اس عہدے پر فائز ہیں۔ میر واعظ کو جون ۱۹۹۳ء میں حریت کے قیام کے وقت کشمیر کے مزاحمتی قائدین نے متفقہ طور اس لئے اس کا پہلا چیئرمین بنایا تھا تاکہ رواں مزاحمتی تحریک کی زمامِ نئی نسل کے ہاتھوں میں دی جاسکے۔ میر واعظ عمر فاروق کشمیر کے مشہور میر واعظ خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور ان کی پیدائش ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو سرینگر میں میر واعظ (مرحوم) مولوی محمد فاروق کے یہاں ہوئی۔ ۲۱ مئی ۱۹۹۰ء کو جب سرینگر کے نگین (حضرتبل) میں ان کے والد میر واعظ مولوی محمد فاروق کو نامعلوم مسلح افراد نے انتہائی پر اسرار حالات میں گولی ماردی تو اس وقت عمر کی عمر صرف ۱۷ سال تھی لیکن ان کو والد کی جگہ میر واعظ بنادیا گیا اور ساتھ ہی عوامی ایکشن کمیٹی کا سرپرست بھی مقرر کیا گیا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ان کے سر پر کشمیر کی سیاسی اور دینی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ آ گیا تھا اور غالب خیال یہی تھا کہ وہ فی الحال خود کو اس کام سے دور رکھیں گے اور اپنی تعلیم کے حصول کے لیے کشمیر سے باہر چلے جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور سیاست کے ساتھ ساتھ جامع مسجد سرینگر میں وعظ و تبلیغ کے ساتھ بھی جڑے رہے۔ اس عرصے کے دوران جہاں ایک طرف میر واعظ عمر فاروق نے دنیا کے متعدد ممالک کے دورے کئے اور مسئلہ کشمیر کو اجاگر کیا، وہیں انہوں نے حال ہی میں اسلامی یونیورسٹی آف تہران سے مشہور کشمیری صوفی بزرگ حضرت میر سید علی ہمدانی (شاہِ ہمدان) کی شہرہ آفاق تصنیف ''ذخیرۃ الملوک'' پر اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کر کے ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کی ڈگری بھی حاصل کی اور اب وہ میر واعظ ڈاکٹر مولوی محمد عمر فاروق کہلاتے ہیں تاہم ان کا کہنا ہے کہ انہیں 'ڈاکٹر' سے زیادہ 'میر واعظ' کہلانا ہی اچھا لگتا ہے کیونکہ اس نام کے ساتھ دینی شناخت وابستہ ہے۔ چند برس قبل جب لندن کے مشہور میگزین 'ٹائم' نے دنیا کے ''مستقبل کے ہیرو'' کے عنوان کے تحت اپنی سروے رپورٹ پیش کی تو ان میں میر واعظ عمر کا نام بھی شامل تھا۔ سید علی گیلانی کی سوچ سے برعکس میر واعظ کا اپروچ یہ رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں بھارت، پاکستان اور کشمیری نمائندوں کے درمیان بات چیت اور مذاکرات کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے اور اس مسئلہ کا کوئی قابلِ قبول، پائیدار اور دیرپا حل نکلنا چاہیے لیکن انہیں ''خودمختار کشمیر'' کے حامیوں میں ہی گردانا جاتا ہے اور حال ہی میں لبریشن فرنٹ (یاسین) نے ان کے ساتھ اہم مذاکرات کے ایک دور کے بعد حریت (ع) کے قریب جانے کے اشارے دیئے ہیں اور

ایک مشترکہ لائحۂ عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میر واعظ کی بچپن میں خواہش تھی کہ وہ ایک سافٹ ویئر انجینئر بنیں گے لیکن تقدیر نے انہیں حریت کانفرنس کا بانی چیئرمین بنا دیا۔ میر واعظ نے حال ہی میں کشمیر چھوڑ کر جانے والے پنڈتوں سے کہا تھا کہ انہیں بھی کشمیر کی 'تحریکِ آزادی' میں شمولیت اختیار کرنا چاہیے کیونکہ یہ تحریک کسی ایک خطے یا فرقے کی تحریک نہیں بلکہ پوری ریاست کے عوام کی تحریک ہے اور اس میں ریاست کے سبھی فرقوں کو حصہ لینا چاہیے۔

تاریخ کشمیر اس وقت ایک اہم موڑ سے گزر رہی ہے اور سیاسی حالات اس بات اا شارہ کرتے ہیں کہ کشمیری عوام کو ابھی جدوجہد کے نہ جانے کتنے ہی سمندر پار کرنے ہوں گے۔ اس دشتِ کرب و اذیت سے نکال کر کسی پرسکون منزل پر پہنچنے کے لئے کشمیری عوام (ریاستی عوام) کو ایک عظیم قائد کی ضرورت ہوگی، جس میں سبھی مکتبہ ہائے فکر کے لوگوں کو ایک لڑی میں پرو کر ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت ہو اور جو کسی ایک فرقے، خیال، خطے یا مذہب کا لیڈر نہ ہو کر سبھی کا لیڈر رہو۔

64

کشمیر قیادت کا مختصر تعارف..4

تاریخِ کشمیر کے مختلف ادوار میں اس سرزمین پر رہنے والی ہمہ پہلو قوم کے سامنے کئی بار ایسی قیادت آئی، جس نے اپنے عوام اور اس سرزمین کے تمام تنازعات، جھگڑے اور قضیئے ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کی خاطر تحریکیں برپا کیں، آوازیں اٹھائیں اور یہاں ہونے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کو دنیا کے بڑے بڑے ایوانوں تک پہنچانے اور عالمی حمایت حاصل کرنے کی انتھک کوششیں کیں، یہ تحریکیں لمبے اور دراز عرصے تک چلتی رہیں اور یہاں کے عوام ان کے ساتھ آخری دم تک جڑے رہے، ریاست کے عوام نے ان تحریکوں کا جس والہانہ انداز میں ساتھ دیا، اس کی مثالیں دنیا میں بہت ہی کم ملتی ہیں، اگر کشمیر عوام کی جان، مال اور عزت و آبرو کی قربانیوں کا چھ سو پچاس سالہ لیکھا جوکھا تیار کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کا وزن اس عرصے میں دنیا بھر میں ہونے والی قومی جدوجہدوں سے زیادہ ہوگا اور اس کی داستانیں بھی باقیوں سے طویل، دردناک اور تکلیف دہ ہوں گی، خاص طور پر تقسیم ریاست یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد جو کچھ اس سرزمین پر ہوا، اس کا کسی قوم کے ساتھ مقابلہ کرنا یا اس کی مثال دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

تاریخ کشمیر کے موجودہ موڑ پر زیرِ نظر مضامین کے سلسلے میں کشمیر کی موجودہ قیادت کا مختصر تعارف جاری ہے، اور اس قسط میں جس قائد کا تعارف کرانا مقصود ہے، وہ اول تو محتاجِ تعارف نہیں ہے دوم وہ ایک ایسے سیاسی نظریے کی پیروی کرتا ہے ، جس کے ساتھ کشمیری عوام کے تقریباً سبھی مکتبہ ہائے فکر جڑے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ نظریہ ریاست کے مستقبل کے حوالہ سے ایک ایسا روڈ میپ پیش کرتا ہے، جس کے دائرے میں ریاست میں آباد ہندو، مسلم، سکھ اور بودھ، سبھی آتے ہیں اور اس نظریے کو بین الاقوامی سطح پر بھی موجودہ دور میں کافی پذیرائی حاصل ہے۔ اس کی جماعت کو ساری دنیا جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے نام سے جانتی ہے اور قائد کو محمد یاسین ملک کے نام سے۔

جیسا کہ سابقہ اقساط میں آچکا ہے کہ مسلم متحدہ محاذ (MUF) کے قیام اور ریاست میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس جیسی روائتی اور مین سٹریم جماعتوں کے مقابلہ میں ایک متبادل سیاسی محاذ کھڑا

کرنے کی لہر چلی تو جو قائدین سامنے آئے، ان میں شبیر احمد شاہ، قاضی نثار احمد، جی ایم بٹ، سید علی گیلانی، پروفیسر عبدالغنی بٹ، محمد یوسف شاہ (سید صلاح الدین) غلام نبی سمجھی، عدبالغنی لون اور مولانا عباس انصاری جیسے وہ قائدین سامنے آئے، جنہوں نے سال ۸۷ء کے اسمبلی انتخابات میں حصہ لیا اور اگرچہ چار نشستوں پر کامیابی بھی حاصل کی لیکن انہیں کھلم کھلاء ہرادیا گیا جبکہ این سی کانگریس اور عوامی ایکشن کمیٹی کا سیاسی تکون کامیاب ہوگیا، ان قائدین کے پیچھے، دوسری صف میں جو خاص خاص نوجوان موجود تھے اور جو کشمیر میں ایک نئے سویرے اور نئی سیاسی روشنی کی امیدیں لگائے چل رہے تھے، ان میں بلال احمد صدیقی، عبدالحمید شیخ، محمد یاسین ملک، اشفاق مجید وانی، جاوید احمد میر اور متعدد دیگران شامل تھے، جنہوں نے اس الیکشن میں کشمیر کی سیاسی فضاء کو بدلنے کی کوششوں میں اپنا ہاتھ بٹایا لیکن ناکام ہونے کے بعد مایوسی کو گلے لگانے کی بجائے انہوں نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا، جس میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ بندوق کا راستہ تھا، جان کی بازی لگانے کا راستہ تھا اور اس کے ساتھ تباہی، بربادی، خون خرابہ، جنگ وجدل اور آتش وآہن کا واسطہ تھا اور جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کشمیر کی ایسی پہلی عسکری تنظیم تھی، جس کو پاکستان کی طرف سے ہتھیار فراہم کئے گئے...اس حوالہ سے تفصیل پہلی قسطوں میں آچکی ہے لیکن محمد یاسین ملک کا دعویٰ ہے کہ وہ مف کے قیام سے بھی کافی پہلے حکومت سے ناراض اور نالاں تھے اور انہیں اس سے قبل ہی کافی پریشان کیا جاچکا تھا۔

محمد یاسین ملک کی پیدائش 1966ء میں مائسمہ سرینگر میں ہوئی، جبکہ آج 2011ء میں (تقریباً ۴۵ سال بعد) بھی یاسین ملک اپنے اسی پرانے مکان میں اپنے عیال والدین، شریک حیات اور ایک ہمشیرہ کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا سیاسی تعارف صرف اٹھارہ سال کی عمر (1984) میں اس وقت ہوا تھا، جب وہ سکول میں زیرتعلیم تھے، انہوں نے ریاست میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور پولیس کی زیادتیوں کا نشانہ بنے۔ اس کے دوسال بعد یعنی 1986ء میں یاسین ملک پوری طرح سے سیاست میں سرگرم ہوچکے تھے، اس دوران انہوں نے اشتہارات اور پمفلٹ وغیرہ پر مشتمل لٹریچر تقسیم کر کے کشمیر میں، مسئلہ کشمیر کے حوالے سے نوجوان طبقہ میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی، اس وقت وہ جے اینڈ کے سٹوڈنٹس لیگ کے جنرل سیکریٹری تھے، پھر سے گرفتار ہوگئے، ان کو مارا پیٹا گیا اور تقریباً بیس یوم تک بند رکھا گیا لیکن یہاں سے چھوٹتے ہی انہوں نے جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ میں شمولیت اختیار کر لی، جو بعد میں کشمیر میں پہلی عسکری تنظیم بھی بنی۔ 1987ء کے مف انتخابات میں چونکہ یاسین ملک نے سرگرم حصہ لیا تھا اور محمد یوسف شاہ عرف سید صلاح الدین

کے الیکشن ایجنٹ کی حیثیت سے بھی کافی سرگرم رہے تھے اور جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اس الیکشن میں مسلم متحدہ محاذ کے ہرائے ہوئے امیدواروں اور ان کے قریبی ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا تھا، اسی کے ساتھ محمد یاسین ملک کو بھی گرفتار کیا گیا، ایک تعدیب خانہ (انٹیروگیشن سینٹر) میں بیس یوم تک ٹارچر کیا گیا اور بعد میں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں سے چھوٹے تو نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے ریاستی نظامِ سیاست سے بیزار ہوکر ایک ایسا راستہ اختیار کیا، جس کے بارے میں انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، یہ راستہ بندوق کا راستہ تھا، اس کے ساتھ جان کی بازی جڑی ہوئی تھی، اس کے ساتھ جنگ وجدل جڑا ہوا تھا، تباہی اور آتش وآہن وابستہ تھا اور بے شمار قربانیاں جڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ راستہ تھا، جس پر آگے تو بڑھا جاسکتا تھا لیکن نہ تو واپس مڑنے کی گنجائش تھی اور نہ ہی فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی۔ محمد یاسین ملک جے کے ایل ایف نامی اس پہلی عسکری تنظیم کے پہلے کمانڈر انچیف تھے اور اس وقت بھی اسی کے چیئرمین ہیں۔ وہ jklf کے بانی 'حاجی گروپ' کے ممبر تھے، جن میں شیخ عبدالحمید، اشفاق مجید وانی، جاوید احمد میر اور محمد یاسین ملک شامل تھے۔ سال ۹۰ء میں لبریشن فرنٹ نے کچھ بڑی عسکری کاروائیاں بھی انجام دیں، جن میں مفتی محمد سعید (جو کہ اس وقت بھارت کے وزیر داخلہ تھے) کی صاحبزادی روبیعہ سعید کا اغواء اور سرینگر ائرپورٹ کے قریب انڈین ائر فورس کے اہلکاروں کی ہلاکت وغیرہ شامل تھی۔ حاجی گروپ کے دوممبران اشفاق مجید وانی اور شیخ عبدالحمید مختلف وارداتوں میں فورسز کے ہاتھوں جاں بحق ہوگئے جبکہ محمد یاسین ملک اور جاوید احمد میر کو گرفتار کرلیا گیا اور 1994ء تک مختلف جیلوں میں نظر بند رکھا گیا۔ جب محمد یاسین ملک کو ناسازئ صحت کی بنیادوں پر رہا کردیا گیا تو انہوں نے ''یکطرفہ جنگ بندی'' کا اعلان کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ایک پرامن اور عدمِ تشدد پر مبنی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ یاسین کا کہنا ہے کہ ان کی جماعت کی جانب سے ہتھیار ترک کردینے کے باوجود اب تک ان کے چھ سو سے زیادہ ارکان کو ہلاک کردیا گیا ہے۔

یاسین ملک کی زندگی کا دوسرا حصہ بھارتی جیل خانوں، تعدیبی مراکز اور عدالتوں کے چکر کاٹتے ہوئے گزرا ہے، اس دوران انہیں کئی بار قیدِ تنہائی میں رکھا گیا اور ایسے بھی مواقع آئے جب انہیں ذہنی، دماغی اور نفسیاتی مریضوں (قیدیوں) کے ساتھ بھی رکھا گیا۔ ان کا کہنا ہے ''مجھے قید و بند کے دوران چھ مرتبہ جان سے مارنے اور صفِ ہستی سے ہٹانے کی کوشش کی گئی'' اگرچہ قید و بند کی وجہ سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے تاہم انہیں کئی طرح کی جسمانی بیماریوں کی وجہ سے کافی مشکلات کا

سامنا کرنا پڑا۔اس سلسلے میں انہوں نے امریکہ کا دورہ بھی کیا، جہاں اپنے علاج کے علاوہ انہوں نے کشمیر کے حوالہ سے ہونے والی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور باہری دنیا کو مسئلہ کشمیر سے روشناس کرایا۔ یاسین ملک کو اکتوبر ۱۹۹۹ء میں حریت کانفرنس کے کئی دیگر ارکان اور قائدین کے ہمراہ گرفتار کیا گیا اور اس بار شمالی ہندوستان کے انتہائی بدنام قید خانہ جودھ پور میں نظر بند رکھا گیا۔ یہاں سے رہا ہوئے تو 2002ء میں پھر سے پوٹا نامی قانون کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور ساتھ ہی پبلک سیفٹی ایکٹ بھی لاگو کر دیا گیا۔

یاسین ملک اور ان کی جماعت کے کھاتے میں جو سب سے اہم بات جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے چند سال قبل وادی اور جموں صوبوں کے تقریباً پانچ ہزار دیہات کا دورہ کر کے ایک دستخطی مہم چلائی، جس میں تقریباً پندرہ لاکھ لوگوں نے حصہ لیا۔ اس دستخطی مہم کا مقصد دنیا کو یہ بتانا تھا کہ ریاست کے عوام مسئلہ کشمیر کا حل چاہتے ہیں۔ جب سال ۲۰۰۵ء میں کشمیر میں برفانی طوفان آیا اور کئی دیہات میں تباہی مچی تو جے کے ایل ایف نے اس وقت امداد اور باز آباد کاری کے کاموں میں سرگرم حصہ لیا۔ بعد میں جب سمندری طوفان 'سونامی' بھارت کے کئی ساحلی علاقوں میں اور گجرات میں زلزلہ نے انسانیت کو للکارا تو اس تنظیم نے اس وقت بھی امدادی کاموں میں حصہ لیا۔ سال ۲۰۰۶ء میں جموں وکشمیر کے سرحدی علاقہ جات میں شدید زلزلہ آیا اور ہزاروں لوگ مارے گئے، اس وقت بھی جے کے ایل ایف نے امدادی کاموں میں حصہ لیا۔ یاسین ملک ان سبھی کاموں کو "بلا لحاظ مذہب وملت انسانی خدمت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

یاسین ملک نے پاکستان کی ایک خوبصورت دوشیزہ مشال ملک کے ساتھ ۲۴ فروری ۲۰۰۹ء کو شادی کر لی، لیکن جب سال ۲۰۰۸ء میں ان کی منگنی ہوئی تو وہ اس وقت بھی جیل میں تھے۔ ان دنوں امرناتھ شرائن بورڈ زمینی تنازعہ چل رہا تھا اور حکومت نے متعدد قائدین کو جیلوں میں بند کر رکھا تھا۔ اس کے بعد سال ۲۰۱۰ء میں بھی انہیں احتجاجی پروگرام کی قیادت کرنے کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا اور تقریباً اڑھائی ماہ کے بعد ستمبر میں رہا کر دیا گیا۔

یاسین ملک کے ابتدائی ساتھیوں میں سے دو اس دنیا سے جا چکے ہیں جبکہ تیسرا (جاوید احمد میر) الگ ہو چکا ہے، ان کی عمر کا ایک اچھا خاصا حصہ قید وبند میں بھی گزر چکا ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ قیادت بے شک بدلتی رہے گی، اُتار چڑھاؤ اور ٹیڑھے میڑھے موڑ بھی آ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود جب تک بھارت اور پاکستان کشمیری عوام کو ان کا مستقبل متعین کرنے کا موقعہ نہیں دیتے اور ریاست کی

پانچ اکائیوں کو پھر سے متحد ہونے نہیں دیا جاتا، یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہے گی۔ ۴ جنوری ۲۰۱۱ء کو حریت کانفرنس (ع) کی جانب سے منعقدہ ایک سیمینار سے خطاب کے دوران محمد یاسین ملک نے کہا" جے کے ایل ایف کا سیاسی نظریہ یہ ہے کہ پوری ریاست، جو ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کے وقت موجود تھی، کو ایک بات پھر سے متحد کر کے ایک آزاد اور خود مختار مملکت بنایا جائے اور عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے لیکن اگر عوام کو پاکستان کے ساتھ جانا اچھا لگے تو جے کے ایل ایف اس فیصلے کا بھی احترام کرے گا، اگر عوام کا فیصلہ بھارت کے حق میں ہو تو اس کو بھی تسلیم کیا جائے لیکن عوام کو یہ حق دیئے بغیر نہ تو کشمیر میں امن قائم ہوگا اور نہ یہ تحریک ختم ہوگی"۔

کشمیری قیادت کا مختصر تعارف.....5

کشمیر کی موجودہ تحریکی اور مزاحمتی قیادت میں کچھ ایسے بزرگ قائدین بھی شامل ہیں، جن کا پروفائل اگرچہ کافی پوشیدہ رہا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان کی ذات میں کئی تحریکیں اور کئی تاریخیں پوشیدہ ہیں۔ انہوں نے تقسیم ریاست کا حال اور اس ریاست کی بنتی ، بگڑتی تقدیر کا سارا نظارا اپنی آنکھوں سے دیکھا، ریاست کے پانچ ٹکڑے ہوتے دیکھے اور اس کے سینے پر شہمار بن کر رینگنے والی خونی لکیر کو کھچتے ہوئے دیکھا اور اس جنتِ ارضی کے باغ و بہار کو لٹتے ہوئے دیکھا لیکن اپنے محبوب وطن کی حالتِ زار پر محض اشک نہیں بہائے بلکہ اس کے لئے مزاحمت کی، جیل گئے اور سختیاں برداشت کیں۔ وقت کا کارواں اپنی رفتار سے گزرتا رہا لیکن ان قائدین کے حوصلوں اور ارادوں میں نہ تو کوئی لغزش پیدا ہوئی اور نہ ہی حالات کی تند و تیز آندھیاں انہیں اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوئیں۔ مولانا محمد عباس انصاری ریاست کے ایسے ہی قائدین میں شامل ہیں، جنہوں نے نہ صرف کشمیر کی تحریکِ مزاحمت میں سرگرم اور نمایاں حصہ ادا کیا بلکہ اتحاد بین المسلمین کی خاطر بھی ہمیشہ برسرِ جدوجہد رہے، اس کا ایک نمایاں اور بین ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی سیاسی جماعت کا نام بھی 'اتحاد المسلمین' رکھا ہے۔ محمد عباس انصاری کا جنم سرینگر شہر کے پائین علاقہ خانقاہِ سوختہ میں 1936ء کے آس پاس ہوا تھا، یہ وہ زمانہ تھا، جب کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف عوامی جدوجہد جاری تھی اور دوسری جانب بھارت میں برطانوی سامراج کے خلاف جنگِ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ مولانا عباس کا کہنا ہے کہ انہوں نے 1947ء میں قبائلی یلغار کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس جنگ میں ہونے والی تباہی اور خون خرابہ ابھی تک انہیں دھندلا دھندلا یاد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مقبول شیروانی نے قبائلی سپاہیوں کو بارہمولہ سے اپنے ساتھ یالا تو تھا لیکن بعد میں واپسی پر انہیں گاندربل کے راستے بھٹکا دیا۔ مولانا پہلے شیخ محمد عبداللہ کے قریب گئے اور بعد میں محاذ رائے شماری سے لے کر نیشنل کانفرنس تک ان کا ساتھ دیا لیکن 1979ء میں جب پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو اس کے بعد وہ این سی سے الگ ہو گئے۔ ایک ملاقات کے دوران مولانا عباس انصاری نے اپنی زندگی کی داستان بیان

کرتے ہوئے کہا ''میں اگر چہ ابھی کافی چھوٹا تھا لیکن جب شیخ محمد عبداللہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کیا تو ہم نے اس کی کافی مخالفت کی، یہ ڈاکٹر علی جان، میرے چچا مقصود علی انصاری اور ایسے ہی دیگر افراد کا زمانہ تھا، جب وہ جیلوں میں تھے، مجھے بتایا گیا کہ شیخ عبداللہ مزارِ شہدا میں تقریر کرنے والے ہیں اور یہ تقریر سن کر شام کو رپورٹ پیش کروں، میں پہلے جانے کے لئے تیار نہیں تھا کیونکہ مجھے ان سے کافی نفرت تھی لیکن جب بڑوں نے مجبور کیا تو مجھے جانا پڑا، یہ پہلا موقعہ تھا، جب میں نے شیخ کو روبرو دیکھا اور سنا، غالباً یہ 13 جولائی 1952ء کا دن تھا، اس تقریر میں انہوں نے کہا کہ ان کے ساتھ دلی والوں نے دھوکہ کیا ہے، بقولِ ان کے ''میں اور جواہر لال نہرو دو بھائیوں کی طرح تھے، میں نے ان پر بہت زیادہ بھروسہ کیا تھا لیکن مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ ''وشواس گھات'' کریں گے، میں عہد کرتا ہوں کہ میں کشمیر کا فیصلہ ہونے تک عوام کو ساتھ لے کر جدو جہد کرتا رہوں گا اور جب تک یہ فیصلہ نہیں ہو جاتا، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا'' اس تقریر نے مجھے کافی متاثر کیا، میں ان دنوں سرینگر کے اورینٹل کالج میں زیرِ تعلیم تھا، یہاں شیخ صاحب کا کافی اثر تھا، میں نے یہاں زیرِ تعلیم کافی نوجوانوں کو سیاست کی جانب مائل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور ہم نے شیخ کے حق میں ایک مہم بھی چلائی، جس میں ہم راستوں اور چوراہوں پر پوسٹر چسپاں کرتے تھے یا لوگوں میں پرچے (پمفلٹ) تقسیم کر کے عوامی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم سبھی شیخ عبداللہ کی 'واپسی' سے بہت خوش تھے اور اس کی تحریک کے ساتھ سرگرمی کے ساتھ وابستہ بھی تھے، اسی دوران ۹ اگست 1953ء کو شیخ محمد عبداللہ کو گلمرگ میں ڈاکٹر کرن سنگھ کی ایما پر گرفتار کر لیا گیا، ہم نے اس گرفتاری کے خلاف ایک بہت بڑا جلوس نکالا اور سخت مظاہرہ کیا، ہمیں امیرا کدل سے واپسی پر گرفتار کر لیا گیا لیکن ان دنوں چونکہ ابھی تھانے وغیرہ نہیں تھے، اس لئے ہمیں فتح کدل میں 'چیری بڈھے' کی دکان میں بند رکھا گیا، یہ جگہ ان دنوں سب سے بڑا تعذیب خانہ بھی تھی اور حوالات بھی، یہیں پر گرفتار شدگان کی مار پیٹ کی جاتی تھی۔ لیکن اس دوران ہماری ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہو چکی تھی اور ہمارے پاس چونکہ کوئی بڑا ہتھیار وغیرہ نہیں تھا لیکن چاقو، چھریاں لے کر ہم بھی نکلتے تھے اور اپنے حساب سے مزاحمت کرتے تھے، ہم نے گلی کوچوں میں کئی 'جنگیں' لڑیں لیکن جب پکڑ دھکڑ کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہاں سے کہیں باہر جانا چاہیے کیونکہ ابھی میری دنیاوی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی اور میں اپنی دینی تعلیم بھی مکمل کرنا چاہتا تھا، اس لئے میں نے عراق جانے کا فیصلہ کر لیا اور وہاں سات سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا، واپسی پر 1960ء میں جب میں جموں پہنچا تو کشمیر کا راستہ برف باری کی وجہ سے

بند تھا۔اس دوران میں نے سوچا کہ شیخ عبداللہ اوران کے ساتھیوں مرزاافضل بیگ، ڈاکٹر علی جان، علی شاہ اور صوفی محمد اکبر وغیرہ سے ملاقات کی جائے، جوان دنوں جموں جیل میں بند تھے، انہوں نے مجھے محاذ رائے شماری میں شرکت کے لئے کہا لیکن میں نے کہہ دیا کہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کشمیر میں شعیہ اور سنی طبقوں کے درمیان سخت جو دوریاں پیدا ہوگئی ہیں، ان کو ختم کیا جائے، میں نے کہا کہ میں دل سے رائے شماری کی حمایت کرتا رہوں گا لیکن میری ترجیحات میں اتحاد بین المسلمین سرِ فہرست رہے گا، اور اسی آرزو کو لے کر میں نے اپنی جماعت ''اتحاد المسلمین'' کی بنیاد ڈالی، میں نے سبھی فرقوں کے علمائے کرام کو اس میں شرکت کی دعوت دی اور چیدہ چیدہ علمائے کرام پر مشتمل ایک اتحاد ''انجمنِ علمائے جموں وکشمیر'' بھی معرضِ وجود میں آئی، جس میں تمام فرقوں کے علمائے کرام شامل ہوئے، جن میں مولانا نور صاحب ترآلی، مفتی عبدالرشید صاحب اور مولانا مبارکی صاحب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ہم نے لمبے عرصے تک اس تحریک کو آگے بڑھایا اور اللہ کے فضل سے اس میں اچھی خاصی کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ اسی دوران مارچ 1963ء میں موئے مقدس نبویؐ کی گمشدگی کا واقعہ پیش آیا تو علمائے کرام نے اس کی بازیابی کے لیے کافی کام کیا اور موئے مقدس ایکشن کمیٹی بھی ہم نے ہی تشکیل دی تھی، اس میں مولانا محمد فاروق اور جماعتِ اسلامی کو بھی شامل کیا گیا، 13 جولائی 1963ء کے دن ہم کشمیر کی بہت سی سیاسی اور دینی جماعتوں، جن میں اتحاد المسلمین کے علاوہ محاذ رائے شماری، پولٹیکل کانفرنس اور جماعت اسلامی وغیرہ شامل تھیں، نے مل کر ایک قرارداد پیش کی، جس میں کشمیر میں ہورہی زیادتیوں کی مذمت کی گئی اور موئے مقدس کی بازیابی کا مطالبہ کیا گیا، اسی دوران موئے مبارک کی تحقیقات کے سلسلے میں بھارت کی سراغرساں ایجنسی آئی بی کا سربراہ سرینگر آیا ہوا تھا، اس نے ایکشن کمیٹی کے ممبران کو طلب کیا اور پوچھا کہ موئے پاک کو تلاش کرلیا گیا ہے لیکن اب اس کی پہچان کیسے کی جائے؟ بدقسمتی سے میں نے جلدی جلدی کھڑے ہوکر کہہ دیا کہ اس کو ایک بار پہلے بھی آگ میں ڈالا جاچکا ہے لیکن یہ جلا نہیں تھا، اس لئے اسے دوبارہ آگ میں ڈالا جائے....اس وقت تو اس نے میرا نام پتہ پوچھنے کے علاوہ کچھ نہیں کہا لیکن اسی رات کے دوران میرے تمام رشتہ داروں، دوستوں اور جان پہچان والوں کے گھروں پر چھاپوں کا سلسلہ شروع کردیا گیا اور مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی، میں یہاں سے بچنے میں کامیاب ہوگیا کیونکہ شیخ رشید نے مجھے اپنی گاڑی میں سوار کرکے مولوی محمد سعید مسعودی کے گھر گاندربل پہنچا دیا تھا، وہاں ہم اس موضوع پر بات کرہی رہے تھے کہ اسی دوران پولیس نمودار ہوگئی، مجھے دبوچ لیا گیا اور سیدھا غلام قادر گاندربلی کے پاس پہنچا دیا گیا، رمضان کا مہینہ تھا،

گاندربلی کے ساتھ میری گرما گرم بحث ہوئی اور اسی کے ساتھ پہلے مجھے جموں جیل میں اور بعد میں کٹھوعہ منتقل کردیا گیا، اسی دوران میر قاسم اور دیگر لوگوں کو بھی گرفتار کر کے وہاں لایا گیا، ان میں حکیم حبیب اللہ اور غلام رسول کوچک وغیرہ بھی شامل تھے، وہ اچھے لوگ تھے، کچھ عرصہ بعد جیل میں ایک شخص کی رہائی کا پروانہ آیا، غالباً اس پر 'محمد اعباس' یا ایسا ہی کوئی نام لکھا تھا ولدیت اگر چہ ایک ہی تھی یعنی 'غلام حسن' لیکن وہ چونکہ صاف طور نہیں لکھا تھا اس لئے انہوں نے اسے 'محمد عباس' سمجھ کر مجھے رہا کر دیا، لیکن جب تک انہیں اس بارے میں حقیقت معلوم ہوئی، تب تک میں فرار ہو چکا تھا۔ اس دوران باہر موئے مقدس کی شناخت کر لی گئی تھی اور معاملہ بھی ٹھنڈا پڑ چکا تھا''

مولانا محمد عباس انصاری نے اس ملاقات کے دوران اپنی جو طویل تاریخ بیان کی، اگر اسے زیرِ نظر مضمون میں شامل کیا جائے تو کئی قسطوں کی ضرورت ہوگی لیکن اختصار کا تقاضہ ہے کہ اسے سمندر سمجھ کر کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ جب 1966ء میں شیخ محمد عبداللہ جواہر لال نہرو سے ملنے کے بعد پاکستانی صدر جنرل ایوب خان سے ملنے کے لئے گئے، اس وقت بھی شیخ صاحب نے ان سے مشورہ کیا لیکن بدقسمتی سے ان کی واپسی سے قبل ہی نہرو کی موت واقع ہوگئی اور وہ راز، راز ہی رہا البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس وقت تک بھارت پاکستان کو مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے فریق تسلیم نہیں کرتا تھا اور نہ ہی پاکستان یہ مانتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں فریقانہ حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو نے صاف کہہ دیا تھا کہ پاکستان کو کشمیر کے ساتھ دلچسپی ہے اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں لیکن شیخ صاحب نے کہا تھا کہ اس حوالہ سے کشمیری عوام سب سے بڑے فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا نے کہا ''یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی پارٹی کے جھنڈے میں پانچ ستارے رکھے ہیں، جو ریاست کے پانچ منقسم حصوں کی نمائندگی کرتے ہیں، بہرحال یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا، شیخ صاحب گرفتار اور رہا ہوتے رہے اور ہم لوگ بھی ساتھ میں پستے رہے تا آنکہ 1979ء میں، میں نے اس محاذ کو خیر باد کہہ دیا۔ اگلی ایک دہائی کے دوران کشمیر میں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ یہاں پھر سے نوجوانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی، ہم نے مسلم متحدہ محاذ کی بنیاد ڈالنے میں اپنا رول نبھایا اور مجھے یاد ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے گھر پر ہی سب سے پہلی نشست اس دن منعقد ہوئی تھی، جب میری والدہ محترمہ کی وفات ہوئی تھی اور بہت سے قائدین ہمارے گھر تعزیت کی غرض سے آئے ہوئے تھے''

مولانا عباس انصاری نے 1987ء کے اسمبلی انتخابات میں خود حصہ نہیں لیا تاہم انہوں نے اپنے امیدواروں کو میدان میں ضرور اتارا اور مف کے جھنڈے تلے ان کی حمایت بھی کی۔ اس الیکشن

میں مف کو ہرادیا گیا اوراس کے قائدین کو جیلوں میں بھردیا گیا، جب باہر نکلے تو عسکری محاذ سرگرم ہوچکا تھا۔انصاری جون 93ء میں بننے والی کل جماعتی حریت کانفرنس کے بانی ممبران میں شامل تھے۔ مولانا عباس کو ۲۰۰۲ء میں دوسال کے لئے حریت کانفرنس کا چیئرمین بنایا گیا اوراس دوران جو سب سے اہم بات ہوئی، وہ حریت اور بی جے پی حکومت میں ڈپٹی وزیراعظم ایل کے ایڈوانی کی ملاقات تھی۔مولانا کا کہنا ہے کہ اس ملاقات میں حریت نے تجویز رکھی تھی کہ کشمیر کو مسئلہ حل کرنے کے لئے سارک ممالک پر مشتمل ایک نگران گروپ بنایا جائے، جورائے شماری سے ملتے جلتے ریفرنڈم پر عمل درآمد کی نگرانی کرے اورلوگوں کوایک موقعہ دیا جائے تا کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرسکیں، یہ بات اگرچہ اس وقت مان بھی لی گئی تھی لیکن بعد میں حکومت بھی گئی اور یہ وعدہ بھی وعدہ ہی رہا۔

مولانا عباس آج بھی اس عقیدے پر سختی سے قائم ہیں کہ مسئلہ کشمیر کو حل کئے بغیر بھارت پاکستان اور کشمیر ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں قیامِ امن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا اوراس سلسلے میں ریاست کے پانچوں خطوں کوایک ساتھ جوڑنا اورانہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقعہ دینا ایک ناگزیر عمل ہے، بھارت اور پاکستان چاہیں تو سالہا سال تک کشمیری عوام کے اس مطالبے کو دبا سکتے ہیں اورٹال سکتے ہیں لیکن ایک نہ ایک دن انہیں یہ کام ضرور کرنا ہوگا۔

66

کشمیری قیادت کا مختصر تعارف....6

کشمیر کی موجودہ تحریکِ مزاحمت میں شامل قیادت کا ذکر اگر گہرائی میں جا کر تفصیل کے ساتھ کیا جائے تو اس میں قائدین کی ایک انتہائی طویل فہرست دکھائی دیتی ہے، اتنا ہی نہیں، اس فہرست میں شامل قائین کا قد اور قربانیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان میں سے چند ایک کا انتخاب کرنا اور انہیں تاریخ کی کسی کتاب میں شامل کرنا اور چند ایک کو چھوڑ دینا یا پھر (خدانخواستہ) فراموش کر دینا ایک انصاف پسند قلمکار کے لئے گناہ کے مترادف ہوگا لیکن اگر ان سبھی قائدین اور سالار و سپاہ کا حال لکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے دفتروں کے دفتر درکار ہوں گے اور اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایک اخبار کے مضمون یا ایک چھوٹی سی کتاب میں یہ سب ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود کوشش تو یہ ہے کہ تفصیلاً نہ صحیح پھر بھی برائے حوالہ سب کا ذکر کیا جا سکے تو وہ بھی کافی ہوگا۔ جہاں تک تحریکِ مزاحمت کے ابتدائی سالاروں کا تعلق ہے، اس حوالہ سے ایک ایسا قد آور جرنیل ہمارے سامنے ابھر کر آتا ہے، جس نے نہ صرف مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے ساری دنیا کی توجہ کھینچنے اور اس پر جمی ہوئی دھول صاف کرنے میں سب سے پہلے پیشقدمی کی بلکہ انتہائی مشکل دور میں بھی اپنے اس موقف پر قائم رہے، جس پر اس کے لئے پاکستان جیسے ملک میں، جہاں کشمیر کی خودمختاری یا پاکستان سے الگ رہ کر ایک نئی مملکت بنانے کی بات کرنا بھی گناہ ہے، کافی مشکل کام تھا۔ پاکستان کے مرکز چاندنی چوک (راولپنڈی) میں بستے ہوئے یہ کہنا کہ کشمیر ایک آزاد اور خودمختار ملک کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھر کر آنا چاہیے، سچ مچ ایک مشکل کام ہے اور خاص طور پر جب اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کے حوالہ سے کشمیر کی بات کی جائے تو وہاں بھی اس موقف اور اس نظریے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ لیکن اس کے باوجود گلگت بلتستان کے استور علاقہ سے اٹھ کر یہاں تک پہنچنے والے اس کشمیری لیڈر نے اپنا موقف نہیں بدلا اور اسی لیڈر کو دنیا جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے بانی اور امان اللہ خان کے نام سے جانتی ہے۔ امان اللہ خان نے تحریک کے ابتدائی مرحلہ میں بندوق کو کشمیر پہنچانے اور اس خاموش سرزمین پر مسلح تحریک کا آغاز کرنے میں انتہائی اہم اور کلیدی رول ادا کیا کیونکہ ان دنوں پاکستان سے بھی صرف جے کے ایل ایف کے لڑکوں کو ہی

ہتھیار فراہم کئے جاتے تھے، کیونکہ یہ کشمیر کی آزادی کی بات کرتے تھے اور پاکستان نہیں چاہتا تھا کہ کشمیر میں کوئی ہلہ گلہ مچے اور عالمی برادری اس سلسلے میں پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرائے لیکن وقت بدلتا گیا اور پاکستان کے موقف میں بھی تبدیلی آتی رہی، جو کہ ایک الگ موضوع ہے۔

امان اللہ خان پاکستان میں کس قدر 'محدود' زندگی گزارتے ہوں گے، اس بات کا اندازہ سال 2001ء میں راقم کو اس وقت ہوا، جب دورۂ پاکستان کے دوران راقم کے علاوہ کشمیر کے ایک نامور صحافی اور مورخ شبنم قیوم نے چاندنی چوک راولپنڈی میں خان سے ملنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ ملاقات نہیں ہو پائی (جس کا آج بھی افسوس ہے) اور راقم اس کے بجائے ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی کی عمارات دیکھنے چلا گیا لیکن شام کو جب ہم دونوں اپنے میزبانوں کے پاس واپس لوٹے تو وہاں ہم دونوں سے ایک مشترکہ سوال پوچھا گیا، جو اس طرح سے تھا'' آپ میں سے چاندنی چوک کون گیا تھا؟'' حالانکہ اس سے قبل یہ معلوم تھا کہ چاندنی چوک صرف نئی دلی میں ہے، جہاں جانے کے بارے میں کبھی کسی نے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ بہر حال امان اللہ خان کا تعلق ریاست جموں وکشمیر کے شمالی علاقہ گلگت بلتستان سے ہے اور ان کا جنم استور میں ۲۴ اگست ۱۹۳۴ء کو ہوا تھا۔ ان کی ایک ہمشیرہ، جس کا رشتہ کپوارہ کشمیر میں ہوا تھا، نے امان اللہ کو بچپن میں اپنے ساتھ کشمیر لایا اور یہاں کشمیر یونیورسٹی سے ہی انہوں نے ۱۹۵۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، امر سنگھ کالج میں داخلہ لیا اور بعد میں ۱۹۵۲ء میں واپس پاکستان لوٹ گئے۔ کراچی میں ایس ایم کالج میں اپنی تعلیم جاری رکھی، ۱۹۵۷ء میں گریجویشن کرنے کے بعد ۱۹۶۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور یہ سارا کام امان اللہ خان نے اپنے بل بوتے پر کیا۔ تاریخی شواہد کے مطابق وہ سکول میں طالب علمی کے زمانے سے ہی تحریکِ کشمیر کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں کشمیر کے حوالہ سے بننے والی ''کشمیر کمیٹی'' کی بنیاد رکھنے والوں میں امن اللہ خان بھی شامل تھے۔ ان کو ۱۹۶۵ء میں 'محاذِ رائے شماری' کا جنرل سیکریٹری بنایا گیا، اسی سال جب شہید کشمیر مقبول بٹ نے جموں وکشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کی بنیاد ڈالی تو اس میں بھی امان اللہ خان اولین شرکاء میں تھے۔ شہید مقبول بٹ کی بھی اپنی الگ کہانی ہے۔ انہوں نے دس سال تک بھارتی قید خانوں میں گزارے اور اس دوران انہیں پاکستان کا ایجنٹ قرار دیا گیا حالانکہ اس سے قبل انہوں نے پاکستانی جیل خانوں میں چار سال سے زیادہ کا عرصہ گزارا تھا، جس دوران ان پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام عائد تھا، تاہم وقت نے ثابت کیا کہ مقبول بٹ نہ تو بھارتی ایجنٹ تھے اور نہ پاکستان کے بلکہ وہ کشمیری عوام اور کشمیر کے ایجنٹ تھے اور اس مقصد کے لئے اپنی جان سے بھی کھیل گئے۔ یہ انکشاف بھی امان

اللہ خان کی ویب سائٹ نے کیا تھا کہ شہید مقبول بٹ پر ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء تک گلگت میں بھارتی ایجنٹ ہونے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا جبکہ دوسری جانب 'غیر حاضری' میں سرینگر میں بھی ان پر مقدمہ چلا اوراس میں ان پر پاکستانی ایجنٹ ہونے کا الزام عائد تھا۔سوچا جا سکتا ہے کہ ایک غیر جانبدار کشمیری یا کشمیرنواز ہونا کس قدر مشکل اور 'جان لیوا' کام ہے!امان اللہ خان نے پاکستان سے ۱۹۷۲ء میں کچھ دیر کے لئے ہجرت کر لی اور لندن جا کر جموں و کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ اور JKPF کی ساری شاخوں کو ضم کر کے جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کی بنیاد ڈالی۔۱۹۸۵ء میں انہیں لندن میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور اگرچہ وہاں سے بری ہو گئے لیکن دسمبر ۱۹۸۶ء میں انہیں واپس پاکستان بھیج دیا گیا۔اسی دوران ۱۹۸۸ء میں کشمیر میں مسلح تحریک کا آغاز کرنے میں بھی امان اللہ خان نے ہی پہل کی، جس کے ردِعمل میں دسمبر ۱۹۹۰ء میں بھارت نے ان کا امریکی ویزا منسوخ کروا دیا۔ان کے خلاف بین الاقوامی پولیس (انٹر پول) کی طرف سے گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے اور اس کے ردِعمل میں انہیں اکتوبر ۱۹۹۳ء میں بیلجیم میں گرفتار کر لیا گیا، جہاں ان کو یوروپی پارلیمنٹ کی طرف سے کشمیر کے حوالہ سے ایکسمینار میں شرکت کی غرض سے بلایا گیا تھا لیکن اس دوران ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ریاست کے سابق وزیر اعلیٰ اور بھارت کے سابق وزیر دفاع جارج فرنانڈز نے خان کی گرفتاری کی سخت الفاظ میں مذمت کی تھی، اس دوران بھارت نے بلجیم حکومت سے امان اللہ خان کو بھارت کو سونپنے کیلئے ایڑھی چوٹی کا زور لگایا لیکن یہ مانگ نامنظور کر دی گئی اور امان اللہ خان کو تقریباً تین ماہ کے بعد رہا کر دیا گیا۔

امان اللہ خان کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی عصمیٰ خان ہیں، جن کا رشتہ کشمیر میں مرحوم عبدالغنی لون کے صاحبزادے سجاد غنی لون کے ساتھ نومبر ۲۰۰۰ء میں ہو گیا۔عصمیٰ اب سرینگر میں آباد ہیں اور کشمیر کے حوالہ سے مختلف موضوعات پر لکھتی رہتی ہیں۔امان اللہ خان نے دو کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے پہلی کتاب انگریزی میں ہے اور اس کا نام Free Kashmir (آزاد کشمیر) ہے جبکہ دوسری کتاب ان کی اپنی سوانح حیات ہے، اس کا نام 'جہدِ مسلسل' ہے، اور یہ اردو میں شائع ہوئی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے درجنوں کے حساب سے چھوٹے کتابچے اور پمفلٹ بھی تحریر کئے ہیں، جن میں وہ کشمیر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔امان اللہ خان مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے دنیا کے تقریباً بیس ملکوں کا دورہ کر چکے ہیں، جہاں بقولِ ان کے انہوں نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے اور پورے جنوبی ایشیائی خطے کو اس طویل پریشانی سے نجات دلانے کی وکالت کی، جو اس مسئلہ کے التویٰ میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

امان اللہ خان اکثر کہتے آئے ہیں کہ وہ بھارت اور پاکستان میں سے کسی بھی ملک کے دشمن نہیں ہیں۔لیکن وہ کشمیر کو ان دونوں کا حصے بھی نہیں مانتے، بلکہ وہ اس حکومتی نظام کے دشمن ہیں، جس نے ان کے مادرِ وطن (ریاستِ جموں وکشمیر) کو پنجے میں لے رکھا ہے اور ان کا اختلاف ان سیاست دانوں کے ساتھ ہے، جو کشمیری عوام کو ان کا تسلیم شدہ اور پیدائشی حق یعنی حقِ خودارادیت دینے کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔

امان اللہ خان کا کہنا ہے کہ پچھلے ستر برس کے دوران بھارت اور پاکستان نے مسئلہ کشمیر کی وجہ سے جو نقصانات اٹھائے ہیں، ان کو منافع میں بدلنے اور اپنا اپنا وقار بنائے رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دونوں ممالک کشمیر کو اس کے حال پر چھوڑ دیں اور اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنا سیکھ لیں، اسی میں ان دونوں ممالک کی بھلائی ہے اور یہ کشمیری عوام کا حق بھی بنتا ہے کہ وہ بھی دنیا کی باقی اقوام کے ساتھ ساتھ ترقی کی منازل طے کریں۔امان اللہ خان کی ایک بدقسمتی یہ بھی رہی کہ کشمیر کے اندر، جہاں بھارت کے خلاف بندوق اٹھانے والی ان کی ہی جماعت سب سے پہلے میدان میں آئی، آج کل ان کا کوئی خاص تنظیمی ڈھانچہ موجود نہیں ہے اور وہ سبھی ساتھی، خاص طور پر محمد یاسین ملک اور جاوید احمد میر ان سے الگ ہو گئے ہیں اور اگر چہ وہ بھی خود کو جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہیں تاہم یہ وہ جے کے ایل ایف نہیں ہے، جس کے چئیر مین امان اللہ خان ہیں۔اس وقت لبریشن فرنٹ کشمیر میں چار خانوں میں منقسم ہے۔پہلے خانے میں محمد یاسین ملک کی جماعت ہے، جو مائسمہ سرینگر میں سرگرم ہے، دوسری جماعت میں بٹہ کراٹے، ننھا جی اور شفاعت احمد وغیرہ شامل ہیں اور ان کا مرکزی دفتر راج باغ میں ہے۔جبکہ فرنٹ کے ایک سینئر ترین کمانڈر جاوید احمد میر نے بربرشاہ علاقہ میں دفتر کھول رکھا ہے اور اپنی سرگرمیاں وہاں سے جاری رکھے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ امان اللہ خان کی جے کے ایل ایف کے دفتر کا اگر چہ ایڈریس معلوم نہیں تاہم اس دفتر کو ڈاکٹر محمد افضل چلاتے ہیں اور کبھی کبھار اس جماعت کا کوئی پریس ریلیز بھی سرینگر کے اخبارات میں پڑھنے کو مل جاتا ہے۔

امان اللہ خان کا نظریہ شروع سے ہی واضح رہا ہے کہ کشمیر ایک خودمختار اور آزاد مملکت تھی اور تاریخ جانتی ہے کہ اس قوم کو ماضی میں کئی مرتبہ دبانے اور غلام بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ ہر بار قابض حکمرانوں کے ساتھ ٹکرائی اور ان کو یہاں سے فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، اس وقت بھی یہ قوم بھارت کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور ایک نہ ایک دن بھارت اور پاکستان کو ان کی جدوجہد کو تسلیم کرنا پڑے گا اور اس معاملہ میں جس قدر جلدی ہو سکے، اسی قدر دونوں کے حق میں اچھا ہے۔امان اللہ خان

اس وقت اپنی عمر کی ۸۷ویں دہلیز پر ہیں، انہوں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی کشمیر کی آزادی کے لئے آواز اٹھائی، جیل گئے اور بُرے دن بھی دیکھے، اس راستے میں پھولوں کے ملنے کی امید تو کیا تھی بلکہ الٹا قدم قدم پر کانٹے بسیار ملتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ خان صاحب کی قسمت میں بھی تھے، ان کی ایک ہی بیٹی تھی، جو کشمیر میں آباد ہے، اس وقت بھی خان کو کشمیر کے مستقبل کا غم کھائے جارہا ہے اور ان کا ہر کام کشمیر کے تعلق سے ہی انجام پاتا ہے لیکن انہیں کشمیر کی قیادت کے ساتھ کافی شکوے بھی ہیں اور وہ ان کے انتشار اور اختلاف سے کافی دکھی رہتے ہیں۔ خان امان اللہ اتحاد و اتفاق کے عمر بھر حامی رہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے گرد زیادہ بڑا حلقہ جمع نہیں کر پائے، مجھے ان کا ایک مشہور قول بہت پسند ہے، جو وہ اکثر دوہراتے رہتے ہیں اور وہ اس طرح سے ہے:

''تحریکوں میں افراد کی قیمت نہیں ہوتی، تحریکوں کی طاقت جہدِ مسلسل، حوصلہ اور عزم و استقلال ہوتا ہے، ہمارے پاس سب کچھ ہے مگر دیانتداری اور ڈسپلن نہیں ہے'' اللہ کرے کہ اس آواز کو کشمیری قیادت دیر سویر سمجھ لے......'

تحریکِ مزاحمت میں خواتین کا رول....1

مزاحمتی تحریکیں جب عسکری اور جنگی تحریکوں میں بدل جاتی ہیں تو اس میں سب سے زیادہ نقصان اور پریشانی مرد کے مقابلے میں عورت کو ہی اٹھانا پڑتی ہے کیونکہ ایک مرد اگر اپنی جان گنواتا ہے تو وہ تنہاء متاثر ہوتا ہے لیکن ہر مرد کے پیچھے کئی خواتین متاثر ہوتی ہیں، ایک بے سہارا اور عمر رسیدہ ماں، کئی کئی بہنیں، شریکِ حیات اور دختران بیک وقت سرِ راہ آجاتی ہیں اور ہمارے سماج میں ایک بے سہارا خاتون کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے، اس سے بھی سبھی واقف ہیں۔ اگر تحریک میں مذہبی عنصر بھی شامل ہو تو مزاحمت کرنے والی قوم کی خواتین کے لئے مصائب بڑھ اور بھی بڑھ جاتے ہیں کیونکہ قابض یا حملہ آور قوم کی افواج اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لئے خواتین کی بے حرمتی اور بے عزتی کو ایک موثر ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں اور کشمیر میں اگر اُن واقعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے، جن کا تعلق کشمیری مسلم خواتین کے ساتھ ہے اور جو موجودہ مزاحمت کے دوران پیش آئے تو اس کے لئے ایک ضخیم ترین کتاب کی ضرورت ہوگی۔ سال ۹۰ میں جب کشمیر میں سب سے پہلی گولی چلی، اسی کے ساتھ خواتین کی بے حرمتی اور بے عزتی کے واقعات بھی رونما ہونے شروع ہو گئے تھے۔ عسکریت پسندوں کے ساتھ بہت سی خواتین بھی وابستہ ہو گئیں، یہ خواتین عسکریت پسندوں کے لئے اسلحہ اور دیگر ضروریات ایک جگہ سے دوسری جگہ با آسانی پہنچانے میں معاون ثابت ہوئیں کیونکہ شروع میں فورسز کی توجہ ان کی جانب نہیں تھی اور وہ ان کی نظروں سے بچ کر آجا سکتی تھیں، لیکن بعد میں جب یہ راز افشاء ہوا اور چند ایک خواتین کے بارے میں فورسز کو پتہ چلا کہ وہ عسکریت پسندوں کے لئے 'کوریئر' کا کام کرتی ہیں تو خواتین کے لئے پریشانیاں بڑھ گئیں۔ ان بیس بائیس برسوں میں کشمیر کی سرزمین پر بے شمار خواتین کو عسکریت پسندوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کی پاداش میں گرفتار کیا گیا اور جان سے بھی مارا گیا جبکہ متعدد اجتماعی اور انفرادی عصمت ریزی کے واقعات بھی پیش آئے، جن کا تفصیلاً ذکر کرنا ایک اخباری مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ زیرِنظر مضمون میں جن چند ایک خواتین کا ذکر کرنا مناسب اور موزون لگتا ہے، ان میں تین سرِفہرست ہیں، ان تینوں کی قربانیاں کافی زیادہ ہیں، انہوں نے مسلسل عذاب و

عتاب کا لامحدود سلسلہ دیکھا اور برداشت کیا ہے۔ مجھے یاد ہے جب ۱۹۹۰ء کے ابتدائی ایام میں کشمیر میں تحریکِ مزاحمت کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے کشمیر میں برقعہ مہم چلی ،اس مہم کے ساتھ ہی شہر سرینگر میں سنیما گھروں کو بند کرانے کی مہم بھی شروع ہوگئی اور ان دونوں مہموں میں جس کشمیری خاتون نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ سیدہ آسیہ اندرابی تھیں ،ان دنوں میں جماعتِ اسلامی کے ترجمان اخبار'اذان' میں بحیثیت کاتب کام کرتا تھا اور میرے سامنے سرینگر کے پلیڈیم سنیما کے فوسٹروں پر کالک پوتنے کا واقعہ پیش آیا، جس میں آسیہ اندرابی نے اپنی خواتین برگیڈ ''دخترانِ ملت'' کے ہمراہ حصہ لیا تھا۔آسیہ اندرابی اوران کے شوہر محمد قاسم کی قید و بند کی ایک طویل کہانی ہے، جس پر تفصیلاً لکھنے کی ضرورت ہے اور تادمِ تحریر دونوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اذیتناک زندگی گزار رہے ہیں۔ آسیہ کے ساتھ ساتھ جو دوسری کشمیرخاتون مزاحمتی تحریک کے ساتھ جڑی اور ایکسپوز ہوئی، وہ فریدہ بہن جی تھی ،فریدہ آلوچہ باغ سرینگر کے بیگ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور اس خاندان کے کئی افراد ابتدائی ایام میں تحریک کے ساتھ وابستہ ہوئے اور کئی ایک نے اپنی جانیں بھی گنوادیں۔فریدہ بہن جی کے بارے میں کئی کتابیں بھی لکھی گئیں، انہوں نے تقریباً چار سال کا عرصہ دلی کے بدنام جیل تہاڑ میں بھی گزارا اور ایک طویل عرصہ تک عدالتوں کے چکر کاٹے ، وہ اس وقت 'کشمیر ماس مومنٹ' کی چیئر پرسن ہیں اور اس مضمون کو ضبطِ تحریر میں لانے کے وقت بھی وہ دلی میں کسی مقدمے کی تاریخ کے سلسلے میں گئی ہوئی ہیں، اس لئے ان کے بارے میں تفصیلات اگلے شمارے میں پیش کی جائیں گی۔تیسری خاتون، جو کشمیر کی تحریکِ مزاحمت کے ساتھ وابستہ ہوئی اور عذاب وعتاب کے ایک طویل سلسلے سے گزری، وہ ہے اسلام آباد کی زمرودہ انجم حبیب، وہ 'خواتین مرکز نامی تنظیم کے ساتھ وابستہ ہیں اور اگر ان کی مزاحمتی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ تقریباً بیس سال کے طویل عرصے پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے، جس بارے میں اگلی اقساط میں ذکر آئے گا۔

جہاں تک آسیہ اندرابی کی مزاحمتی تاریخ کا تعلق ہے، یہ عسکری تحریک کے آغاز یعنی 1990ء کے ساتھ ہی شروع ہوجاتی ہے اور آسیہ اندرابی اپنی 'دخترانِ ملت' نام کی خاتون برگیڈ کے ساتھ سرینگر میں سرگرم دکھائی دیں۔ حالانکہ آسیہ اس سے کافی پہلے کشمیر میں سرگرم تھیں لیکن ان کو اسی عرصے کے دوران اچھا خاصا ایکسپوژر ملا۔ آسیہ کا جنم 1962ء میں سرینگر کے پائین شہر علاقہ میں سید شہاب الدین اندرابی کے گھر میں ہوا، انہوں نے کشمیر یونیورسٹی سے سال 1981ء میں ہوم سائنس کے مضمون میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی اور وہ ایک سائنسدان بننا چاہتی تھیں، جس حوالہ سے وہ اپنی

اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہمسایہ ریاست ہماچل پردیش جانا چاہتی تھیں لیکن اپنے بھائی عنائت اللہ اندرابی نے اُنہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور آسیہ نے گھریلو زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا، اسی دوران ان کی نظروں سے ایک کتاب ''خواتین کے دلوں کی باتیں'' گزری، جو ان کے والد کی ذاتی لائبریری میں موجود تھی، یہ کتاب مسلم خواتین کے حقوق کے بارے میں تھی اور اس کے مطالعہ نے آسیہ کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ انہوں نے اسلامی شعار اختیار کرنے اور مسلم خواتین کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے متاثر ہوکر انہوں نے نوئے کی دہائی کے آغاز میں کشمیری خواتین پر مشتمل اپنی تنظیم ''دخترانِ ملت'' بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بعد جب کشمیر میں عسکری تحریک کا آغاز ہوا تو آسیہ کی جماعت بھی اس میں شامل ہوگئی اور انہوں نے کشمیر کی مسلم خواتین کو اس مہم میں شامل کرنے کے حوالہ سے کافی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اسی دوران بھارت نے کشمیر کی کئی علیحدگی پسند اور عسکری تنظیموں پر پابندی عائد کی تو اس فہرست میں دخترانِ ملت کو بھی شامل کیا گیا، آسیہ نے تحریکِ مزاحمت میں شامل جمیعت المجاہدین کے ایک کمانڈر عاشق حسین فکتو (عرف محمد قاسم) کے ساتھ شادی کرلی لیکن بدقسمتی سے دونوں کو ایک ساتھ رہنے کا بہت کم موقعہ ملا کیونکہ اس کے بعد ہی ان دونوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ انہیں گرفتار کر کے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت بند کر دیا گیا، جہاں محمد قاسم پر انسانی حقوق کے کارکن پنڈت ہردے ناتھ وانچو (ساکینہ جواہر نگر) کے قتل کا مقدمہ چلایا گیا لیکن ریاستی ہائی کورٹ نے کچھ دیر بعد انہیں الزامات سے بری کر دیا، بعد میں محمد قاسم کو دلی میں گرفتار کیا گیا اور اگرچہ ابتداء میں ان پر بیرونی زرِمبادلہ کو عسکریت پسندوں تک پہنچانے کا الزام لگایا گیا لیکن بعد میں انہیں پھر سے وانچو کے کیس میں دوبارہ پھنسایا گیا اور دلی کی ایک عدالت نے انہیں عمر قید کی سزاء سنائی، حالانکہ ان کو جیل میں اٹھارہ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی رہائی عمل میں نہیں لائی جا سکی ہے۔ ان برسوں میں آسیہ کو کئی بار گرفتار کیا گیا اور کئی بار رہاء کیا گیا لیکن نہ تو ان کے سٹینڈ میں کوئی کمی آئی ہے اور نہ ہی حکومت کی جانب سے ان پر شکنجہ نرم ہوا ہے۔ 2008ء میں امرناتھ لینڈ سکیم کے دوران اٹھنے والی ایجی ٹیشن، جس میں تقریباً ساٹھ نوجوان مارے گئے، آسیہ نے بھی زوردار مہم چلائی، اس دوران بھی انہیں گرفتار کیا گیا اور تقریباً چھ ماہ بعد رہائی نصیب ہوئی۔ اسکے بعد 2009ء میں شوپیان میں رونماء ہونے والی دوہرے ریپ اور قتل کی واردات کے خلاف بھی آسیہ نے احتجاجی مظاہروں کی قیادت کی، اس بار بھی انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ آسیہ اندرابی کی جہدِ مسلسل سے متاثر ہوکر بالی وڈ کے ایک پروڈیوسر نے ان پر ایک فلم بنانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن آسیہ نے صاف کہہ دیا کہ اگر ایسا

کیا گیا تو وہ پروڈیوسر کے خلاف کیس کر دیں گی، جس سے خوفزدہ ہو کر یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ آسیہ اندرابی نے اپنی آرگنائزیشن دخترانِ ملت کو کسی خاص دائرے میں محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے وقتاً فوقتاً کشمیری خواتین کے خلاف ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی، انہیں اپنا دفاع کرنے کی ترغیب دی اور یہاں تک بھی کہا کہ اگر انہیں اپنی عصمت کی حفاظت کے لئے تیز دھاری ہتھیار بھی رکھنا پڑیں تو انہیں ایسا کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ آسیہ نے شہر میں ہونے والی فحاشی اور آوارہ گردی کے خلاف کئی بار آواز اٹھائی اور اس سلسلے میں انہیں عوام کا سپورٹ بھی حاصل رہا۔

اس وقت جبکہ یہ مضمون لکھا جا رہا ہے، آسیہ اندرابی بدستور جیل میں ہے اور انہیں کشمیر سے باہر کسی جیل میں بھیج دیا گیا ہے، جبکہ ان کے شوہر ڈاکٹر محمد قاسم (جنہوں نے عظیم اسلامی مفکر اور محدث حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں تحقیقی مقالہ لکھ کر کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری جیل میں ہی حاصل کی ہے) ابھی تک جیل میں بند ہیں، ان کے دو بیٹے سرینگر کے صورہ علاقے میں اپنے گھر میں رہ رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے نہ تو اپنے موقف میں کوئی تبدیلی لائی ہے اور نہ ہی وہ اپنے ماضی کی کسی حرکت پر پشیمان ہیں۔ اگرچہ دوران اسیری راقم کو ڈاکٹر قاسم کے قریب رہنے اور ان کے ساتھ ایک لمبا عرصہ گزارنے کا موقعہ ملا لیکن جہاں تک آسیہ اندرابی کا تعلق ہے، میں نے انکے تقریباً چھ انٹرویو کئے ہیں لیکن اس دوران انہوں نے مجھے کبھی بھی اپنے گھر یا کسی کمین گاہ پر نہیں بلایا بلکہ ہمیشہ وہ خود اس مقام پر آئیں جہاں میں نے انہیں بلایا۔ میں نے اپنی کتاب 'شبستانِ وجود' میں بھی ان دونوں کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے، مجھے امید تھی کہ شائد انہیں کسی بات پر اعتراض ہوگا لیکن حقیقت میں اسکے برعکس ہوا۔ آسیہ اندرابی اپنے موقف کے حوالہ سے ایک سخت گیر خاتون تصور کی جاتی ہیں اور انہوں نے کئی بار کشمیر کے 'فائر برانڈ' لیڈر سید علی شاہ گیلانی کے علاوہ پاکستانی قائدین کو بھی ہدفِ تنقید بنایا، ان کے چند پسندیدہ اقوال کو مضمون میں شامل کرنا کافی مناسب نظر آتا ہے۔

''میں کشمیریت یا کسی ایسے قومی فلسفے میں یقین نہیں رکھتی، میرے حساب سے دنیا میں صرف دو ہی اقوام ہیں ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم'' میں اندرابی ہوں، سید ہوں، میرے اسلاف عرب سے وسطی ایشیا ہوتے ہوئے کشمیر آئے تھے اس لئے میں کشمیری نہیں ہوں۔ میں خود کو پاکستانی کہلوانے سے زیادہ مسلمان کہلوانا پسند کرتی ہوں''

☆☆☆☆

تحریکِ مزاحمت میں خواتین کارول....2

خواتین کسی بھی معاشرے کاایک ناقابلِ تنسیخ اور ناقابلِ فراموش حصہ ہوتی ہیں اوراس طبقے کو نہ صرف یہ کہ ہمارے سماج میں پہلے ہی بے شمار طریقوں سے ہراسان وپریشان کیاجاتا ہے،اس کے حقوق سلب کئے جاتے ہیں اوراسے تحقیر وتذلیل کا شکار بنایا جاتا ہے بلکہ اسے مرد کے حصے کے مصائب وآلام بھی اٹھانے پڑتے ہیں، خاص طور پران مقامات پر، جہاں کشمیر جیسی صورت حال ہو،عوام کئی کئی ٹکڑوں اور حصوں میں بٹے ہوئے ہوں اوراپنے مستقبل کے حوالے سے حیران وپریشان اور محوِ جستجو ،قربانیاں دے رہے ہوں، کئی دہائیوں پر محیط غیر یقینیت اور بے چینی کے سیاہ بادل فضاؤں پر قبضہ جمائے بیٹھے ہوں اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ یہ سلسلہ کب تک چلتارہے گااور آنے والے مراحل کیا کیارنگ دکھائیں گے اور آنے والے حادثات کے خدوخال کیا ہوں گے! کشمیری خواتین کے لئے یہاں کی صورت حال سے بچ کر نکلنا اورخود کواس سے دور رکھنا اوربھی زیادہ مشکل تھا کیونکہ اس تحریک میں سماج کا کوئی بھی طبقہ ایسا نہ تھا، جواس میں شامل نہ ہوا ہو،شیر خوار بچے اورضعیف بزرگوں نے جس جگہ اپنی کھال کھچوالی ہو،وہاں خواتین کا طبقہ اس سے الگ کیسے رہ سکتا تھا۔

گزشتہ شمارے میں کشمیر کی تحریکِ مزاحمت میں شامل ہونے والی خواتین کا ذکر چلاتو سیدہ آسیہ اندرابی کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ کیسے اس میدان میں آگئیں اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان لڑکی،جوسائنسدان بننے کےخواب بُن رہی تھی،یکا یک ایک ’شدت پسند‘اسلام نوازمزاحمت کارخاتون بن گئیں اورساری زندگی مصائب وآلام کے نام کردی،آسیہ کاتعلق چونکہ کشمیر کے مرکز یعنی سرینگر سے تھا،اس لئے ان تک یہ ہوااز خودہی پہنچ گئی لیکن ادھر جنوبی کشمیر کااسلام آباد قصبہ بھی شہر سے زیادہ دورنہیں تھااوراس ہوا کو وہاں تک پہنچنے میں کوئی خاص وقت نہیں لگا۔کشمیر یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی (سال ۸۸ءمیں)زمردہ انجم حبیب نے اسلامی حنفیہ کالج اسلام آباد میں لیکچرر کےطور ملازمت اختیار کی اور ساتھ ہی کشمیری خواتین کےحقوق اوران کےساتھ ہونے والی سماجی نابرابریوں کےخلاف آوازاٹھانے کے لئے اسلام آباد میں ’’ومنز ایسوسی ایشن‘‘ کے نام کی ایک تنظیم بنائی،کیونکہ انہی دنوں وہاں جہیز کی وجہ

سے ایک نو بیاہتا دلہن کی موت واقع ہوئی تھی اوراس سلسلے میں کافی ہنگامہ کھڑا ہوا تھا۔اس مہم میں پنڈت برادری کے بہت سے اساتذہ نے بھی حصہ لیا تھا جبکہ اس تنظیم میں ڈسٹرکٹ سوشیل ویلفئر آفیسر ،ڈسٹرکٹ پلاننگ آفیسر اورکئی کالجوں اور ہائر سیکنڈری سکولوں کی استانیاں بھی شامل ہوئیں اور پورے ضلعے میں ایک زبردست مہم چلی۔سال ۸۹ء میں جب کشمیر میں عسکریت کا آغاز ہوااوراسی کے ساتھ کشمیری پنڈت برادری نے بھی وادی سے رختِ سفر باندھا تو ہماری تنظیم میں شامل کئی پنڈت خواتین بھی وادی سے چلی گئیں۔ایک دوسال ہمارا کام متاثر رہااوراس کے بعد سرینگر میں اسلامک سٹوڈنٹس لیگ میں شامل چندنوجوانوں نے مسلم خواتین مرکز کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی،اس کی سربراہ بختاور بہن جی تھیں اوراس سلسلے میں شکیل احمد بخشی اور ظہیرالدین وغیرہ کافی سرگرم تھے،یہ لوگ وادی کے مختلف علاقوں میں اس تنظیم کے یونٹ کھڑے کررہے تھے اور جب اسلام آباد کی باری آئی تو انہوں نے ذمرودہ سے رابطہ کیا قائم اوراس تنظیم میں شامل ہونے کی پیشکش کی،چونکہ ذمرودہ پہلے ہی اس طرح کے تصور کے ساتھ جی رہی تھی اس لئے انہوں نے یہ پیش کش تو قبول کر لی لیکن بقولِ ان کے اس تنظیم میں بختاور بہن جی کے علاوہ کوئی ایسی قائد یا ورکر نہیں تھی،جوخواتین کے مسائل اور مشکلات کو صحیح تناظر میں سمجھ سکتی،ذمرودہ نے حال ہی میں ایک ملاقات کے دوران اپنے ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا'' یہ تنظیم کچھ جذبات کی بنیاد پر ضرور کھڑی ہوئی تھی اور میں بھی ایک لمبے عرصے تک یہی کوشش کرتی رہی کہ ایک نہ ایک دن ہم سبھی کسی ایک بنیادی نکتے پر متفق ہوجائیں گی کہ آخر ہمیں کرنا کیا ہے اور چونکہ ان دنوں ابھی کشمیر میں عسکری تحریک شروع نہیں ہوئی تھی اس لئے ہماری تنظیم خواتین کی سماجی مشکلات کے بارے میں کام کرتی تھی۔بعد میں ظہیرالدین اور میں نے اس کا آئین مرتب کیا اوراسی آئین میں جہاں ایک طرف کشمیری خواتین کے عام معاملات کے بارے میں شقیں رکھی گئیں،وہیں یہ بات بھی وضح کی گئی کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں خواتین کارول کیا ہونا چاہئے،اس کے بعد کل جماعتی حریت کانفرنس وجود میں آئی اور میں اس میں بھی شامل ہوئی بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ میں اس کے بنیادی ممبران میں سے تھی تو بے جا نہ ہوگا''

ذمرودہ کا کہنا تھا کہ ان کی نظر دنیا بھر میں جاری مزاحمتی تحریکوں پر تھی اوراس تناظر میں وہ سمجھتی تھیں کہ کشمیری خواتین تحریک میں کافی مثبت اور اثر انداز رول ادا کرسکتی ہیں''ہم نے حریت والوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی از حد کوشش کی اورانہیں اس بارے میں ذہنی طور تیار کرنے کی بھی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے انہوں نے خواتین کے رول کو بری طرح سے نظرانداز کیا،جس سے ہمیں

بہت مایوسی اور میں نے سیاست کو چھوڑ کر ایک ہیومن رائٹس کارکن کے طور کام کرنے کو ترجیح دی لیکن اس دوران ہماری تنظیم حریت کی ایک اکائی کے طور پر بھی متحرک رہی، اسی دوران مجھے جنیوا، امریکہ اور کئی دیگر بیرونی ممالک کا دورہ کرنے کا بھی موقعہ ملا، جہاں ہم نے بین الاقوامی برادری کے سامنے مسئلہ کشمیر اور اس حوالہ سے یہاں ہونے والی ظلم و زیادتیوں کا احوال بہت شاندار طریقے سے رکھا اور پہلی بار کشمیر اور باقی دنیا کے درمیان ایک زبردست رشتۂ ہمدردی پیدا ہوا، یہ سلسلہ ۲۰۰۳ء تک چلتا رہا اور اس سال فروری میں ہمیں بنکاک کی خواتین کی ایک تنظیم 'وومنز الرٹ' کی طرف سے ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک دعوت ملی، مجھے حریت کی طرف سے اس کانفرنس میں روانہ کیا گیا لیکن دلی پہنچنے پر ایک سازش کے تحت ۶۔ فروری ۲۰۰۶ء کو گرفتار کر لیا گیا، میرے ساتھ مسلم کانفرنس کا ایک کارکن اور پروفیسر عبدالغنی کا خاص دستِ راست شبیر احمد ڈار بھی گرفتار ہوا اور ہم پر ملی ٹنٹوں کے ساتھ روابط رکھنے کا الزام عائد کیا گیا اور تہاڑ جیل میں بند کر دیا گیا''

ذمرودہ اور شبیر احمد ڈار کو جیل میں ایک ساتھ بند کر دیا گیا تھا لیکن شبیر احمد ڈار کو حریت، مرکز مذاکرات کے دوران تقریباً ڈیڑھ سال بعد رہا کر دیا گیا جبکہ ذمرودہ کو چار سال اور دس ماہ جیل میں گزارنے پڑے۔ اپنی گرفتاری کے پسِ منظر میں ذمرودہ کا کہنا ہے ''اس وقت دلی میں حریت کانفرنس کا ایک دفتر مالویہ نگر علاقہ میں قائم تھا اور حکومتِ ہند اسے بند کر دینا چاہتی تھی لیکن اس کے لئے کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا، اس لئے مجھے اور شبیر ڈار کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کام کے لئے جواز پیدا کیا گیا اور مجھے پکا یقین ہے کہ اس سازش میں بعض حریت والوں کا بھی ہاتھ تھا''

اپنی جیل یاترا کے بارے میں ذمرودہ کا کہنا تھا ''جیل اور وہ بھی بھارت کا تہاڑ جیل کسی قبر سے کم نہیں ہوتا، خاص طور پر کشمیری لوگوں کے ساتھ وہاں کس طرح کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے، اس بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس بارے میں سوچتے ہوئے بھی بدن میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے'' ذمرودہ نے کہا ''میں اُس وقت پورے بھارت میں پہلی خاتون تھی، جس پر سب سے کالا اور بھنگ قانون 'پوٹا' لگایا گیا تھا'' انہوں نے اپنی 'جیل یاترا' کے بارے میں ایک کتاب ''قیدی نمبر ۱۰۰'' بھی لکھی ہے، جس کی تیاری میں راقم نے بھی ان کی تھوڑی بہت معاونت کی تھی، یہ کتاب دراصل میری ''شبستانِ وجود'' کے بعد چھپی تھی اور اسے کافی سراہا گیا تھا۔ زندگی کے اس موڑ پر جبکہ ذمرودہ اپنی ۴۵ ویں دہلیز پر کھڑی ہیں اور اس اتھل پتھل کے دوران وہ اپنا گھر بسانے یا خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کے لئے بھی وقت نہیں نکال پائیں اور حال ہی میں ان کی سب سے رفیق ساتھی، والدہ محترمہ بھی اس دنیا

سے رختِ سفر باندھ کر راہئ ملکِ عدم ہو چکی ہیں، ذمرودہ کا یہی کہنا ہے کہ کشمیری سوسائٹی میں جب تک خواتین کو صحیح مقام دے کر زندگی کے ہر شعبے میں ساتھ چلنے کی اجازت نہیں دی جاتی، یہاں کا مقدر نہیں بدل سکتا، وہ تحریکِ مزاحمت کے حوالہ سے کسی غلط فہمی یا تذبذب کی بھی شکار نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ مسئلہ کشمیر ایک مسلمہ حقیقت کی طرح واضح اور حل طلب ہے اور اگر یہ کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل نہیں کیا گیا تو اس کے ساتھ اور بھی بہت سے ملکوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ اگر کشمیری چین سے نہ بیٹھے تو وہ لوگ بھی آرام سے نہیں رہ سکتے، جن کا اس مسئلہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی واسطہ ہے۔

جیل سے چھوٹنے کے بعد ذمرودہ نے کشمیری سیاسی قیدیوں اور متاثرہ کنبوں کے حوالہ سے اعداد و شمار اکٹھے کرنے کا بہت بڑا کام اپنے ذمے لے رکھا ہے اور اس حوالہ سے کافی کام بھی کیا ہے، مرودہ کا کہنا ہے "عام طور پر بھارتی میڈیا تحریک پسندوں کے ساتھ یہ الزام چسپاں کر دیتا ہے کہ کشمیر کے بعض لیڈر محض پیسے کیلئے مزاحمتی تحریک چلا رہے ہیں اور اس میں غریب گھروں کے بچوں کو ملوث کیا جاتا ہے لیکن میں کہتی ہوں کہ مجھے کس چیز کی کمی تھی؟ میں ایک اچھے بٹ خاندان سے تعلق رکھتی تھی، سبھی بھائی بہن اچھی پوزیشنوں پر تھے اور میں نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک اچھی پوسٹ سے شروعات کی تھی، پھر میرا اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ محض اس قوم کا درد اور اس کے ساتھ ہونیوالی زیادتوں کا احساس ہے جو ایک عام کشمیری کو رنج و غم میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنے انجام کی پرواہ کئے بغیر کانٹوں اور پتھروں سے بھرے اس رستے پر چل پڑتا ہے... اور یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔

تحریکِ مزاحمت میں خواتین کا رول....3

تنازعہ کشمیر کی تاریخ کا احاطہ کرنا اور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا کوئی معمولی کھیل نہیں ہے، اس چھوٹی سی وادی، جسے کشمیر کے نام سے جانا جاتا ہے اور جسے قدیم زمانے سے ہی جنت ارضی کا نام بھی دیا گیا ہے، کے، چپے چپے پر ہزاروں داستانیں بکھری پڑی ہیں، ہر داستان میں ہزاروں راز و نیاز پوشیدہ ہیں اور ان سب کو کسی ایک کتاب میں جگہ دینا کسی کے بھی بس کی بات نہیں ہو سکتی لیکن اس کے باوجود چونکہ اس سرزمین کا ہم پر قرضہ یہ بھی ہے کہ اس کچھسے نکلنے والی خوراک، اس کے پھولوں سے نکلنے والی خوشبو اور اس کی چھاتی سے نکلنے والا دودھ سے بھی میٹھا پانی ہمارے وجود کا حصہ ہے، اس لئے اس قرض کا تقاضہ ہے کہ اپنے اس وطنِ عزیز کے بارے میں کچھ نہ کچھ بات کی جائے۔ اپنی تنگ دامنی اور افلاس علم کو نظر میں رکھتے ہوئے میں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا، جس کا میرے اپنے زمانے کے ساتھ واسطہ تھا اور اس دور کے مظالم نے باقیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی نہیں بخشا تھا، یہ داستان تھی اس وطن کے مظلوم اور مقہور عوام کی، جن میں، خوش قسمتی سے میں بھی شامل ہوں اور دوسرے الفاظ میں کہوں تو یہ میری اپنی داستان تھی، جو سنائے یا بیان کئے بغیر میرا زندہ رہنا دشوار تھا، حالانکہ ابھی اس کہانی کے اور بھی کئی پہلو اور کئی موڑ ہیں لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے اسے اسی موڑ پر چھوڑنا پڑ رہا ہے، مجھے یہ لکھتے ہوئے ایک طرف خوشی ہو رہی ہے کہ میری کتاب اس مضمون کے ساتھ تکمیل کو پہنچ رہی ہے لیکن ساتھ ہی دکھ اس بات کا ہے کہ ابھی میں اسے جاری رکھنا چاہتا تھا تاہم امید کا دامن اتنا بھی تنگ نہیں کہ اس سے آگے کام بند کر دیا جائے، انشاءاللہ جہاں تک ممکن ہو سکے گا، اس سلسلے کی اقساط جاری رہیں گی اور ان گوشوں اور پہلوؤں کو ٹٹولنے اور جاننے کی بھی کوشش کی جائے گی، جو ضروری ہوں گے تاہم زیرِ نظر مضمون کے بعد کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپنے کے لئے روانہ کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک رواں مضمون ''تحریک مزاحمت میں خواتین کا رول'' کا تعلق ہے، یہ باب از خود ہی کافی وسیع اور اہم ہے کیونکہ کشمیری خواتین بھی اس تحریک کے ساتھ اسی دن وابستہ ہو گئی تھیں، جب کہ مرد حضرات نے اس پرخار راستے پر پہلا قدم اٹھایا تھا۔ خواتین قائدین میں سے میں نے اب تک جس

کے ساتھ بھی بات کی، پتہ یہی چلا کہ وہ یا تو عسکری تحریک سے پہلے ہی اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھی یا عین انہی دنوں اس کے ساتھ جڑ گئی، جب کشمیری نوجوانوں نے ہتھیار اٹھائے۔اس سلسلے میں کشمیر ماس مومنٹ کی چیئر پرسن فریدہ بہن جی نے ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ وہ کافی عرصہ قبل (تقریباً سال 1989ء میں) تحریک کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھیں۔فریدہ نے کہا ''مولانا عباس انصاری نے 87ء کے انتخابات میں مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کو حکومت کی جانب سے زبردستی ہرا دینے کے بعد 'کشمیر لبریشن سیل' کے نام سے ایک مزاحمتی گروپ تشکیل دیا تھا، اس گروپ کے ساتھ ایک 'لبریشن کونسل' نام کی ایک تنظیم بھی تھی اور میں اس ونگ کے ساتھ وابستہ تھی۔کشمیر سیل کے مختلف جلسوں، جلوسوں اور دیگر مزاحمتی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھی۔انہی دنوں میرا چھوٹا بھائی بلال احمد بیگ عسکری تنظیم سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ (SLF) کے ساتھ وابستہ ہو گیا، جلد ہی فوج کو اس بات کی بھنک لگ گئی اور ہمارے گھر پر چھاپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔کسی نہ کسی بہانے فورسز کی پارٹیاں ہمارے ساتھ ساتھ اُن تمام گھروں کو بھی نشانہ بناتی رہتی تھیں، جہاں ہماری موجودگی کا احتمال ہوتا، کچھ عرصہ بعد بلال گرفتار ہو گیا، اسے کبھی مدھیہ پردیش کے کسی جیل میں بند رکھا گیا، کبھی جموں اور کبھی سرینگر میں اذیتوں کا شکار بنایا گیا اور بالآخر سال 89ء میں جب انہیں ایک طرف رہا کیا گیا تو دوسری جانب ان کی دوبارہ تلاش کے لئے چھاپوں کا سلسلہ جاری رہا، جس سے تنگ آکر اس نے کشمیر سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس سے قبل تقسیم ریاست کے وقت ہمارے ایک چچا حبیب اللہ بیگ پاکستان (آزاد کشمیر) چلے گئے تھے، ہمارے والد محمد یوسف بیگ نے ہمیں کئی بار ان کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کن حالات میں پار چلے گئے تھے، ہمارے پاس ان کی تصویریں کبھی کبھی آتی رہتی تھیں لیکن نہ وہ ہمارے پاس آسکتے تھے اور نہ ہی ہم ان سے ملنے جا سکتے تھے، کیونکہ ہمارے درمیان کانٹوں، گولیوں اور بموں سے بھری ایک لمبی دیوار (جنگ بندی لائن) حائل تھی اور اس کو پار کرنے کا ہمارے پاس کوئی بھی راستہ نہیں تھا۔اس واقعہ نے ہماری سوچ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا اور بچپن سے ہی ہمارے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کشمیر کے ایسے نہ جانے کتنے ہزار کنبے ہوں گے، جن کو اسی طرح کی اذیتوں سے گزرنا پڑ رہا ہوگا، کشمیر کے منقسم عیالوں کو آپس میں فون پر بات کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی اور یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا جس کے ساتھ ہم لوگ بڑے ہوتے رہے، اس کے بعد جب بلال بیگ کے لئے بھی یہاں کی جگہ تنگ کر دی گئی تو ہمیں چالیس سال بعد ایک اور صدمے سے گزرنا پڑا اور ہماری بے چینی میں اور بھی اضافہ ہو گیا''

تاریخ کے صرف پچاس سالہ عرصہ میں بلال احمد بیگ کی ہجرت فریدہ بہن جی کے لئے دوسرا

ایسا صدمہ تھا، جس کا تعلق کشمیر پرابلم کے ساتھ تھا، ان دوصدموں کی نوعیت اس لئے کچھ کم تھی کہ ہجرت کرنے والے چاچا، بھتیجا سرحد کی دوسری جانب کم از کم زندہ اور سلامت تو تھے لیکن اسی پر بس نہیں ہوئی اور جو تیسرا صدمہ انہیں ملا، اس کی نوعیت سب سے زیادہ شدید تھی، اس بارے میں فریدہ نے بتایا

''بلال کی ہجرت کے بعد فورسز نے ہمارے ساتھ اور بھی سخت سلوک روا رکھا، ہمارے گھروں پر چھاپوں کا سلسلہ اور بھی تیز کر دیا گیا اور اسی دوران 1992ء میں جب فوج نے وادی میں 'پکڑو اور مارو' کا سلسلہ (آپریشن ٹائگر اور آپریشن کیچ اینڈ کل) شروع کر رکھا تھا، ایک دن فوج نے بمنہ میں ایک گھر پر چھاپہ مار کر دس افراد کو گرفتار کر لیا، جن میں میرے والد محمد یوسف بیگ بھی شامل تھے، ہمارے والد کو دورانِ حراست اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا اور ان کی لاش اگلے دن ہمیں انتہائی بری حالت میں سونپ دی گئی لیکن گرفتار شدگان میں سے کئی ایک ابھی تک لاپتہ ہیں۔ ان میں محمد صدیق صوفی اور جاوید احمد شالہ شامل بھی ہیں، یہ دونوں افراد آج تک نہ تو گھر لوٹے اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی علم ہے کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، زندہ بھی ہیں یا مار دیئے گئے ہیں''

کشمیر ملی ٹینسی کا یہ وہ دور تھا جب فوج کی طرف سے ''پکڑو اور مارو'' کی پالیسی کے تحت کشمیر کے اطراف و کناف سے ہزاروں لوگوں، خاص طور پر عسکری نوجوانوں اور ان کے قریبی رشتہ داروں کو گرفتاری کے بعد لاپتہ کر دیا گیا اور اس وقت بھی ان میں سے تقریباً چھ ہزار افراد لاپتہ ہیں۔

فریدہ بہن جی کو فروری 96ء میں سرینگر میں ان کی رہائش گاہ نٹی پورہ سے پولیس نے ایک شبانہ چھاپے کے دوران گرفتار کر کے دہلی پہنچا دیا اور وہاں کافی عرصہ قبل لاجپت نگر علاقہ میں ہونے والے ایک بم دھماکے میں ملوث کر دیا گیا۔ اس دھماکے میں وہاں ایک شاپنگ کمپلکس کو نقصان پہنچا تھا اور کئی لوگ مارے گئے تھے، پولیس نے اس کیلئے اخوان المسلمین (جس کا سابق نام کا نام سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ تھا) کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس کیس کی عدالتی کاروائی چونکہ دلی میں ہو رہی تھی، اس لئے بہن جی کو بھارت کے سب سے بدنام تہاڑ جیل میں بند کر دیا گیا، جہاں انہوں نے تقریباً پانچ سال کا عرصہ گزارا۔ اپنی 'جیل یاترا' کے بارے میں بہن جی نے کہا ''تہاڑ کے مظالم پر ایک بہت بڑی اور دل دہلا دینے والی کتاب لکھی جا سکتی ہے، خاص طور پر اس جیل کی سپرانٹنڈنٹ کرن بیدی، جسے بھارت نے پدم شری کا ایوارڈ دیا ہے، کی اصلیت کے بارے میں اگر بات کی جائے تو وہاں جلادوں کے بھی

کلیجے کانپ اٹھتے ہیں'' فریدہ بہن جی کو پانچ سال بعد اگست 2001ء میں تہاڑ سے ضمانت پر رہا کر دیا گیا لیکن انہیں ہر ماہ کیس کی سماعت کے سلسلے میں سرینگر سے دلی جانا پڑتا تھا اور یہ اذیت ناک سلسلہ تقریباً مارچ 2010ء تک جاری رہا، اس کے بعد دلی کی پٹیالہ ہاؤس عدالت نے اس کیس میں ملوث افراد کو سزائیں سنائیں، جس میں پانچ افراد کو سزائے موت اور باقیوں کو کم از کم پانچ سال کی قید ما مشقت کی سزاء شامل ہے۔فریدہ نے چونکہ اس کیس میں پانچ سال کا عرصہ پہلے ہی جیل میں گزار دیا تھا اس لئے انہیں اسی میں چھوڑ دیا گیا جبکہ سزائے موت پانے والوں میں علی محمد بٹ، سید نوشاد، جاوید احمد خان، نثار احمد قاضی عرف نازہ شامل ہیں، جبکہ عبدالغنی گونی، فاروق احمد خان اور لطیف احمد واجہ اگر چہ دلی کے اس کیس میں بری ہو گئے تھے لیکن پولیس نے ان کے خلاف مزید فرضی کیس کھڑے کر دیئے اور دوبارہ جیل بھیج دیا اور تادمِ تحریر یہ تینوں راجستھان کے جے پور جیل میں نظر بند ہیں''

فریدہ بہن جی اس وقت کشمیر ماس مومنٹ نامی مزاحمتی تنظیم کی سربراہ ہیں، (مولوی بشیر احمد اس تنظیم کے چیئرمین ہیں) فریدہ بہن جی نے جون 2001ء میں اس وقت پاکستان کا دورہ کیا تھا جب وہاں مقیم ان کے بھائی بلال احمد بیگ کی شادی ہوئی۔شادی کی اس تقریب میں کشمیری مہمانوں کا جو وفد اسلام آباد پاکستان گیا، ان میں فریدہ بہن جی اور سینئر قلم کار شبنم قیوم کے علاوہ راقم بھی شامل تھا۔ اس دورے کے دوران پاکستان میں ہونے والے دلچسپ تجربات کے بارے میں ، میں نے اپنی کتاب 'شبستانِ وجود' میں تفصیل سے لکھا ہے۔ بلال کی شادی پاکستانی کشمیر کی سرحد کوہالہ کے نزدیک واقع انتہائی خوبصورت مقام مری کی ایک مہاجر کشمیر لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی اور یہ دورہ صرف پندرہ دن پر مشتمل تھا۔اس دوران فریدہ بہن جی نے جیل کے اندر اُن پر ہونے والے مظالم کی ایک طویل داستان سنائی تھی لیکن اس کا احاطہ کرنے کے لئے کسی الگ اور ضخیم کتاب کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

کشمیر ماس مومینٹ کے قیام کے بارے میں انہوں نے بتایا

''شروع میں ہم سب خواتین عباس انصاری (حریت کانفرنس کے سابق چیئرمین اور اتحاد المسلمین کے سربراہ) کی کشمیر سیل میں شامل 'کشمیر لبریشن کونسل' کے ساتھ وابستہ تھیں لیکن بعد کے چند برسوں میں چونکہ اس میں شامل کئی افراد یا تو شہید ہو گئے یا پھر جیلوں میں ڈال دیے گئے اس لئے مجبوراً ہمیں کشمیر ماس مومنٹ کے نام سے الگ تنظیم بنانا پڑی۔ ماس مومنٹ کا قیام سال 1996ء میں میری گرفتاری کے بعد عمل میں لایا گیا اور اس کے پہلے چیئرمین مشتاق احمد شیخ عرف جانہ کا ٹُر تھے لیکن

جب میں جیل سے باہر نکلی تو تنظیم نے اس کا چیئر مین مجھے بنا دیا''

اس حوالہ سے مولانا عباس انصاری نے کہا ''شروع شروع میں حریت پسند محاذ میں کسی خاتون یا خواتین پر مشتمل تنظیم کو شامل کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن میں نے ذاتی طور پر اس سلسلے میں کافی زور لگایا اور ہم نے 'لبریشن کونسل' کا نام بدل کر 'ماس مومنٹ' رکھ دیا کیونکہ تحریکِ مزاحمت ایک ایسے موڑ پر آ گئی تھی کہ جہاں خواتین کا رول کافی اہم بنتا تھا''

کشمیر ماس مومنٹ ریاست جموں و کشمیر کی واحد مزاحمتی تنظیم ہے، جس کے باقی ممبران مرد حضرات ہیں لیکن اس کی سربراہ ایک خاتون ہیں اور اس خاتون کو 'خاتونِ کشمیر' کا خطاب بھی دیا گیا ہے۔ کشمیر کے معروف مورخ اور صحافی شبنم قیام نے کافی عرصہ قبل ان کے بارے میں ''خاتونِ کشمیر'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ فریدہ بہن جی اور ان کی جماعت کا موقف ہے کہ کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے کیونکہ تقسیم برصغیر کے لئے جو فارمولہ اختیار کیا گیا تھا، اس کی رو سے چونکہ اس ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اس لئے اس کا پاکستان کے ساتھ جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ چونکہ تقسیم کے وقت کشمیر کے ہزاروں عیال منقسم ہو گئے، جو اب بڑھ کر لاکھوں تک پہنچ چکے ہیں اور ان عیالوں کو پھر سے ملانا ایک انسانی مسئلہ بھی ہے اور سیاسی بھی۔

اس کے باوجود کہ کشمیر کی موجودہ مزاحمتی تحریک میں یہاں کی خواتین کا بے حد رول رہا ہے اور انہوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دی ہیں، جو کہ جانی، مالی اور عزت و عصمت کی شکل میں موجود ہیں لیکن میری بدقسمتی یہ ہے کہ میرا ناتواں قلم ان سب قربانیوں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اگر اس کتاب یا اس سلسلۂ مضامین میں کوئی بات شامل نہیں ہوئی تو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، البتہ اگر زندگی نے فرصت دی تو اس سلسلے میں مزید کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔ (انشاءاللہ)

تمت بالخیر

کتابیات..

۱۔	دی ویلی آف کشمیر	سر والٹر لارنس
۲۔	جموں، کشمیر، لداخ	پرویز دیوان
۳۔	راج ترنگنی آف زوُنہ راجہ	ترجمہ: جے سی دت
۴۔	نیل مت پوران	ترجمہ: ارجن دیو مجبوؔر
۵۔	راج ترنگنی...	کلہن پنڈت
۶۔	مکمل تاریخِ کشمیر	محمد الدین فوق
۷۔	دی ہسٹری آف انڈیا اینڈ پاکستان	پروفیسر میجر طارق اعوان
۸۔	واقعاتِ کشمیر	محمد اعظم دیدمری ترجمہ ظہور شہداد
۹۔	کشمکش	چودھری غلام عباس
۱۰۔	اگر اب بھی نہ جاگے تو...	مولانا شمس نوید عثمانی رامپور
۱۱۔	کرائسٹ اِن کشمیر	عزیز کشمیرؔی
۱۲۔	میں نے کشمیر جلتے دیکھا	غلام احمد میر راجوریؔ
۱۳۔	شیرازہ (کشمیری)	مہجور نمبر (کلچرل اکیڈمی)
۱۴۔	اندرا گاندھی، ایمرجنسی اینڈ انڈین ڈیموکریسی	پنڈت پی این دھر
۱۵۔	۱۹۷۴ء سلطنت کے آخری ایام	پی جی رسول
۱۶۔	کشمیر گیزیٹر..۱۹۴۰ء	حکومت جموں و کشمیر
۱۷۔	تاریخِ پاکستان	محمد علی چراؔغ (پاکستان)
۱۸۔	تاریخِ پنجاب	جسٹس سید محمد لطیف پاکستان
۱۹۔	جیوسٹیز	ویب سائٹ
۲۰۔	وکی پیڈیا، انسائکلو پیڈیا	ویب سائٹ

۲۱۔	سینٹر فار ساؤتھ ایشین سٹیڈیز	کیمبرج یونیورسٹی لندن
۲۲۔	دی ڈان، کراچی پاکستان	اگست ۱۹۹۹ء
۲۳۔	کشمیر، اے ڈسپیوٹڈ لیگیسی	السٹیر لیمب
۲۴۔	نہروز لیگیسی ان فارن افیئرس	اے جی نورانی
۲۵۔	ریئلٹیز بیہائنڈ کشمیر پرابلم	ہلال احمد وار
۲۶۔	سفرِ زندگی (دی ہیئر اپرنٹ)	ڈاکٹر کرن سنگھ
۲۷۔	آنر (میگزین)	مدیر: رشید احمد
۲۸۔	میرا پیام اور ہے...	عباس آزاد، کراچی پاکستان
۲۹۔	آتش چنار	شیخ محمد عبداللہ / یوسف ٹینگ
۳۰۔	اکبرنامہ	ایس ایم برک ترجمہ
		مسعود مفتی پاکستان
۳۱۔	تزکِ جہانگیری	نورالدین محمد جہانگیر
۳۲۔	بہارستان شاہی	انگریزی ترجمہ
۳۳۔	محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک	محمد سعید الحق
۳۴۔	تذکرہ...	مولانا ابوالکلام آزاد
۳۵۔	کشمیر میں اردو...	کلچرل اکیڈیمی
۳۶۔	جیوگرافی آف جموں اینڈ کشمیر	ماجد حسین
۳۷۔	چناروں کے سائے میں	شوکت علی کشمیری کے ساتھ ایک انٹرویو
۳۸۔	کشمیر کے تلخ حقائق	ہاشم قریشی
۳۹۔	روشنی کا مینار، مقبول بٹ۔	ہاشم قریشی
۴۰۔	شہیدِ اعظم اور گنگا ہائی جیکنگ	ہاشم قریشی
۴۱.	ویلفیئر آف مسلمز	پوفیسر جی ایم شاہ

مقبول ساحلؔ کی دیگر کتابیں!

۱ خاموش تلاطم...........شعری مجموعہ...۱۹۹۱ء

۲ شبستانِ وجود (ایک صحافی کی سرگزشت) ۲۰۰۹ء

۳ تنازعۂ کشمیر...تاریخ کے آئینے میں......۲۰۱۱ء

۴ قدم قدم تعزیر..............افسانے....۲۰۱۱ء

۵ پرچھانواں.....مجموعۂ شعر پہاڑی....زیرِ طبع

۶ ابابیل......ناول.......... پہاڑی....زیرِ طبع

۷ راجپوت...ناول.....................زیرِ طبع

۸ چناب کی چڑیلیں....ناول.........زیرِ طبع

۹ حرف حرف زنجیر..مجموعۂ شعر اردو...زیرِ طبع

۱۰ لہولہو تصویر......کہانیاں............زیرِ طبع